ہفتہ وار لاہور

# خیام

The
# KHAYYAM 1940

سالنامہ ۱۹۴۰

Illustrated Weekly

LAHORE

## ANNUAL



مدیر و مالک
حافظ محمد عالم

۸/ /8/-

# نادرالوجود چیدہ چیدہ ہز ماسٹرس وائس ہندوستانی ریکارڈ سماعت فرمائیے




## ماہران موسیقی کے نادر تحائف

دیوکارانی و ممتاز علی

N 15633 { ایک چاندی کا ہے مندر ... فلم جیون پربھات / مجھے پہچانتے ہو ... ۔۔

کشور ساہو

N 15634 { چل چل رے چکوا گھر گھر ... فلم جیون پربھات / چلے تھے بڑے دشمن جان بن کر ... ۔۔

ممتاز علی و مایا دیوی

N 15635 { میرو للنا جھولے پالنا ... بھاگ پہلا ۔۔ / ۔۔ ۔۔ دوسرا ۔۔

N 15636 { ہوری آئی رے کنھیا برج کے بسیا بھاگ پہلا ۔۔ / ۔۔ ۔۔ دوسرا ۔۔

مس میرا

N 15702 { ہم پنجرے کی مینا ... فلم وچن / نول نویلی ناری ... ۔۔

مس میرا وغیرہ

N 15671 { جنم لیا تو جی لے بندے ... فلم نرملا / جیون ہے سنگرام ... ۔۔

سروج بورکر

N 15736 { متوالی کوئلیا بولے ... فلم سبھا بھی / من مورکھ کیوں دیوانہ ہے ... ۔۔

رینوکا دیوی اور جیراج

N 15737 { گھر آئے سجن لوٹ آئے ... ۔۔ / ہم قیدی ... ۔۔

مس میرا

N 15738 { ننھی ننھی بوندیا ... ۔۔ / بن تتلی بن تتلی ... ۔۔

N 15739 { پھول سجن تم میرو من بھنورا ... ۔۔ / پھول بگیا موری آنا ... ۔۔

## سُریلا اور بہترین ریکارڈنگ

ہنس پکچرز

N 15790 { جھنڈا اونچا رہے ہمارا ... فلم برانڈی کی بوتل / لینگے لینگے کیسریا دھر کے ... ۔۔

پدما دیوی

N 15722 { میری گلی میں ایک پردیسی ... فلم زمانہ / سوتے میں ہم سے ملا ہے پریتم ... ۔۔

امیر جان اور گوپے

N 15723 { مورے آنگنا میں بنسی بجا جا ... ۔۔ / آج ہمارے پیارے ہم سنگ جھولے ... ۔۔

شانتا آپٹے

N 5811 { رات آئی ہے نیا رنگ جمانے کے لئے ... فلم امرت منتھن / کسی بہ دل ❤ تم کا بارکیوں ... ۔۔

N 5828 { دیکھو دیکھو سکھی ری ... ۔۔ / سادھو وپیا کی رات ... ۔۔

وسنت دلیسائی

N 5860 { سکھی ری شام بڑو ... ۔۔ / آدی پرش نرائن ... فلم اجودھیا کا راجہ

شانتا آپٹے

N 5845 { سنو سنو بن کے پرانی ... فلم امرجوتی / اب میں نے جانا ہے ... ۔۔

N 5846 { آج ہیں بن بے حد بھاتا (شانتا و نند یکار) ... ۔۔ / سمندری ڈاکوؤں کا گانا (پربھات فلم کمپنی) ... ۔۔

مس وسنتی

N 5884 { آنکھیں کے تم تارے ... ۔۔ / یہ جوگن کھوجن نکلی ہے ... ۔۔

وسنت دیسائی

N 5859 { بھول جا بھول جا بھلاؤں کیسے ... ۔۔ / کارج کی جوت سدا ہی جرے ... ۔۔

شانتا آپٹے

N 5887 { منگل جنگل میں رہتا ہے ... فلم دہاں / ہر گلی میں ہے ... ۔۔

وسنت دلیسائی

N 5888 { مجھے نہ بھیجو ندی کنارے ... ۔۔ / ہے دنیا میں پاپ غلامی ... ۔۔

بوا صاحب بھگوت اور وتسلا

N 5889 { چمکی ہاتھ کی چوڑی چما چم ... ۔۔ / مالن بیٹھی پربت چوٹی پر ... ۔۔

نئی گراموفون مشین

### ماڈل نمبر ۱۷۹



یہ نئی ٹیبل گرانڈ گراموفون مشین آپکے مکان کی زینت اور آپکے روپیہ کا بہترین بدل ہے

دیکھنے میں خوبصورت اور برتنے میں پائدار ہے

کسی گراموفون ڈیلر کے شوروم میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت صرف ۱۵۰ روپے۔

## دی گراموفون کمپنی لمیٹڈ۔ دم دم بمبئی مدراس دہلی

# ارشاداتِ عالیہ

از استاذ السلطان عالیجناب نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مدظلہ العالی

کسی کا حسن اگر بے نقاب ہو جاتا
نظامِ عالمِ ہستی خراب ہو جاتا

جو آپ آتے تو دنیا مری بدل جاتی
خوشی ملال، سکوں اضطراب ہو جاتا

ابھرنے دیتی نہ یادِ شراب پھر مجھ کو
شراب چھوڑ کے غرقِ شراب ہو جاتا

نظارۂ رخِ دلدار ہر طرح دشوار
نقاب اٹھتی تو حائل حجاب ہو جاتا

ہزار ہنستے رہے گل مگر نہ تھا ممکن
کہ میرے زخمِ جگر کا جواب ہو جاتا

نگاہِ لطف نہیں انکی خیر ہے ورنہ
کچھ اور حال ہمارا خراب ہو جاتا

جو موت کا نہ محبت میں آسرا ہوتا
کسی حسین پہ مرنا عذاب ہو جاتا

اگر میں ہوش میں ہوتا تو یہ طلسمِ جہاں
مری نگاہ میں دھندلا سا خواب ہو جاتا

وہ آنے والے ہیں شب کو یہ چاہتا ہوں جلیل
غروبِ شام سے قبل آفتاب ہو جاتا

# نذرِ خیام

(سلطان الشعراء مولانا ظفر علی خاں کی تازہ ترین نظم)

میں کچھ آزاد نہیں ہوں کہ ہوں گاندھی کا غلام
اس سے اونچا ہے بہت میری ارادت کا مقام

میرے ملجا میرے ماوا ہیں رسولِ عربی
پیشوا میرے وہی ہیں وہی میرے ہیں امام

کشورِ ہند میں قائد وہی ہو سکتا ہے
ایک ہوں جس کی شریعت میں حلال اور حرام

جو پرستار اگر ہو تو وطن کے بت کا
جس کے مسلک میں ہو بازیچۂ اطفال اسلام

کٹ کے اپنوں سے پرایوں سے جو رشتہ جوڑے
نظر آتا نہیں اس قوم کا اچھا انجام

شرم سے آنکھ مہ و مہر کی نیچی ہو جائے
نظر آئے جو انہیں ملتِ بیضا کا نظام

اس کی شمشیر پلٹ دیتی ہے تلوار کا رخ
اس کی تدبیر نے الٹی ہے بساطِ ایام

نہ جھکا غیر کے آگے کبھی اپنی گردن
ہے یہ توحید کے فرزند کو میرا پیغام

زیبِ قرطاس یہ اشعارِ دلآویز ہوئے
اب کریں حضرتِ ناظر انہیں نذرِ خیام

# اعجازِ تغزل

(امام المتغزلین مولانا حسرت موہانی کی تازہ ترین غزل)

آپ کے حسنِ جہاں سوز کا جلوا دیکھا
ہم نے گھر پھونک کے خوب آج تماشا دیکھا

کیا بتائیں دمِ نظارہ بفرطِ حیرت
کیا نہ دیکھا رُخِ زیبا میں ترے کیا دیکھا؟

دلربائی میں ترے حسن کو دیکھا بے مثل
جاں نوازی میں ترے ناز کو یکتا دیکھا

کھنچ گئی نورِ علیٰ نور کی تصویرِ جمیل
بعد کعبے کے جو آنکھوں نے مدینا دیکھا

ہم نہ کہتے تھے یہ لپکا نہیں اچھا حسرت
خاک میں مل کے محبت کا نتیجا دیکھا؟

# لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہو گیا

از حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

کیوں اسیرِ گیسوئے خمدارِ قاتل ہو گیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہو گیا

کوئی نالاں کوئی گریاں کوئی بسمل ہو گیا
انکے اُٹھتے ہی دگرگوں رنگِ محفل ہو گیا

قیسِ مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں
ہر بگولا دشت کا لیلےٰ کا محمل ہو گیا

اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدائے دستِ قاتل ہو گیا

یہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمندِ زلف کا
لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہو گیا!

# الہامات

از حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی

مجھے بھی اپنے عالمگیر جلووں میں نہاں کر لے
مزاجِ جوہرِ آئینہ ہوں میں امتحاں کر لے

کوئی تو سن ہی لیگا ختم اپنی داستاں کر لے
بیاں کرنے کی ہر دل آرزو مندِ بیاں کر لے

ترے بس میں نہیں یا اس سمجھی نوائے گلشن کا
بقدرِ فرصتِ امروز سیرِ گلستاں کر لے

ریاضت ہائے نالاں کے شوق میں دم توڑنے والے
مٹا کر اپنی ہستی ہر نفس کو جاوداں کر لے

متاعِ زیست پر ہے انتہا مار سنج کو
بنا لے حاصلِ ہستی اسے یا رائیگاں کر لے

مرے ہمراہ لاکھوں زندگی کے ساز و ساماں ہیں
مری منزل ہے کہہ دو انتظامِ کارواں کر لے

میں ہر ساں دوا کے غم سے یوں بچتا ہوں وابستہ
کہ غم خود ہی علاجِ خاطرِ ناشادماں کر لے

گذرگاہِ جہاں میں اسلئے ہے دردِ پیدائی
کہ انساں خود نگاہ و دل کا اپنے امتحاں کر لے

بہارِ زندگی ہر ایک نفس باقی نہیں رہتا
یہ اب تیری خوشی ہے اسمیں صرفِ فغاں یا کر لے

محبت نام ہے لاحاصلی و ناتمامی کا
محبت ہے تو دل کو فارغِ سود و زیاں کر لے

تعین کی حدوں میں حریت کا سر نہیں جھکتا
جو رسماً ضبطِ سجدہ ہے تو سجدے رائیگاں کر لے

زمین و آسماں سے تنگ ہے تو چھوڑ دے ان کو
مگر پہلے نئے پیدا زمین و آسماں کر لے

حریمِ سیرِ گل کیا وہ نگاہِ دور رس ہوگی
جو سینہ چیر کر کانٹوں کا پیدا گلستاں کر لے

وہ میرِ کارواں ہو میرے نصب العین کا ضامن
جو منزل کو بھی رستے میں شریکِ کارواں کر لے

مسافر ہوں میں زیرِ سایۂ گل بسر کر لوں گا
ہمیشہ جس کو رہنا ہو وہ تعمیرِ آشیاں کر لے

کوئی صوفی ہو اے سیماب شاعر ہو کہ پیغمبر
جسے چاہے وہ اپنا محرمِ رازِ نہاں کر لے

ہفتہ وار    خیام    لاہور

یکشنبہ ۸ر اکتوبر ۱۹۳۹ء مطابق ۲۴ر شعبان و ۱۶ر اکتوبر ۱۹۳۹ء مطابق ۳ر رمضان ۱۳۵۸ھ

# "خیام" کا دوسرا سال

## یکسالہ واقعات و حوادث پر سرسری نظر

حکایت ہائے عہد دوستی را کردہ ام از بر
چوں ہندوئے کہ بعد از سوختن ہیزم نگہ دارد (نظیری)

خدائے رحیم کے رحم و کرم سے "خیام" اپنی زندگی کا دوسرا برس ختم کر چکا ہے۔ یہ سال واقعات و حوادث کے اعتبار سے کس قدر المناک و ہوشربا ثابت ہوا؟ اسکا جواب جاپان سے دریافت کیجیے جس کے ہاتھوں سے مظلوم و مغلوب چین کا خون ٹپک رہا ہے۔ جنرل فرانکو سے پوچھیے جو جمہوریت ہسپانیہ کی بے گور و کفن نعش پر فاتحانہ گیت گا رہا ہے۔ مراکش کے عربوں سے دریافت کیجیے جنھوں نے فرانکو کے دلفریب وعدوں سے متاثر ہو کر ہسپانیہ کے ذرہ ذرہ کو عربی خون سے سیراب کر دیا۔ میمل اور چیکوسلوواکیہ سے پوچھیے جن کی طرز حکمرانی ہر ہٹلر کے اشارہ ابرو سے بدل کر رہ گئی فلسطینی عربوں سے کہیے جو درد دل کا علاج موت کی چوٹوں سے کرتے رہے یا البانیہ سے پوچھیے جس کی قومی حکومت اطالوی غلبہ سے دم توڑ چکی ہے اور سب سے آخر میں پولینڈ سے پوچھیے جس کے جغرافیائی دامن کا ایک ٹکڑا روس کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا جرمنی کی نوک شمشیر پر۔

### پولینڈ

ہم سب سے پہلے مسئلہ پولینڈ پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ قارئین کرام موجودہ رفتار کا اندازہ ماضی قریب کے واقعات سے لگا سکیں۔ پولینڈ کی زبوں حالی جرمنی کے اس خواب کی تعبیروں میں شامل ہے جس سے وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا اور اس اقدام کے محرکات میں دول عظمیٰ کی شریفانہ امن پسندی بھی شامل ہے۔ جرمنی نے آسٹریا۔ چیکوسلاویکیہ اور میمل پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا لیکن دول عظمیٰ نے میونخ کانفرنس کے سوا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس طرز عمل سے ہٹلر کی آتش ملک گیری اور بھی مشتعل ہوئی وہ محسوس کرنے لگا کہ برطانیہ و فرانس امن عالم کے لئے ہر جائز و ناجائز خسارہ و ایثار پر آمادہ ہیں اس لئے اگر ڈینزگ اور کاریڈور کی واپسی کے نام پر پولینڈ کی قسمت بدل دی گئی تو پیرس و لندن سے کوئی موثر آواز بلند نہ ہو گی۔ لیکن اس کی توقعات غلط ثابت ہوئیں اور وارسا پر جرمن بم کا جو پہلا دھماکا ہوا اس سے فرانس و برطانیہ کی حربی قوتیں بیدار ہو گئیں اور یہی بیداری انھیں میدان انتقام میں لے آئی۔

ہم پولینڈ کا انجام بتانے سے پہلے واقعات کی رفتار پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں ۲۶ر مارچ کو جب جرمن بھیڑیا میمل کا خون آزادی پی کر دُم ہلا رہا تھا تو ہر ہٹلر نے ڈینزگ اور کاریڈور کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ یہ آواز جب برلن سے اٹھی تو پیرس، لندن اور وارسا کے حلقوں میں اضطراب رونما ہو گیا لیکن سیاسی حلقے اس مطالبہ کو بے معنی دھمکی سے تعبیر کرتے رہے تاہم مسٹر چیمبرلین نے احتیاطی طور پر اعلان کر دیا کہ پولینڈ کی حفاظت کی جائے گی یہ اعلان ۳۱ر مارچ ۱۹۳۹ء کو ہوا۔ اور ۲۶ر اپریل کو برطانیہ بھر میں جبری بھرتی ہونے لگی۔ اس اقدام سے یہ حقیقت خلاف توقع طور پر ظاہر ہو گئی کہ برطانیہ کا پیمانۂ شکیب لبریز ہو کر چھلک رہا ہے اب وہ ہر ہٹلر کی صبر آزما حرکتوں کے خلاف جوابی قدم اٹھانا چاہتا ہے ۱۴ر اپریل کو مسٹر روزویلٹ (صدر جمہوریہ امریکہ) نے ہٹلر و مسولینی سے قیام امن کی اپیل کی۔ ۲۸ر اپریل کو ہر ہٹلر نے مسٹر روزویلٹ کی اپیل کا مضحکہ اڑایا اور کہا کھوئے ہوئے ممالک کی واپسی کا مطالبہ اصول امن کے خلاف نہیں ۱۲ر مئی کو ترکی بھی جمہوری محاذ میں شامل ہو گیا لیکن اس کے جواب میں ۲۲ر مئی کو جرمنی و اطالیہ میں فوجی معاہدہ ہو گیا

### جنگ

۱۸ر اگست کو جنرل ہمگلیرز (سالار پولینڈ) نے پولستانی فوجوں کے سامنے کہا کہ امن کے یہ معنی نہیں کہ چھینا جھپٹی سے کام لیا جائے اس پر ہر ہٹلر حد درجہ مشتعل ہوا۔ اس نے ۲۲ر اگست کو اعلان کیا کہ جرمنی ڈینزگ اور کاریڈور پر مسلط ہو کر رہے گا۔ ۲۷ر سے ۲۹ر اگست تک فرانس و برطانیہ اپنے سفیروں کی معرفت کوشش کرتے رہے کہ ڈینزگ اور کاریڈور کا مسئلہ مصالحانہ گفت و شنید سے تصفیہ پذیر ہو لیکن ہر ہٹلر کے سر پر جنگ کا بھوت سوار تھا اس نے صلح و امن کے تمام خوشگوار موقعے ضائع کر دیئے اور یکم ستمبر کی صبح کو جب آفتاب کی پہلی تجلی وارسا کے افق پر پھیل رہی تھی تو جرمن جہازوں نے آتش افشانی شروع کر دی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے ۲ر ستمبر کو برطانیہ نے جرمنی سے مطالبہ کیا کہ نازی فوجیں پولینڈ سے باہر نکل آئیں ورنہ فرانس و برطانیہ بھی میدان جنگ میں کود پڑیں گے ہر ہٹلر نے جواب میں تاخیر کی اور ۳ر ستمبر کو دونوں حکومتیں جرمنی کے خلاف صف آرا ہو گئیں بدقسمتی سے فرانس و برطانیہ کا جغرافیائی دامن پولینڈ تک وسیع نہ تھا اس لئے وہ اس کمزور ملک کو نازیوں کے خونیں پنجہ سے چھڑا نہ سکے لیکن فرانس نے مغرب کی طرف سے جرمنی پہ حملہ کر دیا اور برطانوی جہازوں نے جرمنی کی بحری ناکہ بندی کر دی۔ انگریزی طیارے جرمن حدود میں داخل ہو کر پمفلٹ برسا رہے ہیں لیکن جرمنی نے انسانی شرافت اور بین الاقوامی قوانین سے آگے بڑھ کر غیر مقاتل رعایا پر بمباری کی جس سے ہزاروں بے گناہ انسان محض پولستانی ہونے کے جرم میں خاکستر بنا دیئے گئے پولینڈ کی جنگ بالآخر اس مرحلے پر پہنچی کہ مغربی۔ جنوبی اور شمالی پولینڈ پر تو جرمنی کا قبضہ ہو گیا اور مشرقی پولینڈ پر روس ایک قطرہ خون بہائے بغیر مسلط ہو گیا۔

### اب کیا ہو گا؟

روس کی اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ روس و جرمنی کے معاہدہ ہی میں تقسیم پولینڈ کی شرط شامل تھی اگرچہ موسیو مالوتوف وزیر خارجہ روس نے اپنے غاصبانہ اقدام کو منطقی قوت سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ موسیو مالوتوف کہتے ہیں کہ پولینڈ کی حکومت مفقود الخبر تھی اس لئے روسی آبادی کے تحفظ و امان کی ذمہ داری کسی پر عائد نہ ہوتی تھی لہٰذا روس نے امن قائم کرنے کی غرض سے مشرقی پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ اگر امن کا مفہوم غاصبانہ ملک گیری سے پورا ہو سکتا ہے تو روس کی منطق قابل تحسین ہے لیکن بیماری کا علاج اگر موت سے نہیں کیا جاتا تو اس واقعہ سے ایک پرانے واقعہ کی یاد آ جاتی ہے۔ انقلاب روس کے بعد بالشویکوں سے پوچھا گیا کہ زار کہاں ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ ہمیں تو معلوم نہیں لیکن سنا گیا ہے کہ ایک نورش (کسان) نے زار کو اس لئے قتل کر دیا کہ زارانہ حکومت نے اس کے بیٹے کو سزائے موت دی تھی اس تجاہل عارفانہ کا اعادہ تسخیر پولینڈ کے لئے بطور وجہ جواز کیا جا رہا ہے ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بالشویک روس جو ساری دنیا میں صلح و مساوات اور حریت و اخوت کی روشنی پھیلانا چاہتا تھا آج غاصبانہ تاریکی کے اس غار میں ہے جہاں آمریت کی سیاہ کاریاں بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اب کیا ہو گا؟ اس کا جواب لندنی اخبارات ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ پولینڈ کے ایک حصہ پر روس اور دوسرے پر جرمنی قابض ہو گا۔ اور درمیان میں ایک بفر سٹیٹ ہو گی جسے اپنی حفاظت و بقا کے لئے دو شوہروں کی بیوی کی طرح رہنا پڑے گا لیکن ممکن ہے کہ یہ صورت حال جنگ کو صلح کی طرف لے آئے کیونکہ اب جرمنی پولینڈ کو ہضم کرنے کے لئے صلح کانفرنس کا چورن ڈھونڈے گا۔

### ہسپانیہ

مارچ کا مہینہ بہت زیادہ انقلاب انگیز ثابت ہوا ہے اس ماہ میں جرمنی نے سلواکیہ اور میمل پر متصرف ہو کر معاہدہ ورسائی کی آخری دھجی بھی بالٹک کی فضا میں اڑا دی اس طریق سے بیس برس کی بنی بنائی حکومتیں از سر نو جرمن امپائر میں شامل کر لی گئیں۔ چونکہ اس مسئلہ پر ضرورت سے زیادہ روشنی پڑ چکی ہے اس لئے تفصیل و تذکرہ کی ضرورت نہیں اسی مہینے کی ۲۸ر کو میڈرڈ میں جنرل فرانکو کی فوجیں داخل ہو گئیں۔ اور ہسپانوی جمہوریت کی قبر پر آمریت کا ایوان حکومت تعمیر کیا گیا۔ تسخیر ہسپانیہ تاریخ یورپ کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے جسے ملت فرنگ قیامت تک نہیں بھول سکتی۔ محاربہ ہسپانیہ بظاہر جمہوریت اور بغاوت دست و گریبان تھی لیکن حقیقت میں یہ اعتقادی جنگ تھی۔ ایک طرف روس، فرانس و برطانیہ

کی اخلاقی و مادی قوتیں اشتراکیت و جمہوریت کا چراغ روشن کرنا چاہتی تھیں دوسری طرف جنرل فرانکو کی پشت پر مسولینی، ہٹلر اور دوسری آمریت پرست قوتوں کا ہاتھ تھا اس لئے جمہوری ہسپانیہ کی شکست اس حقیقت پر روشن ترین شہادت ہے کہ یورپی جمہوریت آمریت کے مقابلہ سے قاصر رہی۔

بغاوت ہسپانیہ کا آغاز مراکش میں تیار کیا گیا تھا جنرل فرانکو نے عربوں سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ جمہوریت کا تختہ الٹتے ہی مراکش کو آزاد کیا جائیگا۔ لیکن یہ وعدے بیان معشوق کی طرح قابل ایفا نہیں سمجھے گئے اور معارکہ ہسپانیہ میں جو عربی خون صرف کیا گیا تھا اس کی قیمت حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں ملی۔

## جاپان و چین

اس برس چین کی مظلومیت بھی جاپان کی ہوس استعمار پر قربان ہوگئی۔ چین وہ ملک ہے جس کے آفتاب تہذیب نے ساری دنیا کو منور کیا اس کے فنون لطیفہ کی روشنی میں دنیا نے تمدنی ترقی کی راہ دیکھی لیکن قدیم ترین تمدن والے ملک کو خون کے دریا میں ڈبو دیا گیا اور اس کی عظمت پر جاپانی تفوق کا پردہ ڈال دیا گیا۔ جنرل چیانگ کائی شک کی غیر منظم فوج نے اگرچہ نہایت بہادری سے مقابلہ کیا۔ شہر شہر میں جنگ جاری رہی غیر مسلسل حملے اور غیر منظم محاربے ہوتے رہے مگر جاپان کی قوت چین کو آغوش مرگ میں سلا کر رہی مگر موجودہ جنگ نے جاپانی سیاسیات کا رخ بدل دیا ہے جاپان جنگ و جدال سے دامن چھڑانا چاہتا ہے تاکہ متحارب ملکوں میں تجارتی لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری کیا جائے اس غرض کے لئے وہ چین سے بعض شرائط و قیود کے ماتحت جان چھڑانا چاہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سرحد منچوکو کے بارے میں روس سے بھی تصفیہ کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں ایک معاہدہ بھی ہو چکا ہے لیکن اس طریق سے چین کی قسمت بدلتی نظر نہیں آتی کیونکہ فاتح خواہ کتنا ہی ایثار کرے لیکن وہ مفتوح کو پہلی سی حالت تک نہیں لاتا۔ جاپان نے چین سے یورپی اثر و رسوخ کو جلا وطن کرنے کی ٹھان لی تھی چنانچہ جاپانی افسر کے چینی قاتلوں کو گرفتار کرنے کے بہانہ پر برطانوی بستی (ٹین سن) کا محاصرہ کیا گیا۔ اور سفید آبادی کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا اس کے تصور سے بھی عہد وحشت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے لیکن چینی قاتلوں کی گرفتاری ہو چکی ہے اس لئے یہ فتنہ قیامت بننے سے پہلے ہی اپنی موت مر گیا۔ ورنہ جنگ کا شعلہ مرکزی یورپ کے بجائے مشرق بعید سے اٹھتا اور یورپ و ایشیا کی متاع امن کو جلا کر راکھ کر دیتا۔

## دنیائے اسلام

فلسطین کے سوا ساری اسلامی دنیا کی حالت پر سکون اور اطمینان بخش رہی فلسطین کے متعلق برطانیہ نے جو تجویز پیش کی تھی اسے عربوں کے علاوہ یہودیوں نے بھی قبول نہیں کیا۔ عربی دنیا کے تمام گوشوں سے اس کے خلاف آواز بلند ہوئی فلسطینیوں نے تو اپنے مطالبات کا اعادہ از سر نو شورش و جہاد کی زبان سے شروع کر دیا۔ اسکندرونہ پر ترکی کا قبضہ ہو جانے سے شام کا مستقبل توجہ طلب ہو رہا ہے معاہدات کے مطابق ۱۹۳۹ء میں شام سے فرانسیسی اقتدار کا خاتمہ ہو جانا چاہئے تھا لیکن فرانسیسی حکمت عملی ابھی صحیح راہ کی طرف نہیں آسکی البتہ یہ کوشش ہو رہی ہے کہ شام میں ملوکیت قائم کی جائے اور بادشاہ ایسے شخص کو بنایا جائے جو فرانسیسی اغراض کے قریب ہو اس مقصد کے پیش نظر امیر عبداللہ والی شرق اردن کو منتخب کیا گیا تھا۔

تجویز یہ تھی کہ برطانیہ و فرانس متحد ہو کر شام فلسطین اور شرق اردن کو مشترک کر دیں اور اس متحدہ حکومت کی باگ ڈور امیر عبداللہ کو سونپی جائے لیکن امیر صاحب سے عربوں کو عقیدت نہیں اس لئے یہ تجویز عمل و حقیقت کی طرف نہ آسکی اس کے بعد شاہ فاروق خدیو مصر کو خلیفۃ المسلمین بنانے کا خیال ظاہر کیا گیا اور قرار پایا کہ محولہ بالا مملکت بھی مصر سے ملحق کر دی جائے۔ چونکہ شاہ فاروق سیاسی طور پر اس قوت کے مالک نہیں جو خلیفہ کے لئے ضروری ہے اس لئے یہ تجویز بھی حسن قبول سے محروم رہی اب خیال کیا جاتا ہے کہ سعودی شہزادے کو شاہ شام بنایا جائیگا لیکن جنگ کے باعث یہ سکیم بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی ممکن ہے کہ یہ عقدہ ترکی کی وساطت سے حل ہو جائے۔ مصر اس برس فوجی ترقی کی طرف راغب رہا۔ برطانیہ و مصر نے باہمی اشتراک سے اطالوی حملے کی روک تھام کا انتظام کر لیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مصر و برطانیہ کے مفاد چونکہ مشترک ہیں لہذا اس ملک کو فوجی و حربی اعتبار سے عظیم الشان قوتوں کے ہم پایہ بنایا جائے گا۔

ترکی نے موجودہ جنگ میں فرانس و برطانیہ کی معاونت کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن اس کی حکمت عملی بہت ہی خوشگوار ہے وہ سارا برس آمریت و جمہوریت سے یکساں طور پر فائدہ اٹھاتا رہا ہے لیکن ترک کا سیاسی مذہب جمہوریت ہے اس لئے وہ فرانس و برطانیہ کا ساتھ دینے پر مجبور ہے افغانستان کی حالت پر سکون رہی البتہ ایک پراسرار ہستی شامی پیر کے نام سے میدان شورش میں آئی تھی مگر اسے منہ کی کھانا پڑی اور پیر صاحب برطانوی طیارے پر سوار ہو کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ اسی مہینے دو صاحبزادے جو عہد غازی امان اللہ خان کے فرزند تھے تیراہی قبائل کی امداد سے شورش پھیلانے میں کامیاب ہو گئے لیکن افغان گورنمنٹ کے حسن تدبر سے ان کی سرگرمیاں مایوسانہ خموشی کی نذر ہو گئیں۔

پٹھانستان یعنی آزاد سرحد کی شورش انتہائی شدت پر رہی۔ طیاروں کو بے پناہ بمباری کے باوجود فقیر ایپی کا عسکری شیرازہ منتشر نہیں ہو سکا اب فقیر صاحب تمام قبائل کے اتحاد و اشتراک سے سارے آزاد سرحد میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

## ہندوستان

یہ برس ہندوستان کے لئے خوشگوار ثابت نہیں ہوا۔ کانگرسی صوبوں کے مسلمانوں کو اپنے حقوق و مفاد اور آزادی کے خون پر آنسو بہانے پڑے ان صوبوں کے ایک وفد نے پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ کا دورہ کیا۔ اور ہر مقام پر ہندو اکثریت والے صوبوں کے مسلمانوں کی الم انگیز حالت بتائی گئی۔ یو-پی اور بہار کے مسلم لیگیوں نے کانگرسی مظالم کے متعلق تحقیقاتی رپورٹیں شائع کیں۔ کانگرس میں افتراق رونما ہو گیا اور سوبھاش بابو نے اعلان کر دیا کہ گاندھی جی۔ پٹیل جی اور پنڈت نہرو فیڈریشن کے معاملہ میں حکومت سے خفیہ معاہدہ کر چکے ہیں اس پر سوبھاش کو پہلے کانگرس کی صدارت سے محروم کیا گیا اس کے بعد ان کے خلاف تعزیری کارروائی کی گئی۔ سوبھاش جی نے فارورڈ بلاک کے نام سے اپنی علیحدہ انجمن بنالی لیکن موجودہ جنگ کے باعث کانگرس ہائی کمانڈ نے روٹھے ہوئے سوبھاش کو دوبارہ منا لیا ہے۔

اسی برس کے ربع اول میں آریوں نے دولت آصفیہ کے خلاف ستیہ گرہ شروع کر دی اور دس ہزار آریہ حیدرآباد جا کر قید ہو گئے۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر مجلس اتحاد ملت ہند نے جوابی کارروائی کرنے کی ٹھان لی اور جد و جہد کے لئے مولانا ظفر علی خاں کو ڈکٹیٹر منتخب کیا گیا لیکن گذشتہ مہینے دولت آصفیہ نے جو اعلان اصلاحات کیا اس سے متاثر ہو کر آریوں نے سول نافرمانی بند کر دی۔ لکھنؤ میں مدح صحابہ کی تحریک زوروں پر رہی لیکن حکومت صوبجات متحدہ نے عید میلاد کے موقع پر سنیوں کو برسر عام مدح صحابہ پڑھنے کی اجازت دیدی جس سے مشتعل ہو کر شیعوں نے "تبرا ایجی ٹیشن" شروع کر دی جو تقریباً چھ ماہ تک جاری رہی اور پندرہ ہزار سے زاید شیعہ قید ہوئے آخر ۱۶ ستمبر کو یہ تحریک جنگ کے باعث بند کر دی گئی۔ شیعہ سنی مصالحت کے لئے علامہ مشرقی لکھنؤ گئے لیکن انھیں چند افراد سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ اور دو دن کے بعد بعض شرائط پر رہا کر دیا گیا۔ لیکن پنجاب میں علامہ صاحب کی رہائی کو معافی مانگنے پر محمول کیا گیا اس لئے علامہ صاحب ۱۵ ستمبر کو اپنے چھ مقتدر ساتھیوں سمیت دوبارہ لکھنؤ گئے چونکہ یو-پی گورنمنٹ نے اپنے حلقہ میں خاکساروں کو وردی اور بیلچہ کے ساتھ چلنے کی ممانعت کردی ہے اس لئے انھیں گرفتار کیا گیا اور ایک ایک ماہ قید اور پچاس پچاس روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ کانگرسی حکومت کی اس حرکت پر خاکسار رضاکاروں نے باقاعدہ ستیہ گرہ شروع کر دی ہے۔

فیڈریشن کی مخالفت بدستور رہی لیکن اس ماہ کے وسط میں وائسرائے نے التوائے وفاق کا اعلان کر دیا ہے جس کے باعث مخالفت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ شرکت جنگ کے متعلق کانگرس اور مسلم لیگ نے مشروط فیصلے کئے ہیں لیکن یہ قرار دادیں عملی طور پر کارگر نہ ہونگی کیونکہ عوام اقتصادی زبوں حالی کے باعث فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہیں اور انھیں کوئی لیڈر اس ارادہ سے نہیں ہٹا سکے گا۔

یہ ہے واقعات یک سالہ کی مختصر رپورٹ۔ خدا کرے کہ آئندہ برس انسانیت کے لئے خوشگوار ثابت ہو۔

سالنامے کے ہر صفحے کی پیشانی پر حضرت علامہ اقبال مرحوم کا ایک ایک شعر ملاحظہ فرمائیے!

-:؛:-

## اہل قلم معاونین کا شکریہ

معنوی اعتبار سے اگر سالنامہ خیام میں کوئی خوبی نظر آتی ہے تو اس کا باعث ہمارے اہل قلم معاونین کی بے پایاں نوازشات اور کرمفرمائیاں ہیں۔ اس اشاعت میں ہم میرزا غالب۔ مولینا گرامی اور حضرت خیال عظیم آبادی مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام شایع کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔ جن اصحاب نے یہ ادبی نوادر ہمیں ارسال فرمائے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کا کلام فصاحت التیام بھی شریک اشاعت ہے جس کے لئے ہم ان محترم رہنماؤں کے ممنون احسان ہیں۔

افسانہ نویسوں اور مقالہ نگاروں میں اکثریت ہمارے مستقل قلمی معاونوں کی ہے۔ ہم ان کی کرمفرمائی کے ہمیشہ ممنون رہے ہیں اور اب پھر ان کی ذرہ نوازی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں امید ہے کہ ان سب حضرات کی مشفقانہ توجہ ہمارے شریک حال رہے گی اور ہم خیام کا معیار بلند سے بلند تر کر سکیں گے۔

ایڈیٹر

**اگر خیام اردو ادب کی کچھ خدمت انجام دے رہا ہے تو آپ کا فرض ہے کہ خیام کی توسیع اشاعت کیلئے کوشش فرمائیں!**

# معروضات

لگا رہا ہوں مضامینِ تازہ کے انبار
خبر کرو مِرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

گزشتہ سال "خیام" کا سالنامہ اُردو صحافت میں اپنی نظیر آپ ثابت ہُوا تھا۔ اب خیام کا دوسرا سالنامہ حاضرِ خدمت ہے جس کے ظاہری و معنوی محاسن کا اندازہ آپ اس کے ایک ایک ورق کو بنظرِ امعان پڑھکر خود لگا سکتے ہیں۔ اس اشاعت کی تدوین و تکمیل کیلئے جس محنت و کاوش اور سعی و جہد سے کام لینا پڑا اس کی تفصیل و تشریح ہمارے زورِ بیان کی محتاج نہیں ہم نے اس فقید المثال پرچہ کو بوجوہِ تمام کامیاب بنانے کیلئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اب سراہنا اور لطف اُٹھانا صرف آپ کا کام ہے۔

اظہارِ حقیقت کو اگر خودستائی پر محمول نہیں کیا جا سکتا تو ہم کہتے ہوئے ادائے فرض کی فرحت محسوس کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں جب کاغذ کی گرانی اخبارات و جرائد کی موت کا گھڑیال بجا رہی ہے اور جنوں صحیفے زندگی کے آخری مرحلے پر کھڑے ہو کر موت کا انتظار دیکھ رہے ہیں متعدد جریدے یا صفحات میں تخفیف کر چکے ہیں یا سالانہ چندہ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اور اُنہوں نے باوجود اعلان کے اپنی خاص اشاعتیں بھی روک دی ہیں "خیام" نے ایک جرأت آزما قدم اُٹھایا ہے اور اپنی روایات قائم رکھنے کی غرض سے معمول کی بہ نسبت قریباً آٹھ نو سو روپیہ زاید خرچ کر کے ایک ایسا سالنامہ مرتب کیا ہے جس کو دیکھتے ہی آپ خود کہہ اُٹھیں گے۔ ع

اے مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

کاغذ کی قیمت پہلے سے دُگنی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ جو کاغذ ہم "خیام" کے لئے استعمال کرتے تھے اُس کی درآمد جنگ کی وجہ سے بالکل رُک گئی ہے۔ آرٹ پیپر کا بھاؤ تو ناقابلِ برداشت حد تک چڑھ گیا ہے۔ بلاکوں کیلئے جو کیمیائی مصالحے استعمال ہوتے تھے اُن کے نرخ گراں ہو چکے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود سالنامہ "خیام" کے مضامین اور ٹائیٹل کو بہترین کاغذ پر چھاپا گیا ہے اور تصویریں بھی حسبِ معمول اعلیٰ قسم کے آرٹ پیپر پر سہ رنگی وغیرہ کی شائع کی گئی ہیں۔

اس اشتہار سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہماری تجارتی اغراض مفادِ ادب اور خدمتِ اُردو کے جوش سے کس درجہ مغلوب ہو چکی ہیں اور یہ سالنامہ گزشتہ سال کی بہ نسبت کتنا شاندار اور رُوح پرور ہے۔ وہ اگر فردوسِ گوش تھا تو یہ "جنتِ نگاہ" ہے۔ وہ اگر نقشِ اوّل تھا تو یہ نقشِ ثانی ہے۔ اور ع نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل۔

زیرِ نظر سالنامہ میں گزشتہ سال کی بہ نسبت بہت زیادہ جدّت طرازیوں تنوّع اور حسنِ ترتیب سے کام لیا گیا ہے خود ستائی کے خوف سے ہم اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ آپ خود محسوس کرینگے کہ ے

اِس دَور میں مَے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

---

سالنامہ ۱۹۴۰ء سے خیام کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے ہمارے ذہن میں اس جریدہ کو ہر لحاظ سے کامیاب بنانے کے لئے بہت سی تجاویز ہیں جن کو انشاء اللہ تعالےٰ ہم نئے سال سے بروئے کار لائیں گے۔ قارئین خیام نے ہماری گزشتہ کاوشوں کو بہت زیادہ سراہا ہے اور ہماری ہر طرح حوصلہ افزائی فرمائی ہے اگر اُن کی ہمدردی اور پُرجوش تعاون ہمارے شاملِ حال رہا تو ہم خدا کے فضل و کرم سے خیام کا ہر پرچہ "سالنامہ" بلکہ سالناموں کا سالنامہ بنانے کی کوشش کرینگے فی الحال ہم صرف یہ کہکر قارئین کو سالنامہ شروع سے لیکر اخیر تک پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں کہ ے

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

## کیف و نشاط

کہتے ہیں کہ امیر تیمور کو موسیقی سے حد درجہ رغبت تھی جب وہ ہندوستان میں بطور فاتح آئے تو ایک محفلِ نغمہ و سرود منعقد کی گئی ہندوستان کی موسیقی دنیا بھر میں مشہور ہے امیر تیمور نغمہ سرائی سے حد درجہ محظوظ ہوئے یُوں تو تمام گویّے اپنے اپنے فن میں بےمثال تھے مگر ایک اندھے مطرب کی جادو نوائی نے امیر کو مسحور کر دیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ - اندھے گویّے نے کہا "دولت"! امیر نے ازراہِ تفنن فرمایا کہ دولت اندھی ہوتی ہے گویّے نے کہا "جی ہاں: - اگر دولت اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے گھر آتی؟"

---

ناسخ و آتش کی معاصرانہ چشمک قارئین سے پوشیدہ نہیں۔ ناسخ کا دیوان کلامِ آتش سے پہلے چھپ گیا تھا جب خواجہ آتش کی نظر سے شیخ ناسخ کا دیوان گزرا تو اُنہوں نے جوابی طور پر اپنے دیوان کی ترتیب شروع کر دی۔ اس پر ناسخ صاحب نے کہا ے

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیوان کا جواب
بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

جب آتش صاحب کو یہ شعر سُنایا گیا تو اُنہوں نے ذیل کا جواب لکھکر ناسخ کو بھیجدیا ے

کیوں نہ ہر مومن دے اس ملحد کو دیوان کا جواب
جس نے دیوان اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

---

ابونواس عہدِ عباسیہ میں بہت بڑے شاعر تھے۔ ایک دن زبیدہ خاتون نے ان سے کہا کہ امین بھی شعر کہتا ہے۔ اسے اصلاح دے دیا کریں۔ ابونواس نے حکم کی تعمیل کی ایک دن امین اپنی غزل اصلاح کے لئے لایا ابونواس نے اس میں قطع و برید کر کے دو تین شعر رہنے دیئے اس پر امین حد درجہ برہم ہوا اور اسی برہمی کے عالم میں ابونواس کو جیل بھجوا دیا۔ جب زبیدہ کو اس واقعہ سے آگاہی ہوئی تو اُنہوں نے ابونواس کو رہا کرا لیا۔ اس واقعہ کے چند دن بعد جب ابونواس زبیدہ کی خدمت میں حاضر تھے تو امین آیا اور ایک غزل اصلاح کے لئے سامنے رکھ دی۔ ابونواس غزل پر نظر ڈالتے ہی بگڑ کر جوتیاں ڈھونڈنے لگے زبیدہ نے کہا ابونواس کہاں جانے کی تیاری کرتے ہو؟ - ابونواس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:-

"جیل"!

نوٹ:- خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہایت ضروری ہے "منیجر"

# وہ راتیں یاد آتی ہیں

از حضرت ماہر القادری

وہ راتیں جو کہ تھیں موضوعِ الفت کی کہانی کا
وہ راتیں جن پہ سایہ تھا نشاط و شادمانی کا
وہ راتیں جن پہ دھوکا تھا حسینوں کی جوانی کا
وہ راتیں جن کو کہہ سکتے ہیں حاصل زندگانی کا
وہ راتیں یاد آتی ہیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں

وہ راتیں جن کو میرے شوقِ سجدہ نے ابھارا تھا
وہ راتیں جن میں ان کا جورِ پنہاں بھی گوارا تھا
وہ راتیں جن کے پیچ و خم میں امیدوں کا دھارا تھا
وہ راتیں جن کو اُن کی مسکراہٹ نے سنوارا تھا
وہ راتیں یاد آتی ہیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں

وہ کچھ بے تابیاں سی جلوہ گر زلفِ پریشاں پر
کہ جو بھاری ہیں میری سینکڑوں شب ہائے ہجراں پر
نوازش ہائے بے پایاں مری دنیائے ویراں پر
وہ ان کا مسکرا کر جھومنا صبحِ بہاراں پر
وہ راتیں یاد آتی ہیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں

ہوا پھولوں کو چھو کر آ رہی تھی مرغزاروں سے
وہ اُن کی تابشِ عارض کا ٹکرانا ستاروں سے
وہ اُن کا گنگنا کر کھیلنا پھولوں کے ہاروں سے
وہ میرے شعر پر تنقید فرمانا اشاروں سے
وہ راتیں یاد آتی ہیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں

ہوائیں سنسناتی تھیں، ستارے جگمگاتے تھے
وہ پیہم گنگناتے تھے مسلسل مسکراتے تھے
وہ اپنی مست مست آنکھوں سے پیمانے پلاتے تھے
نگاہوں کو مری آدابِ مے نوشی سکھاتے تھے
وہ راتیں یاد آتی ہیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں

# دنیائے اسلام کا سیاسی مستقبل!

## اسلامی افریقہ، ممالک عربیہ، جمہوریۂ ترکیہ، ایران اور افغانستان کی سیاسیات پر مبصرانہ نگاہ

## موجودہ جنگ و جدل کی تاریکی میں مسلمانوں کے عزم و ارادہ اور جہد و عمل کی عالم افروز تنویریں

پڑا ہے زلزلہ دنیا میں پھر توحید کے ہاتھوں
بلند اک ساتھ ہوتی ہیں مسلمانوں کی تکبیریں

از جناب ایم اے اطہر امرتسری

موجودہ زمانہ میں جب جنگ و انقلاب کی پرچھائیاں ہر طرف چھا رہی ہیں، جرمنی کی آہن پوش بازوں کے دھماکوں اور طیاروں کی آتش فشانی سے انسانی تہذیب و شرافت کی موت کا اعلان کر رہی ہے۔ سمندر کے سینے پر جہازوں کی تیز خرامی آتش و خون کا نظارہ کر رہی ہے۔ ہر قوم آلات حرب اور سامان رسد و اعدت لیکر میدان کارزار میں کھڑی ہے اور انقلاب کی راہ دیکھ رہی ہے۔ مستقبل قریب کے باریک ترین پردے میں تجدید و اصلاح کا وہ ہنگامہ پرورش پا رہا ہے جو دوش انقلاب پر سوار ہو کر میدان سیاست میں آ کر [illegible] اب [illegible] کی روشنی بھی آسکتی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب دنیا کے اس گوشہ پر نگاہ ڈالنے کے بعد دیا جاسکتا ہے جسے عالم اسلام کہا جاتا ہے۔ اسلامی دنیا کی [illegible] جدید نصب العین اس حقیقت پر روشن ترین شہادت ہے کہ اسلامی سیاست جسے گذشتہ جنگ عظیم میں خاک و آتش کیا گیا تھا، حوادث زمانہ کی ٹھوکریں کھا کھا کر طاقتور اور قابل اعتراف زندگی سے آشنا ہو چلی ہے۔ [illegible] اور تجدید و بیداری سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی فطرت میں قدرت نے واقعی لچک رکھی ہے جتنا اسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اتنا ہی ابھرتا ہے۔ چنانچہ مراکش سے لیکر قسطنطنیہ تک بیداری و شجاعت کا ایک ہمہ گیر ہنگامہ برپا ہے اور یہ ہنگامہ ان آوازوں سے مرکب ہے جو افریقہ کے ذرّہ ذرّہ روش عرب سے لیکر ترکیہ کے مہذب ترین فرد کے دل سے نکلتی رہتی ہیں۔ اسلئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ قارئین خیام کو تمام اسلامی ملکوں کی مقامی و داخلی حالت اور بین الاقوامی سیاسیات کے کئی گوشوں سے روشناس کرایا جائے تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ دور حاضرہ کے مراحل و نتائج کا پہلو مسلمانوں سے کسقدر وابستہ ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر یہ طویل مقالہ سپرد قلم کرنا پڑا۔ مضمون اگرچہ طویل ہے لیکن اتنے بڑے مسئلہ کی وضاحت جس کا سلسلہ بحیرۂ روم کے مغربی دروازہ سے لیکر مشرقی یورپ تک وسیع ہو، طوالت نگاری کے سوا نہیں ہو سکتی اگر اختصار سے کام لیا جاتا تو زیر بحث [illegible] پہلو افادیت کشائی سے محروم رہتے تاہم میں خیال کرتا ہوں کہ یہ طویل مقالہ بھی اپنے موضوع کی وسعت کے اعتبار سے مختصر ہے۔ مضمون کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے مختلف ممالک کی مقامی سیاسیات و حالات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد بین الاقوامی اور بین الاسلامی معاملات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ترتیب [illegible] مناسب سمجھی گئی کہ قارئین کرام کو ہر ملک کے مقامی و بین الاقوامی مسائل سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ مضمون کی تیاری میں حتی الوسع احتیاطی تبصرہ اور مستند معلومات سے کام لیا گیا ہے۔ باایں ہمہ اگر کوئی اصطلاحی غلطی واقع ہو گئی ہو تو عجب نہیں۔

(م۔ا۔ اطہر امرتسری)

## اسلامی افریقہ

اسلامی افریقہ سے مراد شمالی افریقہ کا وہ حصہ ہے جو بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع ہے۔ یہ سرزمین مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس الغرب، لیبیا اور مغربی مصر تک وسیع ہے۔ شمالی افریقہ کی غلامی و محکومی کا سب سے بڑا سبب اس کا جغرافیائی محل وقوع ہے۔ اگر یہ ممالک بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع نہ ہوتے تو مستعمرین مغرب انہیں محکومی و غلامی کے جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پھینک دینے کے تمنائی نہ ہوتے۔ ہسپانیہ جب جبل الطارق کی اوٹ سے جنوب کی طرف جھانکتا ہے تو اسے مراکش سے اپنی مشرقی تمنائیں وابستہ نظر آتی ہیں۔ اسی طرح اطالیہ کی نگاہیں لیبیا سے دوچار ہو کر اسے عظمت روم کے گذشتہ دور کی یاد دلاتی ہیں۔

برطانیہ اگرچہ بری و بحری اعتبار سے بحیرۂ روم میں دلچسپی نہیں ہو سکتا لیکن مصر کی محکومی نے اسے بھی اس سمندر کا حصہ دار بنا دیا ہے۔ بحیرۂ روم چونکہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی سیاسی قسمتوں کے انفصال کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اسلئے ساحلی افریقہ (یعنی مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، لیبیا اور مصر) کی اہمیت نہ زمانۂ جنگ میں نظر انداز ہو سکتی ہے نہ ایام صلح میں فراموش کرنے کے قابل ہے۔ اگر ان ممالک پر یورپی حکومتوں کی سیادت قائم نہ ہوتی تو مشرق و افریقہ کے تمام دروازے مغربی دولتوں پر نہ صرف بند رہتے بلکہ ایشیائی و افریقی غلبہ کا خوف پرتگال، ہسپانیہ، اطالیہ اور یونان کو مضطرب رکھتا۔ لیکن موجودہ حالات "ماضی کی تمنائی" کی روشنی میں بحث و نظر کے مستحق نہیں۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی افریقہ کا مستقبل کیا ہوگا۔ ذیل میں تمام ممالک کی سیاسی حیثیت پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

### مراکش

مراکش دو حصوں میں تقسیم ہے۔ فرانسی مراکش اور ہسپانوی مراکش۔ مغربی بحیرۂ روم کے پھاٹک پر شمال میں جبل الطارق اور جنوب میں مراکش کی بندرگاہ سیوطہ ہے یعنی اس دروازے کے دو طاق ہیں جبل الطارق اور سیوطہ اگر ایک طاق خراب ہو تو دروازہ بند نہیں ہو سکتا اس اعتبار سے دنیا کی سیاسی اہمیتوں میں مراکش کا جو درجہ ہے وہ سب کو معلوم ہے لیکن اس ملک کے مستقبل پر نظر ڈالنے سے پہلے ماضی قریب کے حوادث و واقعات پر ملکی سی روشنی ڈالنی ضروری ہے تاکہ تفہیم مطالب میں آسانی ہو۔

۱۹۰۴ء میں مراکش پر سے برطانوی سیادت کا سایہ اٹھالینے ایک خفیہ معاہدہ سے اس ملک کو فرانس و ہسپانیہ میں بانٹ دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں مولائے عبدالحفیظ (سلطان مراکش) نے فرانس کی سیادت قبول کر لی لیکن وہ اپنی حرکت پر بہت زیادہ نادم ہوئے بایں ہمہ ہسپانوی مراکش کے عرب راہ حریت پر گامزن رہے۔ ہسپانیہ چونکہ طاقتور تھا۔ اس لئے وہ آگ اور لوہے کی قوت سے غلامی کی لعنت مسلط کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن عربوں کی سرفروشانہ بغاوتیں جاری رہیں۔ ۱۹۱۹ء میں جب دنیا کے چہرے سے جنگ عظیم کی خونیں نقاب اتری تو ہسپانوی مراکش میں باقاعدہ انقلاب آرائی شروع ہو گئی۔ ۱۹۲۱ء میں امیر محمد بن عبدالکریم نے علم جہاد بلند کیا اور اپنی ناقابل تسخیر قوت سے ہسپانیہ جیسی جابر و قاہر حکومت کو کئی بار منہ کی کھانے پر مجبور کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۵ء میں ریف کی حکومت نے خالص عربی امارت کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد امیر صاحب نے فرانسی مراکش پر حملے شروع کر دیئے جس پر فرانس و ہسپانیہ متحد ہو گئے۔ اور دو لاکھ مسلح فوج نے شیطانی آلات کے ساتھ چند ہزار بے سروسامان عربوں کا مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں امیر محمد بن عبدالکریم کو مغلوب ہونا پڑا۔ اور مئی ۱۹۲۶ء میں انہیں جلاوطن کر کے مڈغاسکر میں نظر بند کر دیا گیا جہاں آج تک سیاسۃ غریب الوطنی کے مصائب جھیل رہے ہیں۔ امیر صاحب کی ناکامی کے بعد ہسپانیہ کا خیال تھا کہ آزادی کی آگ بجھ چکی ہے لیکن عرب و جذبہ اگر ایک بار ابھر آئے تو اسے بندوق کی گولی اور سنگین کی انی بھی نہیں دبا سکتی۔ اہل مراکش آزادی کے لئے باقاعدہ جد و جہد کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۳۱ء میں جنرل فرانکو نے انہیں آزاد کرانے کا وعدہ کیا جس پر پچاس ہزار عربوں نے بغاوت ہسپانیہ میں حصہ لیا۔ اگرچہ جنرل فرانکو کی فتح بڑی حد تک عربی خون کی پیداوار ہے لیکن انہوں نے جمعیت شبان مسلم کی استدعا کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراکش کو ہسپانیہ خونیں انقلاب بھی بدل نہ سکا دوسری طرف فرانس کا رویہ بھی مراکشیوں کے لئے خوشگوار نہیں۔ ۱۹۳۰ء کا فرمان [illegible] قابل عمل ہے جس کی رو سے مذہبی تعلیم کی آزادی [illegible] جنگ ہسپانیہ کے دوران میں فرانکو [illegible]

پر بھی بڑی خونریز لڑائی ہو رہی تھیں چنانچہ اسلحہ کافی تعداد میں مہیا ہو گئے تو عربوں نے تیاری وحدت عربیہ کی تحریک نے اس اقدام کا آغاز کر لیا۔ موجودہ حالت میں دونوں مراکش کا معنوی اتحاد ہے کیونکہ دونوں کی روایات تہذیب، تمدن، قومیت، عصبیت اور نصب العین میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ہسپانیہ اور فرانس جنگ میں شامل ہو گئے تو یہ اتحادی عرب اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائینگے لیکن ان کی حقیقی نجات وحدت عربیہ میں ہے جس پر ہم آئندہ سطور میں بحث کرینگے۔

## الجزائر

مراکش کے مشرقی پہلو میں الجزائر (الجیریا) ہے اس ملک پر فرانس تقریباً ایک صدی سے قابض ہے۔ آج سے ۱۵۰ برس پیشتر اس ملک کی مالی حالت بگڑی ہوئی تھی اور امداد ملت کی محتاج تھی اسلئے فرنگیوں کو مداخلت کا موقع مل گیا لیکن فرانس نے اسے باقاعدہ غلام بنانے کا تہیہ کر لیا۔ ۱۸۳۰ء میں چڑھائی کر کے حملہ کیا گیا۔ امیر عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ ایسی حیرت انگیز بہادری اور بے نظیر شجاعت سے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیتے رہے۔ امیر عالم اسلامی کی ان شخصیتوں میں سے ہیں جن کی جانبازی کا بیان سن کر عہد رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے لیکن غداروں نے فرانس سے ساز باز کر لی اسلئے امیر صاحب کی روشن امیدیں ظلمت افزا مایوسیوں سے بدل گئیں۔ وہ ۱۸۴۷ء میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور دمشق میں انکی وفات ہوئی۔

الجزائر میں فرانسی سرمایہ داروں نے کارخانے کھول رکھے ہیں جو مقامی پیداوار کو مصنوعات سے بدلتے ہیں لیکن کارخانوں میں عربی مزدوروں کے ساتھ منافرت انگیز سلوک کیا جاتا ہے جس کے باعث آج سے دو برس پہلے انقلاب انگیز بغاوت رونما ہو گئی تھی۔ عام طور پر یہاں بھی فرانسی مراکش کی سی مذہبی پابندیاں عائد ہیں۔ اور عربوں کو فرانسی تہذیب و تمدن کی طرف بزور قانون لایا جا رہا ہے۔

## اتحاد ثلاثہ

مراکش اور الجزائر نے آزادی کے لئے متحدہ جد و جہد کی سکیم تیار کر رکھی ہے۔ یہ پروگرام آج سے دو برس پیشتر جنرل فرانکو کی دوراندیشی سے پیدا ہوا تھا لیکن آج کل اسے فرانس جامہ عمل پہنانے کی ادھیڑ بن میں مصروف ہے۔

جب ہسپانیہ کا سورج نصف النہار پر تھا تو جنرل فرانکو نے ہسپانوی مراکش، فرانسی مراکش اور الجزائر کو ایک لڑی میں پرونے کی تحریک شروع کرائی تھی اس مقصد کیلئے ہسپانوی مراکش کی راہ سے فرانسی افریقیہ میں باغیانہ جنگ بھی بھیجا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں ڈیلی ٹائمز نے بیان کیا تھا کہ چند لوگ فرانسی مقبوضات میں گرفتار کئے گئے تھے جو ہسپانوی پراپیگنڈا کر رہے تھے لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ فرانس ہسپانیہ کو نقصان پہنچانے کی غرض سے وحدت عربیہ کے اس "فرانکوی نقشہ" میں رنگ بھرنا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں کہ افریقہ کی عربی وحدت باقاعدہ صورت اختیار کرنے کی بجائے گرد باد کی طرح بہت جلد نظروں سے اوجھل ہو جائے گی لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ تنظیم خواہ فرانسی مقاصد کے زیر اثر ہو یا ہسپانوی اغراض کے ماتحت لیکن اس کا انجام عربی مفاد کے لئے سازگار ہوگا کیونکہ ہیولی تیار ہو گئے تو ان کی سیاست و قوت ایک مرکز پر آ جائیگی اور اس مرکز سے جو آواز اٹھیگی وہ یقیناً مؤثر ثابت ہو گی۔ کیونکہ فرانس و ہسپانیہ کو اس پر یقین کرینگے کہ عربوں کو اگر مطمئن نہ کیا گیا تو بحیرۂ روم کے مغربی دروازہ سے لیکر سویز تک چپے چپے پر شعلہ متلاطم ہو جائیگے لیکن اتحاد ثلاثہ کی بنا پہلے ہسپانوی اغراض پر تھی اور اب فرانسی مفاد پر ہے اسلئے شمالی افریقہ کی وحدت اسلامی کا تخیل یورپی دماغ کا مرہون ہے لیکن عربوں کی فطرت نسل و خون کے تعلق سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے اس لئے عجب نہیں کہ دونوں مراکشوں اور الجزائر کے عرب اخوت و اتحاد کا کام اس اصول پر کریں کہ ہسپانیہ و فرانس اپنی اپنی سکیم پر اظہار افسوس کرتے رہ جائیں۔ یہ تو خیر گذری کہ ہسپانیہ تازہ جنگ فرنگ میں شامل نہیں ہوا ورنہ ہسپانوی و فرانسی اغراض و مفاد کی جنگ مراکش ہی سے شروع ہوتی۔

## تونس

تونس پر فرانسی اقتدار کا سایہ حقیقی طور پر ۱۸۸۱ء میں شروع ہوا جب اس ملک کی مالی زبوں حالی اسے خود بخود غلامی کی طرف لے گئی۔ تونس کا تاریخی پس منظر بھی الجزائر کی طرح خون آلود ہے لیکن جب سے اطالیہ کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی، تاریخ تونس کا جدید باب گذشتہ داستان کی بہ نسبت بہت قابل توجہ ہو گیا ہے اس ملک کا بحری محل وقوع اطالوی نقطۂ نگاہ سے بہت زیادہ سازگار ہے اگر اس پر اطالیہ کا قبضہ ہو جائے تو وہ طرابلس اور لیبیا کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو سکتا ہے لیکن فرانس کی دفاعی قلعہ بندی نے اطالوی خواب کو بے تعبیر بنا دیا ہے۔ اطالیہ اپنا استحقاق ثابت کرنے کی غرض سے چلاتا رہا ہے کہ تونس میں اطالوی کثیر تعداد میں آباد ہیں اور فرانسی حکام ان سے خوشگوار سلوک نہیں کرتے اسلئے تونس پر اطالوی جھنڈا لہرانا چاہئے لیکن اس مطالبہ کے پردے میں بحری اقتدار کی ہوس پوشیدہ ہے اسلئے فرانس کی جوابی تیاری نے اٹلی کو خاموش کر دیا ہے۔

تونس میں فرانسی و اطالوی باشندے بہت زیادہ تعداد میں ہیں جن کا سرمایہ دارانہ تفوق عربی زندگی پر حاوی ہے اور امتیازی قوانین کے باعث عربوں پر ترقی کی تمام راہیں بند ہیں لیکن موجودہ حالات میں جب فرانس کی جوابی قلعہ بندی نے تونس کو ہر طرف سے جکڑ لیا ہے مقامی آبادی بذات خود کوئی نتیجہ خیز حرکت نہیں کر سکتی اس کی سیاسی زندگی الجزائر کے ذریعہ سے مراکش سے ملتی ہے اسلئے تونس میں وہی سیاسی زلزلہ انقلاب برپا کر سکے گا جو مراکش سے پیدا ہوگا۔

## طرابلس

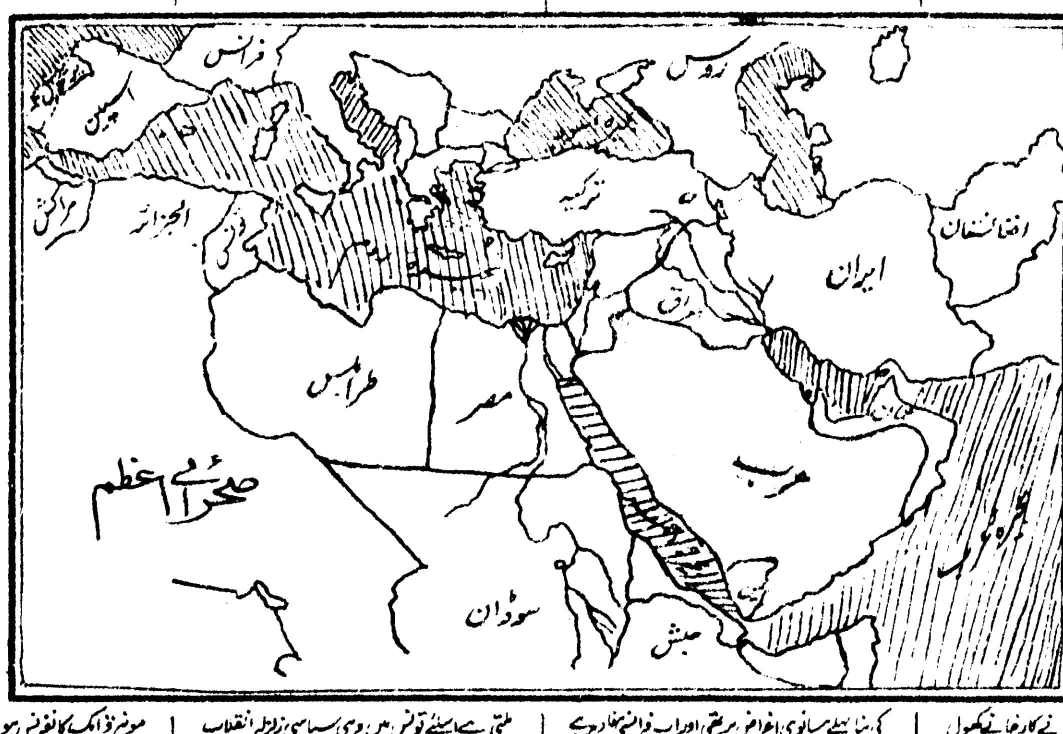
طرابلس اور صحرائے لیبیا پہلی ہی سے تو تھا ہی لیکن اب حبش پر بھی فسطائی پرچم لہرا رہا ہے۔ حبش بھی آبادی کے اعتبار سے ایک اسلامی ملک ہے لیکن ان ملکوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس کا جواب طرابلس یا لیبیا سے نہیں مل سکتا کیونکہ اطالوی قوتیں "سنوسی جہاد" کا آتشکدہ بجھا چکی ہیں۔ ابھی اس تحریک کی راکھ باقی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس راکھ میں کوئی چنگاری بھی ہے یا نہیں۔ البتہ حبش کی جدید بیداری کا رخ اگر اطالیہ کی طرف ہوا تو طرابلس والے بھی اس موقعہ سے فائدہ اٹھائے بغیر نہیں رہینگے اور عجب نہیں کہ یہ نیم کشتہ ملک حبشی سہارے سے از سر نو زندہ ملک کی صورت اختیار کر سکے لیکن اس قیاس کو جانچنے کیلئے ابھی وقت کی ضرورت ہے۔

## مصر

دور جدید مصر کی اسلامی اور ایشیائی سیاست میں مصر کا درجہ بہت بڑا ہے۔ مصر کی جدید سیاسی تاریخ کا قابل فخر باب ۱۹۲۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب وفد پارٹی اور طلبہ کی محیر العقول قربانیاں کامیابی کے مرحلے پر پہنچ گئیں اور برطانیہ نے مصر کو داخلی آزادی بڑی حد تک تسلیم کر لی لیکن فوج، یورپی امتیازات، نہر سویز اور سوڈان کے متعلق برطانوی تحفظات میں کمی نہ ہوئی جس پر احرار مصر نے ہنگامہ آرائی کی آخر مذکورہ بالا مسائل تو حل نہ ہوئے لیکن ۱۹۲۳ء میں جمہوری دستور کا حق عطا کیا گیا۔ سعد زاغلول مرحوم کی قیادت میں پہلی دستوری وزارت قائم کی گئی۔ ۱۹۲۴ء میں سرلی سٹیک گورنر جنرل سوڈان کے قتل کی وجہ سے مصری اختیارات میں کمی واقع ہوئی جس پر یہ حقیقت زیادہ بے نقاب ہو گئی کہ جمہوری دستور سیاسی درد کی دوا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد مطالبات چہارگانہ (یعنی امتیازات، سویز، سوڈان اور فوج) کا تذکرہ چھیڑا گیا۔ مصری قوم کا ایک وفد لندن بھی گیا لیکن ناکام واپس آیا۔ ۱۹۳۰ء میں جب وفد پارٹی نے مقاطعہ کی پالیسی پر عمل کیا تو صدقی پاشا کی آمرانہ وزارت عمل میں آئی۔ کئی برس تک تشدد کے بل بوتے پر حکومت ہوتی رہی اور دستوری جمہوریت کی جگہ مطلق العنانی نے لے لی۔ ۱۹۳۵ء میں جب توفیق نسیم کرسی وزارت پر جلوہ گر ہوئے تو اہل مصر نے ہنگامہ خیز شورش کے ساتھ دستور کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ یہ تحریک کامیاب ہوئی اور امتیازات و مراعات کے علاوہ اہل مصر کے تین مطالبے بھی کسی حد تک تسلیم کر لئے گئے اور ۱۹۳۷ء میں بمقام مونٹرو ایک کانفرنس ہوئی جس میں مراعات کا بھی خاتمہ تصفیہ ہو گیا۔ اس کانفرنس کے کچھ عرصہ بعد شاہ فواد اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور ان کی جگہ شاہ فاروق خدیو مصر مقرر ہوئے اس کے بعد وفد پارٹی کا زوال شروع ہوا۔ عوام کا خیال تھا کہ مصطفےٰ نحاس اور دوسرے قائدین وفد قومیت کے جسم سے مذہب کی روح نکالنا چاہتے ہیں انکی قوم پرستانہ راہ عمل مغربی دہریت پر ختم ہوتی ہے۔ اسی خیال سے حزب الوفد کا ایوان اقتدار زمین بوس ہو گیا۔ حزب الوفد کی ناکامی کے بعد دو تین وزارتیں یکے بعد دیگرے بدلیں لیکن پالیسی میں کوئی نمایاں تغیر واقع نہیں ہوا۔ موجودہ وزیر اعظم علی ماہر پاشا اگرچہ اعتدال پسند ہیں لیکن انہیں مذہب پرست طبقہ کی تائید حاصل ہے۔

## موجودہ حالت

اطالیہ عرصہ سے مصر کو حریفانہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مسولینی کا خیال ہے کہ اگر مصر پر فسطائی پرچم لہرانے لگے تو جہاں نہر سویز پر قبضہ ہو جائیگا۔ وہاں طرابلس سے لیکر قاہرہ تک بحیرۂ روم کے شمالی ساحل پر



فسطائی حکومت ہوگی اور اسطرح مسولینی بحیرۂ روم، افریقہ اور ایشیا کی سب سے بڑی راہ پر نعرۂ افادہ کا غیبری لگانے کے قابل ہوجائے گا۔ لیکن حبش کی بے اطمینانی اور اسلامیانِ لیبیا کا مذہبی ہیجان اس کی راہ میں حائل ہوتا رہا۔ اگرچہ مسولینی چند مسلمان ضمیر فروشوں سے "محافظ اسلام" کا خطاب حاصل کرچکا ہے لیکن اس کی اصطلاح میں "حفاظت" کے معنی ہیں کہ مسلمانوں کے گلے میں فسطائی غلامی کا طوق ڈالا جائے۔ وہ ایک طرف مصر کو ہتیا لینے کا متمنی ہے دوسری طرف نہر سویز کی راہ سے بحیرۂ احمر کے اسلامی ممالک پر چھا جانا چاہتا ہے۔ اس لئے خدانخواستہ اگر اٹلی نے جرمنی کا ساتھ دینے کی حماقت کی تو اس کا پہلا نشانہ مصر ہوگا کیونکہ انگلستان کو بحیرۂ روم میں تنگ کرنے اور برطانوی افریقہ و ایشیا پر اثر ڈالنے کے لئے مصر کی تسخیر ضروری ہے لیکن جو سکیم مسولینی کے دماغ میں ہے اس کا جواب برطانیہ و مصر کے جوشِ عمل سے مل رہا ہے چنانچہ نہر سویز کی حفاظت اور سرحد لیبیا کے استحکام سے ظاہر ہے کہ مصر و برطانیہ کی مشترکہ مساعی آنے والے خطرے کا تدارک کرچکی ہیں۔

مصر اگرچہ داخلی طور پر خود مختار ہے۔ خارجی امور میں بھی اس کا طرزِ عمل نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن برطانوی سیادت سے ابھی آزاد نہیں۔ جوشِ جذبات میں تو کہا جاسکتا ہے کہ مصر کو برطانیہ سے پوری طرح پیچھا چھڑا لینا چاہیئے لیکن اس مسئلہ پر سیاسی بصیرت کے ساتھ غور کیا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ جب تک مصر کسی بہت بڑی طاقت کے حلقۂ تعاون میں ہے۔ اس کی مقامی ہستی خطرات سے محفوظ ہے ورنہ یہ چھوٹا سا ملک اطالیہ کے سیلابِ استعمار کی تاب نہیں لاسکتا۔ اسلئے موجودہ حالات میں برطانیہ کا تعاون ہی اس کے لئے سازگار ہوسکتا ہے جس کے اپنے مفاد بھی اس سرزمین سے وابستہ ہیں۔ وہ نہر سویز اور بحیرۂ روم کے لئے مصر کی حمایت میں ہر ممکن قربانی کرنے کو تیار ہے لہذا جب تک یہ ملک حسب سابق ترکی کا دامن حمایت نہ تھام لے اسے برطانیہ کے تعاون سے محروم نہیں ہونا چاہیئے۔

# جزیرۃ العرب

جزیرۃ العرب کے تمام ممالک انقلاب کی راہ سے گذر رہے ہیں۔ لیکن ہم عرب کی عمومی حالت پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہر ملک کی سیاست پر سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ تمام رموز و حقائق کی نقاب کشائی ہوسکے۔

## یمن

بحیرۂ احمر کے باعث یمن کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ جاذبِ توجہ ہوگئی ہے لیکن یہ ملک بذاتِ خود اتنا طاقتور نہیں کہ سیلابِ استعمار کا مقابلہ کرسکے ایک طرف اسے برطانیہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ دوسری طرف اطالیہ دعوتِ دوستی دیتا ہے۔ یہی رقابت ہے جو امام یحییٰ وحیدالدین کی ملوکیت کی محافظ ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب امام یمن کی علالت مخدوش صورت اختیار کرچکی تھی تو مسولینی نے شہزادہ سیف الاسلام احمد (ولیعہد یمن) کو شیشے میں اتار لیا ان کی وساطت سے صنعا اور دوسرے مشہور مقامات میں فسطائی دارالتبلیغ کھولے گئے اور ملک کے نظم و نسق میں فسطائیت کو داخل ہونے کی اجازت دی گئی ۱۹۳۷ء میں امام صاحب نے فسطائی اثر زائل کرنے کی کوشش کی لیکن سیف الاسلام کا اقتدار اور فسطائیت کا حد سے بڑھا ہوا وقار ان کی راہ میں حائل تھا اس لئے وہ بوجوہ تمام کامیاب نہ ہوسکے لیکن فسطائیت پر مقبولیت کے اکثر دروازے بند ہوگئے۔ بایں ہمہ مسولینی کا دستِ شفقت یمن کے سر پر بدستور رہا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اطالوی اشرفیوں کی جھنکار اس درجہ مؤثر ثابت ہوتی ہے کہ اس میں یمنی سرداروں کا آوازۂ ضمیر گم ہوچکا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء سے لے کر آج ۲۵ ستمبر ۱۹۳۹ء تک جتنی اطلاعیں موصول ہوتی ہیں۔ ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اطالیہ اسلحہ اور روپیہ کے ذریعہ سے امام یمن کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یمن کے بارے میں اطالیہ کا نصب العین کس درجہ خوفناک ہے۔ مسولینی نہر سویز پر تو قابض ہونے سے رہا کیونکہ مصر میں اس کا طوطی نہیں بول سکتا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ بحیرۂ احمر کے ذریعہ سے نہر سویز کی سیاسی حیثیت پر اثر ڈالا جائے۔ اسلئے وہ یمن اور یمن کے بعد عدن میں اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے اور تسخیرِ عدن کے بعد جو اس کا پروگرام ہے۔ اس پر اس مقالہ میں بحث نہیں ہوسکتی لیکن یمن پر اطالوی تسلط کا مقصد ایک اور بھی ہے جو براہِ راست عربستان کی آزادی کے لئے خطرناک ہے اگر وہ یمن کے دروازے سے عرب میں داخل ہوگیا تو تمام ممالک عربیہ پر حاوی ہوجائیگا۔ اس لئے یمن کی حالت تشویش و اندیشہ کی دعوت دیتی ہے۔

## نجد و حجاز

نجد و حجاز کے آزاد خود مختار حکمران سلطان عبدالعزیز ابن سعود ہیں۔ جو اسلام دوستی اور قدامت پسندی کے باعث حکومت کو راہِ شریعت پر چلانا چاہتے ہیں۔ حجاز کا امن و امان اور حاجیوں کا سکون و اطمینان ان کی انتظامی قابلیت اور ذاتی رعب و وقار پر ناقابلِ تردید شہادت ہے۔ سلطان نے ۱۹۲۴ء میں شریف حسین کی حکومت کا خاتمہ کیا۔ ۱۹۲۵ء میں یہ ملک باقاعدہ طور پر مملکتِ سعودیہ میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں عسیر کی تسخیر ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں یمن و حجاز کے درمیان لڑائی ہوئی۔ سلطان ابن سعود کی فوجیں فاتحانہ پیشقدمی کر رہی تھیں لیکن قائدینِ عرب کی مساعی سے صلح ہوگئی۔ آج کل سلطان ابن سعود جنگ میں برطانیہ کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ برطانیہ کے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ سلطان نے روغنی چشموں کے بارے میں یورپی حکومتوں کو جو مراعات عطا کی تھیں اس پر اسلامی دنیا کے بعض حصوں میں اظہار اضطراب کیا گیا۔ لیکن اس کا کوئی غلط خواہ اثر نہیں ہوا۔ پچھلے دنوں سلطان کے نمائندہ نے ہر ہٹلر سے ملاقات کی تھی جس پر بعض حلقوں میں ان کی روش پر بحث ہونے لگی لیکن عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ برطانیہ میں اس پر کسی توجہ طلب تشویش کا اظہار نہیں کیا گیا۔ تازہ عربی ڈاک سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ اور دولتِ سعودیہ کے درمیان ایک جدید معاہدہ ہونے والا ہے جس کی رو سے مسئلہ فلسطین کا حل مفادِ اسلامی کے مطابق کیا جائیگا۔ سلطان کے فرزند کو شاہ شام بنایا جائیگا اور اسلحہ وغیرہ کیلئے قرض دیا جائے گا۔ اگر یہ معاہدہ تکمیل پذیر ہوگیا تو حجاز و برطانیہ کا رشتۂ دوستی اور بھی منضبط ہوجائیگا۔

## عراق

عراق کو عربی ممالک میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ ملک تہذیب و ترقی اور فوجی و ملی اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

انتداب کے بعد عراق میں ۱۹۲۰ء میں وسیع شورش ہوئی۔ عراقی نوجوان سر پر کفن باندھ کر میدان میں آگئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب وزارت قائم ہوگئی اور امیر فیصل نیم نمائندہ حکومت کے تخت پر جلوہ گر ہوئے لیکن معاہدۂ عراق و برطانیہ عربوں کے مطالبات کا پورا جواب نہ تھا۔ اسلئے شورش و اضطراب کا سلسلہ جاری رہا لیکن ۱۹۲۴ء میں جو وزارت قائم ہوئی اس نے معاہدہ پر مہرِ تصدیق ثبت کردی ۱۹۲۶ء میں جمعیت الاقوام کی تحقیقات پر موصل عراق کو مل گیا۔ اور اسی برس عراق و برطانیہ نے آپس میں ایک اور معاہدہ کیا ۱۹۲۷ء میں اس معاہدہ پر نظرِ ثانی ہوئی اور برطانیہ نے عراق کو آزاد ملک تسلیم کرلیا لیکن یہ معاہدہ ۱۹۳۰ء سے پہلے عمل پذیر نہ ہوسکا۔ برطانیہ نے تمام امور میں عراق کی خود مختاری تو تسلیم کرلی لیکن فوجوں کی نقل و حرکت اور مغربی فرات پر فضائی اڈہ برقرار رکھنے کا حق اپنے لئے محفوظ رکھا۔ ۳ راکتوبر ۱۹۳۲ء میں عراق کو جمعیتِ اقوام کا رکن بنایا گیا۔ ۸ ستمبر ۱۹۳۳ء کو سوئٹزرلینڈ میں امیر فیصل کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ شاہ غازی تختِ عراق پر متمکن ہوئے لیکن یہ نوجوان بادشاہ بھی اپریل ۱۹۳۹ء کو موٹر کے حادثہ سے راہیٔ ملکِ عدم ہوا اب اس کا کم سن بچہ امیر عبداللہ کی نگرانی میں بادشاہی کر رہا ہے۔

شاہِ عراق کی ترقی خواہی اور سیاسی بصیرت اس امر سے ظاہر ہے کہ عربی ممالک میں سے سب سے پہلے میثاقِ سعدآباد کے بانیوں میں جگہ حاصل کرلی اور اس معاہدہ کے باعث ملک کی دفاعی قیادت اور فوجی قوت پر ترکیہ کی امارت قبول کرلی گئی اس اقدام کے باعث بغداد سے لیکر ڈھکہ (افغانستان) تک اسلامی تنظیم و اخوت کا جال بچھ گیا۔ آزادی کے بعد عراق کو جن مشکلات کا سامنا ہوا ان میں روغنی چشموں کا بہت زیادہ حصہ ہے کیونکہ تیل کمپنی کی وجہ سے عراق کی سیاسی حکومت کے ساتھ ساتھ ایک کاروباری حکومت قائم ہوچکی ہے جس کے آغوش میں ہمیشہ سیاسی فتنے پرورش پاتے رہتے ہیں۔ لیکن تیل کمپنی کے باعث حکومت کو جو مالی امداد ملتی ہے اس سے ملک کا اقتصادی درجہ بہت زیادہ بلند ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں جرمنی کی جانب سے عراق کی طرف بہت التفات بڑھایا گیا تھا، اور بغداد کو فضائی سروس کے ذریعہ سے برلن سے ملانے کی تجویز تھی اس مقصد کیلئے نازیوں نے مالی قوت سے بھی کام لیا لیکن موجودہ جنگ کے باعث ہر ہٹلر کی امیدوں کا گھر گھروندہ بن کر رہ گیا ہے کیونکہ عراق نے مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی خدمات برطانیہ کے سپرد کردی ہیں۔

## شام

کرنل لارنس کی سرگرمیوں کی آخری منزل دمشق تھا جہاں سے وہ اپنا کام پورا کرکے واپس ہوا تھا۔ اس ملک پر ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی انتداب قائم ہوا لیکن فرانسیسی حکام نے ملک کی جغرافیائی وحدت پارہ پارہ کردی اور ایک چھوٹے سے ملک کو جس کی آبادی ۳۰ لاکھ سے زیادہ نہ تھی ۵ حصوں میں تقسیم کردیا۔ اس تقسیم و تجزیہ اور انتداب کے خلاف عربوں نے کئی برس تک خونریز ہنگامہ برپا کیا، جس کے مقابلہ میں فرانس کو ستر ہزار کے قریب سپاہی میدان میں لانے پڑے لیکن شامیوں کا جذبہ ہمیشہ چوٹ کھا کھا کر ابھرتا رہا۔ ۱۹۲۵ء میں دروزی جہاد کے باعث قیامت برپا ہوگئی۔ فرانس نے اپنی تمام قوتوں سے کام لیا۔ دمشق پر چھپن گھنٹے متواتر آگ برسائی گئی جس کے باعث ہزاروں عالیشان عمارتیں راکھ کا ڈھیر ہوگئیں لیکن عرب آگ کے دریا میں غوطے کھا کھا کر بھی مرعوب نہ ہوئے جدوجہد کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں کئی مہینے مسلسل ہڑتال رہی جس سے متاثر ہوکر فرانس نے شام کو بڑی حد تک سیاسی آزادی عطا کردی لیکن لبنان میں ایک علیحدہ عیسائی جمہوریت قائم کی گئی اہل شام سے وعدہ کیا گیا کہ تین برس کے بعد انتداب مکمل طور پر ختم کردیا جائے گا۔ اسی عرصہ میں ترکوں نے اسکندرونہ کی واپسی کا مطالبہ شروع کردیا جس پر عربوں نے صدائے احتجاج بلند کی لیکن فرانس نے اپنی سیاسی اغراض اور جمعیت اقوام کی سفارش پر اس علاقہ میں ترکی کی حاکمانہ شمولیت بھی گوارا کرلی۔ اس پر عربوں نے بغاوت انگیز مظاہرے کئے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہنگامہ آرائی اغیار کی شرانگیز ترغیب تھی جو ترک و عرب کی کشمکش سے اپنے مقاصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں فرانس نے ترکوں کو دوست بنانے کی غرض سے اسکندرونہ ترکوں کے حوالے کردیا اور عرب رو دھو کر خاموش ہوگئے۔ اب فرانسیسی وعدہ کے مطابق انتداب کے خاتمہ کا زمانہ آرہا ہے جس پر شام و فرانس میں کشمکش جاری ہے۔ فرانس کا خیال ہے کہ شام کی ملوکیت کسی ایسے شخص کے سپرد کی جائے جو آسمانِ پیرس کی آواز پر عمل کرے۔ اس غرض کے پیش نظر دو تجویزیں ہیں۔ اول شام و فلسطین اور شرق اردن کو متحدہ سلطنت میں بدل دیا جائے اور اس مملکت کی سلطانی کا شرف امیر عبداللہ کو حاصل ہو۔ اس تجویز پر فرانس و برطانیہ میں گفتگو ہو رہی ہے۔ چونکہ امیر صاحب عربی مقاصد کی بجائے مغربی اغراض کی طرف بہت زیادہ متوجہ رہتے ہیں اسلئے عربوں کی کوئی باثر جماعت اس تجویز کی حامی نہیں اس کے بعد سلطان ابن سعود کے صاحبزادے کا نام لیا جارہا ہے جس پر عربوں کی اکثر جماعتیں مطمئن نظر آتی ہیں۔ کیونکہ ابن سعود عربی تہذیب و تمدن [illegible]

روایات کے [illegible] نظر آتے ہیں [illegible] تحریک [illegible] صدیوں [illegible] ابنائے اسلام بیداریٔ عامہ اور [illegible] ممالکت ان کے زیرنگیں ہوتی [illegible] اتنی قوت نہیں [illegible] اور ان کی [illegible] بھی [illegible] بھی [illegible] اپنے [illegible] ان کی تائید میں آواز بلند کر [illegible] عمل نظر نہیں آتی لیکن [illegible] حادثہ ختم ہوتے [illegible] سیاست [illegible] ہو جائیں گے۔

## فلسطین

فلسطین کا [illegible] تبصرہ و تنقید اور تشریح و تفسیر کا محتاج ہے لیکن موجودہ [illegible] کے [illegible] نے جنگ میں [illegible] کا اعلان کر دیا ہے۔ اس [illegible] سے فلسطین کا ماحول خوشگوار نظر آنے لگا ہے۔ فلسطین گذشتہ چند سال سے [illegible] ہلاکت خیز [illegible] گذر رہا ہے اس کی تفصیلات قارئین کرام [illegible] اسلئے یہاں تبصرہ آرائی کی ضرورت نہیں لیکن اس ملک کا مستقبل [illegible] ممکن ہے کہ جنگ کے نتائج فلسطین کی قسمت بھی بدل دیں اور برطانیہ اسلامی دنیا کو خوش کرنے کے لئے گذشتہ تلخ تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے اس توقع کی بنا پر ہم اس اہم [illegible] تشنۂ تشریح [illegible] رہے ہوں۔

## وحدتِ عربیہ

گذشتہ پانچ برس سے عربی بولنے والی قومیں اتحاد و اخوت کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہی ہیں اس مقصد کیلئے بعض اہم اور نتیجہ خیز کام بھی کئے گئے۔ اس سلسلے میں مکہ معظمہ اور قاہرہ کی بین الاسلامی کانفرنسیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اتحاد و اخوت کا بھولا ہوا سبق آشوبِ فلسطین نے یاد دلایا ہے۔ اس سرزمین کے حوادث و سوانح سے عرب محسوس کرنے لگے ہیں کہ مسئلہ اگر منعقد نہ ہوئی تو ہر عربی ملک کو اسی طرح مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا حقیقت بھی یہ ہے کہ تقسیم عرب کا مقصد یہی تھا کہ مختلف عربی ممالک مفاد و مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکیں تاکہ انہیں ایک ایک کرکے دبا دیا جائے۔ عرب عرصہ تک تو اس حال سے بے خبر رہے لیکن وہ جہاد کی فضا میں پیدا ہوئے اور انقلاب کے آغوش میں پرورش پاکر جوانی تک پہنچے

ہیں ان کے لئے اس حقیقت کا احساس مشکل نہیں تھا کہ جب تک عرب متحد ہوکر اپنے بچاؤ کی فکر نہ کرینگے حوادث زمانہ ان کی پریشانی سے ناجائز فائدہ اٹھائے بغیر نہیں [illegible] حقیقت کی طرف [illegible] وسعت نظر سے کام لیں تو ان کی [illegible] وسیع ہو سکتی ہے [illegible] ہو [illegible] ہوتے [illegible] جزیرۂ عرب کے [illegible] کو وسیع کر دیں تو ان [illegible] وحدت عربیہ [illegible] رہ سکتی ہے [illegible] عرب [illegible] اتحاد [illegible] اور ترقی [illegible] حکومت کی [illegible] ضروری [illegible] کے آخر میں [illegible] جائے گی۔

## تجدیدِ خلافت

عرب کے مسائل امروزہ میں "تجدید خلافت" کا مسئلہ بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں۔ مصر کے بعض علماء خلافت کے ڈھانچہ میں نئی روح پھونکنے کی فکر میں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ شاہ فاروق کے سر پر تاج خلافت رکھا جائے لیکن اسلامی دنیا کا کوئی نمائندہ حلقہ اس تجویز پر متفق نہیں ہوا۔ شاہ فاروق چونکہ سیاسی قوت اور خودمختاری کے اعتبار سے اس بلندی پر نہیں جہاں خلافت کا پرچم لہرا سکتا ہے اسلئے ان کی خلافت پر مقبولیت کے اکثر دروازے بند ہو رہے ہیں۔ عربی ممالک بھی اس تجویز پر مطمئن نہیں کیونکہ لفظ خلیفہ ہی سے اسلامی خلافت کا مفہوم وابستہ ہے اسلئے تمام امرائے عرب "فاروقی خلافت" کی تجویز پر رقیبانہ رشک سے نظر ڈالتے ہیں۔ یہ تحریک سلطان نجد و حجاز کیلئے خصوصیت کے ساتھ باعث اضطراب ہے۔ حرمین الشریفین کی خدمت و محافظت کا شرف انہیں حاصل ہے اور خلیفہ کیلئے یہ اعزاز ضروری شرط کی حیثیت رکھتا ہے ممکن ہے کہ یہ فتنہ سر اٹھانے نہ پائے کیونکہ اس سے وحدت عربیہ کو بالخصوص اور تحریک [illegible] اسلامی کو بالعموم نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ لیکن مدبرین کا خیال ہے کہ خلافت کا مردہ حیات بعد الممات کے قابل نہ ہو سکے گا کیونکہ اس کے لئے فضا سازگار نہیں۔

## ایرانِ جدید

ایران کی نئی تعمیر کا آغاز گذشتہ جنگ عظیم سے ہوتا ہے جب اس ملک کی داخلی و خارجی آزادی روس و برطانیہ میں تقسیم ہو چکی تھی اور یہ عظیم الشان سلطنت جسے ایشیا کی [illegible] کے آغاز [illegible] کا بار ہا موقع مل چکا ہے سیاسی و انتظامی صلاحیت سے بالکل محروم تھی۔ جنگ کے بعد ایران کی حالت زوال و انحطاط کے آخری مرحلے پر آ گئی تھی۔ سپاہیوں اور دوسرے ملازمین سرکار کو چار چار ماہ تک تنخواہ نہیں ملتی تھی جس کے باعث ملک کا فوجی دائرہ صرف تین ہزار سپاہیوں تک محدود ہو گیا تھا نظم و نسق کی عنان انگلستانی فوج کے ہاتھ میں تھی جسے "ایس پی آر" کہا جاتا تھا ۱۹۲۳ء تک یہی حالت رہی اس کے بعد ملت ایران نے رضا خاں پہلوی کی رہنمائی میں کروٹ بدلی اور ۱۹۲۴ء تک قاچار شاہی کا خاتمہ ہو گیا اب ایران ترقی و فلاح کی آخری راہ پر گامزن ہے۔ ملک کی تمدنی، تعلیمی، فوجی اور مالی حالت یورپی ممالک کی ترقیوں سے مقابلہ کرتی ہے۔ فوجی تعلیم لازمی ہونے کے باعث ہر ایرانی ایک بلاتنخواہ سپاہی ہے باقاعدہ فوجیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہے۔ [illegible] صنعتی اعتبار سے ایران پر غیرملکی ماہرین کا تسلط ہے سب سے زیادہ کاروباری [illegible] کا ہے جس کے سرمایہ داروں نے کارخانوں کا ہمہ گیر جال بچھا رکھا ہے۔ موجودہ حالات میں ایران کی سیاسی حکمت عملی ترکی کے ہاتھ میں ہے اس لئے مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

## افغانستان

تاریخ افغانستان کا قابل انتخاب ۱۹۱۹ء سے شروع ہوتا ہے جب امیر حبیب اللہ خاں کو قتل کیا گیا اور ان کی جگہ غازی امان اللہ خاں تخت افاغنہ پر جلوہ گر ہوئے۔ امیر صاحب نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ملک کو کامل خودمختاری سے آشنا کرنا شروع کر دیا چنانچہ اسی برس جب پنجاب میں رولٹ ایکٹ کے باعث اضطراب تھا تو امیر امان اللہ خاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ جنرل نادر خاں ریزمک اور کوہاٹ تک پیشقدمی کرتے ہوئے آئے اس کے بعد معاہدہ راولپنڈی کی رو سے افغانستان کی غیرمشروط خودمختاری تسلیم کر لی گئی غازی موصوف نے ملک کو فوجی، مالی، تعلیمی اور تمدنی اعتبارات بام عروج پر پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد اگست ۱۹۲۶ء [illegible] درمیان تمام بڑی بڑی حکومتوں سے دوستانہ معاہدے کئے گئے ۱۹۲۷ء میں غازی موصوف یورپ گئے لیکن ان کا اصلاحی پروگرام غلو آمیز اور کمالیت پرستی تھا اسلئے ملک میں بے اطمینانی کا پرچار ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شنواری قبائل نے بغاوت کر دی۔ بڑھتے بڑھتے انقلاب انگیز صورت حال سے دوچار ہونے لگی۔ بغاوت اس درجہ کامیاب ہوئی کہ حبیب اللہ عرف بچۂ سقہ نے کابل پر قبضہ کر لیا اور ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء میں غازی امان اللہ خاں بھاگ کر قندھار آئے اور یہاں سے عازم یورپ ہو گئے اس کے بعد جنرل نادر خاں پیرس سے تشریف لائے آپ نے وزیری قبائل کی فوج تیار کی جو حبیب اللہ کی ہزیمت کا باعث ہوئی۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو شاہ نادر خاں تخت افغانستان پر رونق افروز ہوئے آپ نے اصلاحات کا کام خوشگوار اور اعتدال پسندانہ طریق پر انجام دیا اس حسن عمل سے ملک ایک بار پھر ترقی و عروج سے ہمکنار ہو گیا لیکن نومبر ۱۹۳۳ء میں شاہ غازی شہید کر دیئے گئے اس کے بعد اعلیٰحضرت ظاہر شاہ تخت سلطنت پر رونق افروز ہوئے جن کے عہد میں افغانستان انتہائی ترقیات سے ہمکنار ہو رہا ہے۔

افغانستان میثاق سعدآباد میں شامل ہے اسلئے اس کی بین الاسلامی حیثیت عام درجہ قابل اعتنا ہے لیکن اس ملک کا جغرافیائی محل وقوع بہت اہم ہے یہ روس و برطانیہ کے درمیان ایک آہنی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے برطانیہ افغانستان کی اہمیت اچھی طرح محسوس کر رہا ہے۔

## پٹھانستان

افغانستان کی خارجہ حکمت عملی اور فوجی معاملات میثاق سعدآباد کے باعث بین الاسلامی مفاد کے ماتحت ہے اسلئے یہاں اس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں البتہ حکومت ہند اور افغانستان کے تعلقات مخصوص حیثیت رکھتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان آزاد پٹھانستان کی دیوار حائل ہے اور بدقسمتی سے اس دیوار کو گرانے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ حکومت ہند نے بارہا "فارورڈ پالیسی" کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی لیکن تقریباً دو سو پچاس لڑائیوں کے باوجود پٹھانستان کا عقدہ حل نہ ہو سکا۔ آج کل فقیر صاحب ایپی اور ملا شیر علی کی سرگرمیاں محاربہ پر منتج ہو رہی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ فقیر صاحب آفریدی، مہمندی، مسعودی اور وزیری علاقوں کو ملا کر ایک متحدہ سلطنت بنانا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے یہ تجویز خیرمقدم کی مستحق ہے کیونکہ تمام پٹھان اگر کسی مرکزی ادارہ سے منسلک ہو جائیں تو یہی ادارہ حکومت ہند سے دائمی طور پر صلح کر سکتا ہے ورنہ ایک قبیلہ سے اگر مفاہمت کی جاتی ہے تو دوسرا قبیلہ برسرپیکار ہو جاتا ہے۔ اس کشمکش کا ایک ہی علاج ہو سکتا ہے کہ تمام قبیلوں کو ایک سلسلہ سے جوڑ دیا جائے تاکہ مشترکہ طور پر تمام قبائل کو راہ مصالحت کی طرف لایا جائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ حکومت برطانیہ بھی زود یا بدیر "وفاق پٹھانیہ" کا خیرمقدم کرے گی۔ اگر آزاد سرحدوں کی کوئی نمائندہ حکومت قائم ہو جائے تو افغانیہ و ہند کی اس رقابت کے بھی امکانات دور ہو جائینگے جو آزاد قبائل سے وابستہ ہے۔

## ترکیہ

جمہوریۂ ترکیہ عالم اسلامی میں قائدانہ حیثیت رکھتی ہے جو آواز انگورہ سے اٹھتی ہے اس کی صدائے بازگشت بغداد، دمشق، قاہرہ، رباط، ریف، تونس، طہران اور کابل سے سنی جاتی ہے۔ اس خصوصیت کی سب سے بڑی وجہ ترکوں کی تاریخی فضیلت، سیاسی تفوق، عسکری قوت، جغرافیائی اہمیت، عربی قابلیت اور شاندار اسلامی خدمت ہے۔ ترکی جہاں مشرقی اعتبار سے جزیرۂ عرب کا پڑوسی ہے وہاں اس کی مغربی حیثیت یورپ کی ارضی و بحری شاہراہوں سے ہمکنار ہے۔ بحری اعتبار سے اس کے بائیں پہلو میں بحیرۂ اسود ہے جو

باقی بر صفحہ ۱۳۳

# مغل شہزادی کا ولیعہد بخارا سے عشق

ٹامس مور کی مثنوی "لالہ رخ" انگریزی لٹریچر میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے اور تخیل کی وسعت، فضا کی رومانیت اور استعارات و تشبیہات کے لحاظ سے اپنی قسم کی واحد چیز ہے۔ لیکن اس میں تاریخی حقیقت کا کوئی شائبہ نہیں۔ "نقاب پوش پیغمبر" اور "ملکہ نور جہاں" کا پس منظر کسی حد تک تاریخی کہا جاسکتا ہے لیکن باقی تمام چیزیں یکسر مصنف کی ذہنی پیداوار ہیں۔ اصل مثنوی انگریزی کے قریباً ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، میں نے صرف خلاصہ پیش کیا ہے اور وہ بھی بہت حد تک اپنے الفاظ میں۔ مجھے اعتراف ہے کہ خلاصہ میں مصنف کی اصل روح مفقود ہے لیکن میرا منشا صرف لالہ رخ کا رومان پیش کرنا تھا اور اس میں میرا خیال ہے میں ناکام نہیں رہا جہاں تک تاریخ اور حقائق کا تعلق ہے اُن سے مصنف کو تعلق تھا اور نہ مجھے ہے مزید برآں میں نے ضمنی مثنویوں کو بہت ہی مختصر کردیا ہے تاکہ قارئین کی توجہ زیادہ تر "لالہ رخ کے ولیعہد بخارا سے عشق" کی جانب مبذول رہے۔

شبلی بی کام

## شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ کا ایک دلاویز رومان

### پری تمثال دوشیزہ

جس زمانہ میں ہندوستان کی زمام اقتدار شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھ میں تھی بخارا کے کوچک میں خاندانِ زیخ کا مشہور بادشاہ عبداللہ حکومت کرتا تھا۔ جب وہ بوڑھا ہوگیا تو اس نے اپنا تاج و تخت بیٹے کے حوالے کیا۔ اور بعزم حج مکہ روانہ ہوا۔ راستے میں وہ کشمیر جنت نظیر کی گلپوش وادی سے گذرتا ہوا ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں بھی آیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے اس کی بہت خاطر و مدارات کی اور بہت جلد دونوں میں اتنے دوستانہ مراسم استوار ہوگئے کہ ولیعہد بخارا کی نسبت شہنشاہ اورنگ زیب کی سب سے چھوٹی لڑکی "لالہ رخ" سے قرار پاگئی۔ شہزادی لالہ رخ ایک بے انتہا خوبصورت دوشیزہ تھی۔ ہمعصر شعرا نے اس کے حسن جہانتاب کی تعریف و توصیف میں بہت سی نظمیں کہی ہیں۔

### سفر کشمیر

طے یہ ہوا کہ شادی کے رسوم کشمیر کی بہار آفریں وادی میں ادا کئے جائیں جس کے بعد دولہا دلہن بخارا روانہ ہوں۔ چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب نے لالہ رخ کو ایک پرشکوہ جلوس کے ہمراہ نہایت دھوم دھام سے روانہ کیا۔ دہلی کے تمام بازار رنگین پردوں سے سجے ہوئے تھے۔ جمنا کے شفاف پانی میں بھی شاہی کشتیاں دوڑ رہی تھیں۔ در شاہی محل سے لیکر مضافات شہر کے خیمات تک زرق برق لباس پہنے خدام دست بستہ کھڑے تھے۔ شہزادی یونان کے کسی حسین مجسمے کی طرح محافہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد کشمیر و تاتار کی حسین باندیاں اور خواصیں عربی گھوڑوں پر سوار تھیں۔

### کشمیری مغنی

شہزادی پہلی بار محل سے باہر نکلی تھی۔ اسلئے

پردے کے پیچھے اپنے باپ کے دربار میں بھی داخل ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن نہ تو اس وقت نہ اس وقت اُسے فرامرز میں کوئی کشش نظر آئی۔

نوجوان کشمیری شاعر نے اپنا ستار اُٹھایا اور کورنش بجالاکر عرض کی کہ جو مثنوی میں سنانے لگا ہوں۔ وہ خراسان کے نقاب پوش پیغمبر سے متعلق ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک طویل داستان سنائی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

### "جلوہ گاہ رسالت"

سرزمین فارس میں ایک جماعت ایسی تھی جو خلافت بغداد کی سخت مخالف تھی۔ اس کا امیر ابن مقنع تھا۔ جو ہر وقت منہ پر ایک نقاب ڈالے رہتا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ عوام اس کے چہرے کی تجلی جلال کے نظارے کی تاب نہیں لا سکتے۔ ابن مقنع کی جماعت کا ہر فرد اپنے امام کے ہر لفظ کی تعمیل میں اپنی دُنیوی و اُخروی نجات تصور کرتا۔ اور اس کے ادنیٰ سے اشارے پر بھی ہر وقت اپنا سر کٹانے کو تیار رہتا تھا۔

ایک روز مقنع کے تمام مرید دربار میں جمع ہوئے۔ شاید ان کا امام کوئی نیا معجزہ پیش کرنے والا تھا۔ دفعتہً ایوان میں ایک فوجی نوجوان داخل ہوا اور "جلوہ گاہ رسالت" کو بوسہ دینے کی خاطر آگے بڑھا ---- وہ عظیم تھا جس نے تمام یورپ میں اپنی بہادری کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا اس نے سنا تھا کہ ابن مقنع کی جماعت "حریت عالم" کی علمبردار ہے چنانچہ وہ اس مذہب کو قبول کرنے کی خاطر آیا تھا۔ ابن مقنع کو علم تھا کہ عظیم سا بہادر شخص پوری فوج سے کم نہیں۔ اسی لئے وہ بھی دل سے چاہتا تھا کہ عظیم اس کے حلقۂ ارادت میں آجائے۔



## ٹامس مور کی زندہ جاوید مثنوی "لالہ رخ" کا خلاصہ

سفر کے ابتدائی ایام تو نہایت خوشی و مسرت میں گذرے لیکن مناظر کی یکسانیت دیکھ کر شہزادی کو بہت جلد محسوس ہوا کہ اُسے تنوع اور تجدد کی ضرورت ہے اسکی ایک کنیز نے وامق و عذرا۔ شیریں و فرہاد کے افسانہائے عشق سنا سنا کر مسرور رکھنے کی کوشش کی لیکن شہزادی کو ان میں کوئی خاص لطف نہ آیا اور وہ اکثر اُداس رہنے لگی۔ آخر جلوس میں سے کسی کو خیال آیا کہ

شاہ بخارا کے خدام کے ہمراہ جو نوجوان کشمیری شاعر آیا ہے وہ مشرق قدیم کے افسانے نہایت خوش الحانی سے سُناتا ہے۔ اگر اُسے طلب کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ شہزادی کی طبیعت بحال ہوجائے۔ چنانچہ فرامرز کو طلب کیا گیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا جس کے مردانہ حسن میں وہی دلکشی پائی جاتی تھی جو ہندوستان کی عورتوں کو کرشن جی میں نظر آتی ہے۔ شہزادی نے اُسے

از عبدالرحیم شبلی بی کام

غالباً یہی وہ معجزہ تھا جس کے اظہار کیلئے آج ابن مقنع نے دربار منعقد کیا تھا۔

## محشرستانِ حسن و جمال

عظیم مقنع کی عظمت سے بہت متاثر ہوا اور فوراً زمین بوسی ہونے کے لئے جھکا۔ عظیم کے سرنگوں ہوتے ہی تمام عقیدتمند بھی جھک گئے اور ایک پرزور نعرہ تکبیر بلند کیا۔ مرصع تخت اور چھت کے درمیان دو در پچے تھے جن پر حریر و دیبا کے پردے پڑے رہتے۔ ان زرکار پردوں کے پیچھے خوبصورت نسل انسانی کا ایک حسین زار لہلہا رہا تھا شاید جنت کی حسین ترین آبادی کچھ عرصہ کے لئے ان پُراسرار حجروں میں منتقل کر دی گئی تھی۔ لیکن عوام کو اس محشرستانِ حسن و جمال کا مطلق علم نہ تھا جس وقت عظیم "تختِ پیغمبری" کے سامنے جھک رہا تھا تو نازنینوں کے اس حرم کی ایک دوشیزہ کو اس میں کوئی خاص دلکشی نظر آئی۔ اور وہ ایک چیخ مار کر بیہوش ہو گئی ——— اس کا نام زلیخا تھا۔ دراصل وہ عظیم کو پہچانتی تھی۔

ایک زمانہ تھا جب عظیم اور زلیخا یکجان و دوقالب تھے اور محبت کے نشہ میں ان کو خیال بھی نہ آتا تھا کہ وہ کبھی جدا ہوں گے۔ اچانک ایک روز عظیم مادرِ وطن کی آواز پر جنگ میں شریک ہو گیا۔ زلیخا نے مہینوں اس کا انتظار کیا لیکن اس نے نہ آنا تھا نہ آیا۔

## نقاب پوش پیغمبر

ادھر ابن مقنع کے مبلغ تمام اطراف ملک میں اس غرض کے لئے روانہ کئے گئے کہ وہ اپنے "پیغمبری" وعودہ جنت" کے لئے حوریں تلاش کر کے لائیں۔ چنانچہ جب وہ زلیخا کے ملک میں پہنچے تو اُسے بھی اپنے ساتھ پکڑ لائے۔ زلیخا نے سمجھا کہ وہ ایک نیک مرد کی صحبت میں جا رہی ہے لیکن یہاں آ کر اُسے معلوم ہوا کہ یہ سب دھوکہ اور فریب تھا۔ ابن مقنع دراصل ایک بدصورت اور عیاش شخص تھا۔ اور اس نے محض اپنی بھیانک شکل چھپانے اور بدقماشیوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر چہرے پر نقاب ڈال کر عظمت و جلال کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے عظیم کو ایک بدکردار شخص کے سامنے عقیدت و خلوص کے جذبات کے ساتھ جھکتے دیکھا تو اُسے بہت رنج ہوا اور وہ چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔

مقنع نے حسب معمول عظیم کو "روحانیت" کا پُرفریب سبق دیا۔ اور وہ اس کی چرب زبانی سے اتنا متاثر ہوا کہ فی الفور اس کے فداکاروں میں شامل ہو گیا۔

## شباب انگیز رقص

"رسمِ بیعت" ادا کرنے کے بعد عظیم کو مقنع کی "جنتِ شداد" کی سیر کرائی گئی جو ایسی فریب نظر تھی کہ وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔ کنج فردوس کے ایک شفاف چشمہ کے کنارے کنواری لڑکیوں کا ایک شباب انگیز رقص کیا گیا جس کو دیکھ کر ناممکن تھا کہ کوئی شخص اس جنت کے علاوہ بھی کسی چیز کا خیال کرتا۔

رقص کے بعد عظیم اپنے خیالات میں کھویا ہوا باغ کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک اسے ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز آئی۔ وہ حیران تھا کہ اس موسیقی و تبسم کی سرزمین میں رنج و محن کا کام؟ جب وہ آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک گوشہ میں ایک نقاب پوش نازنین تصویرِ غم بنی کھڑی ہے۔ اس کے جذبات میں تلاطم برپا ہو گیا۔ اور اس نے عالم بے خودی میں اپنے بازو پھیلا دیئے۔ اور نہ جانے وہ غم کی ماری لڑکی بھی کیوں اس کی طرف بے اختیار کھنچی آئی۔ جب وہ عظیم کے آغوش میں گری تو اس کا نقاب سرک گیا ——— آہ وہ زلیخا تھی جو اپنے گمشدہ عاشق سے ملنے کیلئے یوں غم کا لباس اوڑھے چلی آئی تھی۔

عظیم ششدر رہ گیا لیکن بہت جلد زلیخا نے تمام حال کہہ کر اس کی حیرت دور کر دی۔ عظیم نے اُس سے والہانہ التجا کی کہ وہ فی الفور اس ناپاک سرزمین سے اس کے ہمراہ بھاگ نکلے لیکن "مذہبی" تصورات غالب آئے اور زلیخا نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی قسم کے پیش نظر جو اس نے مقنع کے سامنے کھائی تھی بھاگنے سے تامل کیا۔ اور "خدا حافظ" کہتی ہوئی عظیم سے جُدا ہو گئی۔

## نقاب سرکنے کے بعد

کچھ عرصہ بعد عباسی خلیفہ مہدی نے ابن مقنع کا استیصال کرنے کی غرض سے اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس جنگ میں ابن مقنع بہادری سے لڑا لیکن بالآخر بھاگنے پر مجبور ہوا۔ واپس جا کر اس نے مریدوں کو "روحانیت" اور "مذہب" کے نام پر بھڑکایا اور پھر میدانِ جنگ میں آ موجود ہوا لیکن چونکہ اُسے اپنے انجام کا بخوبی علم تھا۔ اسلئے آخری رات اُس نے اپنے آپ کو مریدوں پر ظاہر کر دیا تاکہ وہ اسکی کریہہ المنظر صورت دیکھ لیں اور اپنی جگہ زلیخا کو مقرر کر کے خود کو نذرِ آتش کر دیا۔ صبح نمودار ہوئی تو خلیفہ مہدی کی فوج ظفر موج عظیم کی قیادت میں شہر کی فصیلوں پر چڑھ آئی۔ سامنے ایک نقاب پوش آتا دکھائی دیا۔ سب نے شور مچایا "وہی ہے بدکردار" اور عظیم نے آگے بڑھ کر اپنا بھالا اُس کے سینہ میں بھونک دیا لیکن جب نقاب سرکا تو معلوم ہوا وہ زلیخا تھی۔ عظیم پر غم و اندوہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ عظیم اس حادثہ کے بعد غم سے اتنا نڈھال ہوا کہ وہ عالم شباب ہی میں بوڑھا ہو گیا۔

لالہ رُخ نے فرامرز کی اس مثنوی کو بیحد پسند کیا۔ اور اگلے دن خواہش کی کہ وہ کوئی اور بھی ایسا ہی قصہ اُسے سنائے۔ چنانچہ فرامرز نے ستار اُٹھایا اور مندرجہ ذیل مثنوی سُنائی ———

## بارگاہِ الٰہی میں پری کا تحفہ

صبح کا وقت تھا بہشت کے دروازے پر ایک پری اُداس و ملول کھڑی تھی۔ اس کی بلوریں آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی خطاؤں پر نادم ہے اور بہشت میں داخل ہونے کی متمنی ہے۔ رضواں نے اُسے زار و قطار روتے دیکھ کر کہا ——— "تیرے لئے جنت میں داخل ہونے کی صرف یہ صورت ہے کہ تو کوئی ایسا تحفہ تلاش کر کے لا جو بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا جائے اور وہ خوش ہو کر تجھے معاف کر دے!"

یہ سُنکر پری کی خوبصورت آنکھوں میں مسرت کی چمک پیدا ہو گئی۔ اور وہ بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ زمین پر اُتری۔ اور سوچنے لگی کہ وہ کون سا تحفہ ہو سکتا ہے جو خُدا کے حضور قبولیت کا شرف پائیگا۔ وہ اسی اُدھیڑبن میں تھی کہ اس کی نگاہ ہندوستان جنت نشان پر پڑی۔ اس ملک پر اُڑتے اُڑتے اس نے ایک جگہ آزادی کی خاطر ایک سپاہی کو شہید ہوتے دیکھا۔ پری نے سمجھا کہ اس نے اپنا مقصود پا لیا۔ اور فوراً اس کے ایک خون کا قطرہ نکال کر خوشی خوشی جنت کے دروازے پر آئی۔ لیکن افسوس اُسکی یہ پیشکش بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کا درجہ نہ پا سکی۔

اس کے بعد وہ مصر کی رومان آفرین سرزمین میں آئی۔ اور یہاں سے ایک عاشق ناکام کی "آہ وداع" لیکر آسمان پر پہونچی۔ لیکن محافظ فرشتہ نے کہا ——— "تمہارا تحفہ آہ سے بھی مقدس ہونا چاہیئے"۔

پری بہت ملول خاطر ہوئی لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری اور پھر اُڑتی اُڑتی لبنان ایک سرسبز وادی میں پہونچی۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک معصوم بچہ تتلیاں پکڑنے میں مصروف ہے۔ اچانک اذان ہوئی اور وہ سب کھیل کو چھوڑ کر سربسجود ہو گیا اتنے میں وہاں ایک مسافر آیا جس کے بشرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اور آنکھوں میں ظلم و ستم کا خون جوش مار رہا تھا۔ جب اس نے معصوم بچے کو مصروفِ عبادت دیکھا تو معاً اس کا دل بھی گداز ہو گیا۔ اور فرطِ ندامت سے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور بے اختیار وہ خدائے ذوالجلال کے سامنے جھک گیا۔ پری یہ منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوئی اور پکار اُٹھی ——— "میں نے گوہرِ مقصود پا لیا"۔ چنانچہ اس نے گنہگار کا آنسو لے جا کر خدائے قدوس کے دربار میں پیش کیا۔ اور اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ———!

## لالہ رُخ لاہور میں

جب یہ مثنوی ختم ہوئی تو چونکہ لالہ رُخ پر نیند کا غلبہ طاری ہو چکا تھا۔ اس لئے سب اہل مجلس اُٹھ کر باہر آ گئے اور شہزادی کو اپنے خیمہ میں سونے دیا گیا۔

اگلے دن شام کو قافلہ لاہور پہونچا۔ یہاں بہت سی مسجدیں۔ خانقاہیں اور مقبرے دیکھ کر شہزادی بہت متاثر ہوئی اور رات کے افسانے کی پری کی طرح اس کا دل گداز ہو گیا۔ لاہور میں شاہ بخارا کا قاصد شہزادی کے حضور پیش کیا گیا۔ جس نے عرض کیا کہ شاہ بخارا کشمیر میں شہزادی کے استقبال کا نہایت نفیس انتظام کر رہا ہے۔ شہزادی کے جذبات اس پیغام سے سرد پڑ گئے کیونکہ وہ وقت قریب آ رہا تھا جب اُسے ایک اجنبی کے حوالہ کر دیا جائیگا۔ درحقیقت اُسے فرامرز سے محبت ہو گئی تھی اور وہ جاننا چاہتی تھی کہ آیا فرامرز کو بھی اس کے ساتھ محبت ہے یا نہیں۔ لاہور میں شہزادی کی آمد کی خوشی میں ایک عظیم الشان جشن منعقد کیا گیا۔ لیکن اُس نے چند ہی منٹ بھی نہ لی کیونکہ اسکے دل میں ایک نامعلوم خلش پیدا ہو رہی تھی۔

دو تین دن لاہور ٹھہرنے کے بعد قافلہ پھر روانہ ہوا۔ شہزادی کی اُداسی دور کرنے کیلئے فرامرز کو پھر حاضرِ خدمت کیا گیا۔ چنانچہ اُس نے دل کی داستانِ محبت سنائی۔

## احساسِ شباب کا پہلا دن

عرب کے امیر کی شہزادی ہندہ ایک پری تمثال اور زہرہ جبین دوشیزہ تھی۔ ایک روز وہ دریچہ میں بیٹھی کسی نامعلوم ہستی کا انتظار کر رہی تھی۔ دراصل "احساسِ شباب" کا آج پہلا دن تھا اور وہ سوچ رہی تھی "کیا مجھ سے بھی کوئی محبت کریگا"۔ کہ اچانک سامنے کی خلیج میں سے کوئی کشتی آتی محسوس ہوئی۔ اور ایک لمحہ میں کوئی شخص کمرے کے جھروکے میں سے جھانک رہا تھا۔ ہندہ نے سمجھا۔ کوئی آسمانی ہستی ہے لیکن جب اس کا خوف و استعجاب رفع ہوا تو اُسنے دیکھا کہ ایک مردانہ حسن و شباب کا مجسمہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے کھڑا ہے۔ ہندہ نے پوچھا "اس مداخلت بیجا کا سبب؟" محض "شوقِ دیدار" مرد نے نہایت تمکنت سے جواب دیا "کیا یہی اس کا گمنام عاشق ہے"۔ ہندہ نے سوچا اور اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی۔ چنانچہ مرد کو اندر بلا لیا اور باتیں کرنے لگی۔ بہت جلد ہندہ کو معلوم ہو گیا کہ نووارد عرب نہیں ہے بلکہ اُس کے ملک کا دشمن ایرانی ہے۔ جو حب الوطنی کے نشہ میں چور ہے۔ اس کے باوجود دونوں کی محبت میں کمی نہ آئی اور اُنہوں نے قومی دشمنی کے باوجود خلوص و وفا کے عہد و پیمان کئے۔

## دلدوز ٹریجڈی

چند ہی دن کے بعد عربوں نے ایران پر چڑھائی کی۔ اُن کا سردار ہفید تھا۔ وہی شخص جو اس روز عرب شہزادی کے دامِ زلف میں گرفتار ہوا تھا۔

ایرانیوں نے پوری قوت سے مدافعت کی لیکن عربوں کی پیشقدمی کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ چنانچہ بہت سے ایرانیوں کو عربوں نے قید کر لیا۔ ان میں ہفید کی معشوقہ ہندہ بھی تھی ہفید نے اپنی محبت کے پیش نظر ہندہ کو راتوں رات اس کے محل میں محفوظ واپس پہونچا دیا اور باقی قیدیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کا حکم دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد ایرانیوں نے اپنی منتشر قوت کو مجتمع کیا۔ اور پورے جوش سے عربوں پر حملہ کیا۔

اسی یورش میں ہندو بھی مارا گیا جب ہند کو اپنے عاشق کا حال معلوم ہوا تو اُس نے بھی خلیج فارس میں کود کر جان دے دی ۔۔۔۔۔۔!

## تو ہو اور گوشۂ تنہائی

جب تک یہ مثنوی ختم ہوئی۔ شاہی قافلہ دریائے اٹک کو عبور کر چکا تھا۔ اور حسن ابدال کے شفاف چشموں کے کنارے خیمہ زن تھا۔ شہزادی لالہ رُخ کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ اُس کا جی چاہا۔ ولیعہد بخارا سے نکاح کا خیال ترک کر کے فرامز کے ساتھ یہیں اقامت گزیں ہو جائے۔ لیکن آہ۔ یہ بالکل خیال خام تھا۔ جدائی کی گھڑیاں قریب آ رہی تھیں۔ چند ہی دنوں میں وہ کشمیر کی پُرفضا وادیوں میں پہونچ جائیگی۔ اور اس کے بعد غالباً وہ فرامز کو دیکھ بھی نہ سکے گی۔

ایکدن شہزادی کی محفل میں ملکہ نور جہاں کا تذکرہ ہونے لگا۔ فرامز نے کہا: "مجھے ایک مختصر نظم یاد آگئی ہے جس کی ہیروئن نور جہاں ہے۔ اجازت ہو تو شہزادی کے گوش گزار کی جائے"۔ لالہ رُخ نے ایک تبسم دلنواز کے ساتھ سر ہلایا اور فرامز نے ملکہ نور جہاں کا قصہ یوں سُنانا شروع کیا۔

## جشنِ شگوفہ

کشمیر کی گلریز وادی اپنے زعفران زاروں، مترنم چشموں، اور دلکش کنجوں کی وجہ سے پہلے ہی فردوسِ بریں سے کم نہیں لیکن "جشنِ شگوفہ" کے موقعہ پر اس کی سماوی لطافت دیدنی ہوتی ہے۔ یہ وہ موسم ہوتا ہے جب ثمردار درختوں میں شگوفے پھوٹتے ہیں۔ سبزہ زاروں میں ہر طرف پھول لہلہا رہے ہوتے ہیں اور دوشیزگانِ کشمیر اپنے خرام ناز سے جادو جگا رہی ہوتی ہیں شہنشاہ جہانگیر ایسے ہی موسم میں نزہت گاہِ کشمیر میں اپنے دل و دماغ کو سکون بخشنے کے لئے ملکہ نور جہاں کی معیت میں آیا کرتا تھا۔ لیکن اس سال وہ مُسرت نظر نہیں آتا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نور جہاں اس کے ساتھ نہیں۔ پچھلے دنوں کسی وجہ سے دونوں میں رنجش پیدا ہو گئی۔ اسی لئے تقریبِ عیش و نشاط وہ مزا نہیں جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ نور جہاں بھی غمزدہ ہے۔ اور دل سے چاہتی ہے کہ اس کا عاشق دلدادہ پھر اپنے تبسم دلنواز سے اسکی روح کو شاد کام کرے۔

## نغمۂ سامعہ نواز

شالامار میں جشن منعقد کیا جا رہا ہے۔ باغ کی روشوں پر کشمیر کی حوریں ۔۔۔۔۔۔ نزاکت و رعنائی کے بہترین نمونے ۔۔۔۔۔۔ جمع ہو کر صاعقہ پاشیاں کر رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شالامار میں حسن و شباب کا ایک دریا مست خرام ہے۔ لیکن شہنشاہ دل گرفتہ اور ملول خاطر ۔۔۔۔ کیونکہ نور جہاں ۔۔۔۔۔ وہ ملکۂ جمال جس کی ضیائے تبسم سے ظلمتکدۂ دل منور ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ وہاں نہیں ہے۔

لیکن دراصل نور جہاں وہیں تھی۔ اُس نے ایک دوشیزۂ عرب کا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ساعت کا انتظار کر رہی تھی جب وہ بانسری کا جادو آزما کر دیکھے گی کہ اُس کے عاشق پر کوئی اثر ہوتا ہے یا نہیں۔

جہانگیر کنیزوں کے رقص و سرود سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا۔ کہ اچانک دور سے ایک لاہوتی نغمہ بلند ہوا اور اس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ نغمہ میں کچھ ایسا سحر اور جادو پنہاں تھا کہ شہنشاہ موسیقی منبع و ماخذ کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ قریب جا کر جب اس نے نور جہاں کو پہچانا تو اُسے تمام رنجشیں بھول گئیں۔ اور "تم؟" کہتا ہوا بے اختیار اپنی محبوبۂ جانفزا سے لپٹ گیا۔ عشاق کے دلوں کی کشیدگی بھی کیسی والہانہ پرستش کا پیش خیمہ ہوتی ہے!

## لالہ رُخ کا جشنِ عروسی

آخر قافلہ کشمیر کی نزہت آگیں وادی کے نزدیک جا پہنچا۔ چونکہ منزل بالکل قریب تھی اسلئے لالہ رُخ کو فرامز کے دیکھنے کا موقعہ نہ مل سکا اُسے معاً یہ دلشکن احساس ہوا کہ اب مسرت کی گھڑیاں قریب الاختتام ہیں۔ اور اب سوائے فرامز کی یاد کے اُس کے پاس کچھ نہ رہیگا۔

سرینگر میں اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا اور طے یہ ہوا کہ "جشنِ عروسی" شالامار باغ میں منایا جائے۔ آخری رات شہزادی اتنی مضطرب تھی کہ باوجود خواصوں کی عاجزانہ درخواستوں کے ایک پل بھر بھی اُسے نیند نہ آئی اور ساری رات اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی۔ اگلے دن شہزادی کو ہر طرح سے آراستہ پیراستہ کیا گیا اور کشتیوں کے ایک جلوس میں شاہی بجرا روانہ ہوا۔ باغ کی فضا پھولوں کی خوشبو میں رچی ہوئی تھی اور دونوں طرف سرو جھوم جھوم کر شہزادی کو مبارکباد دے رہے تھے۔

## شہزادی کے خوابوں کا مالک

جب لالہ رُخ باغ کی نہر میں سے ہو کر ایوان میں پہونچی تو بخارا کا شہزادہ اپنی ملکہ کی پذیرائی کے لئے تخت سے اُترا اور شہزادی کا دستِ نازنین اپنے ہاتھ میں لیا۔ شہزادی نے جب دھڑکتے ہوئے دل اور کپکپاتے ہوئے بدن کے ساتھ اوپر نگاہ کی تو وہ یہ دیکھ کر ششدر و حیران رہ گئی کہ فرامز شاہ بخارا کے لباس میں اس کے سامنے کھڑا ہے ۔۔۔۔ فرامز اس کے خوابوں کی دنیا کا مالک۔ اُس کا محبوب جس کے تصور میں اس کا سفرِ کشمیر آسان ہو گیا تھا۔ دراصل شاہ بخارا فرامز کا بھیس بدل کر خود دہلی پہونچا تھا اور وہاں سے خادم بنکر شہزادی کی معیت میں ہی کشمیر آیا تھا۔ اس تبدیلی ہیئت کا مقصد سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ شادی سے قبل لالہ رُخ کی محبت حاصل کر سکے۔ ٭

# سوہنی مہینوال

پنجابی داستان کا آزاد ترجمہ

از حضرت مولانا ... اختر

شعاع عشق جب اٹھی تجلی گاہ فطرت سے
منور ہو گئی بزم جہاں مہر محبت سے

ہوا اس کا گذر پنجاب کی رنگیں فضاؤں سے
تو گونج اٹھا زمانہ ہیر رانجھا کی نواؤں سے

اٹھی موج چناب[2] اک نغمۂ کیف آفریں ہو کر
وہ نغمہ چھا گیا دنیا پہ جو سحر آفریں ہو کر

سکوں پایا جنون عشق نے حسن خود آرا سے
ہوئی رنگیں سحر گجرات کی شام بخارا سے

وہ عزت بیگ[1] بلخی بادۂ الفت کا متوالا
وہ مستانہ کہ تھا جو شمع نظارہ کا پروانہ!

بظاہر اس کو تھی فرصت نہ اشغال تجارت سے
حقیقت میں مگر تھا مضطرب سوز محبت سے

بخارا شاہراہ مہر طلعت کا وہ مسکن تھا!
دماغ عاشقی جس کی ضیا ریزی سے روشن تھا

بخارا کے حسین خورشید وش آفت کے پرکالے
تصدق جن پہ حافظ شاہد شیراز کر ڈالے

مگر اس کے لئے اس حسن و رعنائی کی جنت میں
نہیں تھی کوئی حور ایسی جسے چشم الفت میں

تلاش حسن دلکش کیلئے اس نے وطن چھوڑا
تجارت کے بہانے بلخ سے پنجاب میں آیا

دکھایا عشق نے جب ساحل رود چناب اسکو
نظر آئے زمیں پہ مسکراتے آفتاب اسکو

زمین گجرات کی یعنی جہان شان محبوبی!
ہر اک ذرہ تھا اسکا مظہر عرفان محبوبی!

اگر گیسو بدوش اسکا کوئی مست شباب آئے
تو عاشق کو نظر اٹھتی ہوئی موج شراب آئے

نظارے کر رہا تھا وہ جمال آرا حسینوں کے
نظر میں تولتا پھرتا تھا جلوے مہ جبینوں کے

پڑی اسکی نظر ناگاہ اک گل گو کی دختر پر
کہ پروانہ یکا یک جا گرا شمع منور پر

وہ لڑکی ایک آئینہ تھی شان دلربائی کا
نظر آتا تھا جس میں رخ کمال کبریائی کا

وہ لڑکی سوہنی کہتے تھے سب جس کو محبت سے
ریاض دہر میں آئی تھی گویا حور جنت سے

ادائیں اس کی جب ہوتی تھیں مصروف بلا خیزی
قدم لیتا تھا آ کے فتنۂ آشوب چنگیزی

ابھی اٹھا نہیں تھا پردۂ دوشیزگی اس کا
شراب شرم میں پنہاں تھا کیف دلکشی اس کا

خدا اس سے نہ ہوں کچھ بے خبر [illegible]
کہ اک تصویر دلکش تھی وہ احساس جوانی کی

ابھی اٹھنے نہ پائی تھی [illegible]
کہ دل میں دوڑ اٹھیں بجلیاں سوز محبت کی

نگاہ عزت سے کہنے لگا اے [illegible] دل
ترے جلوے سے روشن ہو گئی ظلمت سرائے دل

اگر مجھکو مری [illegible] پر رحم آ جائے
مرے اجڑے ہوئے گلشن میں پھر رنگ بہار آئے

اگرچہ سوہنی بھی مضطرب تھی درد الفت سے
مگر مجبور تھی ماں باپ کے احکام و عزت سے

اندھیرا بس گیا ارماں کا [illegible] نے ہر طرف دیکھا
حصول مدعا کے واسطے تلا[3] کے پاس آیا!

لگا کہنے خدارا میری حالت پر کرم کیجے!
غریب شہر و مفلس ہوں ملازم مجھ کو رکھ لیجے

دیا تلے نے اس کو کام جب بھینسیں چرانے کا
تو روشن ہو گیا اک اک ورق اسکے فسانے کا!

غلامی کے عوض دیدی خوشی سے خواجگی اس نے
اچھالا اس طرح دنیا میں نام عاشقی اس نے

مہینوال[4] اسکو کہہ کر جس گھڑی تلا بلاتا تھا
تو دل ہی دل میں اپنے بخت پہ وہ مسکراتا تھا

چراگاہوں میں چھا جاتی تھی جب سنسان خاموشی
مسلط دہر پہ ہوتی تھی بن کر نیند بیہوشی!

چھپا لیتی تھی ظلمت سحر کو جب اپنے دامن میں
چمکتی تھی ضیائے حسن چرواہے کے مسکن میں

وہ دونوں جذبۂ الفت سے ہم آغوش ہوتے تھے
کہ جن پر ماہ و اختر رات کے وجد میں ڈوبتے تھے

رہا یہ سلسلہ کچھ روز لیکن وائے بدبختی
کسی نے ان ملاقاتوں کی تلے کو خبر کر دی

بلا کر رات عزت بیگ کو کہنے لگا تلا
تری گستاخیوں سے ہو گیا میں شہر میں رسوا

یہ سن کر اس نے رو کے خطۂ گجرات کو چھوڑا
نشے کے دن کو چھوڑا بیخودی کی رات کو چھوڑا

وہ خوں ہونا تمناؤں کا آغاز محبت میں
وہ گل ہونا چراغ آرزو کا شام غربت میں

جب آدھی رات کو دنیا ہوئی روپوش ظلمت میں
تو آئی دل گرفتہ سوہنی عزت کی خلوت میں

کہا عزت نے اے سرمایۂ عیش و نشاط دل؟
ترے جلوے سے ہے روشن چراغ انبساط دل!

مجھے تو سونپ کر اب دوزخ درد محبت کو
نہ جانے کل بہشت آرا کرے گی کس کی خلوت کو

ہجوم رنج و غم میں وہ وداع اس سے ہوا آخر!
لگایا ڈیرہ دریا کے سکوت افزا کنارے پر

مگر محو عمل تھیں جذبۂ الفت کی تاثیریں
وہ تاثیریں کہ جن میں وصل کی پنہاں تھیں تقدیریں

جہاں چھپتا تھا جس دم رات کے تاریک دامن میں
تو جلتا تھا چراغ وصل چرواہے کے مسکن میں

بپا کرتا تھا بزم عیش دریا کے کنارے پر
کہ آ جاتی تھی ہر شب سوہنی موجوں کے دھارے پر

تجلی چھپ گئی سورج کی جب دامان مغرب میں
اٹھا طوفان تاریکی عالم سینۂ شب میں

فسون خامشی سے سو گئے خاموش ہنگامے
کہ صحرا بے سکوں میں کر دئے بیہوش ہنگامے

وہ شورش خیز موجیں سو گئیں تھک کر کنارے پر
جو دن کو رقص کرتی تھیں ہواؤں کے اشارے پر

ہوا کی سرسراہٹ ہی کہ شور ہیبت افزا ہے
کہ جوش قہر میں دریا بس کچھ گنگناتا ہے

وہ ملاحوں کے نغمے گونجتے تھے جو فضاؤں میں
تڑپتی ہے ابھی تک روح طوفانی ہواؤں میں

وہ آئی سوہنی نظارۂ دلبر کی دیوانی!
وہ آیا آنکھ جانب عشق کا جوش ستم رانی!

سبوئے پختہ کے دھوکے میں لائی ہے گھڑا کچا!
مگر ارمان دید اس کو نہیں کچھ دیکھنے دیتا

وہ موجیں تلملائیں سوہنی کو گود میں لے کر
وہ دریا کے کنارے پر اٹھا ہنگامۂ محشر

وہ عزت بیگ بھی پانی میں یہ کہتا ہوا کودا
تجھے جانے نہ دوں گا میں بہشت عشق میں تنہا

گلے مل کر تلاطم کی فضا میں کھو گئے دونوں
کہ وصل جاوداں کا جام پی کر سو گئے دونوں

[1] مہینوال کا حقیقی نام
[2] چناب ایک دریا کا نام ہے جو وسط پنجاب سے گذرتا ہے
[3] تلا سوہنی کے باپ کا نام تھا۔
[4] مہینوال پنجاب میں بھینس چرانے والے کو کہتے ہیں اور عزت بیگ کا لقب بھی تھا



سوہنی مہینوال

سینۂ امواج پر سوئی ہوئی ہے سوہنی　　مستیِ جاوید میں کھوئی ہوئی ہے سوہنی

ہے مہینوال اسطرف ساحل پہ محوِ انتظار　　جسطرح پروانہ ہجرِ شمع میں ہو بیقرار

# سفید پھول

بلند پایہ نفسیاتی افسانہ

از جناب کرشن چندر ایم اے

کبالا سوچ رہا تھا، تم نینا ہو، تم دھند کی دیوی ہو، تم گلاب کا پھول ہو، تم راستہ بھول کر آگئی ہو، راستہ۔ کبالا نینا کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا، نازک چھوٹے سے گلابی پاؤں۔ اچھا تو وہ چپل کیوں نہیں پہنے ہوئے ہے۔؟ وہ اس کے لئے ایک ایسا اچھا چپل تیار کرے گا کہ دھند کی دیوی بھی اسے پہن کر خوش ہو جائے۔ لیکن ہر روز کبالا چپل تیار کرکے بغل میں دبائے اونچی پہاڑ کے پُرپیچ اور دشوار گذار راستے پر چل رہا تھا ......

موضع مہندر کے موچی کا نام کبالا تھا۔ کبالا کو آج تک کسی نے گالی دیتے یا جھوٹ بولتے نہ سنا [illegible] کے علاوہ شاید اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ وہ پیدائشی گونگا تھا۔ یوں بھی تو مہندر کا گاؤں بودھوں کا گاؤں تھا جہاں ہر فرد سچائی اور اہنسا کا پجاری تھا۔ لوگ بہت کم بولتے تھے، چوری چکاری اور دغابازی کا نام نہ تھا۔ پچھلے سو برس میں وہاں قتل کی ایک بھی واردات نہ ہوئی تھی۔ لوگ مہندر میں اس طرح خوش و خرم رہتے تھے گویا جنت میں رہتے ہوں۔ یہ بات الگ ہے کہ سماج کی الجھنوں میں پھنس کر گاؤں کے لوگ بعض اوقات ایسے کام بھی کر بیٹھتے تھے جن پر انہیں بعد میں پچھتانا پڑتا تھا۔ لیکن ایسی باتیں بہت کم پیش آتی تھیں اور پھر یہ تو سماج کی الجھنوں کا قصور تھا، نہ کہ اُن کا۔

کبالا کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب دو مضبوط دیودار کے درختوں کے سایے تلے کھڑی تھی۔ یہ دیودار کی لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر تیار کی گئی تھی۔ یہ کبالا کی دکان تھی اور کبالا کا آبائی گھر۔ مہندر کا خوبصورت گاؤں نیچے گھاٹی میں واقع تھا۔ اور جب ہوا دیودار کے درختوں میں گزرتی ہوئی گیت گانے لگتی اور سورج کا دیوتا اپنے سنہری رتھ پر سوار ہو کر اونچے دیوداروں کی چوٹیوں کے اوپر سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا تو نیچے گھاٹی میں گاؤں کی خوبصورت منقش چھتیں اور پرانے بودھ مندر کا منگولیائی برج سورج کی طلائی کرنوں میں جگمگ جگمگ کرنے لگتے۔ سورج نکلتے ہی کبالا دکان سے باہر ایک چھوٹے سے اخروٹ کے درخت کے نیچے آبیٹھتا۔ اور جوتیاں بناتے بناتے اپنی بڑی بڑی ویران آنکھوں سے دور، نیچے راستے پر گزرتی ہوئی گاؤں کی ماہ جبینوں کی طرف دیکھتا، جو مٹی کی گاگریں کولہوں پر رکھے یا سر پر اٹھائے قطار باندھے گیت گاتی ہوئی آہستہ آہستہ راستے پر سے چلی جاتی تھیں اور جب وہ راستے پر سے گزر جاتیں تب بھی وہ راستے کی طرف دیکھتا رہتا، اس وقت کبالا کو ایسا محسوس ہوتا گویا اُن کے پاؤں کے لمس سے راستے کی مٹی کا ہر ذرہ کندن بن کر دمک رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اس کے دل کے اندھیرے میں ایک سونے کی لکیر سی کھنچ جاتی، اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اونچی آواز میں گائے یہاں تک کہ دور نیچے راہ چلتی ہوئی ماہ جبینوں کے پاؤں ٹھٹک جائیں اور وہ نازک اندام، سروقد نینا، گاؤں کے نمبردار کی لڑکی بھی ایک ہاتھ گاگر پہ رکھے اور دوسرے ہاتھ سے دھوتی کا میلا آنچل منہ میں لئے اس کی طرف تکنے لگ جائے۔ چوٹی کے اوپر چھونے سے نیلے آسمان میں اڑتے ہوئے بادل یکایک ٹھٹھر جائیں اور اس کے پرسوز گیت کو سننے کے لئے اونچے اونچے دیودار [illegible] جھک جائیں ـــــ لیکن جب کبالا اپنے لب کھولتا تو اس کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل جاتی کرخت اور بلند، جسے سن کر آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے نازک مزاج [illegible] پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ جاتے اور کبالا شرمندہ ہو کر اپنے لب زور سے بھینچ لیتا، جیسے اپنے ہونٹوں کو اس نے سوئی کے ٹانکوں سے خود ہی سی دیا ہو۔

کبالا دیکھنے میں تو بہت خوبصورت تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کسی وحشی ہرن کی سی تھیں، اور [illegible] اور جب وہ اخروٹ کے درخت کے نیچے زانو تلے کئی جوتے سنوار رہا ہوتا تو اس کا [illegible] اور مجسم سایہ بالکل کسی دیوتا کی طرح معلوم ہوتا۔ [illegible] کبالا کو دیکھ کر کسی کو یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ آج سے دو سو برس پہلے اسی موچی کے ایک بزرگ نے اس گاؤں کے ایک غریب بودھ سادھو کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا کیونکہ اُسے شک تھا کہ بودھ سادھو اس لڑکی کو ورغلا رہا تھا جس سے کبالا کے بزرگ کو محبت تھی۔ گاؤں میں قتل کی واردات شاید اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی، اور گاؤں کے پنچوں نے بہت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی کی جان کے بدلے جان لینا دھرم نہیں۔ اسلئے انہوں نے کبالا کے بزرگ کو گاؤں سے باہر نکال دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ جب تک اس خاندان کی سات پشتیں اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کرلیں اس خاندان کے کسی فرد کو یہ اجازت نہیں ہوگی کہ وہ گاؤں کے حدود کے اندر داخل ہو سکے۔ اس دن سے لے کر گاؤں کے موچی کی دکان پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع تھی، گرمی ہو یا سردی، دھوپ ہو یا برف، چار پشتوں سے مہندر موچی نے گاؤں میں قدم نہ رکھا تھا وہ بہت سی چیزیں کھینتر کے گاؤں سے لے آتا تھا جو مہندر کے کوہسار کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی وادی میں واقع تھا اور اب تو کھینتر کے گاؤں کے موچی کے خاندان سے مہندر کے موچی کے تعلقات اس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ مہندر کے موچی کا خاندان بودھ پنچوں کی سزا کو قریباً بھول گیا تھا۔

صرف نوجوان کبالا کے دل میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی ٹیس اٹھتی، کیونکہ وہ نوجوان تھا اور اکیلا اور گونگا، اس کے ماں باپ مر چکے تھے اور کھینتر کے موچی کے خاندان کے افراد اس کے گونگا ہونے کی وجہ سے اس سے متنفر تھے۔ اروائی اور رذی شی دونوں بہنیں اس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں کی دلچسپ حرکات کی جن سے وہ اپنی زبان کا کام لیا کرتا تھا نقلیں اتارتی تھیں اور جب ان کے طویل [illegible] میں ان کے تینوں بڑے بھائی بھی شامل ہو جاتے تو گونگے کے دل کا زخم رِس کر بہنے لگتا اور وہ چیخ مار کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

کبالا کا ایک دوست بھی تھا۔ اس کا نام تھا کھنڈا۔ کبالا نے کھنڈا کو ایک دن کھینتر سے واپس آتے ہوئے راستے میں پڑا پایا تھا، وہ بھوک سے بیتاب ہو کر چلا رہا تھا، اس کی ڈائن ماں اسے راستے ہی میں چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کبالا کھنڈا کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا، اس نے اسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا، اور کھنڈا بھی کبالا کو بہت چاہتا تھا۔ کئی بار جب کھنڈا کبالا کو اداس دیکھتا تو شریر نگاہوں سے اس کی طرف تاکتا اور پھر دُم ہلا کر اس طرح بھونکتا گویا کہہ رہا ہو گونگے بھیا کیوں اداس ہو، میری طرف دیکھو، میں بھی تمہاری طرح بات چیت نہیں کر سکتا لیکن کیا میں خوش نہیں ہوں۔ وہ دیکھو، میں بھی تمہاری طرح بات چیت نہیں کرسکتا، لیکن کیا میں خوش نہیں ہوں، وہ دیکھو اس اخروٹ کی ٹہنی پہ کیسی خوبصورت چڑیا بیٹھی ہے، اسے لو وہ اڑ گئی، اور پھر کھنڈا اچھلتے کودتے کبالا کے قدموں کے گرد ناچنے لگتا۔ یہاں تک کہ کبالا کا غم دور ہو جاتا۔ اس کے چہرے پر بشاشت آجاتی اور وہ اپنے پیارے کتے کی پیٹھ کو زور سے تھپک کر اپنے پاس بٹھا لیتا۔ اس وقت اس کی نگاہیں صاف کہہ رہی ہوتیں، کھنڈا بھیا، تم بہت شوخ ہو، شوخ اور پیارے، شوخی تو اروائی اور رذی شی میں بھی ہے لیکن وہ پیاری نہیں ہیں، اور نینا میں شرارت نہیں پر وہ بہت اچھی ہے، کیا تم نینا کو نہیں جانتے؟ وہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کی لڑکی ہے اور اس دن اپنے باپ کے ساتھ یہاں آئی تھی، نہیں جانتے؟ ذلیل کھنڈے، چلو ہٹو یہاں سے۔

اور کھنڈا اکڑ کر کہتا، مجھے نمبردار کی کیا پروا ہے اور میں کوئی نینا وینا نہیں جانتا اور تم مجھے اپنے پاس سے نہیں ہٹا سکتے، میں جنگل کے بھیڑیے کی مانند ہوں مجھ کو کوئی معمولی دیسی کتا نہ سمجھنا، سمجھے؟

جب کبالا نے نینا کو پہلے پہل دیکھا تھا تو اس دن دھند چھائی ہوئی تھی، ایک ہلکی لطیف دھند جو دیودار کے درختوں کو اپنے سفید لبادے میں لپیٹے ہوئے، جنگل کے سبزہ زاروں سے لے کر اوپر آسمان میں پھیلے ہوئے بادلوں تک چھائی ہوئی تھی، ساری فضا میں ایک عجیب سناٹا تھا، نہ ہوا چل رہی تھی، نہ پرندوں کے بول سنائی دیتے تھے، کیونکہ جب دھند آجاتی ہے تو پرندے بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس گونگی دنیا میں کبالا [illegible] واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک چٹان پہ کھڑے ہوئے اس نے دھند کی دیوی کو دیکھا۔ ہاں یہ دھند کی دیوی ہی تو تھی سرو قامت، سر سے پاؤں تک ایک سفید دھوتی میں ملبوس، اس کا چہرہ، کبالا کو ایسا معلوم ہوا گویا شبنم کے قطروں میں دھلا ہوا گلاب کا پھول دھند کی ہلکی اور سپید لہروں میں تیر رہا ہے۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا، اور منہ کھولے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ دھند کی دیوی نے کہا، میں راستہ بھول گئی ہوں، میں نینا ہوں۔ مجھے گاؤں کا راستہ دکھا دو۔

کبالا چند لمحوں کیلئے بُت کی طرح ساکن کھڑا رہا پھر آہستہ سے پیچھے مڑ گیا۔ اس نے نینا کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ دھند گہری ہو رہی تھی لیکن اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اور کبالا سوچ رہا تھا، تم نینا ہو، تم دھند کی دیوی ہو، تم گلاب کا پھول ہو، تم راستہ بھول کر آگئی ہو، راستہ، کبالا نینا کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ نازک چھوٹے سے گلابی پاؤں، اچھا تو وہ چپل کیوں نہیں پہنے ہوئے ہے؟ وہ اس کے لئے ایک ایسا اچھا چپل تیار کرے گا کہ دھند کی دیوی بھی اسے پہن کر خوش ہو جائے، [illegible] اور اس پر باریک نقرئی تاروں کے پھول، خوبصورت اور ملائم جیسے نینا کے پاؤں، اس نے چاہا کہ وہ دیوی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے اور کہے کہ اپنے پجاری کو ان کی پوجا کرنے دو اور پھر یکایک اسے خیال آیا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا اور وہ اس راز عظیم کو اپنے دل کے انتہائی گوشوں میں چھپانے کو تیار ہو گیا۔ اب چلتے چلتے اسے یہ خیال ستانے لگا کہ نینا اس سے کوئی بات نہ پوچھ لے، ایک بات، ایک لفظ اور وہ جان لے گی کہ وہ گونگا ہے، اور قدرت نے اس کی تخلیق کرتے ہوئے ساز حیات میں [illegible] کو ایک بار چھیڑ کر ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا ہے [illegible] اور یہ حسرت شاید پیدا ہونے پر [illegible] ہوا لیکن اب تو غم کی ایک رمق بھی باقی نہ تھی [illegible] موت کی طرح ساکن اور تاریک۔

گاؤں کی حد کے قریب پہنچ کر کبالا [illegible] پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے [illegible] راستے کی طرف اشارہ کیا۔

نینا نے ایک لمحہ کیلئے رک کر پوچھا، تم کون ہو

کہاں سے آئے ہو؟ میں نے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا تم کہاں رہتے ہو؟

کبالا نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا، اور پھر آنکھیں نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد نینا بولی اوہ ۔۔۔ تم ہو کبالا!

کبالا دیر تک گردن جھکائے، بازو لٹکائے کھڑا رہا، اور جب وہ چلنے لگی تو اس نے اپنی بڑی بڑی وحشی ہرن کی سی آنکھوں سے نینا کی طرف دیکھا، وہ کیا کہنا چاہتا تھا، وہ کیا کہہ سکتا تھا، کاش وہ کچھ کہہ سکتا۔

نینا آہستہ سے چلی گئی، جیسے دھند میں اس کی مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھ کر کبالا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

---

جس دن نینا راستہ بھول کر کبالا کے دل میں اتر آئی تھی، اس دن سے کبالا کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا گویا زمین کے سوئے ہوئے سب بھید جاگ اٹھے ہیں، مہندر کے فلک بوس پہاڑوں میں ایک نئی رعنائی و دلکشی آ گئی ہے، اور اس کی روح میں خوشی اور غم کی حدیں سمٹ سمٹا کر ایک دوسرے سے مل گئی ہیں، شاید اگر وہ گونگا نہ ہوتا تو اس کے جذبات کی بلندی کا یہ عالم نہ ہوتا مگر اس کی زبان نینا سے اس کے دل کا مدعا کہہ سکتی تو شاید اس کی وارفتگی کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی، لیکن اب جبکہ اس کے جذبات کے سیل بے کراں نے چاروں طرف قدرت کے گلے شکوے آپ ہی بند دیکھے تو اس کی روح کی تڑپ اور شعریت اس کی بنائی ہوئی چپلوں اور جوتیوں میں منتقل ہو گئی، ان دنوں اس نے چپلوں اور جوتیوں کے ایسے حسین اور نادر نمونے ایجاد کئے کہ ان سے اس کی شہرت دور دراز اطراف تک پھیل گئی، اور لوگ دور دور سے آ کر اس سے جوتے اور چپل بنوانے لگے۔ کھینتر کے لوہار نے اس سے اشاروں ہی اشاروں میں کئی بار کہا کہ اب جبکہ تمہاری دکان چمک اٹھی ہے تمہیں شادی کر لینی چاہئیے، اور اب وہ بغیر کسی عوض کے کبالا کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کو تیار تھا، نہ صرف وہ بلکہ اس کی لڑکی بھی تو اب اسے التفات کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اب ان کی نگاہوں میں شوخی کے ساتھ احترام اور شاید کچھ اور جذبات بھی ملے جلے ہوتے تھے۔ شاید اب وہ دونوں اپنی اپنی جگہ کبالا کو اپنا ہونے والا خاوند سمجھ رہی تھیں، اب انہیں کبالا کی بڑی بڑی آنکھوں میں اور اس کے چہرے کی دلآویز رنگت اور لمبے گٹھیلے جسم میں جرأت و مردانگی اور خوبصورتی کے تمام لوازم دکھائی دیتے تھے جس طرح تالاب میں کنکر کی ایک ہلکی سی ضرب سے بھی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں، اور پھر بڑھتی ہوئی دائرے بناتی ہوئی دور دور تک پھیل جاتی ہیں، اسی طرح کبالا کی محبت نے بھی مہندر کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اور اب لوہار کی لڑکی اور اس کی سہیلیاں کھینتر کو اس بات کا پتہ لگ گیا تھا نینا کی سہیلیوں کو اور شاید گاؤں کے ہر فرد کو۔ جب گاؤں کی دوشیزائیں نینا کو چھیڑتی تھیں تو نینا کو کبالا پر بہت غصہ آتا تھا بیوقوف گونگا، پاگل چمار، نہ جانے وہ اسے کیا کیا کچھ کہہ ڈالتی تھی، اور بے چارے کبالا کو کیا پتہ تھا کہ نینا کا باپ تو ایک عرصہ ہوا نینا کے بیاہ کا معاملہ طے کر چکا تھا اس نے نینا کو تاشی پور کے بودھ سردار کے ساتھ بیاہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے تین ہزار روپے پر فیصلہ ہوا تھا، تاشی پور کا بودھ سردار بڑا ہی کنجوس تھا اور دو ہزار سے زیادہ دینے کا نام نہ لیتا تھا جب نینا کے باپ نے صاف کہہ دیا تھا کہ تاشی پور کے سردار سے اپنی لڑکی بیاہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی چہیتی بیٹی کو ہمیشہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے۔ اور تاشی پور جہنم سے کم نہ تھا۔ اونچے سنگلاخ پہاڑ، دشوار گزار راستے، ہر وقت برف و باراں، تاشی پور بہشت کا جہنم تھا، اور یقیناً اپنی نازک اندام بیٹی تاشی پور کے بودھ سردار سے نہ بیاہیگا، آخر بڑی مشکل سے تین ہزار پر فیصلہ ہوا تھا۔

لیکن کبالا اپنی جگہ خوش تھا، نینا دو بار اپنے باپ کے ہمراہ اس کی دکان پر چپلوں کا ناپ دینے کیلئے آئی تھی نینا کے لئے اس نے سب سے خوبصورت چپل تیار کئے تھے جنہیں دیکھ کر گاؤں کی دوشیزائیں حسد سے جل اٹھی تھیں، نینا کے پاؤں کو جنہیں وہ چھو کر ماسنہ خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ جیسے کبالا کے دل میں یہ خواہش آگ کی طرح بھڑک اٹھی تھی کہ وہ ان دو کنول کے پھولوں کو اٹھا کر اپنے سینہ میں چھپا لے۔ نینا کے باپ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بودھ پجاری کو کہہ کر کبالا کے خاندان کی سزا منسوخ کرانے کی کوشش کریگا۔ اور انہیں جلد ہی کبالا کو اپنے گاؤں میں واپس آنے کی اجازت مل جائیگی، اور پھر نینا کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک اٹھی تھیں، اور اس نے نہایت ملتجیانہ انداز میں اپنے باپ سے درخواست کی تھی کہ وہ ضرور بالضرور کبالا کے خاندان پر عائد کی ہوئی سزا منسوخ کرا دے، ان باتوں کو یاد کر کے وہ جوتیاں بناتے بناتے خود ہی مسکرا پڑتا، ہاں وہ بہت خوش تھا، وہ دن بھر حسین چپل بناتا، کھنڈا کے ساتھ کھیلتا اور صبح و شام اخروٹ کے درخت کے تلے کھڑے ہو کر دور نیچے گھاٹی کے سنہری راستے پر گزرتی ہوئی دوشیزاؤں کی طرف دیکھتا، ان میں نینا بھی ہوتی تھی۔ پیلے آنچل والی نینا۔

---

اور پھر ایک دن گاؤں کے لوہار نے کبالا کو بتایا کہ گاؤں کے نمبردار کی لڑکی نینا کی شادی ایک دو دن میں تاشی پور کے بودھ سردار سے ہونے والی ہے۔ شادی اوانتی پور میں ہوگی، جو مہندر اور تاشی پور کی درمیانی حد پر اونچے برفانی پہاڑوں کی ایک ڈھلوان میں واقع تھا، شادی کے رسوم اوانتی پور کا مقدس بودھ پجاری سرانجام دیگا۔ نینا بڑی خوش قسمت تھی کہ ایک ایسے بڑے سردار کے گھر بیاہی جانے والی تھی جو کسی طرح بھی ایک راجہ سے کم نہ تھا، اور سنا ہے، لوہار نے کہا، کہ نینا کے باپ نے تاشی پور کے سردار سے تین ہزار معاوضہ لیا تھا، اب یہ سزا دینے والے بودھ پجاری کیا سو گئے تھے؟ گاؤں کا لوہار بہت دیر تک اسی طرح کبالا سے باتیں کرتا رہا، اور کبالا سر جھکائے ایک چپل میں سوت کے تاگے لگاتا رہا، اور جب لوہار وہاں سے رخصت ہو گیا، تو نمبردار کا بھیجا ہوا ایک آدمی آ گیا، اور اس نے کبالا سے کہا کہ نمبردار کہتا ہے کہ کبالا سے کہو کہ وہ نینا کے لئے عروسی چپل کل صبح تک تیار کر دے، کیونکہ انہیں کل صبح ہی اوانتی پور جانا ہے، پرسوں نینا کی شادی ہے۔

نینا کی شادی؟ کبالا کے دل میں خیال آیا کہ پہلے تو عروسی چپل بنانے سے انکار کر دے، پھر اس نمبردار کے بھیجے ہوئے آدمی کا گلا گھونٹ ڈالے نمبردار کی جان لے لے اور پھر اسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر نیچے ایک چٹان پر اپنا سر پٹخ دے، لیکن اس نے بڑی مشکل سے آخر اپنے غصہ اور نا امیدی پر قابو پایا اور نمبردار کے نوکر کو اشارہ سے کہا کہ وہ نمبردار کے حکم کی تعمیل کریگا، لیکن اس وقت اس کے پاس نقرئی تاگے نہ تھے، تو وہ انہیں کھینتر سے لائیگا، اور کل صبح تک عروسی چپل ضرور تیار کر دیگا۔

لیکن دوسرے دن جب نمبردار کا آدمی چپل لینے کے لئے آیا، تو کبالا نے ہاتھ جوڑ کر اسے اشاروں میں کہا، کہ عروسی چپل تیار نہیں ہے۔ وہ کھینتر گیا تھا لیکن اسے نقرئی تاگے کہیں سے نہ ملے، اور وہ بے نیل و مرام واپس آ گیا، اسے بہت افسوس تھا کہ عروسی چپل کے تیار نہ ہونے سے شادی میں رخنہ پڑتا تھا لیکن وہ کیا کرے، وہ بالکل لاچار تھا، جب نمبردار کے آدمی نے یہ باتیں اپنے مالک سے کہیں تو وہ بہت سیخ پا ہوا، اس نے بد بخت گونگے کو بے نقط گالیاں سنائیں کمینہ بدمعاش گونگا، وہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا تھا کیا؟ کمینہ، شیطان، کیا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر عروسی چپل نہ ہوگی، تو نینا کی شادی رک جائیگی؟ وہ اس پاجی کو نینا کی شادی سے واپس آنے پر ضرور مزا چکھائیگا وہ ایسا انتظام کریگا کہ مہندر کے لوگ تو کیا آس پاس کے کسی گاؤں سے کوئی آدمی بھی اس کے ناپاک ہاتھوں کا سیا ہوا جوتا نہ پہنیگا، لیکن وہ ذرا اپنی لڑکی کی شادی سے فارغ تو ہو لے ..........

کچھ دیر کے بعد، اسی اخروٹ کے درخت کے تلے کھڑے ہو کر کبالا نے دیکھا، کہ گاؤں کے لوگ اوانتی پور کو جانیوالے راستے کی طرف اکٹھے ہو رہے ہیں، گاؤں کے نمبردار کو اس کے مبارک سفر پر روانہ کرنے کے لئے، پھر کچھ عرصہ کے بعد ڈھول، قرنوں، نغموں اور مقدس منتروں کی آوازوں کے درمیان نمبردار نینا اور اپنے عزیز و اقارب کو لے کر اوانتی پور کی جانب روانہ ہو گیا، کبالا دیر تک کھڑا دیکھتا رہا حتیٰ کہ ساز و سامان سے لدی ہوئی گٹھریں اور قافلے کے لوگ تنگ راستے پر گزرتے ہوئے اگلے موڑ پر غائب ہو گئے، اس کے سینہ سے اک آہ نکلی، اچھا تو یہ اس کی محبت کا انجام تھا، لیکن اسے اس سے بہتر انجام کی امید ہی کیوں ہوئی؟ وہ چپ چاپ سر جھکائے اپنے لکڑی کے گھر کے اندر داخل ہو گیا، کھنڈا اس کے قدموں کے ساتھ لگا آ رہا تھا، کبالا نے غصہ میں آ کر کھنڈا کو ایک دو ٹھوکریں لگائیں، لیکن غریب کھنڈا اچھلا نہیں، بلکہ نیچے مالک کو اداس نگاہوں سے دیکھتا ہوا اس کے قدموں کے ساتھ لگا ہوا اندر آ گیا، کبالا نے کھاٹ پر بیٹھ کر اپنے چہرے کو دونوں بازوؤں میں تھام لیا، اور کھنڈا نے اپنی تھوتھنی اس کے دونوں پاؤں کے بیچ میں رکھ دی، پھر ایک بہت لمبے عرصہ کے بعد کبالا نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کھنڈا کو اٹھا لیا، اور اس کے گلے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، غریب گونگے کا مضحکہ خیز رونا، لیکن یہ دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا، ہاں اب اس کا ضمیر اسے بار بار ملامت کر رہا تھا کہ اس نے نینا کے لئے عروسی چپل کیوں نہ تیار کر دیا، چپل تو اس کے پاس تھا، اور نقرئی تاگے بھی، یہ کیسی کمینہ حرکت تھی آخر اس میں نینا کا کیا قصور تھا، اور اب کیا نینا عروسی چپل پہنے بغیر ہی بیاہی جائیگی، نینا کے پاؤں، کتنی شرم کی بات تھی، لیکن وہ تو اب بھی ایک ایسا عمدہ عروسی چپل تیار کر سکتا تھا کہ جس پر کنول کے پھولوں کا دھوکا ہو، پھر اس نے سوچا، وہ کیوں نہ ابھی عروسی چپل تیار کرنے کیلئے بیٹھ جائے، وہ ساری رات سفر کرتا ہوا اگلی صبح اوانتی پور پہنچ سکتا تھا، اور شادی سے پہلے خود اپنے ہاتھوں سے نینا کے پاؤں میں چپل پہنا سکتا تھا، یہ خیال آتے ہی اس نے چپل بنانے کا تہیہ کر لیا، اور چمڑا صاف کرنے بیٹھ گیا۔

جب کبالا نے چپل کو مکمل کر لیا تو اس وقت مغرب میں شفق کی سرخی بھی باقی نہ رہی تھی، چاروں طرف پہاڑوں پر سیاہ بادل امڈ آئے تھے، اور سائیں سائیں کرتے ہوئے وادی کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے، تب دیکھتے ہی دیکھتے ایک اندھیری رات کی رانی جاگ اٹھی اور اس نے بادلوں کو اپنے گرد پاکر خوشی اور مستی سے ناچنا شروع کیا، اس کے پازیب کی جھنکار ہوا سے بودھ مندر کے سنگلیانی برج اور گاؤں کی منقش چھتوں میں لرزتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور اس کی کلائیوں میں پڑے ہوئے نقرئی کنگن رہ رہ کر کوند جاتے تھے، انہی کی چمک میں گاؤں کے لوہار اور کمہار نے دیکھا کہ اوانتی پور کے پر پیچ اور دشوار گزار راستے پر کبالا سر جھکائے اور بغل میں کچھ دبائے اور کھنڈا کو ساتھ لئے جا رہا ہے۔

---

اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس رات مہندر کی وادی میں ایک ہیبتناک چیختا ہوا طوفان آیا، وہ طوفان جس نے پہاڑ کے بڑے بڑے درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا، نمبردار کے اونچے گھر کا منقش چھت اڑ گئی اور پرانے بودھ مندر کا برج پارہ پارہ ہو گیا، شمالی ہواؤں کے برفانی خزانے چاروں طرف ژالہ باری کرتے گئے۔ اور ایک شدید ہولناک برفباری شروع ہوئی جس نے صبح ہونے تک مہندر، کھینتر اور تاشی پور کے کہساروں کو برف کی ایک سفید گہری چادر سے ڈھانپ دیا، اور دوسرے دن دوپہر کے وقت جب تاشی پور کا بودھ سردار اپنی دلہن کو لے کر تاشی پور روانہ ہوا، اور برات شہنائیاں بجاتی ہوئی اوانتی پور کی درمیانی بلند گھاٹی میں سے گزری تو براتیوں نے دیکھا، کہ گھاٹی میں سفید برف پر دور تک قدموں کے نشان پڑے ہیں اور ایک بڑے سے تنگ درخت کے نیچے ایک بد قسمت راہگیر اکڑا پڑا ہے۔ اس کا کتا اس کے پاؤں میں تھوتھنی دئے ہوئے اکڑ گیا تھا۔ راہگیر کے ہاتھ اس کی چھاتی پر بندھے ہوئے تھے، اور ان کی مضبوط گرفت میں کوئی چیز تھامے ہوئے تھا ۔۔۔۔۔ یہ ایک پیلا کاغذی چمڑے کا بنا ہوا عروسی چپل تھا اور اس پر چاندی کی تاروں سے کنول کے دو خوبصورت سفید پھول کاڑھے ہوئے تھے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

# دار الصحت رجسٹرڈ حکیم مولوی محمد نذیر ایچ پی مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ

## قدرتی تیل

قدرتی تیل رجسٹرڈ کی ایجاد ۱۹۱۳ء میں ہوئی ثلث ہی صدی میں اپنے بیش بہا فوائد کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہو گیا ہے چنانچہ معزز ہندوستانی حکما۔ ڈاکٹر اور وید صاحبان کے علاوہ ولایت کے کئی ڈاکٹروں نے بھی سرٹیفکیٹ دیئے ہیں اور اکثر اپنے مطب میں برتتے اور خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ تیل جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے ہر قسم کے درد میں اکسیر ہے اور فوری فائدہ دکھاتا ہے۔ بدن پر مالش کر کے نہانا خراب پانی کے نقصان اور موسمی بخار۔ سردی و زکام سے محفوظ رکھتا ہے اور بدن کو چست اور قوی بناتا ہے سر پر مالش کرنے سے بالوں کی سیاہی قائم رہتی ہے۔ بال نرم اور چمکدار ہو جاتے ہیں اور قبل از وقت سفید نہیں ہوتے نزلہ۔ زکام۔ ترکھانسی۔ سر آنکھ۔ کان۔ دانت۔ کمر سینہ کے درد آشوب چشم۔ دانت میں پانی لگنے۔ فالج۔ لقوہ۔ گٹھیا۔ ورم جگر۔ ذات الجنب۔ نمونیہ۔ ملیریا۔ لرزہ بخار۔ طاعونی گلٹی۔ ہیضہ۔ مرگی۔ زہریلے جانوروں کے ڈنک مارنے۔ ورم چوٹ۔ خراش۔ آگ سے جلنے۔ مستورات کے وضع حمل اور کمزور بچوں کے واسطے تریاق ہے۔

---

ہمارا قدرتی تیل رجسٹرڈ ہے اس لئے حریص۔ نقال قدرتی تیل کا نام تو اپنے اشتہار میں لکھ نہیں سکتے مگر ہر ممکن طریقہ سے پبلک کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارا ہی مال بہتر ہے۔ لہذا معزز پبلک سے درخواست ہے کہ قدرتی تیل کی خریداری میں بہت احتیاط سے کام لے اور جس قدرتی تیل کی ضرورت ہو براہ راست کارخانہ ہذا سے طلب کرے تاکہ دھوکہ سے محفوظ رہے۔

---

نوٹ:۔ ایک پاؤ سے کم قدرتی تیل رجسٹرڈ پارسل نہیں ہوگا۔ قدرتی تیل مختلف شیشیوں میں پیک بھی ملتا ہے۔ قیمت فی سیر چار روپیہ علاوہ پیکنگ محصولڈاک وغیرہ۔

**روغن بہار رجسٹرڈ** جسمانی صحت کا دارومدار دماغی صحت پر ہے۔ کامیاب زندگی اور کام کو پوری توجہ سے کرنے کے لئے دماغی سکون کی نہایت ضرورت ہے اور دماغی سکون حاصل کرنے کیواسطے حکیموں اور ڈاکٹروں کا قول ہے کہ مقوی دماغ و مفرح طبع اور خوشبودار تیل استعمال کیا جائے چنانچہ آجکل مختلف قسم کے خوشبودار تیل رائج ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کے استعمال سے فائدہ نہیں ہوتا جو دماغ کے لئے ضروری ہے۔ روغن بہار جو ان تمام خوبیوں کا جامع ہے جن کی بالوں کو ضرورت ہے اور تمام مضر اجزا سے پاک ہے۔ خالص سفید تل کے تیل سے تیار کیا جاتا ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس میں آمیزش ثابت کرنے والے کو ایک سو روپیہ نقد انعام ملے گا۔ اس کے مستقل استعمال سے ہمیشہ کیواسطے امراض دماغی سے نجات ہو جاتی ہے۔ دماغی کام کرنے والے معزز حضرات اور خواتین کے لئے ایک بیش بہا اور نادر تحفہ ہے۔ بالوں کے بڑھانے میں لاجواب ہے اس کے قدرتی رنگ کو قائم رکھتا ہے۔ ملائم خوبصورت اور چمکدار رہتا ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ قیمت فی سیر چھ روپے علاوہ محصولڈاک وغیرہ۔

## معجون بےنظیر رجسٹرڈ — موسم سرما کا بےنظیر تحفہ

ہندوستان کی شدید گرمی سے صحت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کا بہترین موقع موسم سرما آگیا ہے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے جسمانی خرابیوں کو دور کرنے کیلئے دار الصحت رجسٹرڈ مئوناتھ بھنجن کا تیار کردہ معجون بےنظیر رجسٹرڈ استعمال فرمائیے۔ جو صبح کا خوشگوار اور لذیذ ناشتہ بھی ہے۔ اور دوا کی دوا۔ یہ معجون سالہا سال تک ہزاروں آدمیوں پر تجربہ کرنیکے بعد ۱۵ برس سے پبلک میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کا مقوی اعصاب اور مقوی باہ ہے جملہ اعضائے رئیسہ کو قوت دیتا ہے خون صالح پیدا کرتا ہے اور جسم کے وزن کو بڑھاتا ہے۔ حرارت غریزی کی حفاظت کرتا ہے اور عام جسمانی کمزوری و لاغری کو دور کر کے جسم کو فربہ اور چہرہ کی رنگت کو نکھارتا ہے۔ دل و دماغ میں عجیب فرحت اور قوت پیدا کرتا ہے طبیعت ہر وقت بشاش رہتی ہے اس معجون میں ایسے اجزا شامل کئے گئے ہیں جو قبض کو دور کر کے معدہ کو قوت دیتا ہے۔ جس سے ہاضمہ درست ہو جاتا ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ تجربہ کیجیے آپ خود ہی اسکے فوائد کی تصدیق فرمائینگے۔

نوٹ:۔ آدھ سیر سے کم نہیں روانہ ہوگا۔

ملنے کا پتہ

**منیجر دار الصحت رجسٹرڈ مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ**

# چاند سلطانہ کے تعمیرات جدید روشنی میں

## گلبرگہ کا گنبد ہیرا پور کی مسجد بارہ دری اور کنواں کیا اسی کے بنوائے ہوئے آثار ہیں؟

از جناب احمد اللہ صاحب قادری
(ایم۔ اے۔ ایس (لندن))

احمد نگر کی مشہور، مدبر، سیاس۔ ہر دلعزیز اولوالعزم اور بہادر ملکہ چاند سلطانہ (وفات یکم محرم سنہ ۱۰۰۸ھ) کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے اور اس کے کارنامہوں اور حالات سے صفحات تاریخ مشمون و مملو نظر آتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر (جلوس سنہ ۹۶۳ھ وفات سنہ ۱۰۱۴ھ) کے جلیل القدر بیٹوں (مراد وفات سنہ ۱۰۰۸ھ) اور دانیال (وفات سنہ ۱۰۱۳ھ) سے جنگ کرنے کے باعث اسے لازوال شہرت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ پہلی سلمان، ایرانی نژاد، ہندوستانی خاتون ہے جو ہر طرح سراہے جانے کی مستحق ہے اس نے دور اختلال میں احمد نگر کی شیرازہ بندی کی اور کمال دانشمندی سے ملک کو امراء کی سازشوں کا شکار نہ ہونے دیا۔ اور اسے ترقی کے بلند زینہ پر پہنچا دیا۔ اگر اس سلطنت کی باگ ڈور اس زمانہ میں کسی جہاندیدہ اور باتدبیر بادشاہ کے ہاتھ میں بھی ہوتی تو اس سے یہ توقع رکھنی عبث تھی کہ وہ ایسا اعلیٰ قسم کا انتظام کرتا جیسا کہ اس کے عہد میں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بڑی مفکر۔ زمانہ شناس اور بیدار مغز ملکہ تھی جس نے احمد نگر کے اقتدار اعلیٰ کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا اور ضعیف ملک کے مُردہ قالب میں جان ڈالدی جو امراء کی باہمی خانہ جنگیوں کا جولانگاہ بنا ہوا تھا اور اس وقت اس سلطنت کی کیفیت بعینہ اس کشتی کی تھی جو عین منجدھار میں بادوباراں کے طوفان میں گھر جاتی ہے۔

---

چاند سلطانہ سے تقریباً پونے چار سو سال پیشتر شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ (جلوس سنہ ۶۳۴ھ وفات سنہ ۶۳۸ھ) تخت دہلی پر متمکن ہوئی مگر یہ امر واقعہ ہے کہ وسط ہند کی بادشاہ زادی (چاند سلطانہ) کی اولوالعزمی بہادری اور جانبازی کو ہند شمالی کی شہنشاہ زادی (رضیہ سلطانہ) نہ پہنچ سکی۔ چاند سلطانہ کی خدمات ہر حیثیت سے اہم اور قابل ترجیح ہیں۔

ہم نے اب سے تقریباً نو سال پہلے سنہ ۱۹۳۳ء میں رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی فرمائش پر اس کی سوانح کتابی صورت میں لکھ کر شایع کرلئے تھے۔ ابھی حال ہی میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی ترمیم و اضافہ کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ انگریزی ایڈیشن میں ہم نے ایک نہایت دلچسپ بحث اس کی تعمیرات سے کی ہے اور اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ جو عمارات چاند سلطانہ کے نام سے موسوم ہیں دراصل کیا وہ خود اسی کی بنائی ہوئی ہیں یا مورخین نے ناواقفیت کے باعث اسے چاند سلطانہ سے متعلق کر دیا ہے؟

ذیل میں ہم اپنی کتاب MEMOIR OF CHAND BIBI کے انیسویں باب کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو چاند سلطانہ کی تعمیرات کے بارے میں ہے۔

حیدر آباد کے سررشتہ آثار قدیمہ ARCHAOLOGICAL DEPARTMENT, نے اپنے ضمیمہ رپورٹ میں جو سررشتہ کی سنہ ۱۳۲۱ف و سنہ ۱۹۲۲ء کی کارگزاری کی بابت ہے۔ لکھا ہے کہ گلبرگہ کا وہ گنبد جو درگاہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے جنوب مشرقی گوشہ میں واقع ہے اسے چاند سلطانہ نے اپنے دفن ہونے کی غرض سے بنوایا تھا۔ رپورٹ کی اصل عبارت یہ ہے۔

"درگاہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے جنوب مشرقی گوشہ میں چاند بی بی زوجہ علی عادل شاہ کا گنبد ہے جسے اس نے اپنی مدفن کی غرض سے بنوایا تھا۔ لیکن اس کا مزار احمد نگر میں واقع ہے۔ اس گنبد کے مینار و ستون صفا سنگ خارا اور گچ سے بنائے گئے ہیں بلحاظ صنعت تعمیریہ گلبرگہ کے اور گنبدوں سے زیادہ حسین ہے" (رپورٹ سررشتہ آثار قدیمہ صفحہ ۱۹)

---

گلبرگہ سے قریب "ہیرا پور" نام ایک قصبہ ہے اس میں ایک خوبصورت مسجد اور اس کے قریب ایک کنواں اور ویران باغ کے آثار ہیں۔ مسٹر غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد دکن نے جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں ان آثار کا معاینہ کیا تھا۔ ان کی رائے میں یہ مسجد، کنواں اور باغ چاند سلطانہ کے بنوائے ہوئے ہیں اور ان کی نسبت سررشتہ آثار قدیمہ کی سالانہ رپورٹ بابت سنہ ۱۳۴۲ف ۱۹۳۳ء میں جو حاشیہ لکھا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"ناظم صاحب جب بسلسلہ دورہ گلبرگہ گئے تو انھوں نے ہیرا پور کی مسجد کا بھی معاینہ کیا۔ اس مسجد کو چاند بی بی نے سنہ ۹۹۴ھ (سنہ ۱۵۸۹ء) میں بنوایا تھا جب کہ ابراہیم عادل شاہ کی "کوئین ریجنٹ" تھی زیر بحث مسجد اسلامی فن تعمیر کا قابل قدر نمونہ ہے۔ اس مسجد کے احاطہ میں ایک باغ اور ایک کنواں بھی واقع ہے۔ لیکن باغ تباہ و برباد حالت میں موجود ہے اور کنویں پر ایک کتبہ نصب ہے جو مجلہ کتبات اسلامیہ ہند کے آٹھویں نمبر بابت سنہ ۱۹۰۷ء میں شایع ہوا ہے۔"

مندرجہ بالا بیان میں جس کتبہ کا حوالہ درج ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔

"حضرت نواب کامیاب گردوں اقتدار ہمایوں ارفع اقدس اعلیٰ ابراہیم عادل شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ توجہ بزیارت قطب الاقطاب شہباز سرافراز مخدوم سید محمد حسین گیسو دراز قدس سرہ فرمودہ من ثالث شہر محرم الحرام سنہ ۹۸۹ھ مع عساکر مظفر و منصور دریں بقعہ منزل فرمودند و حضرت علیا زمان مخدومہ جہان والدہ نواب فلک اقتدار وسعت شعار و ہدایت آثار نظر فرمودند۔ چشمہ آب و باغ باشجار اثمار بنا فرمودند در تاریخ از شہر محرم الحرام شہور سنہ ۹۹۴ھ من الہجرت النبویہ علیہ السلام۔ یارب ایں آثار درگاہ را الیٰ یوم القیام بحرمت النبی علیہ السلام نگاہ دار دبمنہ وکرمہ امین۔"

اس کتبہ کو میجر ہیگ نے کتبات ہند اسلامیہ میں شایع کیا ہے اور اس کی حسب ذیل تصریح کی ہے۔

"کتبہ سے پایا جاتا ہے کہ سلطنت بیجاپور کا اقتدار اعلیٰ چاند بی بی کے ہاتھ میں تھا۔ مخدومۂ جہاں کے نام سے یہ ملقب تھی۔ نوعمر شہزادے سلطان ابراہیم عادل شاہ کی ماں تھی۔ مگر درحقیقت چاند بی بی سلطان ابراہیم عادل شاہ کی ماں نہ تھی بلکہ اس کی چچی تھی اور خود بادشاہت کرتی تھی اور سلطان کو اپنا فرزند (متبنیٰ) سمجھتی تھی۔"

"مخدومۂ جہاں" اور "والدہ" کے الفاظ دکن کی تحریروں میں صرف بادشاہ کی خاص والدہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ کتبہ میں نام کے بجائے "مخدومہ جہاں والدہ" کے القاب مذکور ہیں لیکن چاند سلطانہ سلطان ابراہیم عادل شاہ (جلوس سنہ ۹۸۸ھ وفات سنہ ۱۰۳۵ھ) کی والدہ نہیں بلکہ چچی تھی اس لئے میجر ہیگ نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے۔

"چاند بی بی کوئین ریجنٹ تھی، اور اس حیثیت سے اُس نے ابراہیم عادل شاہ کو اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا۔ اس لئے "مخدومہ جہاں والدہ" کے القاب اس کے لئے کتبہ میں استعمال ہوئے ہیں۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد اور اس کے ملحقہ کنوئیں اور ویران باغ کو چاند سلطانہ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اور ان عمارات کو چاند سلطانہ کی تعمیر قرار دینے میں مسٹر غلام یزدانی اور ان کے پیشرو مسٹر ہیگ دونوں سے فاش غلطی ہو گئی ہے۔

سنہ ۹۹۱ھ میں دلاور خاں وکیل سلطنت بیجاپور نے چاند سلطانہ کو سلطنت کی نیابت سے معزول کر کے امورِ ملکی و مالی سے بے دخل کر دیا تھا۔

"در [illegible] چاند بی بی سلطان [illegible] ملیہ والی کوتاہ کردہ نوعے بود کہ ہیچ کس باو رجوع نداشتہ باشد" (تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۵۶)

سنہ ۹۹۱ھ میں ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطان شاہزادہ میران حسین بن سلطان مرتضیٰ نظام شاہ سے منسوب ہوئی اور ابراہیم عادل شاہ نے اس کو بیجاپور سے جانب احمد نگر روانہ کیا تو اس کے ساتھ چاند سلطانہ بھی اپنے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ والی احمد نگر سے ملنے کے لئے بیجاپور سے احمد نگر چلی گئی اور اس کے بعد وہ پھر بیجاپور واپس نہیں آئی۔

"در سنہ اثنیٰ وتسعین وتسعمائہ مرتضیٰ نظام شاہ مکتوب مصادقت اسلوب بپادشاہ عدالت پناہ فرستادہ۔ اظہار مواصلت نمود وہمشیرہ عیانی آنحضرت مسماۃ بی بی خدیجہ سلطان المشہور براجہ بیورا برائے پسر خود میران حسین خواستگاری کردہ۔ درہماں سال قاسم بیگ حکیم ولد قاسم بیگ بزرگ ومرزا محمد تقی نظیری وودیگر اشراف داعیان احمد نگر با چہار صد نفراز مردم خاصہ خیل نظام شاہی در کمال تجمل جہت التوا، عقد [illegible] بردن عروس بہ بیجاپور آمدند وبعد از چہار ماہ از طرفین جشنہا وطوہائے بزرگ بوقوع پیوستہ باتمام رسید۔ بی بی خدیجہ را بقاضی شریعت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام صیغہ عقد ازدواج شہزادہ میران حسین گفتہ۔ بالکی آں مخدرہ را ہمراہ چاند بی بی سلطان کہ میل ملاقات برادر خود داشت بجانب احمد نگر روانہ ساختند"

(تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۵۶)

سنہ ۹۹۳ھ میں چاند سلطانہ کے بیجاپور سے احمد نگر واپس آنے کے بعد قلعہ شولاپور کے لئے جو چاند سلطانہ کا جہیزی قلعہ تھا مرتضیٰ نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ کے مابین مناقشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس واقعہ کو مشہور مورخ حکیم محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اس طرح لکھا ہے۔

"درسنہ اثنیٰ وتسعین وتسعمائہ صلابت خاں بموجب فرمان نظام شاہ قاسم بیگ ومرزا محمد تقی نظیری را باجمعی از مردم معتبر بہ بیجاپور فرستاد تا خواہر عادل شاہ را جہت شہزادہ میران حسین خواستگاری نمایند ............ قاسم بیگ ومیرزا محمد تقی خواہر عادل شاہ را با میران حسین عقد بستہ باحمد نگر آوردند ......... درآں زماں چاند بی بی زوجہ علی عادل شاہ نیز جہت دیدن برادر خود نظام شاہ باحمد نگر آمدہ بملاقات وے فائض گردید۔ صلابت خاں بدلاور خاں وکیل السلطنۃ عادل شاہ پیغام کرد کہ چوں نظام شاہ کہ قلعہ شولاپور را در جہیز چاند بی بی دادہ بود اکنوں عادل شاہ فوت شدہ و چاند بوی بیوہ گشتہ باایں طرف آمدہ باید کہ آں قلعہ تسلیم گماشتگان نظام شاہ نمایند دلاور خاں قبول آں امر نا کردہ صلابت خاں را اظہار رنجش نمودہ خواہر عادل شاہ را مع شہزادہ میران حسین بہ دولت آباد فرستاد کہ ہرگاہ عادل شاہ قلعہ شولاپور بدہد جشن وطوی کردہ عروس را بخانہ شہزادہ سپارند والا معطل وموقوف باشد"

(تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۴۴)

مورخ فرشتہ کی مختلف تصریحات سے جن کے اقتباس اوپر درج کئے جا چکے ہیں ثابت ہو رہا ہے کہ چاند سلطانہ سنہ ۹۹۱ھ میں امور سلطنت سے بےدخل کر دی گئی اور اس کے ایک سال بعد سنہ ۹۹۱ھ میں اس نے بیجاپور کو چھوڑ دیا تھا اور احمد نگر میں اپنے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس مقیم ہو گئی تھی اور اس کے احمد نگر واپس آنے کی وجہ سے اس کے جہیزی قلعہ شولاپور کی واپسی کا مرتضیٰ نظام شاہ نے مطالبہ کیا تھا اور اس بنا پر دونوں بادشاہوں میں مخالفت ہو گئی تھی۔ ایسی حالت میں سنہ ۹۹۴ھ میں چاند سلطانہ کو "ریجنٹ کوئین" سمجھنا واقعہ کے خلاف اور اسی سال سنہ ۹۹۴ھ میں مسجد اور اس کی ملحقہ عمارات کی تعمیر کا اس سے منسوب کرنا صریح غلطی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسجد۔ کنواں اور ربلع ابراہیم عادل شاہ کی حقیقی والدہ کے تعمیر کرائے ہوئے ہیں۔ تاریخوں میں اس بیگم کا نام "بڑی صاحبہ" آیا ہے۔ اور مورخین نے اس کا علیا حضرت والدہ صاحبہ کے لقب سے ذکر کیا ہے۔ یہ بڑی زیرک اور ہوشیار عورت تھی۔ امرائے دربار مہمات سلطنت میں اس سے اکثر مشورہ لیا کرتے تھے۔

"ازوسے درخدمت سلطان ابراہیم درخزانہ عامرہ درآمد۔ صندوق ہائے آلات مرصع کشادہ پارہ زیور وآلات مرصع جہت پیرایہ علیا حضرت بڑی صاحبہ والدہ سلطان ابراہیم وخادمان آنحضرت درطبق نہادہ ہمراہ سلطان در اندرون حرم سرا فرستاد"

(بساتین السلاطین صفحہ ۱۹۵)

"خدمتگاران وغلامان خاص بادشاہ ودایگان وکنیزان خدمت بادشاہ وخدمت علیا حضرت والدہ بادشاہ ہمہ آوردہ خویش مقرر کردہ"

(بساتین السلاطین صفحہ ۱۸۹)

"میرزا ال معتمد سخن فہم بلند ادراک درخدمت مہد علیا حضرت والدہ عادل شاہ فرستادہ"

(بساتین السلاطین صفحہ ۹۶)

چونکہ سلطان ابراہیم عادل شاہ کی والدہ کو حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز سے بے حد عقیدت تھی اس لئے اُس نے حضرت کے گنبد کے جنوب مغربی حصے میں ازراہ عقیدت اپنے لئے مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ جو چاند سلطانہ کے گنبد کے نام سے غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے۔

امید کہ مسٹر غلام یزدانی اپنی زیرِ ترتیب رپورٹ سررشتہ میں ان بیانات کی تردید فرما دیں گے جو چاند سلطانہ کی تعمیرات کے بارے میں اُن سے سہواً ہو گئی ہیں۔

# برساتِ کی ایک رنگین شام

از جناب طفیل احمد خاں صاحب سلطانپوری

تمہیں بھی یاد ہے وہ شامِ رنگیں | فضا پر جب دُھندلکا چھا رہا تھا
سماں بارش کی چھینٹوں سے نکھر کر | حسیں شادابیاں برسا رہا تھا
ہوائے سرد کا ہر ایک جھونکا | فضا میں لڑکھڑاتا جا رہا تھا
فضا انگڑائیاں سی لے رہی تھی | مناظر پر نشہ سا چھا رہا تھا
اُفق پر اُودے اُودے بادلوں میں | حسیں بجلیوں کا دل مُدلا رہا تھا

فلک پر غول آوارہ بطوں کا
نظر سے دُور ہوتا جا رہا تھا

وہ رنگیں شام جس کے سائے میں تم! | حسیں پریوں کو بھی شرما رہی تھیں
تمہاری چشم میگوں کی بہاریں | فضائے شام کو بہکا رہی تھیں
حسیں راہوں پہ ہم تم چل رہے تھے | فضا میں ہوش کھوتی جا رہی تھیں
حسیں رُخسار پر زلفیں بہک کر | دلِ معصوم کو بہکا رہی تھیں
صبا جیسے کلی کو چھیڑ دے یوں | مری باتوں پہ تم جھنجھلا رہی تھیں
سمٹ کر مستیاں میگوں شفق کی | تمہاری انکھڑیوں میں آ رہی تھیں

کسی "مہتاب رُخ" دیوی کی مانند
فضائے شام پر تم چھا رہی تھیں

دردناک افسانہ

# موت کا راگ

از جناب
منیر ادیب
بی اے آنرز



## ۱

مجھے معلوم نہیں میں کتنی دیر تک سویا رہا۔ مگر جیسے ہی میری آنکھ کھلی سب سے پہلی چیز جس پر میری نگاہ پڑی وہ پلنگ کے قریب ایک مختصر اور لرزتا ہوا اغبار سا تھا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ مکڑی کا جالا ہے۔ جس کے ایک گوشے میں مکڑی تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہے۔ جالے کے بیچ اور ایک مکھی کے ننھے ننھے پر لہرا رہے تھے۔ میں اس منظر کو بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھنے لگا۔ مکھی زمین تک وہاں اٹکی رہی اور پھر کمرے کی فضا میں روپوش ہوگئی۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ اب مکھی وہاں نہیں آئے گی جالے سے نگاہیں ہٹا لیں۔ اور جب ایک قلیل وقفہ کے بعد دوبارہ ادھر دیکھا۔ تو وہی مکھی جالے کے قریب اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ چند لمحے یہ منظر رہا اور پھر نیا تماشا ہوگیا۔ تیسری بار بھی یہی ہوا۔ اب کے مکھی جالے کے بالکل قریب تھی۔ یکایک اس کے پر جالے میں پھڑ پھڑانے لگے اور دوسرے لمحہ میں ننھا منا پیکر جالے میں گرفتار تھا۔

میں سوچنے لگا۔ آخر اس ننھی جان کو کیا خیال آیا کہ کمرے کی اتنی وسیع فضا کو چھوڑ کر بار بار جالے کے قریب آئی اور آخر موت کے پنجے میں گرفتار ہوگئی۔ مکھی جانتی تھی کہ جالے میں موت ہے پھر کون سی چیز اسے کھینچ لائی۔ ایک خیال ایک وہم اس کے سوا اس کی موت کی اور کیا وجہ ہوسکتی تھی جالا آکر اس کے پاس نہیں گیا۔ وہ خود ہی کشاں کشاں اپنی موت کی طرف آئی۔ کافی دیر تک اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے اور مکھی کی اس افسوسناک کمزوری پر میں غور کرتا رہا اس کے بعد پلنگ سے اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا یہ کمرہ میرے لئے بالکل نیا تھا کیونکہ اول تو میں پہلے کبھی یہاں نہیں آیا تھا اور اب آیا تھا تو مسلسل ایک ماہ سے صاحب فراش تھا۔

میرا یہاں آنا بالکل اتفاقی امر تھا۔ ایک ماہ قبل میں جالندھر کی ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک چھوٹے سے مکان میں پڑا کراہ رہا تھا۔ چچی جان کو میری حالت کی اطلاع ہوئی اور وہ مجھے باصرار یہاں لے آئیں۔ ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ وہ رشتہ داروں ہی کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتی تھیں اور حقیقی اولاد کی طرح ان کی پرورش کرتی تھیں۔ چچا صاحب کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا اور چچی جان ان کی وفات سے لے کر اب تک اسی حویلی میں زندگی کے دن گزار رہی تھیں۔ چونکہ اس زمانہ میں حویلی آباد مقام پر تھی اس لئے چچی صاحبہ کے یہاں کوئی نہ کوئی مہمان ہر وقت رہتا تھا۔ جن ایام کا میں ذکر کر رہا ہوں حویلی میں میں اور میرے دوسرے چچا مہمان تھے۔

مرحوم چچا کو فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی وہ تمام عمر فنون لطیفہ کے نادر نمونوں کی فراہمی میں بے دریغ روپیہ صرف کرتے رہے۔ چنانچہ اس کمرے کی ہر چیز اس قابل تھی کہ انسان اسے گھنٹوں دیکھتا رہے۔

تصویروں کے انتخاب میں تو مرحوم چچا نے کمال حسن ذوق کا ثبوت دیا تھا۔ قریباً قریباً دنیا کے تمام شہرۂ آفاق مصوروں کی مصورانہ معجز طرازیاں نگاہوں کے سامنے ایک دنیائے طلسم پیش کر رہی تھیں۔ میں کئی منٹ تک تصویروں کو دیکھتا رہا۔ پھر کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

سورج طلوع ہو چکا تھا مگر ابھی ندی کے پار فضا میں کہر کی ہلکی سی چادر چھائی ہوئی تھی۔ سامنے کے کارخانے سے "بھک بھک" دھواں نکل رہا تھا۔ کارخانے کے پہلو میں ایک چھکڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ندی ایک سفید ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی دور جا کر افق کی نیلگوں میں غائب ہوگئی تھی۔ پل کے قریب سفید سفید بطخیں آسمان پر لہراتے ہوئے بادلوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ فضا میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک بیخودی سی لہرا رہی ہے ـــــ ایک فسوں سا چھایا ہوا ہے۔

پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی سی لڑکی ہاتھ بڑھائے بھاگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی مسلسل جنبش ظاہر کر رہی تھی کہ وہ رنگین تیتری کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے اور شریر تیتری اسے بار بار دھوکا دے رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے لڑکی ندی کے پل پر پہنچ گئی یہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گئی اس نے اپنے زندہ کھلونے کو پکڑ لیا تھا اور اب اسے چہرے کے قریب لا کر اس کے مختلف دلآویز رنگوں کا جائزہ لینے کی سعی کر رہی تھی۔ میں اسی منظر کو دیکھنے میں محو تھا کہ پاس سے آواز آئی "تسلیم!" میں نے مڑ کر دیکھا چچی صاحبہ بڑی شفقت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"اب تو تم بالکل تندرست نظر آرہے ہو۔"

"جی ہاں! میری طبیعت میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔"

"جبھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے ہو۔"

"میں شام کو باہر سیر کرنے بھی جاؤں گا۔" میں نے اپنی آرزو کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"خوب خوب" یہ کہہ کر چچی جان نے میری پیشانی چوم لی اور دروازے سے باہر نکل گئیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ لڑکی ایک شکستہ مکان کے دامن میں غائب ہو رہی تھی۔

سورج بلند ہو رہا تھا۔

## ۲

دوسرے دن آنکھ کھولتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ اب مجھے کامل صحت ہوگئی ہے۔ وہ تھکاوٹ اور اضمحلال جو طویل علالت کا نتیجہ ہوتا ہے اور جو ایک دن پیشتر میری رگ رگ پر چھایا ہوا تھا اب نام کو بھی نہیں تھا بلکہ اس کی بجائے ایک مسرت سی ایک جوش سا دل و دماغ میں موجزن تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سماں نہایت پر لطف تھا میں حویلی سے نکل کر ندی کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا مگر شفق کا عکس سطح آب پر مچل رہا تھا۔ کارخانے کی "بھک بھک" فضا میں گونج رہی تھی۔ میں پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہی ننھی لڑکی جسے کل میں نے تیتری کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب چشمے میں دونوں پاؤں ڈالے ہاتھوں سے پانی اچھال اچھال کر گنگنا رہی تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی وہ ذرا ٹھٹکی اور اپنی نگاہیں شرما کر نیچے جھکا لیں۔

"کیا کر رہی ہے تو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں کھیل رہی ہوں۔"

"کھیل رہی ہو؟ خوب، اس طرح پانی اچھال اچھال کر کھیلا جاتا ہے۔"

لڑکی کے ہاتھ رک گئے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ـــ!" وہ اپنی ٹانگیں زور زور سے ہلانے لگی۔ "میرا نام زرینہ ہے۔"

"اور رہتی کہاں ہو؟"

"وہ سامنے ـــــ حویلی کے پاس چھوٹا سا مکان ہے نا ـــ میں اس میں رہتی ہوں۔"

"گویا تم میری ہمسائی ہو۔"

لڑکی نے استفسار انگیز نظروں سے مجھے دیکھا

"میں حویلی میں رہتا ہوں اس لئے تم میری ہمسائی ہو۔"

"آپ حویلی میں رہتے ہیں ـــ مگر وہاں تو اماں جی رہتی ہیں۔"

"اماں جی میری چچی ہیں"۔

"آپ کی چچی ---؟" یہ الفاظ اس نے ایسے لہجے میں کہے جو بیک وقت احترام اور تعجب میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"یہ پر تو نے کہاں سے لئے"۔

"مجھے پرندوں کے پروں سے بڑی محبت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمام دنیا کے پر لے لوں اور انہیں سنبھال سنبھال کر رکھوں"۔

"پروں کے علاوہ تمہیں تیتریوں سے بھی محبت ہے --- ہے نا؟"

"تیتریوں سے ---- وہ تو ---" زرینہ ہنس پڑی اور ایک پر پکڑ کر اسے اپنے منہ اور ناک سے لگانے لگی۔

"یہ میرے پاس بھی ہیں"۔

"اچھا کتنے؟" لڑکی نے اشتیاق انگیز لہجہ میں پوچھا۔

"بے شمار ---- میں شکار کھیلا کرتا ہوں اس وجہ سے"۔

"وہ پر بڑے خوبصورت ہونگے۔ میری اماں جان نے کہا تھا اب کے تمہارے ہاں آؤں گی تو تمہارے لئے کئی پر لاؤں گی۔ مگر وہ ایک پر بھی نہیں لائیں"۔

"میں ہوسٹل آیا ہوں"۔

"تو آپ ---!"

"میں تمہیں تمام پر دے دونگا۔ تم کل حویلی میں آجانا"۔

"بہت اچھا ---- کل صبح سویرے۔ آپ شمو سے کہہ دیں کہ مجھے اندر آنے سے نہ روکے۔ ایک دن مجھے اس نے حویلی کے اندر آنے نہیں دیا تھا" لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم ضرور آنا۔ شمو سے کہہ دونگا"۔

"اچھا، بہت اچھا" یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔

اس دن سیر کے بعد جب میں حویلی میں آیا تو میری طبیعت بہت بشاش تھی۔

## ۳

میں غسل کر کے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا کہ شمو زرینہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی ---- کہنے لگا۔

"کیوں بابو جی! آپ نے اسے صبح سویرے یہاں آنے کو کہا تھا؟"

"کس کو بھئی ---- کون آیا ہے؟"

"یہ شریر لڑکی"۔

اب میں نے دیکھا کہ زرینہ دروازے کے پاس کھڑی شرما رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے زبان باہر نکالی اور پھر آنکھیں فرش پر گاڑ کر ایک سرخ رنگ کا پر جو اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اپنے دائیں رخسار پر پھیرنے لگی۔

"آجاؤ زرینہ! ڈرنے کی کیا بات ہے"۔

زرینہ شرماتی ہوئی آگے آگئی۔

"کس نے روکا تھا تمہیں؟"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"روکنا تو تھا ہی۔ صبح سویرے ہی یہاں آگئی"۔ نوکر نے کہا۔

"میں نے ہی تو اسے آنے کیلئے کہا تھا شمو"۔

"لیکن اتنے سویرے ---- خدا کی پناہ"۔

"اس نے مجھے تھپڑ بھی مارا ہے"۔ زرینہ بولی۔

"اوہ! بڑا پاجی ہے تو"۔ میں نے شمو سے کہا اور وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد زرینہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی پلکیں ابھی تک اشک آلود تھیں۔

"رو پڑی تھیں تم زرینہ؟"

"ہاں اس نے بڑے زور سے تھپڑ مارا تھا۔ اور کہتا تھا کچا چبا جاؤں گا"۔

"بہت برا آدمی ہے۔ آئندہ تم بے خوف و خطر آیا کرو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"پر ہے۔ دیکھو کتنا پیارا ہے۔ آپ اس سے بھی زیادہ خوبصورت پر دیں گے نا؟"

"کیوں نہیں۔ وہ سامنے کالے ٹرنک میں پر رکھے ہوئے ہیں"۔

"تو کھولو اسے"۔

میں نے اٹھ کر ٹرنک کھولا اور مختلف رنگوں کے پر جو میں نے اپنی بھابھی کے لئے رکھے ہوئے تھے زرینہ کے ہاتھ میں دیدیئے۔

زرینہ پروں کو اچھالنے لگی۔

"یہ تو بڑے خوبصورت پر ہیں۔ کتنے اچھے ہیں آپ بھائی جان"۔

"تمہارے پروں سے زیادہ خوبصورت ہیں نا؟"

"ہاں ہاں بھائی جان"۔

یہ کہتے ہوئے وہ ایک پر کو دیکھنے لگی۔ "یہ کس کا پر ہے بھائی جان"۔

"یہ پہاڑی ہوٹے کا ہے اور یہ سیاہ رنگ کا پر ایک خوبصورت کالے پرندے کا ہے جس کی آواز بڑی میٹھی ہوتی ہے"۔

یکایک ہنستی ہوئی لڑکی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ دو تین پر اس کی انگلیوں سے نکل کر فرش پر گر پڑے اور وہ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا زرینہ؟"

زرینہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر دوسرے پروں کے متعلق پوچھنے لگی اب وہ پھر پہلی سی خوش و خرم لڑکی نظر آرہی تھی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں کھیلنے کے بعد وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ سامیری نگاہ پلنگ کے قریب ایک چھوٹے سے میز پر پڑی۔ دونوں سیاہ پر جو میں نے زرینہ کو دوسرے پروں کے ساتھ دیئے تھے۔ میز پر پڑے تھے۔ "وہ شاید ان پروں کو بھول گئی ہے"۔ میں نے دل میں کہا۔ مگر تعجب انگیز بات یہ تھی کہ سیاہ پروں کو دیکھ کر پہلے تو وہ خوفزدہ ہو گئی تھی اور اب دونوں کو یہاں چھوڑ کر چلی گئی۔

## ۴

چند دن کے بعد مجھے صحت کلی حاصل ہو گئی اور میں چچی سے اجازت لیکر گھر روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچنے کو تو میں پہنچ گیا مگر چچی کی والہانہ شفقتیں اور وہاں کے روح افزا مناظر بری طرح تڑپانے لگے۔ میں چاہتا تھا جتنی جلد ممکن ہو سکے چچی کے ہاں پہنچ جاؤں۔ لیکن خانگی مصروفیات اور زمانے کے حوادث نے مکمل ۵ سال تک سر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔ آخر میری تمنا بر آئی اور میں دل میں ہجوم شوق لئے ہوئے حویلی میں پہنچ گیا۔ چچی نے حسب دستور بڑی محبت سے میرا استقبال کیا اور میں محسوس کرنے لگا کہ پھر جنت میں داخل ہو گیا ہوں۔

دوسرے دن صبح کے وقت میں سیر کے لئے حویلی سے نکلا۔ یہ ارادہ لے کر کہ کم از کم تین چار گھنٹے باہر پھرتا رہوں گا۔ چنانچہ اس سیر میں میں نے کئی نئی چیزیں دیکھیں۔ حویلی کے عقب میں پہلے ایک وسیع میدان تھا مگر اب وہاں بچہ کانات لڑتے تھے۔ ---- کے بجائے ایک خوبصورت باغ لہلہا رہا تھا اور کارخانے کے قریب زرد رنگ کی ایک کوٹھی نظر آرہی تھی۔ نہر کے دوسری طرف دور تک کھیت ہی کھیت تھے مگر اب کھیتوں کی بجائے ایک بلند بنگلہ زیر تعمیر تھی۔ زمانہ کتنا تغیر پسند ہے یقیناً دوسروں کی نگاہوں میں یہ خطہ ارض پہلے سے زیادہ حسین۔ پہلے سے بڑھ کر شاداب ہو گیا تھا مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی معصومیت بہت حد تک مجروح ہو چکی ہے۔

سیر کے بعد میں حویلی کے دروازے ہی پر پہنچا تھا کہ میرے قدم رک گئے۔ ساتھ کے چھوٹے سے مکان کے دروازے پر ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کھڑی تھی جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں وہ شرما کر اندر چلی گئی۔ "یہ کہیں پروں والی لڑکی تو نہیں؟" میں نے دل میں سوچا اور پھر اندر آکر چچی سے پوچھنے لگا۔

"یہاں ایک چھوٹی سی لڑکی نظر آیا کرتی تھی۔ شاید اس کا نام زرینہ تھا"۔

"تو کیا وہ چھوٹی سی لڑکی اب تک چھوٹی سی لڑکی ہی رہتی؟" چچی نے ہنس کر جواب دیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ اب وہ یہاں ہے یا باہر چلی گئی؟"

"جانا کہاں تھا بچاری نے"۔

"تو یہیں ہوگی پھر"۔

"ہاں یہیں ہے ساتھ کے مکان میں رہتی ہے بڑی محنتی اور نیک لڑکی ہے۔ گھر کا تمام کام کاج کرتی ہے"۔

"محنتی اور نیک لڑکی جو ہوئی"۔ میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس دن میرے دل میں ایک ہلکی سی خلش پیدا ہو گئی تھی۔

## ۵

میں ہر روز سیر کے لئے جاتا اور زرینہ کے مکان کے پاس پہنچ کر رک جاتا مگر زرینہ ایک لمحہ کے لئے بھی نظر نہ آتی تھی۔ ایک دن شام کے وقت میں سیر سے لوٹ رہا تھا کہ ندی کے پل کے پاس زرینہ دکھائی دی۔ اس نے ایک ننھے بچے کی انگلی پکڑ رکھی تھی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس آکر کہا۔

"مجھے پہچانا زرینہ؟"

اس نے رک کر میری طرف دیکھا۔ "نہیں تو آپ کون ہیں"۔

"بھول گئیں مجھے؟"

"مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے شاید آپ ایک دفعہ یہاں آئے تھے اور حویلی میں رہتے تھے"۔

"ہاں اب تمہیں یاد آگیا۔ تم میرے کمرے میں رنگ برنگ کے پر لینے آتی تھیں"۔

"اوہ" ---- وہ ذرا مسکرائی اور اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے بچے کے ریشمی بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

"چچی تمہاری بڑی تعریف کرتی رہتی ہیں"۔ میں نے کہا۔

"یہ ان کی مہربانی ہے۔ ورنہ میں تو کسی لائق بھی نہیں ہوں"۔

بچہ میری قمیص کا دامن پکڑے ہوئے حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟ بھائی ہوگا"۔ میں نے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"نہیں میرا کوئی بھائی بہن نہیں یہ ایک رشتہ دار کا لڑکا ہے گھر میں گھبراتا تھا میں باہر لے آئی"۔

یہ کہہ کر وہ قدم اٹھانے لگی۔ اس نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ میں نے کہا۔ "زرینہ! اب میں کافی مدت تک یہاں رہوں گا"۔ وہ ذرا ٹھہری میری طرف دیکھا اور پھر میری بات کا جواب دیئے بغیر چلنے لگی۔ اس کے جانے کے بعد میں پچھتانے لگا کہ کیوں ایسی بات اس سے کہی آخر اسے میرے یہاں رہنے یا نہ رہنے سے کیا مطلب؟ اب وہ تیتریوں کے پیچھے بھاگنے والی بچی نہ تھی کہ میری موجودگی سے خوش ہوتی۔ اب اسے پروں کی ضرورت نہیں تھی۔ بچپن کے کھیل بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں اس دن جب میں رات کو سویا تو میری خلش دگنی ہو گئی اس کے بعد میں کئی دن تک زرینہ کو نہ دیکھ سکا۔

## ۶

شاید وہ اتوار کا دن تھا میں نے چند لمحوں کے لئے زرینہ کو دیکھا اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ نہایت حسین نظر آرہی تھی رات کو نہ معلوم کیا بات تھی کہ میری آنکھوں میں نیند ہی نہیں آئی تھی۔ میں نے لمپ روشن کیا اور کتاب پڑھنے لگا۔ کتاب بڑی دلچسپ تھی اور میں بڑے شوق کے ساتھ اس کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میرے کان میں چیخ کی آواز آئی۔ پہلی بار تو میں نے سمجھا کہ شاید میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے مگر جب دوبارہ یہی معاملہ ہوا تو میں نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔

ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ فضا ابر آلود

تھی۔ یکایک مسلسل چیخوں کی آواز آنے لگی۔ میری نظر زرینہ کے مکان پر پڑی اور مجھے محسوس ہوا کہ وہیں سے چیخوں کی آواز آ رہی ہے۔ میں لوکر کے کمرے میں گیا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ایک لمحہ کے لئے بجلی چمکی اور اس کی چمک میں جو نظارہ میری آنکھوں کے سامنے آیا اس نے میرے دل پر لرزہ طاری کر دیا۔ زرینہ کے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ ایک زرد اور بھیانک چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے شمو کو آواز دی وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"چچی جی کو بلاؤ ۔۔۔۔ جلدی۔" میں نے اس سے کہا۔ وہ عجلت کمرے سے نکل گیا۔ میں بھی بیتابی کے عالم میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اور اس سے پیشتر کہ ہم چچی کے کمرے میں پہنچیں چچی خود مخروطی چادر میں لپٹی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔

"چچی! زرینہ کے یہاں کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔"

یہ سن کر چچی نے سرد آہ بھری اور کہنے لگیں "آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔"

"کیا ہوا چچی؟" میں نے پوچھا۔

چچی میرے سوال کا جواب دیئے بغیر سیڑھیوں کی طرف چلنے لگیں۔ میں بھی ادھر چلا۔ زرینہ کے مکان پہ پہنچ کر چچی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تین منٹ کے بعد جا کر کہیں دروازہ کھلا۔ اب پھر وہی دردناک منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ زرینہ ایک زرد چہرے پر جھکی چیخ رہی تھی۔ میں اندر قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ چچی نے کہا۔ "سلیم تم اوپر جا کر سو رہو۔" انھوں نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔

میں کئی منٹ وہاں کھڑا رہا۔ زرینہ برابر چیخ رہی تھی۔ میں تمام رات وہاں ٹھہرا رہتا مگر بارش اس زور سے ہونے لگی کہ وہاں ایک منٹ بھی کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ میں اوپر چلا آیا اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ہر طرف بھیانک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تیز و تند جھونکوں میں مسلسل چیخیں آ رہی تھیں۔ بقیہ رات بڑی بیقراری کے عالم میں گزری۔ دن چڑھے چچی آ گئیں۔

"کیا ہوا چچی؟ زرینہ کس کی لاش پر جھکی ہوئی تھی؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"لاش ۔۔۔۔ ہاں وہ بیچاری زرینہ کی ماں کی لاش تھی۔" چچی نے غمگین لہجے میں کہا۔

"تو وہ کیونکر فوت ہو گئی؟"

"یہ ایک بڑا دردناک واقعہ ہے۔ اس خاندان کے تمام افراد ایک عجیب وہم میں مبتلا ہیں۔ اور یہ وہم ان کے آباؤ اجداد سے چلا آ رہا ہے۔ اب تک کئی جانیں اس وہم کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں زرینہ کی ماں بھی اسی وہم کی نذر ہو گئی ہے۔"

"کون سا وہم چچی ۔۔۔۔؟"

چچی نے ایک لمبی آہ بھری اور کہنے لگیں۔ زرینہ کے خاندان میں ایک بالکل تندرست آدمی بستر پر لیٹ گیا اور کہنے لگا میں چار پانچ روز تک مر جاؤں گا۔ لوگوں نے سمجھا کہ وہ محض مذاق کر رہا ہے گروہ لحہ بہ لحہ کمزور ہونے لگا۔ اور آخر ایک ہفتے کے بعد موت کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس عالم میں اس نے اپنے عزیزوں کو پاس بلایا اور کہنے لگا۔ "تم حیران ہو گئے کہ عین تندرستی کی حالت میں مجھے اپنی موت کا کیونکر یقین ہو گیا آج میں تمھیں اس کی وجہ بتاتا ہوں۔ ہمارے باغ میں جہاں طرح طرح کے پودے اور درخت ہیں وہاں ایک سوکھا ہوا پودا بھی ہے۔ یہ سوکھا ہوا پودا دو ہفتے پیشتر اگا تھا۔ اور پرسوں دن کے وقت بڑھ کر چار فٹ لمبا ہو گیا۔ اور پرسوں رات کو اس پر موت کا راگ گایا جانے لگا۔ گویا میری موت کی علامت تھی۔ سو کر سب سے پہلے میں نے ہی تو راگ سنا تھا۔ میرا باپ بھی یہی موت کا راگ سن کر دنیا سے رخصت ہوا تھا اور باپ میری باری ہے۔ اور آئندہ ہمارے خاندان میں جو شخص سب سے پہلے موت کا راگ سنے گا وہ دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس دن سے اس خاندان پر یہ وہم مسلط ہے۔ جیسے ہی ان کے مکان کے پاس وہ مخصوص پودا اگتا ہے یہ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ ان میں ایک شخص ضرور دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ چنانچہ جو شخص سب سے پہلے موت کا راگ سنتا ہے وہ ضرور فوت ہو جاتا ہے۔"

"موت کا راگ کیا ہے اور یہ کون گاتا ہے" میں نے چچی سے پوچھا۔

"یہ ایک پودا ہوتا ہے جس پر تین لمبے لمبے پتے لگتے ہیں۔ اور جب یہ پودا چار فٹ کا ہو جاتا ہے تو ایک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا پرندہ اس کے گرد گھوم گھوم کر دردناک آواز پیدا کرنے لگتا ہے۔ وہ تینوں پتے سوکھ جاتے ہیں۔ اب جو شخص سب سے پہلے یہ آواز سن لے وہ ضرور مر جاتا ہے زرینہ کی ماں نے بھی موت کا راگ سنا تھا۔"

"کتنی دردناک ٹریجڈی۔" میں نے کہا۔

چچی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "کوئی شخص بھی ان کو اس وہم سے نجات نہیں دلا سکتا۔"

"تو چچی یہ پودے کو کاٹ کیوں نہیں دیتے نہ پودا چار فٹ لمبا ہو گا اور نہ اس پر وہ پرندہ موت کا راگ الاپے گا۔"

"ایسا کرنے کی کوئی بھی جرأت نہیں کرتا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے تمام خاندان پر کوئی ناگہانی مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔"

یہ واقعہ سن کر میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی اور میں زرینہ سے ملنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور جب میں اس سے ملا تو اس کی حالت میں کافی تغیر پیدا ہو چکا تھا اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ اور آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے سے پڑ چکے تھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مہینوں سے بیمار ہے۔ وہ ہمارے یہاں چچی سے ملنے آئی تھی۔ مگر اس دن چچی کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ مایوس ہو کر وہ جا رہی تھی کہ میں نے اس سے کہا۔

"زرینہ! ذرا ٹھہرو۔"

وہ ٹھہر گئی۔

"میں تمھاری دلخراش ٹریجڈی سن چکا ہوں۔ اور مجھے بہت رنج ہے۔"

"آپ کی ہمدردی کا شکریہ!" زرینہ نے کہا اور اس کی پلکوں پر ایک ننھا سا قطرۂ اشک لرزنے لگا۔

"والدین ہمیشہ اولاد کا ساتھ نہیں دے سکتے اس لئے ہمیں صبر کرنا چاہیئے۔ صبر کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔"

اس نے مجھے حسرت آلود نگاہوں سے دیکھا اور خاموش رہی۔

"تم نے یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے معلوم ہوتا ہے مدت سے بیمار ہو۔"

"ماں کی وفات کا صدمہ کوئی معمولی صدمہ نہیں ہوتا۔" اس نے دردانگیز لہجے میں کہا۔

"یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن زرینہ ہمیں صبر کرنا چاہیئے۔ رو رو کر جان ہلکان کرنا بے فائدہ ہے۔"

"اب اب میں کافی سنبھل چکی ہوں۔ ماموں اور ممانی جی مادرانہ شفقت کر رہے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ روز صبح و شام سیر ضرور کیا کرو۔ بچپن میں تو تم سیر کرتے کرتے تھکتی ہی نہ تھیں۔"

"وہ بچپن کا زمانہ تھا۔"

"اب تم جوان ہو گئیں اس میں کوئی شک نہیں تاہم سیر کرنا نہایت مفید ہے۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف چلنے لگی۔ سیڑھی کے پاس پہنچ کر اس نے مجھے معنی خیز انداز سے دیکھا اور نیچے اتر گئی۔

میں نہیں جانتا کہ یہ میری نصیحت کا اثر تھا یا زرینہ کی اپنی مرضی کہ اس نے چند دن کے بعد پھر زندگی کے کنارے ٹہلنا شروع کر دیا۔ ہماری ہر روز ملاقات ہوتی تھی مگر سرسری۔ پھر آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے سے بیحد مانوس ہو گئے۔ اب یہ حال تھا کہ زرینہ میرے بغیر بیقرار رہتی تھی اور میں زرینہ کی عدم موجودگی میں مضطرب و پریشان ہو جاتا تھا۔

۷

کچھ عرصے کے بعد ہماری شادی ہو گئی۔

وہ وقت میری زندگی کا مسرور ترین وقت تھا جب میں نے اپنی زرینہ کی گردن میں باہیں حمائل کر کے کہا۔ "میری زرینہ! تم میری دنیا ہو، میری دنیا کی روشنی ہو آج میں خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھتا ہوں۔"

اس کے جواب میں وہ مسکرانے لگی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ تمام چاند ستاروں کی روشنی اکٹھی ہو کر اس کی کالی کالی، لمبی لمبی پیاری پیاری پلکوں کے نیچے لہرا رہی ہے۔ وہ تمام رات ہم نے عاشقانہ راز و نیاز میں گذار دی۔ آہ! اس رات کا تصور آج بھی میرے دل میں نشتر کی لہر دوڑا دیتا ہے۔

ہماری زندگی اس قدر مسرور، رنگین اور خوشگوار تھی کہ میرے دل میں کبھی خیال بھی نہیں آ سکتا تھا۔ کہ ہم ایک لمحہ کیلئے بھی غمگین ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک صبح جب میں نے اپنی محبوبہ کو خلاف معمول کسی قدر مغموم دیکھا تو انتہائی حیرت کے عالم میں کہا۔

"زرینہ! آج تم خلاف معمول غمگین ہو کیا بات ہے؟"

"میں ۔۔۔۔ غمگین! آپ کیا کہہ رہے ہیں" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ تم غمگین ہو۔"

"اگر میں غمگین ہوں تو پھر دنیا میں کوئی بھی مسرور و خرم نہیں۔ بھلا مجھے غمگین ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آخر مجھے کون سا دردناک واقعہ ستاتا رہتا ہے۔"

"تم بیشک مجھے ٹالنے کی کوشش کرو۔ مگر تمھاری آنکھیں جھوٹ نہیں کہہ سکتیں۔ یہ صاف بتا رہی ہیں کہ زرینہ کا دل ملول ہے۔ شاید تم اس لئے رنجیدہ نظر آ رہی ہو کہ میں صبح تمھارے ساتھ سیر کو نہ جا سکا۔"

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ آج بیٹھے بیٹھے امی جان یاد آ گئیں۔"

"سچ کہتی ہو؟"

"اور کیا ۔۔۔ بالکل سچ کہتی ہوں ۔۔۔ اور وہ پودے کا واقعہ، موت کا راگ، مگر یہ تو ایک مضحکہ خیز وہم ہے۔"

"یہ وہم ابھی تک تمھارے دل سے نہیں نکل سکا؟"

"نکل چکا ہے۔ بالکل نکل چکا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

"زرینہ!" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "وعدہ کرو آئندہ تم پودے کا واقعہ یاد نہیں کرو گی! کتنی افسوسناک بات ہے کہ ہم عقلمند و ذی شعور ہونے کے باوجود اتنے ذلیل وہم کا شکار ہو جائیں۔ اس قسم کا واقعہ تو ان لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جو زندگی کی انتہائی پست سطح پر رینگ رہے ہوں ہمیں زندہ رہنے کے لئے اپنے اندر زندگی کی قوت پیدا کرنی چاہیئے۔ اور یہ قوت حیات "وہم پرستی" کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی اس کا شکار ہونا یا اس میں مبتلا ہونا تو ایک بہت بڑی بات ہے۔ کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ آئندہ اس وہم کو دل میں نہیں لاؤ گی؟"

"ایک بار نہیں، ہزار بار وعدہ کرتی ہوں کہو تو قسم کھا لوں۔"

"مجھے تم پر یقین ہے۔"

۸

ایک مسرور سال گزر گیا۔ اس دوران میں میری زرینہ نے صرف ایک بار اس منحوس پودے کا ذکر کیا۔ اور وہ بھی اس انداز سے جیسے اس کی

تخفہ کرتا ہے۔

زرینہ کو اپنی نانی سے ملے ہوئے ڈیڑھ سال کی مدت گزر چکی تھی اور وہ اس سے ملنے کی بہت آرزو مند تھی۔ میں شہر جا کر اس کی نانی کو لے آیا۔ وہ نانی سے مل کر بہت خوش ہوئی اور میں ان دونوں کو باتیں کرتے ہوئے چھوڑ کر دفتر چلا گیا۔ چنانچہ اس وقت جب کہ میں گھر آنے کے لئے اپنے کمرے سے نکل رہا تھا میرے دل میں ایک خلش سی ہوئی اور میں تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔ گھر آ کر معلوم ہوا کہ جس بات کا خدشہ تھا وہ ہو چکی ہے زرینہ کی نانی، زرینہ کی ماں اور اس کی نانی کی موت کا حسرتناک لہجہ میں ذکر کر رہی تھی اور زرینہ زار و قطار رو رہی تھی۔ میں بہت پچھتایا کہ کیوں نہ زرینہ کی نانی کو اس قسم کی باتیں کرنے سے روکا میں نے دونوں کو تسلی دی اور کسی نہ کسی طرح زرینہ کی نانی کو دو تین دن کے بعد رخصت کر دیا۔ در آنحالیکہ زرینہ مُصر تھی کہ اس کی نانی کم از کم ایک ماہ تک وہاں رہیں۔ میں نے زرینہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔ اور کافی دیر تک اسے سمجھاتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر سنبھل گئی۔

چند ماہ کے بعد میں زرینہ کو پھر رنجیدہ دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ میں نے اپنے نوکر سے کہہ دیا " بیگم کی ہر بات اور کام پر نظر رکھنا "

دو دن تک تو نوکر کچھ نہ بتا سکا اس نے کہا بیگم صاحبہ کی عادتوں میں تو مجھے کوئی بات نظر نہیں آتی وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ تمام کام کرتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ کتابیں بھی اکثر پڑھتی رہتی ہیں "

"خیر تم غور سے دیکھتے رہنا" میں نے کہا۔

ایک دن میں وقت سے گھر آیا تو میں نے دیکھا زرینہ بہت غمگین نظر آ رہی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ مصنوعی طور پر ہنسنے لگی۔ دوسرے دن مجھے نوکر سے پتہ لگا کہ زرینہ باغ میں جا کر خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے سمجھ لیا کہ میری محبوبہ ابھی تک وہم میں اسیر ہے۔

۹

جہاں تک امکانی کوششوں کا تعلق تھا میں نے اس کی دلداری کی اور بار بار اس منحوس وہم کا مذاق اڑایا تا کہ وہ بدبخت خیال اس کے ذہن سے نکل جائے ——— لیکن اس کے چہرے کی زردی میں اضافہ ہوتا گیا۔

"آخر اس کا مطلب کیا ہے؟" میں نے مجبور ہو کر کرخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

اس نے حسرت انگیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ " اگر تم کو میری باتوں سے دکھ ہوتا ہے تو میں خاموش رہتی ہوں "

"خاموشی اور گفتگو کا سوال نہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم اس قدر مغموم کیوں ہو جاتی ہو"

"میں مغموم ہوں ——؟"

"نہیں تمہیں مغموم کہہ رہی ہو"

"اچھا اگر میں قدرے مغموم ہو جاتی ہوں تو سمجھ لو یہ میری عادت ہے"

"اور میں چاہتا ہوں تمہاری یہ بیہودہ عادت دور ہو جائے"

"کوشش کر رہی ہوں کہ یہ بیہودہ اور نامعقول عادت دور ہو جائے۔ آپ مطمئن رہیں آپ کو آئندہ اس بات کی شکایت نہیں رہے گی" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

میں نے اس کی گردن کے گرد باہیں حمائل کر دیں اور محبت سے کہا۔ "مجھ سے بدگمان نہ ہو میری زرینہ! تمہیں غمگین دیکھ کر میرے دل کو بہت دکھ پہنچتا ہے اور تم نے کئی بار وعدہ کیا ہے کہ میں اس قسم کے وہم کو دل کے قریب بھی نہیں آنے دوں گی۔ اور اب دیکھو! تم کیا کر رہی ہو؟"

"ہاں میں نے کئی بار وعدہ کیا ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ میں وعدہ خلافی کر رہی ہوں لیکن ——"

"تو اب کیا ہوا۔ کوئی نیا واقعہ رونما ہو گیا ہے کیا ——؟"

"وہ ——!"

"کیا ہوا زرینہ؟"

"وہ منحوس پودا —— وہاں —— آہ! میں کتنی بدنصیب ہوں"

میرے روکنے کے باوجود وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ آخر اس کے آنسو تھمے اور وہ اس طرح مضمحل ہو کر بستر پر لیٹ گئی جس طرح ایک کلی شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر کے بعد وہ سو گئی میں نے خادمہ کو اس کے پاس بٹھایا اور خود لیمپ لے کر باہر چلا آیا۔

تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ بادل اپنے پراسرار ہاتھوں سے ستاروں کی شمعیں بجھا رہے تھے۔ میں نے لیمپ کی روشنی میں ایک ایک پودے کو دیکھا لیکن کوئی پودا ایسا نظر نہ آیا جسے میں مخصوص پودا کہہ سکوں دل میں خیال آیا کہ نوکر کو بلاؤں کیونکہ اس نے کئی بار زرینہ کو اس پودے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ میں پلٹنے ہی کو تھا کہ دو بڑے بڑے پودوں کے درمیان ایک عجیب و غریب پودا نظر آیا اس کا قد تقریباً ڈیڑھ فٹ کے برابر تھا اور اس پر تین سیاہ لمبے لمبے پتے لگے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کو پکڑ لیا اور اکھیڑنے لگا۔ وہ پودا اتنا مضبوط تھا کہ دو منٹ تک اس میں ذرہ بھر خم نہ پیدا ہوا۔ میں پورا زور لگا کر اسے اپنی طرف کھینچتا رہا یہاں تک کہ وہ اکھڑ کر میرے ہاتھوں میں آ گیا۔ پودے کی جڑ سیاہ تھی اور اس میں تین موٹے موٹے سرخ دانے لگے ہوئے تھے میں پودے کو ہاتھ میں لئے ہوئے باغ سے نکلا اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ ساحل دریا پر پہنچ کر میں نے اسے پانی میں پھینک دیا۔ چند لمحوں کے لئے وہ میری نگاہوں کے سامنے پھرتا رہا اور پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ کام کر کے میں باغ میں لوٹا۔ زمین کو گہرا کھودا اور وہاں ایک اور پودا لگا دیا۔

کمرے میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی میں زرینہ ایک بار تڑپ کر بستر سے اٹھی اور اگر خادمہ اسے نہ سنبھالتی تو وہ دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل جاتی۔ وہ رات اس نے بیقراری کے عالم میں گذاری۔ صبح میں اسے باغ میں لے آیا اور اس نئے لگائے ہوئے پودے کے قریب لے جا کر کہا۔

"دیکھو زرینہ! اس ذلیل اور منحوس پودے کا نشان تک یہاں موجود نہیں"

"تو تم نے اسے اکھیڑ ڈالا" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"یقیناً۔ ایسے ذلیل پودے کا یہاں کیا کام؟"

"مگر اب کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ تم کو معلوم ہو گیا کہ وہ حقیر پودا ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں رکھتا"

"لیکن ——!"

"میری زرینہ! میری جان! ہمارے خیالات ہی ہماری زندگی کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ خدا کے لئے خود کو سنبھالو"

"تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا" اس نے کہا۔

"تقدیر خیالات ہی کا نام ہے۔ جتنے خیالات بلند اتنی زندگی ارفع و پاکیزہ۔ جتنے خیالات پست اتنی زندگی مکروہ و ذلیل"

یہ سن کر وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگی گویا یہ الفاظ اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔

۱۰

چند ہفتے اور گزر گئے۔

یکایک زرینہ بیمار پڑ گئی اور اس بیماری کا وجود وہی منحوس وہم تھا۔ وہ بعض اوقات عالم بیہوشی میں اس کمبخت پودے کا ذکر کرنے لگتی " اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہم نے اس کی روح کی گہرائیوں تک اپنے پنجے گاڑ دیئے تھے۔

وہ رات میری زندگی کی منحوس ترین رات تھی جب میری زرینہ ایک دم چیخنے لگی۔ میں نے اس کا سر گود میں لے لیا۔

"کیوں! کیا ہوا میری جان!؟"

"تم ہو —— خدا کے لئے یہیں رہو۔ وہ وقت آ پہنچا" اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سا وقت میری زرینہ؟"

"تم کوئی آواز نہیں سنتے، سنو یہ آواز"

"بالکل وہم ہے میری زرینہ! خدا کی قسم! بالکل وہم"

"اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ موت کا راگ الاپا جا چکا —— میری زندگی ختم ہو گئی۔ جدائی کا وقت آ پہنچا"

"میرے دل پر اس طرح نشتر نہ لگاؤ زرینہ!"

وہ خاموش ہو گئی اور حسرت میں ڈوبی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"ہنسو میری زرینہ! اس ذلیل وہم کا مذاق اڑاؤ۔ ہنسو"

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"تم تو رونے لگیں"

اس کے ہونٹوں پر تبسم کی مضمحل لہریں لرزنے لگیں۔ آہ منظر کتنا دردناک۔ کس درجہ دلسوز تھا۔ نصف رات تک وہ فراقیہ گیت گاتی رہی پھر یکایک اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے لبوں سے لگا لیا۔

"زرینہ!" میں نے گھبرا کر کہا۔

اس نے آخری بار حسرت آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔ دوبارہ میرے ہاتھ کو چوما اور —— دوسرے لمحہ میں میرے زانو پر میری محبوبہ کی نعش پڑی تھی۔

میں اپنی محبوبہ کا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ خزاں زدہ پتے کی طرح زرد پڑ گیا تھا اور آنکھیں —— یوں معلوم ہوتا تھا جیسے لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے پیچھے حسرت و مایوسی کی گہری تاریکیاں منجمد ہو گئی ہیں۔ فضا میں ایک تلخ اور سوگوار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرے پاس میرا وفادار خادم حسرت انگیز نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

یکایک میرے کانوں میں بھنبھناہٹ کی سی آواز آئی۔ میری نگاہیں قریب کے ایک گوشہ پر پڑیں اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ ایک بدنصیب مکھی جالے میں تڑپ رہی تھی۔

میرا سر سینے سے جا لگا۔ گذشتہ واقعات میری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔ آہ! ان چند سالوں میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ محبت —— مسرت اور پھر —— آہ۔

وہ رات —— وہ ماتمی رات اپنے سیاہ دامن میں میری زندگی کی تمام روشنی لے گئی۔

صبح کو جب باغ کے ایک گوشے میں میری محبوبہ کو —— میری زندگی کی تمام مسرتوں کو سپرد خاک کرنے کے لئے زمین کو کھودا جا رہا تھا میں نے قریب ہی ایک مرجھائے ہوئے پودے کو دیکھا۔ اس کے تینوں لمبے لمبے پتے سوکھ چکے تھے۔ آہ! یہی وہ منحوس پودا تھا جس نے میری محبوبہ کو مجھ سے چھین لیا تھا۔

---

ستم یہ ہے جفاؤں میں وفا کی آرزو ہے
ستم ہے وفاؤں میں جفا کی آرزو ہے
نہ جادہ ہے [illegible] سفر کی آرزو ہے
وہ [illegible]
اور [illegible]

عطا [illegible]

# بیوقوف کا روزنامچہ

۲۹ر مارچ - آج میں نے "ایمپائر گرلس ہائی اسکول" کا معائنہ کیا۔ مسٹرس "خوب" تھی — مگر کچھ زیادہ حسین نہ تھی۔

۳۰ر مارچ - صبح ہی صبح سے دریا کنارے سیر کو نکل گیا — کچھ دیر بعد واپس آیا۔ تمام دن "کروک بینک لمیٹڈ" کی رپورٹ پڑھتا رہا۔

۳۱ر مارچ - ایک روپیہ میں آٹھ پوسٹر کا فوٹو کھچوایا - سپاہی - ملاح - مکہ باز - پہلوان - ڈاکیہ - پولیس مین - انجینیر - اور شکاری — سب کچھ میں — "ایک روپیہ" میں بن گیا۔

یکم اپریل - آج "اپریل فول" ہے - ذرا سویرے ہی اٹھ بیٹھا - اور یہ دیکھنے کیلئے کہ لوگ آج کیا کیا روپ بھرتے ہیں۔ گھر سے نکل گیا - دن بھر پورے شہر میں گشت لگاتا رہا - لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا - تھکا ماندہ گھر آیا۔ شاید — میں ہی سب سے بڑا بیوقوف تھا!

۲ر اپریل - میں نے شادی کرنے کا ارادہ کیا!

۳ر اپریل - آج ایک لڑکی سے ملاقات کی حسین تھی اور خوبصورت، ٹیکسی کرایہ پر لیکر تمام دن اس کا پیچھا کرتا رہا -

۴ر اپریل - لڑکی کا میں نے ذرا بھی خیال نہ کیا -

۵ر اپریل - ریس دیکھنے گیا، یہ خیال کرکے کہ کوئی نہ کوئی گھوڑا آ ہی جائیگا، تمام گھوڑوں کے ٹکٹ خرید لئے — !

۶ر اپریل - گذشتہ شب سینما گیا، "باکس" میں گورنر صاحب تشریف فرما تھے، اس لئے بوڑھا ہی میرا مذاق رہا — !

۷ر اپریل - آج مجھے درد شکم ہوا -

۸ر اپریل - ایضاً

۹ر اپریل - آج خاندانی ڈاکٹر کو بلایا، اس نے کہا - بیماری خطرناک ہے، دہلی جاکر علاج کرانا چاہئے -

۱۰ر اپریل - دہلی پہنچ گیا -

۱۱ر اپریل - گھر یہ معلوم کرنے کیلئے واپس آیا کہ ڈاکٹر نے پرانی دہلی کا مشورہ دیا تھا یا نئی کا — پتہ چلا — پرانی!

۱۲ر اپریل - پرانی دہلی پہنچ گیا!

۱۳ر اپریل - ایک مشہور حکیم سے مشورہ کیا، اس نے کہا میرے پیٹ میں کچھ نہیں ہے - وہ غلطی پر تھا - اس صبح میں نے دو انڈے اور ایک کپ کافی کا پیا -

۱۴ر اپریل - گیا کہنے، دہلی بڑا نفیس شہر ہے سینکڑوں لڑکیوں کو ذرا میں دوست بنالو، اب میں سمجھا، متعدد بادشاہوں نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد کیوں دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا — آج میرے "پیٹ کا درد" کہاں ہے؟

۱۵ر اپریل - دو لڑکیوں سے تبادلۂ خیال کرتا رہا — کیا چیز ہے دہلی — قربانت شوم!

۱۶ر اپریل - آج ان دونوں لڑکیوں نے مجھے بلایا۔ انہوں نے کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ مجھ ایسے آدمی نے ابتک دہلی کے "درشن" نہیں کئے تھے، کتنی اچھی! روپیہ کیلئے گھر لکھنا چاہئے۔

۱۷ر اپریل - اُن ہی لڑکیوں نے مجھے آج پھر بلایا۔ ہائے رے "کشش" — میں عورتوں میں "مشہور و مقبول" ہو رہا ہوں! — انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ دہلی سے اکتا گئی ہیں، اور فرار ہونا چاہتی ہیں۔

میں نے کہا "ہمیں بمبئی بھاگ چلنا چاہئے"

اور — وہ راضی ہوگئیں۔

اسلئے ہم کل بمبئی فرار ہو رہے ہیں۔

۱۸ر اپریل - انہیں تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی پڑی تھی۔ صبح ہی سے میرے دروازے پر دستک دی — مگر آج وہ ایک "موٹی عورت" کے ہمراہ آئیں — انہوں نے کہا کہ وہ ان کی "والدۂ محترمہ" ہیں۔ میں تو کانپ گیا۔ میں نے انہیں یاد دلایا، کہ آج تو ہمارے "فرار" کا دن ہے، اس پر انہوں نے کہا کوئی پروا کی بات نہیں، یہ بھی ہمارے ساتھ "بھاگ" چلنے کو تیار ہیں — !

اس کے بعد انہوں نے تشریح و توضیح فرمائی کہ اس دنیا میں ان کی یہی تو ایک ماں ہے، اسلئے وہ نہیں چاہتیں کہ اُسے "تن تنہا" چھوڑ دیں اور وہ "اکیلی جان" کسی نامعلوم آدمی کے ساتھ اپنی "دو پیاری لڑکیوں" کی فراری کا صدمۂ عظیم برداشت کرے۔

"چنانچہ میں نے کہا درست ہے، اگر آپ اپنے "چچاؤں" اور "چچیوں" کو بھی اس "فراری" میں شامل کرلیں تو بھی میں تیار ہوں، ہم پورے معاملہ کو راز میں رکھیں گے۔ بہرکیف ہم بمبئی "فرار" ہوگئے۔

۱۹ر اپریل - ہم بمبئی پہنچ گئے۔

"غریب لڑکیاں" اپنے ساتھ بہت کم کپڑے لائی تھیں، انہوں نے کہا کہ "فراری" کی عجلت اور "گھبراہٹ" میں انہیں کسی چیز کا خیال ہی نہیں رہا۔ چنانچہ میں نے انہیں بہت سے اچھے اچھے کپڑے خرید دئے۔ وہ حد درجہ خوش تھیں اور مسرور — انہوں نے مجھے خوب پیار کیا!

۲۰ر اپریل - بمبئی دہلی سے بڑا اور کہیں اچھا شہر ہے۔ ہم نے کرایہ پر ایک کار لے لی ہے اور "تاج محل ہوٹل" میں مقیم ہیں — !

۲۱ر اپریل - آج میں نے لڑکیوں کے ساتھ کچھ وقت ہنسی اور خوشی کے ساتھ گذارا، جہاں بھی جاتے ہم سب اکٹھے، کتنی اچھی، کتنی دلکش لڑکیاں ہیں — !!

۲۲ر اپریل - آج صبح مجھے اپنے ڈاکٹر کی بیوی کا ایک تار ملا۔ اس میں لکھا کہ "ڈاکٹر" درد شکم سے راہی ملک عدم ہوگیا۔ جسقدر جلد ہوسکے گھر آجاؤ۔

بیچارہ ڈاکٹر! — اس نے تو مجھے علاج کیلئے بھیجا تھا — ! یہ دلدوز خبر میں نے "اپنی لڑکیوں" کو سنائی اور ان سے کل دہلی چلنے کو کہا، وہ سب رونے لگیں، دیکھا آپ نے! جانگداز خبر کا ہمارے ننھے ننھے دلوں پر بڑا صدمہ ہے — !

انہوں نے ڈاکٹر کو برا بھلا بھی کہا کہ وہ مرا بھی تو ایسے وقت میں جبکہ وہ اپنی "فراری" سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پائی تھیں — کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ ایک ماہ بعد مرتا!

۲۳ر اپریل - تمام دن ٹرین میں گذارا -

۲۴ر اپریل - ایضاً

۲۵ر اپریل - گھر پہنچ گیا - ڈاکٹر کی بیوی — پرانی محبوبہ سے ملاقات کی — تھوڑی دیر بعد ہم چائے پی رہے تھے — !

۲۶ر اپریل - میں نے اپنے ڈاکٹر کا تمام حساب بیباق کیا - اس کی "ڈسپنسری" فروخت کردی اور روپیہ بیوی کے حوالہ کردیا - لیکن اس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، اسکی دلچسپی کا مرکز صرف میں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک سال تک "بیوہ" رہے گی، اس مدت میں مجھے کوئی فیصلہ کرلینا ہوگا - اس نے بتلایا کہ میں مہذب نہیں ہوں، اور اس کے بعد مجھ سے بلا تکلف کہا کہ مجھ ایسی عورت کی سخت ضرورت ہے جو تمہیں شائستہ بنا سکے۔ [illegible] میں نے خیال کیا وہ مجھے "شریف" بنانا چاہتی ہے، میں نے اس سے کہدیا، اگر مجھے "تہذیب"

باقی برصفحہ ۴۲

## کسی کو دیکھ کر

از حضرت عقیل ہاشمی کانپوری

نگاہیں مجھ سے ملا کر جھکا رہا ہے کون
مرے شباب سے شرما کے لڑکھڑا رہا ہے کون

خنک ستاروں کی چھاؤں میں کس کو دیکھ لیا
نگاہِ شوق میں یہ جگمگا رہا ہے کون

سنہری اور حسیں دھوپ کی طرح سرِ شام
مرے قریب دبے پاؤں آ رہا ہے کون

بدن چرائے ہوئے اک جماہی سی لے کر
یہ کہکشاں کی طرح مسکرا رہا ہے کون

کرشن بیٹھے ندی کے کنارے رات گئے
بجا کے بانسری مجھکو بلا رہا ہے کون

جھکائے دوش پہ گردن کو داہنی جانب
سبک کلائی میں کنگن گھما رہا ہے کون

اگر نہیں ہے تو اے دوست زینتِ آغوش
بتا بتا مجھے رنگیں بنا رہا ہے کون

مٹا کے صندلی قشقہ بھی اپنے ماتھے سے
مرا فسانۂ ماضی بھلا رہا ہے کون

عقیل اُف مری برکھا کی مست راتوں میں
سُہانے گیت محبت کے گا رہا ہے کون

# کشتیٔ نوح

از حضرت نوح ناروی

یا وہ گوئی سے محبت میں خموشی اچھی
بات اتنی سی نہ لیکن ہے یہ تنی اچھی

یہ نہ سمجھیں مری ہر بات بُری یعنی اچھی
آپ سمجھے ہیں مگر کب ہے انوکھی اچھی

میں نہ یا نہ ہا نبھنے کا وفا کو ترجیح
یہ بھی اچھی مری دانست میں وہ بھی اچھی

جلد مر جائے کہیں تمکنش ستم سے چھٹیے
نزع میں آپ نے عہدہ یہ شادی اچھی

عشق جاں سوز مرا حسن دل افروز ترا
کون کہتا ہے کہ دونوں میں ہے کوئی اچھی

اس میں اپنا ہی خیال آپ کسی کا بھی نہیں
خود پرستی سے ہے یا دہ پرستی اچھی

پھر نہ ملے سے ملے ہم نہ ملانے سے ملے
جس جگہ دیکھی صورت کوئی اچھی اچھی

جو ترے واسطے جھیلوں وہ ستم ہی اچھا
جو ترے عشق میں آئے وہ بلا بھی اچھی

آپ کیا میری طبیعت سے خبردار نہیں
یہ محبت کی ہے پکی یہ وفا کی اچھی

ہم نے مانا دمِ آخر وہ نہ آئیں گے مگر
اس بُرے وقت میں جھوٹی بھی تسلی اچھی

کیا شئے عشق پر اظہار خیالات کروں
نہ کچھ ایسی یہ بُری ہے نہ کچھ ایسی اچھی

تیری صورت کے علاوہ کوئی صورت ہی نہیں
خوب سے خوب خوش اسلوب انوکھی اچھی

کہہ گئے یہ شبِ غم جی سے گذرنے والے
جس کے پہلو میں وہ ہوں رات اُسی کی اچھی

آج کے وعدے کو پھر کل کیلئے ٹال دیا
وقت پر یہ تمہیں سے وقت کی سوجھی اچھی

عشق میں برق سر طور کی تخصیص نہیں
پھونک دے جو مرے دل کو وہ تجلی اچھی

دل تمہیں نیم نگہ پر ہی دیئے دیتا ہوں
چیز ایسی نہ ملے گی کوئی سستی اچھی

اور کیا چاہیئے ساقی ترے مے خانے کو
جام اچھے ہوں خم اچھا ہو صراحی اچھی

چار ہی روز میں سب عہد وفا بھول گئے
پھر خبر تم نے نہ لی میری خبر لی اچھی

دیکھ کر جن کو نگاہیں بھی نہ قابو میں رہیں
ہر ادا آپ کی اچھی ہے پر ایسی اچھی

آپ ہی بچ گئے ساقی بھی رہے آپ کے ساتھ
مل گئی نوح کو طوفان میں کشتی اچھی

# چاندنی رات

از حضرت دُعا ڈبائیوی

اے ماہ شب چار دہم چھیڑ نہ اصلا
کیا سمجھے کہ بتاؤں دلِ بیتاب کا قصا

للہ خدا کے لئے پردے ہی میں رہ تو
دُکھتا ہے مرے دل پہ غضب تیرا چمکنا

یوں تو کوئی دم یاد سے جاتا نہیں قاتل
ہر وقت اسی شوخ کا رہتا ہے وظیفا

لیکن یہ شبِ ماہ قیامت سے نہیں کم
یاد آتا ہے رہ رہ کے وہی چاند سا مکھڑا

وہ شوق کا اظہار وہ الفت کی امنگیں
وہ سیر وہ دونوں کا ٹہلنا لبِ دریا

وہ عالمِ خلوت وہ محبت کے فسانے
وہ چاندنی رات اور وہ حسن رخِ زیبا

وہ سیلِ پئے اک عالمِ پُر کیف محبت
وہ مدبھری آنکھوں سے شراب چھلکنا

وہ حسن ... آویزے کے توبہ شکن انداز
وہ رہ رہ کے مرے دل کا وہ پہلو میں مچلنا

چٹکی ہوئی وہ چاندنی اطراف جہاں میں
وہ زینتِ آغوش کوئی حسنِ سراپا

وہ قول وہ اقرار وہ پیغامِ محبت
وہ شکوہ شکایت وہ خیالات کی دنیا

اغماض وہ اُس کا وہ مری منتِ پیہم
وہ روٹھنا سو بار وہ سو بار منانا

وہ پیشِ نظر جلوۂ تصویرِ جوانی
بیساختہ وہ میرا کلیجے سے لگانا

وہ عالمِ حسن اور دلچسپ مناظر
پُر کیف نظارہ وہ کسی رشکِ قمر کا

پہلو میں نہ اب دل ہے نہ وہ شوخ ہے دلبر
سب دیکھتے ہی دیکھتے الٹا ہوا نقشا

کرتا ہوں بہت ضبط مگر ضبط کی حد بھی
ان چاندنی راتوں میں نہیں ضبط کا یارا

تدبیر سے قسمت کی بُرائی نہیں جاتی
رونے کے سوا کیا کرے مجبورِ محبت

یہ جانتا ہوں آہ سے حاصل نہیں کچھ بھی
اب خواب کے مانند ہے وہ پہلا زمانا

لیکن یہ شبِ ماہ مرے حق میں ہے قاتل
پھر یاد دلا دیتی ہے بھولا ہوا قصا

دُنیا کے لئے وجہ مسرت ہے شبِ ماہ
میرے لئے اک طرفہ مصیبت ہے شبِ ماہ

# گجرات

از جناب مجید لاہوری

میرا مولد ہے خطۂ گجرات
نازشِ روح، رنگِ نغمۂ حیات

خلد پروردش خواب ہے اس کا
جانِ کوثر "چناب" ہے اس کا

قدسیوں کی جبیں کا نور ہے یہ
رنگِ نقشِ کلیم و طور ہے یہ

عالم سر خوشی میں بہتا ہے
عشق کی داستان کہتا ہے

موج کے لب پر اک ترانہ ہے
یا "مہینوال" کا فسانہ ہے

سوہنی کے جمال کی تصویر
یا مرے خواب شوق کی تعبیر

گاہ ہٹتی ہے گاہ بڑھتی ہے
گاہ گھٹتی ہے گاہ چڑھتی ہے

لبِ ساحل کو دیکھ لیتی ہے
حسرتِ دل کو دیکھ لیتی ہے

شک نہیں اس میں ہمنشیں اصلا
جب کے ٹوٹا تھا اس پہ کچا گھڑا

اور موجیں تو سب ہیں محو خرام
اس کا ہٹتا نہیں یہاں سے گام

اس کو کچھ انتظار ہے شاید
اس لئے بیقرار ہے شاید

یہ فضائیں ہیں مہکی مہکی سی
یہ ہوائیں ہیں بہکی بہکی سی

کیف آگیں فضاؤں کی دنیا
یعنی دلکش اداؤں کی دنیا

زیست کی صبح، شام ہے اسکی
گرد، گردوں مقام ہے اسکی

سازِ فطرت کا دل نشیں نغمہ
پیارا پیارا سا میٹھا میٹھا سا

ہے یہ تصویر خلد زاروں کی
ہے یہ روح رواں بہاروں کی

حسن کیا پھول پھل کے نکلا ہے
کیف سانچے میں ڈھل کے نکلا ہے

غور سے دیکھ ان حسینوں کو
مہ جبینوں کو نازنینوں کو

ان پہ تاروں کا نور قرباں ہو
ماہ پاروں کا نور قرباں ہو

ان پہ قرباں ماہ کی تنویر
اور تصدق ہو ان پہ مہرِ منیر

ان پہ سو جان سے جہاں صدقے
یہ نہیں بلکہ آسماں صدقے

ان دنوں ہے یہی مرا مامن
جنتِ حسن ہے مرا مسکن

# بادِ حسینہ خیالیم...

## طرزِ جدید کا بیحد رنگین افسانہ

از جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی اے

اختر جب اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہو کر دس سال کے بعد اپنے گاؤں میں آیا۔ تو اسے یہاں کے بھولے بھالے لوگوں میں کوئی ایسا شخص نہ مل سکا۔ جو اس کی باتیں پوری توجہ سے سن سکتا۔ اُسے بہت ... کا خبط تھا۔ بچپن ... کے باپ کا کوئی دوست اُن کے مکان پر آتا تھا تو اختر کو کھانے کی بہت سی چیزیں دے دی جاتی تھیں تاکہ وہ ادھر مشغول رہے اور ڈرائنگ روم میں جا کر ... کے سامان کا دماغ نہ چاٹ کھائے۔ پورے دس سال گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے وہ یہاں ... کے ... موضوعات سے بے خبر تھا۔ وہ باتیں کرتا تھا یورپ کی نئی نئی سیاسی چالوں کی، پنجاب اسمبلی کے نئے نئے قوانین کی۔ ہندو مسلم فسادات کی، ... لڑکیوں کی ———
لیکن لڑکیوں کی باتیں وہ اپنے دل ہی سے کیا کرتا تھا۔ یہ نغمہ ابھی تک بلند نہیں ہوا تھا۔

جب وہ آنکھیں نیم وا کر کے ... ذرا اوپر اُٹھا کر، بازوؤں کو جھٹکے دے دے کر روس اور جرمنی کی مخالفت کی داستان دراز ... تو ایک طرف سے آواز آتی۔

"مگر کھلیان پر تو گھاس اُگ رہی ہے۔ پہلے اُسے صاف کریں گے پھر غلہ بھی آجائے گا"

وہ ناک بھوں چڑھا کر اس طرف دیکھتا اور کھسیانا ہو کر کہتا "نور خان! میری باتیں تم نہیں سن رہے؟"

نور خان مونچھوں میں اٹکے ہوئے تنکے کو دیکھنے کے لئے اپنا ہونٹ اوپر چڑھاتا تھا اور پتلیاں پوری قوت سے نیچے کھینچتے ہوئے جواب دیتا "سن رہا ہوں بھائی!" سب لوگ اس کی باتوں کا کچھ نہ کچھ جواب ضرور دیتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک بہت بڑے رئیس کا لڑکا تھا۔ اور رئیسوں کی بے معنی باتوں کا بھی جواب دینا غریبوں پر فرض ہوتا ہے!

اختر پوچھتا "کیا سُنا؟"

"بھئی ——— اب تمہاری باتیں یاد تو رہتی نہیں شاید تم کہہ رہے تھے۔ کہ الٹینیں جرمنی میں بنتی ہیں!"

اختر مایوس مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا "مگر یہ ذکر تو کل ہوا تھا"

اچانک ایک اور جانب کھسر پھسر ہونے لگتی۔

"صرف غلہ؟"

"نہیں۔ گوشت بھی"

"میراثی بھی تھے؟"

"سارے علاقے کے اُستاد"

"آتشبازی؟"

"قیامت مچا دی"

"کتنا خرچ آیا ہوگا؟"

"آٹھ نو سو روپیہ"

"جہیز تھا؟"

"نہیں۔ زندہ باد نہیں"

"نام تو پیدا کر لیا!"

"نام ... تو دنیا جان دیتی ہے۔ نام نہیں تو زندگی نہیں۔ عذاب ہے۔ کلنک کا ٹیکا ہے"

اختر چیخ کر کہتا۔ "بابا احمد دین! میری بات سنی تم نے؟"

بوڑھا اپنی ... چادر سے لمبی جھکی ہوئی ناک پونچھتے ہوئے جواب دیتا "تم کہہ رہے تھے کہ روس کے ملک میں بڑی توپیں ہوتی ہیں۔ بڑے ہوائی جہاز ہوتے ہیں"

"لیکن یہ تو پرسوں کا ذکر تھا!"

جب اُسے ہر طرف سے مایوسی ہو جاتی۔ تو وہ دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھے ہوئے ایک خوبصورت دراز قد نوجوان کی طرف جھک جاتا۔ اور وہ اس کی باتوں کو پوری توجہ سے سنتا۔ لیکن جب کبھی باتیں سنتے سنتے وہ بھی بابا احمد دین یا نور خاں سے باجرے کا بھاؤ پوچھ لیتا۔ تو اختر کی سیاست دانیاں دھری کی دھری رہ جاتیں۔ اور وہ بےبسی کا احساس چھپانے کے لئے کچھ گنگنانے لگتا۔ بہرحال اُسے اس نوجوان سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی۔ کیونکہ ایک بار جب گرداور صاحب آئے تھے اور چوپال پر تیل کے چشموں کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں تو اسی نوجوان خدا بخش نے کہا تھا کہ تیل کے چشمے برما اور امریکہ میں ہیں۔ اب عرب میں بھی تیل کے چشمے نکلنے کی توقع ہے۔ گرداور ایک دہقان کی زبانی یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اور اختر مسرور تھا کہ ان جاہلوں میں ایک شخص تو ایسا ہے کہ اس کی باتیں قدرے کان دھر کر سنتا ہے۔

آج رات کو وہ تمام مجلس سے مایوس ہو کر خدا بخش کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بھی وہاں موجود نہ تھا۔ اس نے ایک دھوبی سے پوچھا "نورے ـ خدا بخش کدھر گیا ہے آج؟"

"بھرتی ہونے۔ کوئی گورا صاحب آیا ہے۔ اچھے اچھے جوان بھرتی کر رہا ہے"

"مگر آجکل سرحد پر تو ......" وہ خاموش ہو گیا۔ نورے دھوبی کے سوا اس کی طرف کوئی متوجہ نہ تھا۔ سب کبڈی کے ہونے والے جلسے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

وہ وہاں سے اُٹھ آیا اور رستے میں سوچنے لگا "اب میں ان جاہلوں کی مجلس میں کبھی نہ بیٹھونگا انہیں تو بس بیل گائے کی فکر کھائے جا رہی ہے انہیں کیا معلوم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اب ایبے سینیا والے مسولینی کے ہولناک ... بم سے بھونے جاچکے تو ان کی بلا سے! فلسطین کے عربوں کی چھاتیاں گولیوں سے آئے دن چھلنی ہو رہی ہیں تو ان کی بلا سے! غریب چینی، امیر جاپانیوں کے قدموں تلے کچلے جا رہے ہیں تو ان کی بلا سے! سب کچھ ان کی بلا سے! انہیں تو بس ایک روٹی کے ٹکڑے کی ضرورت ہے اور شور آسمان سے ... نے ہیں جیسے ساری دنیا پر پلہ بولنے والے ہیں۔ ... سدھرے ہیں نہ سدھرینگے۔ ان بدبختوں کی قسمت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ روشنی کی کرن دیکھتے ہیں۔ تو دم دبا کر بھاگ نکلتے ہیں ——— اُلو ——— سب اُلو!"

> اختر کی آرزوئیں بر آتی ہوئی معلوم ہوتیں اُسے ... ساری ایشیا اپنے انتظار سے بے تاب ... ایک شہ رگ ... سمجھا جاتا ہے ... اس وقت وہ ... امیاں کو ... حجلۂ عروسی کو ... دیکھ کر مغربی اُفق کہ سورج کو گردن سے پکڑ کر اپنی دلہن میں پھینک دے اور بھاگ کر ... سے لپٹ جائے ... لیکن یہ سب ... خواب و خیال تھا ...؟

سامنے سے خدا بخش آ رہا تھا۔ اختر وہیں سے پکارا۔ "کہاں گئے تھے خدا بخش۔ آج سارا دن نظر نہیں آئے"

"بھرتی ہونے"

"پھر ——— سناؤ!"

"صاحب نے نامنظور کر دیا"

"کس لئے؟"

"کہا تھا۔ چال میں کچھ فرق ہے"

"لیکن تم تو اچھے مضبوط جوان ہو۔ صاف قدم ہے تمہارا تو"

"شکر ہے تم بھرتی نہیں ہوئے۔ آجکل سرحد پر پٹھانوں نے قیامت مچا رکھی ہے دیا سلائی کی چمک پر نشانہ باندھتے ہیں کمبخت ——— اور پھر انہیں اوپر سے مار بھی تو لی رہی ہے نا!"

اختر نے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔ اور دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی سے خدا بخش کو سمجھانے لگا۔

"یہ سرحد ہے نا ——— یہ دریائے اٹک ہوا اس طرف پنجاب۔ ادھر سرحد، اس سے پرے افغانستان۔ افغانستان سے پرے روس ——— روس سے پرے ...... لیکن میرے ... کا فائدہ! روس والے پٹھانوں کو مدد دے رہے ہیں انگریزوں کے خلاف۔ افغانستان کے ملکر"

"لیکن بھائی تم نے تو کل کہا تھا کہ روس اور افغان انگریزوں کے دوست ہیں"

"میں نے کب کہا تھا؟ خود بخود باتیں گھڑ لیتے ہو؟ ———" حالانکہ اختر جانتا تھا کہ اس نے یہ بات کل کہی تھی۔ خدا بخش کی ذہانت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ اس کا یہ ارادہ اب پختہ ہو گیا کہ خدا بخش سے یارانہ گانٹھے گا۔ سارے گاؤں میں ایک یہی ذکی نوجوان ہے۔ ملازم ہونے سے قبل کا عرصہ اس کے ساتھ اچھا کٹ جائے گا ——— اور پھر اختر کو خدا بخش سے اور بہت سے کام بھی لینے تھے۔ جو اس کے دل کی گہرائیوں میں قیامت برپا کئے ہوئے تھے!

وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ گدگدے صوفے پر بٹھلایا۔ چائے بنوائی۔

خدا بخش بولا "مگر بھائی اختر میں نے کبھی چائے نہیں پی۔ ایک بار بیمار پڑ گیا تھا۔ حکیم نے کہا تھا۔ قہوہ پیو۔ ساری عمر میں وہی گرم چیز پی ہے میں نے۔ تم خواہ مخواہ چائے بنوا لائے۔ خالہ جی کو تکلیف ہوئی ہوگی"

اختر نے اُسے بازو سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"ارے رہنے بھی دو۔ ایک پیالی پی لو۔ چائے پینا کوئی گناہ تو نہیں کہ تم پچھلی تاریخیں کھول بیٹھے۔ آجکل شہروں میں تو حقے پانی کے بجائے چائے ہی پوچھتے ہیں اور اگر تم اب کوئی نادان کہہ دے کہ "نہیں جی مہربانی" تو بس سمجھو۔ سارا دن بھوکا رہنا پڑ گیا۔ لاہور کی بڑی بڑی دکانوں میں چائے اس اہتمام سے بکتی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ انسان چائے دانی کی ٹونٹی پر منہ رکھ اور آنکھیں بند کر کے ساری کی ساری پی جائے۔ اور خدا بخش ——— جب چائے پلانے والی کوئی انگریزی لڑکی ہو! ——— سفید سفید ننگی پنڈلیوں والی ——— سفید سفید ننگے بازوؤں والی ——— سفید سفید شیشے کے سے صاف گالوں والی میم ——— جو چلتی ہو تو اس کے گالوں پر لہریں سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہوں جو مسکراتی ہو تو اس کی بھری بھری گول ٹھوڑی کے درمیان اور لبوں کے ایک طرف ڈمپل پڑ جاتے ہوں ——— ڈمپل تم جانتے ہو نا ——— گڑھے ——— ننھے ننھے گول گول گڑھے ——— جس کے چست لباس سے اس کے سڈول بھرے بھرے بدن کا عضو عضو پھاڑ کر باہر اُبل پڑنے کا خواہشمند معلوم ہوتا ہوا ——"

خدا بخش نے ایک انگڑائی لی۔ اس نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا "اچھا۔ وہاں لڑکیاں چائے پلاتی ہیں؟"

"تعجب کی بات ہے نا؟"

"بڑے تعجب کی بات"

[illegible]

نوجوان [illegible] نوجوان — عورت مرد کے [illegible] میں گہری دلچسپی لینے والا — عورتوں کا ہولا — اس قدامت پرست گاؤں میں آپھنسا تھا۔ جہاں عورت کو نظر بھر کر دیکھنے کا نتیجہ قتل ہے — تمام متعلقین کی خونریزی ہے۔ — جہاں کسی لڑکی کو اوپر کی گلی پر جاتے جاتے بلا لینا ایک ایسا جرم ہے۔ جو خون سے زیادہ سنگین ہے۔ وہ ان پابندیوں سے گھبرا گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں بھی لاہور کے ہوٹلوں کی بے چین اینگلو انڈین لڑکیوں کی سی چنچل چلبلی چھوکریاں اس سے "شباب بینڈ" کہتے وقت نظریں نیچی کر کے مسکرا لیں — لیکن یہاں تو وہ ایک روز ایک ویرانے میں ایک دہقان لڑکی کو یونہی بلا بیٹھا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے معیار حسن پر پوری نہیں اترتی تھی "کہاں جا رہی ہو؟" — اور اس نے ایک اور لفظ کا بھی آہستہ سے اضافہ کر دیا "پیاری!" اور ایک نوکیلا پتھر اس کے کان کے قریب سے سنناتا ہوا گزر گیا تھا "اگر میں ایک آدھ انچ ادھر سے ہو کر گزرتا تو تمہاری منحوس کھوپڑی سے خون کے فوارے ابلنے لگتے!" — اس دن سے اس پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ [illegible] اور گاؤں کی دوسری [illegible] کی سیاسیات کی باتیں کیا کرتا تھا۔ لڑکیوں کا ذکر کرتے وقت وہ ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی من چلا اس کا گلا ہی نہ گھونٹ دے۔

آج نہایت چالاکی سے اس نے ایک ذکی نوجوان کی نبض کی رفتار معلوم کر لی تھی۔ اور وہ خوش تھا کہ حسن سے کھل کھیلنے کی امنگ میں وہ اس طرح بھی رہے گا کہ خدا بخش سے عورتوں کی اور صرف عورتوں کی باتیں کرتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے۔ دیہات کے رہنے والوں کے محبت کرنے کے طریقے ہی الگ ہوں اور اس طرح خدا بخش کے ذریعے سے کوئی شکار قابو میں آجائے۔ وہ خود بچپن کا زمانہ یہاں کاٹ کر شہروں میں چلا گیا تھا اور جوانی کے ابتدائی ایام اس نے لاہور میں گزارے تھے۔ جہاں انارکلی۔ مال روڈ اور لارنس باغ میں وہ نوخیز تتلیوں کو جی بھر کر دیکھا کرتا تھا۔ اور ہوٹل کے سامنے ایک [illegible] پر رہنے والی ایک اینگلو انڈین نرس سے اس کے [illegible] گہرے تعلقات تھے [illegible]

دوسرے دن جب خدا بخش اسے ملا تو وہ اسے گاؤں سے باہر ایک چراگاہ میں لے گیا۔ دونوں گھاس پر بیٹھ گئے۔ پہلے فصل کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اور آخر اختر بولا "یار مجھے تو اس گاؤں میں ایک تم ہی آزاد طبیعت شخص نظر آتے ہو ورنہ یہاں تو سب کے سب گرجے بستے ہیں۔ [illegible] دس بارہ دن میں سے [illegible] پر جو باتیں کیں۔ وہ ان کے لئے بہت ضروری تھیں۔ [illegible] اونگھنے لگتے تھے۔ [illegible] لیکن تبھی لگتے تھے۔ ایک دن [illegible] کی باتیں [illegible] اور جب ایک بار سب کی طرف دیکھا تو کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ سب اپنی اپنی ہانکے جا رہے تھے۔ ورنہ میں بے وقوفوں کی طرح [illegible] شکر ہے۔ تم میرے ہم خیال نکلے ورنہ بڑی مشکل کا سامنا ہوتا۔ والد صاحب کا اصرار ہے کہ دو چار مہینے گاؤں کی کھلی ہواؤں میں گزارو۔ مگر یہاں تو میرا دم گھٹنے لگتا۔ اب یہاں خوب گزرے گی۔"

خدا بخش صرف مسکرا دیا!

"خدا بخش۔ مجھے یہاں کے مردوں کے متعلق تو کافی تجربہ حاصل ہو گیا ہے۔ سب کو دن بھر اور سب کے دماغوں میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ یہاں کی عورتیں کیسی ہوتی ہیں؟ مجھے کبھی کسی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا!" — اچانک اختر کو وہ لڑکی یاد آگئی جس نے ایک پتھر سے اس کی کھوپڑی کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ جھینپ کر سر کھجانے لگا!

خدا بخش بولا "ان بے چاریوں کو کسی کی باتیں سننے کا وقت ہی نہیں ملتا صبح اٹھ کر جھاڑو دیتی ہیں پنگھٹ پر جاتی ہیں۔ چولہے کے آگے بیٹھی رہتی ہیں باہر کھیتوں میں بھائیوں اور شوہروں کو کھانا دینے جاتی ہیں۔ چرخہ کاتتی ہیں۔ پھر شام ہو جاتی ہے اور وہی پیٹ کا دھندا شروع ہو جاتا ہے۔ اور بھائی میں تو کل تمہاری زبانی لاہور کی باتیں سن کر حیران رہ گیا بڑی آزادی ہے! یہاں ایسی بات نہیں۔ تم نے تو دس بارہ دن یہاں گزارے ہیں۔ میری اتنی عمر گزری ہے۔ لیکن کسی لڑکی سے کھلی بات نہیں کر سکا۔ سب اپنے کام ہیں۔ ان کے اپنے کام۔ وہ الگ مگن رہتی ہیں ہم الگ مست۔ ہمیں تو موقع ہی نہیں ملتا۔ کیا لاہور کی لڑکیوں کیلئے کوئی کام مقرر نہیں؟"

"تم نہ سمجھ سکو گے۔ تم اگر وہاں ایک بازار میں گھومتے ہو۔ اور ادھر سے عورتوں کی ایک ٹولی گزر رہی ہو۔ تو تم جی بھر کر انہیں دیکھ سکتے ہو۔ تمہیں کوئی نہیں روکیگا!"

اختر کو معلوم تھا کہ وہ اپنی باتوں میں ایک حد تک مبالغے کا مرتکب ہو رہا ہے! اور اُسے وہ دن بھی یاد آگیا۔ جب تقریباً ایک میل وہ ایک ٹانگے کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اور میو ہسپتال کے قریب اس ٹانگے سے ایک دیوی نے اتر کر اپنے چمکتے دمکتے سلیپر سے اس کے ننگے سر پر خوب بادام توڑے تھے! اُسے وہ دن بھی یاد آگیا۔ جب ایک گلی سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نوخیز لڑکی کو گھور گھور کر دیکھا تھا۔ لڑکی گائے کے آگے چارہ ڈال رہی تھی۔ اور اختر کو یہ معلوم نہ تھا کہ گائے کی پرلی طرف اس کا بھائی یا شوہر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے اس دن اس نے اتنے گھونسے کھائے تھے کہ وہاں سے فارغ ہو کر اسے لاہور کے ایک مشہور دندان ساز سے مشورہ طلب کرنا پڑا تھا! لیکن وہ جھوٹ اور مبالغہ سے خدا بخش کے دل میں عورت کے حسن کی بہار لوٹنے کا احساس پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ یہ دیکھ کر بے حد مسرور ہو رہا تھا۔ کہ خدا بخش کی آنکھیں نیم عریاں لڑکیوں کی باتیں سن سن کر بند ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ اتنی طویل اور سخت انگڑائیاں لیتا ہے کہ اسکی پسلیاں بجنے لگتی ہیں!

"اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے" اختر نے خدا بخش کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔ "مرد اور عورت کو خدا نے اسلئے پیدا نہیں کیا کہ ایک ہل چلائے اور دوسرا اُپلوں کا دھواں کھائے! مرد اور عورت کو اسقدر قریب ہو جانا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کی دل کی دھڑکن محسوس کر سکیں۔ ایک دوسرے کے لبوں کی گرمی اور ایک دوسرے کے گالوں کی آگ ........"

"مگر ایسا تو نہیں چاہئے! اب تو حیوان کرتے ہیں!" خدا بخش نے قدرے کانپتے ہوئے کہا۔

"اسی لئے تو حیوان ہم سے زیادہ دانا ہیں۔ قانونِ قدرت کی جیسے انہوں نے پیروی کی ہے۔ وہ لاہور اور بمبئی والے لوگ شاید ہی کرتے ہوں ہمیں خدا نے بنایا اسی لئے ہے کہ ہم ........"

خدا بخش بہت دیر تک اختر کی باتیں سنتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ کہ یوں بھی ہو سکتا ہے! اور اگر ایسا ہو سکتا ہے تو کیا یہاں بھی ہو سکتا ہے! اختر بار بار اپنی کامیابی پر مسکراتا تھا۔ کہ اس نے خدا بخش کے دل میں ایک خلش سی پیدا کر لی ہے۔ اور اس نے خدا بخش کی روح کے ساز کے اُن تاروں کو چھیڑ دیا ہے، جن سے نغمے برسنے کے لئے بے تاب ہیں! — نیز وہ اسلئے بھی مسرور تھا کہ عنقریب کوئی بھولی سی دیہاتی لڑکی خدا بخش کی مدد سے اس کے پہلو میں شدت جذبات سے کانپ رہی ہوگی! — وہ اس خیال سے خود بھی کانپ اٹھا!

یورپ کی سیاسیات کا موضوع اب اختر کے نزدیک ایک فرسودہ سی چیز تھی۔ اس نے خدا بخش کو اپنی رنگین گفتگو سے اتنا مست کر دیا۔ کہ ایک دن ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک لڑکی کی اوڑھنی کا پلو کھینچ لیا۔ لڑکی جھینپ کر اوڑھنی کے لئے زمین کی طرف جھکی۔ اس کے بال زمین کو چھونے لگے۔ اور اس کے گال گلابی پڑ گئے۔ خدا بخش اختر کی پسلیوں میں گدگدی کرتا دور بھاگ گیا!

اختر کی آرزوئیں بر آتی ہوتی معلوم ہوئیں — اسے میٹھا میٹھا بخار سا رہنے لگا — انتظار کا بخار جو اکثر اس دولھا میاں کو ہو جاتا ہے جو حجلۂ عروسی کو دور سے دیکھ کر چاہتا ہے کہ سورج کو گردن سے پکڑ کر مغربی افق میں پھینک دے اور بھاگ کر اپنی دلھن سے لپٹ جائے!

ایک دن اچانک خدا بخش کی زبانی یہ خبر سنکر اختر خوشی سے ناچنے لگا۔ کہ کل خدا بخش کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ سوچنے لگا "جو کچھ میری باتوں سے خدا بخش کے دل پر اثر پڑا وہ اب تجربہ کی روشنی پاکر مکمل ہو جائے گا۔ اور اسے اچھی طرح معلوم ہو جائیگا کہ اختر کو بھی میری طرح ایک نوخیز لڑکی کی ضرورت ہے۔"

# شاعر کی محبوبہ

از حضرت رعنا اکبر آبادی

جذبات کے طوفاں میں تسکین کی آبادی
اور رنگ تفکر پر تخییل کی شہزادی

لفظوں کے تلاطم میں کھویا ہوا افسانہ
ہر شعر کے دامن میں سویا ہوا افسانہ

تمثیل نزاکت میں خوشرنگ غزل جیسے
تشریح لطافت میں مفہوم غزل جیسے

تخئیل کے مندر میں اک شہر جبیں مورت
ہو چاند کی کرنوں سے پیدا وہ حسیں مورت

غنچہ کے تبسم میں تنویر نہاں جس کی
آئینۂ شبنم سے تصویر عیاں جس کی

ہے جس کی تجلی سے فطرت کی خود آرائی
اک عمر ابد جس کی شادابی و برنائی

تاروں کی بلندی تک آوازۂ حسن اسکا
زہرہ کو بھی ناممکن اندازۂ حسن اُس کا

وہ جس کو مصور کی قدرت بھی نہیں پاتی
وہ حسن کی دیوی جو خوابوں میں نہیں آتی

محبوبہ شاعر ہے شاعر کی نگاہوں میں
احساس میں جذبہ ہے انفاس میں آہوں میں


باقی بر صفحہ ۳۶

# شاہی باورچی

از جناب شعلہ وارثی لکھنوی

**نواب واجد علی شاہ کے باورچی کے حیرت انگیز کمالات ۔ درخت کی نارنگیوں کو بغیر چھوئے شیریں بنا دیا ۔ ایک پیسہ کی منو کی دال ہیں جو [illegible] روپے کا مصالحہ**

لکھنؤ کا وہ رنگین عہد جو شاہی یا نوابی کے نام سے زبان پر آتا ہے اپنی دلکشی کے اعتبار سے یقیناً اپنی نظیر رکھتا تھا ۔ افسوس کہ وہ شاد و آباد زمانہ دیکھنے والے اب اللہ کو پیارے ہو چکے ۔ معاشرت کا چولا بدل گیا اور پرانی تہذیب بھی [illegible] سانچہ میں ڈھل چکی پھر بھی پرانے لوگوں کی اکثریت [illegible] جب تک عالم [illegible] علی شاہ کے زمانہ کی داستانیں پھر پرانی [illegible] گزشتہ واقعات مزے لے لے کر اپنی زبانوں کی طرح دلوں کو موہ لیتے ہیں اور تصور [illegible] وہ تصویریں ہر پھر کے لگتی ہیں جن کی طرب سامانیوں نے بھی لکھنؤ کو دلہن بنا رکھا تھا ۔

خدا بہانے یہ لکھنؤ والے کس [illegible] دیکھا ہے جو نہ تو پھولوں کی مہک بکھر گئی مگر ابھی غیر فانی یاد کے نقوش [illegible] چھوڑ گئے [illegible] کا نام نہیں [illegible] زمانہ ان کو پہچانتا ہے اور وہ تعلقا ہے دنیا انکا افسانہ سننے کی مشتاق رہتی ہے لیکن افسوس کہ وہ لوگ اب ہیں کہاں ؟

لکھنؤ کا پھولا پھلا چمن جب خزاں کے ہاتھوں برباد ہو چکا ۔ جان عالم واجد علی شاہ مع اہل و عیال لکھنؤ سے رخصت ہو کر مٹیا برج کی بستی بسا چکے اور سنہ ۵ کا ہولناک فتنہ ختم ہو چکا تو اودھ کے خاندان بہادر فرمانروا آتا سے دلی قسمت کے حضور میں پھر حاضر ہونے لگے رفتہ رفتہ بیس بائیس ہزار نمک خواروں کی جمعیت ہو گئی اور امنڈ دریا کے ہگلی کا وہ ساحلی حصہ یعنی مٹیا برج ایک چھوٹا سا لکھنؤ بن گیا ۔

ان انیوالوں میں ہر فن و سال اور ہر علم و فن کے جاننے والے لوگ تھے جو قدر دان مالک کے زیر سایہ زندگی کے دن پورے کرنا چاہتے تھے شاہی تو باقی نہ تھی لیکن شاہی کا جملہ ساز و سامان موجود تھا دربار لگتا تھا فرامین جاری ہوتے تھے خلعت و خطابات کی تقسیم جاری تھی سیرو تفریح کیلئے لکھنؤ کے نقشہ پر محلات کوٹھیاں باغات تعمیر ہوئے اور اسی طرح کے بازار بھی بنائے گئے تفریح کیلئے ایک رمنہ بنایا گیا جس میں جانور پالے گئے اور ان جانوروں کی دیکھ بھال [illegible] نوابی کے سپرد کی گئی ۔ شام کا [illegible] سے کچھ پہلے خود بدولت چند ندیموں کے جھرمٹ

میں تو پیدا ہو یا ہوا [illegible] کی سیر کو تشریف لیجایا کرتے تھے اگر کسی تنہ پر کچھ عرض معروض کرنا ہوتا تو وہ پہلے سے رمنہ میں موجود رہتا ۔ جب حضرت جانوروں کو دانہ کھلوا کر واپس تشریف فرماتے تو مجرا بجا لا کر عرضداشت پیش کرتا اور اسی وقت کوئی نہ کوئی حکم صادر کرا [illegible] ۔

جانوروں کی صحت بحال رکھنے کیلئے [illegible] میں سبزہ لگا [illegible] تیاری کی گئی تھی [illegible] اور بغیر پھلوں نے ثمر لیا تو جیلا [illegible] کی بار [illegible] امرود ، لیمو ، نارنگی ، لیموں ، کیلے اور پپیتے وغیرہ کے [illegible] درخت اپنی اپنی فصل پر پھلتے اور منتظمین انہی جانوروں کو سیر [illegible] کرتے تھے ۔

ایک دن بادشاہ کی سواری ایسے موسم میں آئی جب درختوں پر کثرت سے نارنگیاں لگی ہوئی تھیں انکی شوخ و شاداب سُرخی [illegible] نے سرسبز چمن میں آگ [illegible] لگا رکھی تھی اور باغ کا نقشہ کیا دلکش بنا رکھا تھا ۔ ہوا کی جیسی بھینی خوشبو نے فضا کو معطر کر دیا تھا ۔ اتفاقاً سواری ایسے درخت کے نیچے سے گزری جس کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں ۔ نہ معلوم کیا لہر آئی کہ حضرت نے ہاتھ بڑھا کر ایک نارنگی توڑ لی ۔ کھا کر اس کے رنگ و روپ ملاحظہ کیا ۔ خوشبو سونگھی اور تعریف کی ۔ ندیموں نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے توصیف کا پُل باندھا ۔ اس گفتگو سے دل میں کھانے کی خواہش پیدا ہو گئی ۔ حضرت ظل سبحانی نے چھلکا چھیل کر ایک پھانک نوش کی ۔ لیکن رس کی ترشی نے سارا مزہ کرکرا کر دیا ۔ طبع ہمایوں مکدر ہوئی اور بقیہ نارنگی پھینک دی ۔ اسی اثنا میں میاں منو نے سامنے آکر مجرا عرض کیا ۔

منو میاں شاہی باورچی اور رکابدار تھے جو اپنے کمال کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور اور برد [illegible] تھے ۔ انکی صورت دیکھتے ہی جان عالم کو انکے کمال کا خیال آ گیا اور مصاحبین سے متوجہ ہو کر چند تعریفی جملے ارشاد کئے ۔ پھر منو میاں سے مخاطب ہو کر فرمایا ۔ تم ان نارنگیوں کو بھی شیریں بنا سکتے ہو ۔ منو میاں نے دست بستہ التماس کی حضور کے اقبال سے بنا سکتا ہوں ۔ فرمایا لیکن اس شرط کیساتھ کہ نارنگیاں نہ تو شاخ سے جدا ہوں اور نہ انکی قدرتی [illegible] میں کسی قسم کا فرق آنے پائے ۔ منو میاں نے

[illegible] کی رضا مندی چاہا تو ایسا ہی ہوگا ۔ حکم ہوا کہ پھر اس درخت کی نارنگیوں کو شیریں بنا دو ۔ عرض کی کہ حضور [illegible] بادشاہ نے پوچھا کتنا [illegible] جواب [illegible] کی ۔ جب سرکار حکم دیں ۔ فرمایا کل اسی وقت تک تیار ہو جائیں ۔ منو میاں نے جواب دیا بہت اچھا ۔

اس سوال و جواب کے بعد خزانچی کو حکم دے دیا گیا کہ میاں منو کو بقدر [illegible] کی ضرورت ہو دیا جائے ۔ منو میاں نے [illegible] کے [illegible] لیکر پوا کر دیا [illegible] کے مطابق [illegible] روپیہ وصول کر کے سامان خریدا اور صبح سے کام جاری کر دیا ۔ ابھی عالم کی سواری آنے میں کچھ باقی تھا کہ منو میاں نے [illegible] لکھوا دیں ۔ بادشاہ [illegible] اس درخت کو ملاحظہ فرمایا نارنگیاں بدستور شاخوں میں جھول رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کسی نے [illegible] تک نہیں [illegible] ۔ [illegible] اور رونق بھی جوں کی توں [illegible] پر بھی کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی تو منو میاں سے دریافت کیا کیا نارنگیاں بگڑیں ؟ منو میاں نے بایں ادب سے گذارش کی ۔ حضور کے اقبال سے ہو گئیں ۔

بادشاہ نے ہاتھ بڑھا کر چند نارنگیوں کو شاخ سے جدا کیا ۔ کھا کر ان کے رنگ روپ [illegible] ۔ [illegible] پھر ایک ایک نارنگی ندیموں کو عطا کی اور ایک نارنگی کا چھلکا اتار کر خود بدولت نے نوش فرمانا شروع کیا ۔ رس کی [illegible] و لطافت نے متحیر کر دیا ۔ شیرینی کا یہ عالم تھا کہ ہونٹ سے ہونٹ چپکا جاتا تھا ۔ اتفاق ایسا کہ اس سے پہلے کبھی نارنگی میں محسوس نہیں ہوا تھا لیکن ان خوبیوں کے باوجود اصلی [illegible] ذرا بھی فرق نہ تھا

خود بدولت نے میاں منو کے اعلیٰ کمال کا اعتراف فرمایا ۔ ساتھ ہی چاروں طرف سے تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسنے لگے میاں منو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے شاہی ادب قاعدہ کے مطابق جھک جھک کر آداب بجا لا رہے تھے [illegible] اور [illegible] کی [illegible] اور شاہی داد یا [illegible] بہت [illegible] آ [illegible]

[illegible] خانہ زاد نواز ایسا کو خوش پا کر دست بستہ التماس کی ۔ سرکار اخانہ زاد نے پھل و نقل کا [illegible] کیلئے [illegible] درخت میں صرف ایک نارنگی [illegible] چھوڑ دی ہے حضور حکم دیں کہ کوئی نظر باز وہ نارنگی پہچان کر توڑ لے ۔

بادشاہ نے منو میاں کی گذارش کو حیرت سے سنا ۔ درخت پر نگاہ کی اور ندیموں کو حکم دیا کہ پہچان کر بغیر کچھی نارنگی توڑیں ۔ باری باری سے کئی مصاحبوں نے تجسس و تلاش کی ۔ ایک ایک دو دو نارنگیاں بھی توڑیں لیکن ان میں بے تکی ہوئی نارنگی نہیں نکلی ۔ جب تمام مصاحبین اپنی اپنی کوشش میں ناکام رہے تو خود بدولت نے میاں منو کو حکم دیا کہ اب وہ خود ہی نارنگی توڑ کر پیش کریں ۔ منو میاں نے حکم کی تعمیل کی اور بالکل سامنے والی ٹہنی سے ایک نارنگی توڑ کر حاضر کی اور عرض پیرا ہوئے کہ سرکار اس نارنگی کی ایک پھانک نوش فرمائیں اور بغیر رس نارنگی کا فرق بھی ملاحظہ فرمالیں ۔ تجربہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ نارنگی بالکل اصلی حالت پر تھی اور اس میں وہی ترشی موجود تھی جو ایک روز پہلے تجربہ میں آ چکی تھی ۔ بادشاہ اس کمال سے بیحد مسرور ہوئے اور اسی وقت انعام میں منو میاں کو پانچسو روپیہ نقد دینے کا حکم فرمادیا ۔ نارنگیاں بنانیکے مصارف علیحدہ تھے جو انعام کی رقم سے کم نہ تھے ۔

یوں تو منو میاں بادشاہ کے خاص رکابدار اور باورچیوں میں شمار کئے جاتے تھے لیکن اس دن سے بادشاہ کی نظر عنایت ان پر بہت زیادہ ہو گئی ۔ وہ روزانہ کوئی نہ کوئی چیز تیار کر کے بادشاہ کے دستر خوان پر بھیجتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہوتے ۔ یہ طریقہ اس وقت تک جاری رہا جبتک یہ بے تاج و تخت کا سلطان زندہ رہا اور جب اس نے زندگی کا خلعت اتار کر موت کا جامہ پہنا اور دنیا کے علائق سے کنارہ کش ہو کر اپنا کسی ہوں آسودہ ہو گیا تو شاہی کا سارا [illegible] بھی درہم برہم ہو گیا ۔ اور وہ [illegible] لوگ نوکریاں جانے کے بعد عافیت سے بیٹھنے کا ٹھکانا ڈھونڈ رہا تھا ۔ وہ سب دوبارہ کرنے کی بنا میں مبتلا ہو گئے اور [illegible] منہ اٹھا ہوا [illegible] ۔

منو میاں بھی [illegible]

چنانچہ لکھنؤ میں شاہی باورچی کی بڑی تعریف ہوتی تھی۔ جب ضرورتوں نے مجبور کیا تو لکھنؤ سے اور کسی قدر روانی آگئی تو انہوں نے پھر پکانا شروع کیا۔ لیکن خاطر خواہ کوئی مدد نہ ملی۔ گذشتہ حالات سے تنگ آکر وہ واپس لکھنؤ آگئے۔ میں تمام ہندوستان گھوم چکے ہیں۔ کئی نواب بھی ہیں۔ لیکن قسمت کا کچھ سہارا نہ ہوا۔ آخر کار شہروں کی خاک چھاننے کے بعد حیدرآباد پہنچے۔ اگرچہ یہاں کی آبادی متوسط طبقہ کے لوگوں کی تھی تاہم وہ تین گھرانے معمولی تھے۔ نہیں گھرانوں میں سے ایک گھرانہ میاں صاحب کا تھا جو اپنے تمول اور امیرانہ شان و شوکت کے اعتبار سے اس طرف بہت مشہور تھا۔ اور دوسرا بڑا جاگیردار خاندان تھا۔ اس زمانہ میں جاگیرداری خاندان کے ایک بزرگ سردار جنگ صاحب تھے جو بہت مشہور اور متمول تھے۔ منو میاں نے لوگوں سے ان کا نام سنا اور ایک روز سردار صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ مختصر لفظوں میں اپنی رام کہانی اور جانے ہوئے کی وجہ بیان کی۔ اگلے ہاتھوں یہ بھی عرض کر دیا کہ بکاولی اور انواع و اقسام کے کھانے پکانے کے علاوہ دالیں پکانے میں خاص مہارت رکھتا ہوں۔

سردار صاحب نے متجسس نگاہوں سے منو میاں کو دیکھا۔ معنی خیز طریقہ سے مسکرائے۔ پھر فدائیہ صورت بنا کر کہنے لگے۔ "تو تم شاہی باورچی ہو۔" منو میاں نے جواب دیا۔ "جی ہاں سرکار۔ اور سکا بدار بھی ہوں۔ شاہ اودھ کے ہاں برسوں رکابداری اور باورچی کی خدمت انجام دیتا رہا ہوں۔" سردار صاحب نے کہا۔ "تو کیا تم اپنی استادی کا کوئی نمونہ دکھا سکتے ہو۔" جواب دیا "کیوں نہیں سرکار۔" سردار صاحب نے کہا۔ "تو پھر کل دوپہر کے کھانے میں تمہارے ہاتھ کی پکی ہوئی منسور کی دال ہونا چاہیئے۔" منو میاں نے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہنے لگے۔ "کیا منسور کی دال؟" سردار صاحب نے اپنی فرمائش پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں منسور کی دال۔" جواب دیا "بہتر ہے لیکن سرکار، ہم کو تمام سامان کہاں سے ملیگا؟" سردار صاحب نے کہا۔ "تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو ہمارے باورچی خانے سے منگوا لو۔" جواب دیا "بہتر ہے۔"

دوسرے دن دوپہر کے وقت روزمرہ معمول کے مطابق کھانے کیساتھ منسور کی دال بھی دسترخوان پر رکھی گئی۔ جب سب سے پہلے سردار صاحب اور اُن کے مصاحبین نے اسی کو ملاحظہ کیا۔ دال واقعتاً نہایت لذیذ بنی تھی۔ بہت مزے لے لیکر کھائی گئی۔ سب چٹخارے لیتے گئے۔ اور ہر لقمہ کو جتنی مرتبہ چبایا اتنی ہی دفعہ منو میاں کی تعریف میں کوئی نہ کوئی کلمہ زبان سے نکل گیا۔ دال کا آخری لقمہ اٹھاتے وقت سردار صاحب کو دفعتاً یہ خیال آگیا کہ منو میاں نے خود کو شاہی باورچی بتایا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ سردار صاحب کا بچپن عود آیا اور اٹھتے گھبرا کر منو میاں سے سوال کیا۔ "منو میاں، دال تو واقعتاً نہایت لذیذ اور لاجواب بنی ہے مگر اس پر خرچ کتنا ہوا ہے ذرا صاحب تو بتاؤ۔" یہ کہہ کر سردار صاحب نے لقمہ تو منہ میں ڈال دیا اور جواب کے انتظار میں منو میاں کا منہ تکنے لگے۔ منو میاں نے جواب دیا۔ "سرکار دال تو صرف تین ہی پائی کی ہے لیکن مرچ، زعفران، کستوری، بادام اور دیگر مصالحوں میں چونتیس (۳۴) روپے خرچ ہوئے ہیں۔" ابھی جواب پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ سردار صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں حیرت کی وجہ سے پھٹ گئیں اور منہ سے بیساختہ یہ جملہ نکل کر فضا میں گونج ہوا۔ منو میاں کے کانوں تک پہنچ گیا۔ "چونتیس (۳۴) روپیہ تین پائی کا خرچ!" منو میاں کے لئے یہ جملہ ناقابل برداشت تھا اسلئے کہ انہوں نے وہ زندگی دیکھی تھی جہاں خود نواب بے فکر طرح نہایت بے پروائی کیسا تھ زندگی بسر کرتے تھے۔ "اتنا خرچ" کے الفاظ اُنکو انتہائی گراں گذرے۔ چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ ہونٹ پھڑکنے لگے اور تمام جسم میں کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور چونتیس (۳۴) روپے تین پائی دسترخوان پر پھینک کر اپنی پیٹی اُٹھائی اور سردار صاحب پر ایک نہایت خوبصورت آوازہ کستے ہوئے وہاں سے چلے آئے کہ

یہ منہ اور منسور کی دال - لاحول ولا

اس واقعہ کے گزرنے کے بعد منو میاں لکھنؤ واپس چلے آئے اور شاہی خدمتگذاری کے بعد پھر کسی کی ملازمت نہیں کی جبتک زندہ رہے لکھنؤ کے رؤسا اور اُمرا کی تقریبوں میں کھانا پکانے کی خدمت انجام دیتے رہے اور اسی کے معاوضہ سے اپنی ضروریات زندگی پوری کرتے رہے۔"

"یہ منہ اور منسور کی دال" والی پھبتی اسی کامل الفن باورچی کی کہی ہوئی ہے جو آج تک ہر شخص کی زبان پر موجود ہے اور منو میاں کی یاد تازہ کراتی رہتی ہے منو میاں اب عیش باغ کے گورستان میں آرام سے میٹھی نیند سو رہے ہیں - خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

# مادر پدر خیسالیم بقیہ صفحہ ۳۴

قسمت نے اس کی مطلب برآری کے لئے خود بخود ایک نیا سامان پیدا کر دیا تھا: ؎

کچھ ہمارا بھی انتظام کرو!

وہ اب اکثر یہ غزل گنگنایا کرتا تھا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ دلہن خدابخش کے گھر آگئی - اختر ساری رات جاگتا رہا۔ وہ بے چین ہو کر کئی بار کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کئی بار آتشدان پر سر رکھکر چشم تصور سے خدابخش کو دیکھتا رہا۔ جو حجلۂ عروسی میں اپنی دلہن کو پہلو میں بٹھائے مسکرا رہا تھا!

منہ اندھیرے ہی وہ گھر سے نکل کر خدابخش کی طرف بھاگا۔ اس کا ارادہ تھا کہ آج اسے کھلم کھلا کہہ دے گا کہ تم نے دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکے کو ایک نوجوان لڑکی کی کس قدر ضرورت ہے ؎

کچھ ہمارا بھی انتظام کرو!"

وہ خدابخش کے دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا۔ کہ پیچھے سے اسے کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی - ایک شخص سر پر لکڑیوں کا بہت بھاری گٹھا اُٹھائے اس کی طرف آ رہا تھا۔

"کون؟" اس نے پوچھا۔

"خدابخش"

اختر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ سر کے بل زمین پر کھڑا ہے! اسے تمام کائنات الٹ پلٹ ہوتی ہوئی معلوم ہوئی!

"مگر خدابخش آج رات تو ......"

خدابخش بات کاٹتے ہوئے بولا - "اب میری بیوی تمام زندگی میرے پاس رہے گی۔ آج رات کے بعد کوئی اسے چھین کر تھوڑا ہی لے جائے گا۔ کہ میں اپنے گھر کا ضروری کام بھول کر اس سے چمٹا رہتا۔ شادی پر تمام لکڑیاں خرچ ہو گئی تھیں - میں نے کہا چلو آج رات جنگل سے ایک گٹھا ہی لے آؤں!"

اختر کی تمام امیدیں ذبح ہو کر رہ گئیں مگر ناامیدیوں کی گہرائی سے ایک نئی امید تھرتھراتی ہوئی اُبھری اور اس کے تحت ہو اس پر چھا گئی "ابھی سے مایوس ہونا ٹھیک نہیں۔ دس بارہ دنوں کے بعد خدابخش سے یہ ذکر کر دوں گا۔ اس وقت تک وہ میرا فلسفہ کافی حد تک سمجھ چکا ہوگا۔ اور پھر اتنی تیزی بھی تو بجا نہیں!"

وہ جان بوجھ کر خدابخش کو دس دن نہ ملا - گیارھویں روز اچانک خدابخش سے اس کی گاؤں سے باہر ایک کنج پر مڈبھیڑ ہو گئی۔

"بھائی اختر، تم کبھی نظر ہی نہیں آئے - کیا بات ہے!"

اب اختر سے نہ رہا گیا - بولا "بھائی تمہیں ایک بھری بھالی لڑکی سے کھیلنے ہی سے فرصت کہاں کہ مجھے ملتے پھرو - راتیں تو خیر تمہاری ہی ہیں۔ کیا دن کو بھی اس کی گود میں بیٹھے رہتے ہو؟"

وہ اس سے آگے اپنا وہ مقصد بیان کر دینا چاہتا تھا جس کی خاطر اس نے خدابخش کو پورا ایک مہینہ چاشنے پلائی تھی۔ لیکن پہلے وہ خدابخش کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

خدابخش کی آنکھوں میں یہ بات سُن کر سُرخی سی آگئی - اس کے لبوں کی مسکراہٹ نابود ہو گئی۔ کہنے لگا: "اختر تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ اب میں شادی شدہ ہوں۔ میرا گھر بار ہے۔ بچوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔ کوئی شخص اپنی بیوی کے متعلق اس قسم کی ناروا باتیں نہیں سننا چاہتا —— سناؤ۔ آجکل روس لڑائی کی تیاری کر رہا ہے نا؟"

اختر کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا - بولا "نہیں!" اور سلام علیکم کہے بغیر اپنے گھر چلا آیا۔ آتے ہی اپنے والد کو ایک خط لکھا -

قبلہ والد صاحب! نیاز

میں اب گاؤں میں ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتا۔ یہاں کے لوگ گدھے ہیں اُلو ہیں۔ پتھر کے بُت ہیں۔ یہاں نہ کوئی میری بات سمجھتا ہے۔ نہ سنتا ہے۔ مجھے بیلوں کی نسلوں اور بیج کی قسموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ میرا کیریر (Career) تباہ نہ کریں۔ بواپسی ڈاک اطلاع بخشیں کہ میں کب تک لاہور پہنچ جاؤں۔

اختر

اور جس دن وہ گھر سے روانہ ہوا۔ تو ایک بوڑھا اُسے گلی میں ملا اور بولا "کہو میاں اختر۔ آج کل انگریزوں اور جرمنوں کے تعلقات کیسے ہیں؟"

اختر کچھ کہے بغیر آگے نکل گیا۔ اور آنکھیں جھپکاتے اور سر کھجاتے ہوئے بولا "کمبخت جوانی ہی میں بہرہ ہو گیا!"

دو چار لڑکیاں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں ہونٹوں پر انگلیوں رکھ کر اتنا ہنسیں کہ اختر نے بدحواس ہو کر ایک پتھر سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل ایک جھاڑی میں جا گرا!

دور کسی پہاڑی پر کوئی لڑکی گھاس کاٹتے ہوئے گا رہی تھی: ؎

پردیس نہ جاؤ!

پیتم

پردیس نہ جاؤ!

جوانی ضائع کرنے کے لئے نہیں ہوتی

پیتم

پردیس نہ جاؤ!

اس نے دانت پیس کر گاؤں کی طرف دیکھا اور جی ہی جی میں اس شاعر کو بُرا بھلا کہنے لگا جس نے دیہاتی لڑکیوں کے گانے کے لئے ایسا غلط اور ناقابل عمل خیال نظم کیا تھا!

## ہمیشہ خیام پڑھیے

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل

# ملاپ

## روسی مصنف رومانوف کے رومان آفریں افسانے کا ترجمہ

از جناب ابوالفضل راز چاندپوری

سالانہ امتحان ختم ہو چکا تھا۔ طلبہ اور طالبات تعلیم سے سبکدوش ہو کر اپنے اپنے گھر کو جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بعض زندہ دل طلبہ نے لینا کے یہاں ایک الوداعی جلسہ کا انتظام کیا تھا جس میں طلبہ کے علاوہ چند بے تکلف احباب بھی مدعو تھے۔ تمام مہمان وقت مقررہ پر آ گئے تھے اور ہنسی خوشی کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک نووارد مہمان کے آنے کی اطلاع ملی۔ لینا اس کے خیر مقدم کے لئے دروازہ پر گئی مگر اسے دیکھ کر کچھ پریشان سی ہو گئی۔

وکٹر اندر داخل ہوا اور حاضرین پر ایک غلط انداز نگاہ ڈال کر ایک گوشہ میں جا بیٹھا۔

وکٹر میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور لینا کو محبت آمیز نگاہ سے دیکھتا تھا، مگر لینا اس سے زیادہ مانوس نہ تھی۔ اس کے خیال میں وکٹر شرمیلا، خاموش اور افسردہ دل نوجوان تھا کیونکہ وہ دوسروں کی طرح اپنے احباب کے ساتھ ہنسی مذاق میں کوئی حصہ نہ لیتا تھا۔ اگرچہ لینا کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ عقلمند، ہوشیار اور قابلِ اعتماد ہے، نیز دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں حسین و خوشرو ہے لیکن وہ اسکی سنجیدگی کو پسند نہ کرتی تھی۔

لینا جو اس مجلس کی روحِ رواں تھی۔ اسوقت بیحد مسرور تھی۔ مفرطِ مسرت سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور وہ بات بات پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ کمرہ کی فضا زندگی و زندہ دلی کا آئینہ بن گئی تھی۔ ہر شخص مسرور و شادمان تھا۔ لینا ایک حسین تیتری کی طرح ادھر اُدھر رقصاں تھی۔ یکایک وہ ایک خاص انداز دلربائی سے ایک کوچ پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ وہ وکٹر کی خاموشی و سنجیدگی سے متنفر تھی، مگر اس کی موجودگی کا احساس اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا اور وہ فطرۃً اپنے حسن و رعنائی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھی۔ وکٹر خاموش بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

جیسے ہی لینا کوچ پر بیٹھی سائمن، جو ایک شادی شدہ نوجوان تھا، اس کے پاس جا بیٹھا اور سرگوشیاں کرنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی رفیقۂ حیات لیزا نے ایک قہقہہ مارا۔ لینا نے وکٹر کی جانب دزدیدہ نگاہ ڈالی جو خاموش بیٹھا ہوا اس کی حرکات دیکھ رہا تھا اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ وکٹر کے مقابلہ میں سائمن سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے، مسکراتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور سائمن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کمرہ سے باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر تک برآمدہ سے قہقہوں کی آواز آتی رہی گویا لینا وکٹر کو اس بات کا یقین دلانا چاہتی تھی کہ متانت و سنجیدگی کے مقابلہ میں اسے زندہ دلی اور خوش طبعی زیادہ مرغوب ہے۔ یکایک کمرہ میں سکوت چھا گیا اور حاضرین جلسہ ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اسوقت کسی نے لیزا سے کہا۔

"جاؤ تم اپنے شوہر کی خبر لو، کہیں ——— ؟"

"اوہ! اس کا کیا اندیشہ ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔"

یہ جواب سنکر حاضرین نے ایک قہقہہ مارا۔ وکٹر اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

---

وکٹر کے چلے جانے کے بعد لینا اور سائمن کمرہ میں واپس آ گئے۔ لینا نے آتے ہی کہا۔

"وہ چلا گیا۔ اچھا ہوا۔ میں اس کی سنجیدگی سے تنگ آ گئی ہوں۔"

"یہ خود تمہارا قصور ہے۔ کیا تم کبھی کسی سے محبت نہ کرو گی۔ کیا واقعی تم کو وکٹر سے محبت نہیں ہے؟" لیزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر میں نے کبھی ایسا خیال نہیں کیا، کہ میں اس شخص سے محبت کروں جو مجھ کو اپنی ملکیت سمجھے اور ہمیشہ میری نگرانی کرتا رہے۔"

"تو کیا واقعی تمہیں اس سے محبت نہیں ہے؟ وہ نہایت شریف، متین، عقلمند اور وضعدار شخص ہے۔ کاش! میرے سائمن میں یہ صفات اس سے نصف ہی ہوتیں۔" لیزا نے ایک معنی خیز انداز سے کہا۔ سائمن نے متعجب ہو کر لیزا کی طرف دیکھا۔

لینا نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیزا نے پھر پوچھا۔

"تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ایک عورت کو کسی سنجیدہ شخص سے محبت نہ کرنی چاہئے۔ اور کیا سنجیدہ محبت میں کوئی لطف نہیں ہوتا؟"

"یہ فضول بات ہے۔ جب میں کمسن تھی تو میری ماں مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اس میں سنجیدگی تھی۔ مگر اب اس عمر میں مجھے ایسی محبت کی ضرورت نہیں۔" لینا نے متانت سے جواب دیا۔

"اچھا، لیکن سچ کہنا کیا وکٹر کے چلے جانے کے بعد تمہارے دل میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوا؟"

"یہ سوال بیکار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ میری آزادی کو سلب کرنا چاہتا ہے۔ ... میں کسی سے ہنستی بولتی ہوں تو اسکو ناگوار گزرتا ہے۔ یہ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ کسی کی محکوم بن ... "

"لیکن حقیقی محبت میں یہ خیال کرنا کہ کون کس کا محکوم ہے، ایک مہمل سی بات ہے۔ لینا! تمہیں ابھی دنیا کا تجربہ نہیں ہے ——— ۔"

"نہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں خوش و خرم اور آزاد رہنا چاہتی ہوں۔"

یہ گفتگو کچھ خوشگوار ثابت نہ ہوئی۔ رات بھی زیادہ گزر چکی تھی۔ لہٰذا جلسہ برخاست کر دیا گیا۔

لینا نے تھوڑی دور تک مہمانوں کی مشایعت کی اور شب بخیر کہہ کر اپنے گھر کی طرف واپس ہوئی۔ یکایک وکٹر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔

---

چند لمحے ساکت و صامت رہنے کے بعد لینا وکٹر سے مخاطب ہوئی۔

"آخر یہ کیا حرکت ہے۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس کی بابت؟"

"تمہیں خود معلوم ہے۔"

"نہیں، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔"

"بہت اچھا۔ میں تمہیں بتاؤں گا۔ چلو ذرا آگے بڑھو۔"

لینا بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ ہولی۔ کچھ دور آگے بڑھ کر وکٹر نے کہا۔

"تمکو معلوم ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ مجھے سائمن کی طرح بیوقوف بننا نہیں آتا۔ وہ بدتہذیب دہقانی ——— ؟"

"بس بس۔ خوش و خرم رہنا، ہنسنا ہنسانا قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔"

"اور تم اس کی بدتمیزی اور مسخرہ پن کو پسند کرتی ہو۔"

"میں یہ بتلانے کے لئے مجبور نہیں ہوں۔"

"اچھا۔ مگر کیا تم کو واقعی سنجیدگی سے نفرت ہے اور کیا اس شخص سے محبت کر سکتی ہو جو زیادہ گھر رہے ... تم صرف اور ہر وقت تم کو ہنساتا رہے؟"

"تم ظاہری حال دیکھ کر کسی کے دل کا حال معلوم نہیں کر سکتے۔ میں تم سے بارہا کہہ چکی ہوں کہ مجھے تمہاری خاموشی و سنجیدگی سے نفرت ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم میری آزادی کے مخالف ہو۔"

"یعنی؟"

"یعنی۔ تم ہمیشہ ایک محافظ کی طرح میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو اور عام مردوں کی طرح مجھے اپنا محکوم بنانے پر آمادہ ہو، اس لئے میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔"

وکٹر خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اسوقت وہ دریا کے کنارے پشتے پر کھڑے تھے۔ وکٹر نے مایوسانہ لہجے میں پھر پوچھا۔

"تو بس یہی فیصلہ ہے؟"

"کیا ابھی تک تمہیں شک ہے؟"

"تو میں تمہارا دشمن ہوں۔ تمکو مجھ سے نفرت ہے۔"

لینا نے بھی غصہ سے جواب دیا۔

یہ جواب سنکر وکٹر کا غم و غصہ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اور ایک وحشی شیر کی طرح لینا کی طرف بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹی اور دھڑام سے دریا میں جا پڑی۔ یہ دیکھ کر وکٹر کے ہوش و حواس کچھ درست ہوئے۔ اُس نے خوفزدہ ہو کر دریا کی طرف دیکھا مگر سطحِ دریا کو ساکن پایا اور وہ اپنی قیامگاہ کی جانب چلا گیا۔

---

رات بھر وکٹر خوف و پریشانی میں مبتلا رہا۔ صبح ہوتے ہی اس نے سامان سفر درست کیا اور اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سفر اس کیلئے بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ وہ ٹکٹ چیکر یا پولیس مین کو دیکھ کر گھبرانے لگتا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گویا منتظرِ راہ ہے اس کی نظر تھی لیکن درحقیقت وہ دوسرے مسافروں سے اپنی پریشانی و متغیر حالت کو چھپانا چاہتا تھا۔

وکٹر کو اپنے گھر میں رہتے ہوئے صرف تین ہفتے گزرے تھے مگر یہ قلیل مدت اس کیلئے جہنم کی طویل زندگی ثابت ہوئی۔ ماں، باپ اور دوسرے عزیز اس کی افسردگی و پریشانی کا سبب دریافت کرتے تھے۔ مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکتا تھا۔ وہ ان کی دزدیدہ و جویائے راز نگاہوں کو دیکھتا اور پریشان ہو جاتا تھا۔ دُنیا اس کی نگاہوں میں تاریک تھی۔ وہ گھنٹوں ایک عالمِ بیخودی میں اس طرح بیٹھا رہتا گویا کسی بڑے مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف ہے۔

آخر کار اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ اس زندگی سے تو مرجانا ہی بہتر ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ ماسکو روانہ ہو گیا اور ٹرین سے اتر کر سیدھا اُسی طرف چلدیا۔ جہاں لینا دریا میں غرق ہو گئی تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ شہر کے سب کاروبار حسبِ معمول ہو رہے تھے۔ مگر وکٹر اپنے خیال میں محو منزلِ مقصود کی طرف چلا جا رہا تھا یکایک ایک ٹریم کار اُدھر سے گزری۔ بغیر ارادہ اس کی نظر ٹریم کار کی جانب اُٹھ گئی۔ اُس نے لینا کو ٹریم کار میں بیٹھے دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر اُس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ مگر اس تک نہ پہنچ سکا۔ وہ ٹھہر گیا اور سوچنے لگا کہ شاید اس کی نگاہوں نے دھوکا کھایا ہے۔ لینا تو اس کی آنکھوں کے سامنے دریا میں غرق ہو گئی تھی، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی طرح وہ زندہ بچ گئی ہو۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور اپنی قیامگاہ پر چلا گیا۔

رات بھر اس کو نیند نہ آئی۔ وہ کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں پیدا ہوتے رہے اور صبح کا ہونا قیامت ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی وہ لینا کے مکان پر گیا مگر اُسے احاطہ کے اندر جانے کی جرأت نہ ہوئی اور مکان سے کچھ فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد لینا اپنے گھر سے باہر آئی مگر وکٹر کو دیکھ کر فوراً اندر واپس چلی گئی۔

---

لینا جب دریا میں غوطے کھا رہی تھی تو اتفاقاً

باقی برصفحہ ۱۴۲

# اے حسن اِدھر آ

از جناب [illegible]

اے حسن ادھر آ

دنیا سے خفا ہوں تو دنیا سے خفا ہوں ٭ شاکی ہوں تجھے [illegible] بے رخی کا
[illegible]
[illegible] دل تو [illegible]
دنیا سے نہ گھبرا ٭ اے حسن ادھر آ

تیرے لئے سامان [illegible] ڈھونڈ رہا ہوں ٭ تیرے لئے آنکھوں کی دوا ڈھونڈ رہا ہوں
کیا ڈھونڈ رہا ہوں
میں اپنے خیالوں کا خدا ڈھونڈ رہا ہوں
تو مجھ سے نہ گھبرا ٭ اے حسن ادھر آ

تو ساتھ ہو میرے تو زمانے کو جگا دوں ٭ ہر خار کو بھی میرے لئے پھول بنا دوں
جنت سے ملا دوں
تیرے دل نازک سے آلام مٹا دوں
تو مجھ سے نہ گھبرا ٭ اے حسن ادھر آ

میں تجھکو زمانے کی کشاکش سے بچا لوں ٭ آ میں تجھے [illegible] آنکھوں میں بٹھا لوں
آنکھوں میں بٹھا لوں
آ میں تجھے افکار کی [illegible] سے بچا لوں
تو مجھ سے نہ گھبرا ٭ اے حسن ادھر آ

کافر ہوں تو تیری پرستش ہی روا ہے ٭ تو حسن ہے اور حسن حقیقت میں خدا ہے
تو جلوہ نما ہے
تو دل کا خدا اور وہ کعبے کا خدا ہے
تو مجھ سے نہ گھبرا ٭ اے حسن ادھر آ

آ میں تجھے الفت [illegible] سنا دوں ٭ اک گیت محبت کا ترے ساز پہ گاؤں
اور تجھکو رجھاؤں
آ تیرے تبسم سے میں فردوس بنا لوں
تو مجھ سے نہ گھبرا ٭ اے حسن ادھر آ

میں مونس و غمخوار ہوں غمخوار ہوں تیرا ٭ ہاں روز ازل ہی سے طلبگار ہوں تیرا
پرستار ہوں تیرا
دنیا کے شوالے میں پرستار ہوں تیرا
تو مجھ سے نہ گھبرا ٭ اے حسن ادھر آ

اے حسن ادھر آ

# گلبانگ سخن

از جناب اعجاز صدیقی اکبر آبادی

چاہتا ہوں جو رہے خوش رہے آزاد رہے ٭ میں رہوں باغ میں آباد کہ صیاد رہے
لطف اس کا یہ ہے ظلم مگر شاد رہے ٭ اُن کو یہ ضد کہ لب عشق پہ فریاد رہے
کیوں گرفتار قفس مضطر و ناشاد رہے ٭ جو اسیری کی معین کوئی میعاد رہے
جو بلا پائے محبت کوئی ناشاد رہے ٭ غیر ممکن ہے کہ وہ شاکیٔ بیداد رہے
کیوں لب شوق پہ یہ نالہ و فریاد رہے ٭ تجھ کو اے حسن گر اندازۂ بیداد رہے
میرے سُننے پہ خیال دل برباد رہے ٭ صرف اتنی سی گذارش ہے اگر یاد رہے
عہد و اقرار محبت ہو کہ پیمان وفا ٭ بھولنے کا جو ہو خوگر اُسے کیا یاد رہے
لذت سوز ملی، درد ملا، ٹیس ملی ٭ ہم بہ فیض نگہ حسن بہت شاد رہے
اُسکی ہوتی ہیں محبت میں دعائیں مقبول ٭ جسکے لب بند ہوں اور دل فریاد رہے
خوش رہیں آپ یہ ہے منظور وفا ہو کہ جفا ٭ آپ بیداد سے راضی ہیں تو بیداد رہے
تیرے دیوانے کو اتنا ہی تعلق ہے بہت ٭ تو رہے یا نہ رہے دل میں تری یاد رہے
رہے غمگین تو کیا عشرت احساس ضمیر ٭ گرمیٔ غمکدۂ عالم ایجاد رہے
آپ ممنون آپ کا غم ہو کہ تصور کچھ ہو ٭ کوئی تو ضامن حال دل ناشاد رہے
باغباں گوش بر آواز ہے صیاد خموش ٭ آج گلبانگ سے ملتی ہوئی فریاد رہے
دی ہے وحشت نے سمیٹی ہوئی وسعت ہمہ صحرا ٭ اب سلامت رہے گلشن قفس آباد رہے
صاف ہنگامۂ محشر سے نکل آئیں گے ٭ آپ کی یاد ہی کافی ہے اگر یاد رہے
اپنی بربادیوں کا عشق میں غم تھا مجھکو ٭ دل نے چپکے سے کہا ہم بھی تو برباد رہے
یوں مرے رنج اسیری سے نہ ہو گا واقف ٭ کچھ دنوں میرے قفس میں مرا صیاد رہے
دل تڑپ کر رگ گردن کے قریب آپہونچا ٭ اب ذرا ہاتھ سنبھالے ہوئے جلاد رہے

یہ امانت گہ ناموس سلف ہے اعجاز
اکبر آباد ابد تک یونہی آباد رہے

تاریخی بیان

# مرحوم شاہِ اودھ کا حسرتناک سفر

از جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

جب ہماری سلطنت کو کامل دس برس گزر چکے گورنر جنرل انگلشیہ کا اور ہی حکم آیا کہ سلطنت خالی کر دو کیونکہ انتظامِ سلطنت ناقابلِ اطمینان ہے۔ ان لاٹ صاحب کا نام ڈلہوزی صاحب تھا۔ انکے ریذیڈنٹ جنرل اوٹرم صاحب ہمارے پاس یہ خط لائے ہم کو دیا جس کا نفسِ مطلب یہ تھا کہ حیثیت تمہاری ناقص ہے سلطنت بدنام ہو چکی یہ تباہی اور بربادی اب دیکھنے کے قابل نہیں رہی۔

اس خبر کے سنتے ہی تمام محلات میں کہرام مچ گیا۔ [illegible] ان دنوں ہم بہت علیل تھے اپنے وزیر علی نقی خاں سے صلاح کی تو انکی یہ رائے ہوئی کہ راضی برضا رہیں۔ مگر تمام عملہ اور رعایا اس کے خلاف تھی۔

بالآخر سب کی یہ رائے ٹھہری کہ جو معاہدہ [illegible] سے قسم و قرار پا چکا ہے کہ سلطنت کو کبھی زوال نہ آئے گا انہیں شرطوں کی رو سے اگر انصاف [illegible] ملکہ معظمہ سے اس ناروا امر کی فریاد کی جائے تو غالباً سلطنت انگلشیہ اپنے [illegible] کے موافق سلطنت پر دست اندازی روا نہ رکھے گی۔ آخر [illegible] ربیع الثانی کی [illegible] تاریخ سنہ ۱۲۷۲ھ پنجشنبہ کا دن عمر بھر نہ بھولے گا جبکہ مجھ کو اپنی سلطنت سے جدا ہونا پڑا۔ گویا بلبل سے گلزار چھٹا، یوسف مصر سے نکلے، بوئے گل چمن سے جدا ہوئی۔ آہ اس وقت کے رنج و الم کا کیا ٹھکانا جبکہ تمام عملہ میری طرف ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھ دیکھ کر حسرت و بیکسی کے آنسو کمال ادب سے رومال سے پونچھ رہا تھا اس پر اشکوں کا مسلسل تار نہ ٹوٹتا تھا۔

اعزا کا ہچکیاں باندھ باندھ کر رونا اور پھر رونے کیساتھ اس کا خیال کہ ہمارے بے بس مسافر کے دل پر بھاری صدمہ نہ پہونچے چھپے چھپے آنسوؤں کا پی جانا کلماتِ رخصت مایوسی کے پہلو لئے ہوئے ادا کرنا محلات میں ماتم برپا تھا۔ آخر میں نے تمام اعزا رعایا اور اہلِ عملہ سے کہا کہ تم پر دس برس تک میں [illegible] سلطنت کی [illegible] میں جو کچھ صدمہ اور رنج میری ذات سے تم کو پہونچا ہو اس کو خوشی سے معاف کرنا اس وقت میں معزول ہو کر تم سے چھٹتا ہوں خدا جانے زندگی میں پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔

اس جملے میں خدا جانے کس غضب کا جادو بھرا تھا کہ تمام حاضرین دل کھول کر رونے لگے۔ [illegible] منور الدولہ احمد علی خاں نے کہا کہ ایسے وقت کل غلام کو اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے۔ تمام عملہ کے نام ہمارے پروانے جاری ہو گئے کہ آج سے تم دولتِ انگلشیہ کے تابع ہو۔

جنرل اوٹرم نے [illegible] لاٹ صاحب سے اجازت لے کر [illegible] ہماری والدہ ملکہ کشور آرا بیگم اور بھائی سکندر حشمت اور ولیعہد اور [illegible] ہمارے ہمراہ تھیں۔

رجب کی پانچویں تاریخ شب پنجشنبہ کو لکھنؤ سے کوچ ہوا گویا روح قالب سے جدا ہوئی کچھ ماحضر [illegible] قدرت نے دیا تھا۔

کانپور [illegible] کے مہینہ [illegible] رمضان کی [illegible] تاریخ کو [illegible] روانہ ہوئے۔ آٹھ روز [illegible] قیام رہا وہاں سے بنارس آئے۔ یہاں مہاراجہ بنارس نے بہت کچھ خدمت کی اسی کی کوٹھی میں قیام [illegible] بنارس سے دخانی جہاز پر سوار ہوئے [illegible] معلوم ہوتے تھے رمضان شریف کی ۲۷ تاریخ کو کلکتہ میں داخل ہوئے۔ [illegible] آب و ہوا [illegible] سلطنت [illegible] لندن جانے کی کوئی صورت نہ ہوئی۔

شوال کی ۱۲ تاریخ کو مجبوراً جناب والدہ اور ولیعہد بہادر اور بھائی کو لندن روانہ کیا اب صرف نواب خاص محل اور [illegible] بیبیاں رہ گئیں ان [illegible] نواب علی نقی خاں اور منور الدولہ بھی کلکتے میں آ گئے۔

ایک برس کے بعد معلوم ہوا کہ اودھ میں کچھ باغی لوگ جمع ہوئے ہیں اور سرکار انگریزی کے خلاف سخت لڑائی ہو رہی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ کارتوسوں میں گائے کی چربی شامل کی جاتی ہے۔

اس زمانے میں [illegible] بیمار تھا کسی طرح افاقہ نہ ہوتا تھا صفراوی تپ نے دق کر دیا تھا آخر تبدیل [illegible] صحت ہوئی [illegible] تندرست ہو لیا جب [illegible] اس کے لئے ایک جلسہ کیا گیا تمام ملازمین اور مصاحبین طلب کئے گئے۔ ساری رات [illegible] ناچ گانا ہوتا رہا۔ قہقہے مچا کئے۔ کوئی چار گھڑی رات باقی ہوگی کہ جلسہ برخاست ہوا۔

ہم بھی غفلت میں پڑے ہوئے سوتے تھے۔ یکایک غل کی آواز کان میں آئی ایک شور برپا تھا۔ دوڑو دوڑو [illegible] دیکھا کہ انگریزی فوج [illegible] کی طرح چاروں طرف سے دوڑتی ہوئی [illegible] میں نے پوچھا کیا غل ہے [illegible] نے کہا علی نقی خاں قید ہو گئے [illegible] حمام میں [illegible]

[illegible] سکریٹری [illegible] حاضر ہوئے اور کہنے لگے میرے ساتھ چلئے [illegible] گورنمنٹ کو [illegible] شبہ [illegible] قتل و غارت [illegible] سلطنت [illegible] اٹھا لیا [illegible] کلکتے میں کیا فساد [illegible] سکتا ہوں۔

انہوں نے کہا ہم کو صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ لوگ سلطنت کو [illegible] پھیلانا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا اچھا اگر انتظام کرنا ہے تو میرے چلنے کی کیا ضرورت۔ میرے ہی مکان پر فوج مقرر کر دو۔ انہوں نے کہا مجھ کو جیسا حکم ملا ہے میں نے عرض کر دیا۔ بالآخر میں ساتھ چلنے پر تیار ہوا۔ میرے ہمراہ میرے تمام رفقا چلنے پر تیار ہوئے لیکن سکریٹری نے کہا صرف آٹھ آدمی آپکے ساتھ چل سکتے ہیں۔ [illegible] بہادر دیانت الدولہ [illegible] صاحب اور میں ایک بگھی میں سوار ہو کر قلعہ میں [illegible] جو لوگ میرے ساتھ قید خانہ میں آئے انکے نام لکھنا بھی ضروری ہیں۔

مجاہد الدولہ۔ ذوالفقار الدولہ۔ فتح الدولہ خزانچی۔ کاظم علی سوار۔ باقر علی۔ محمد جان چوبدار۔ حیدر خاں کوک بردار۔ جمال الدین جیراسی۔ شیخ امام علی حقہ بردار۔ امیر بیگ خواص۔ ولی محمد [illegible] محمد شیر خاں گوند انداز۔ کریم بخش سقہ۔ حاجی قادر بخش [illegible] بردار۔ امامی [illegible] یہ لوگ قدیم ملازم نمک حلال زبردستی میرے ساتھ قید خانے میں آئے اور حقِ نمک ادا کیا انکے علاوہ ایک نیا ملازم عبدالرزاق [illegible] بنگالی بھی ساتھ آیا۔ عورتوں میں [illegible] خاصہ بردار۔ [illegible] آغا خانم [illegible] حسینی [illegible] اور محمدی خانم مغلانی تھیں۔

طبیب الدولہ حکیم بھی ساتھ آیا تھا [illegible] اس بلا میں [illegible] ہو گیا۔ آخر گھبرا گیا اور [illegible] بہت کچھ [illegible] بالا ہے [illegible] جان [illegible] کی۔

[illegible] قلعہ میں ہم [illegible] تھے اس کو [illegible] ۱۲۷۳ھ [illegible] لارڈ کیننگ صاحب ڈلہوزی صاحب کے قائم مقام تھے [illegible] آیا [illegible] آپ کو [illegible] کونسل کی تجویز ہوئی کہ چندے آپ تبدیلِ مکان کر دیں۔ کلکتہ میں جب سے آپ آئے ہیں ہم نے ہر طرح آپکی خاطر مدارات کو ملحوظ رکھا اور اب بھی ہم سے اور ہمارے تمام افسروں سے آپ کے اعزاز اور آداب میں فرق نہ آئیگا آپ یقین کریں ہماری یہ خواہش نہیں کہ ہم بے ضرورت آپ کو تکلیف دیں اب بھی آپکے خانگی [illegible] ہم کو کوئی دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں [illegible] جو ضروری [illegible] ہو [illegible] کر دیا جائیگا۔

میں نے جواب لکھا کہ [illegible] مجھ کو اجازت ہونا چاہئے [illegible] ۲۲ آدمیوں [illegible] پندرہ تک [illegible] قید [illegible] دروازے بند [illegible] مجاہد الدولہ مرزا زین العابدین دیانت الدولہ [illegible] معظم علی خاں امانت جنگ [illegible] وقت پروانہ وار جان نثار تھے۔

فتح الدولہ [illegible] الملک [illegible] ۲۳ تاریخ صفر ۱۲۷۴ھ ان کا انتقال ہو گیا۔

[illegible] ذوالفقار الدولہ [illegible] حاجی خاں [illegible] شریک [illegible] تھے۔

آخر اس مصیبت اور کلفت سے عاجز آکر اور تنگ کرنے والوں نے ستایا تو بیگم یاسمیں نے کونسل سے درخواست کی کہ زیارت عتبات عالیات کو جانا چاہتی ہوں۔ اپنا مال و اسباب سب سرکار کی حفاظت میں داخل کر دوں گا۔ گورنمنٹ سے اجازت نہ ملی اور ان کو قلعہ سے نکلنے نہ دیا، آخر وہ بھی حال دیا گیا۔

کرنیل ولیم صاحب ... کرنیل صاحب نے کوٹھی میں چلا آیا۔ بہت سخت باتیں سنائیں۔ اسکی شکایت میں نے کرنیل صاحب سے کی۔ آئندہ سے روز کا آنا موقوف ہو گیا۔

محمد شیر خاں کو ندا نے کو جب کوئی صورت نہ سوجھی تو انہوں نے باقر علی سے جنگ کرنے اسکی ناک کاٹ لی جسکی سزا میں وہ جیل بھیجا گیا۔

ایک روز کا ذکر ہے ہم نے خانگی معاملات میں ایک رقعہ لکھا وہ باقر علی نے پہرہ والے کو دیا لاٹ صاحب کو خبر ہوئی۔ انکو اور کچھ شک ہوا۔ باقر علی نکالا گیا۔

کریم بخش سقہ تپ دق میں مبتلا ہوا ہے سبب سخت بیماری کے وہ بھی چلا گیا۔ وہ برس اس قید خانہ میں مجھ کو ہو چکے ہیں۔

اسی مصیبت سے رات دن کٹتے ہیں گھر سے دو وقتا کھانا آتا ہے دیگچی کھول کر دیکھی جاتی ہے جب کہیں مجھ تک آنے پاتی ہے۔ نہ کوئی غمخوار ہے نہ عزیز ہے نہ یار ہے۔ نہ مددگار ہے عجب حالت اور عجب صورت ہے۔ نہ کسی سے بات کرنے کا حکم ہے نہ کوئی آتا ہے لندن کے خط برابر آتے رہتے ہیں۔ ایک خط لندن سے آیا جس میں لکھا تھا کہ جمادی الثانی کی نویں تاریخ ۱۲۷۵ھ کو ملکہ کشور نواب تاج آرا بیگم جناب عالیہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا اور دسویں تاریخ شب جمعہ کو برادر عزیز سکندر حشمت صاحب عالم مرزا محمد جواد علی صاحب بہادر راہی خلد بریں ہوئے۔

۹ شعبان کو خط آیا جس میں لکھا تھا کہ رافت آرا بیگم بھتیجی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بہت مصیبتیں اٹھا رہا ہوں اور معلوم ہوتا ہے کہ دم نکل جائے مگر حیات مستعار ابھی باقی تھی ۵۵ برس کا سن و طلعتہ کا تھا اور تیس سال کا جوان بھائی۔ برس دن کی بھتیجی تھی وہ انگلستان میں دفن ہوئے۔

یہ سب صدمے ۱۲۷۵ء میں بھگت رہا ہوں اس وقت میرا سن تقریباً ۳۲ برس کا ہے دوسری منکوحہ اختر محل دختر علی نقی خاں سے ایک لڑکا پیدا ہونے کی خبر دی افسوس باپ قید میں ہے۔ بیٹے کی صورت نہیں دیکھ سکتا۔

بس میں اب ہم قید میں اسکو ولیم فورٹ کہتے ہیں اب کچھ ان لوگوں کا حال لکھنا ہے جو لکھنؤ سے ہمارے ساتھ آئے تھے اور مٹیا برج عرف موچی کھولا کلکتہ میں مقیم ہیں۔ ملازم رفیق اور تمام محلات ملا کر اس وقت پانچسو آدمی ہیں۔ ولیعہد بہادر کی ماں ملکہ خاص محل جو نیل کی والدہ ملکہ آفاق جناب تاج النسا بیگم اور تیسرا محل محبوبہ خاص ملکہ عاشق نما جان جان بیگم ہے یہ اکثر بیمار ہے۔ خدا انکو شفا دے۔

نواب سرفراز بیگم جانشین سلطان عالم نواب ... اور تو محض دوستی میں آئی تھی اس نے خرچ کی شکایت کی میں نے گیارہ ہزار روپیہ اس شرط سے دیا کہ کلکتہ میں ... جلد روانہ ہو گئی۔

بیگم خجستہ محل مٹیا برج میں ہے جو زیارت سے مشرف ہو آئی ہے۔ منکوحہ جعفری بیگم ہے عجب چلبلی طبیعت، نازک مزاج، الھڑ، بچی اور ... زبان درشت کلام ہے۔ ہم کو اکثر گھوری سے یاد کرتی ہے اور جب جلے جانے پر بگڑتی ہے تو جیسے ہزار پانچ ہزار پہ فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ ایسی محبوبہ تھی کہ ایک دم ہم سے جدا نہ ہوتی تھی یا مہینوں سے اسکے فراق میں تڑپتا ہوں اس غم سے دل پانی پانی ہو گیا، صفحہ دل کملا گیا سینہ داغوں سے چمن بن گیا۔ دل ہزار سنبھالنے سے نہیں سنبھلتا صبا بھی ہم قیدیوں کی پیغامبری نہیں کرتی۔ ہر طرف پہرہ ہے ہر طرف یاس ہے دو دو رفیق میں ایک خوف اور ایک ہراس۔

اللہ اللہ ایک وہ دن تھا کہ ہم سر پر تاج رکھے تخت سلطنت پر جلوہ گر تھے اور وہ کہ بادشا کہلاتے تھے کئی لاکھ فوج جرار ہمارے حکم کی تابع تھی فقط ستر سو منشی اہل قلم ہمارے دربار میں بیٹھتے تھے۔ پانچسو طبیب ملازم تھے، پندرہ سو چوبدار تھے ستر محل تھے اسی طرح سب ساز و سامان تھے جنکی تفصیل بیکار ہے یا ایک دن یہ ہے کہ جو پانچ بورے سامنے آئے ہیں۔ وہ بھی ہم سے جدا۔ ایک قید خانے میں ہم پڑے ہوئے ہیں چاروں طرف حراست ہے ہمارے ساتھ اٹھارہ آدمی رات دن مصیبت جھیل رہے ہیں ہر ایک اپنے جینے سے بیزار ہے قید غم میں گرفتار ہے بہشتی خاکروب آتے ہیں انکے ساتھ ایک گورا بھی آتا ہے مجال کیا ہے جو منہ سے بول سکے روشنی والا جب تیل لیکر آتا ہے گورے کی ٹھوکر ضرور کھاتا ہے اہر برٹ صاحب دورہ تھا سے آتے ہیں ہر کرنیل کے بشپ وسٹ میر ہیں وہی زندان کا بندوبست کرتے ہیں قیدیوں کی گنتی لینے میں ایک وارڈن زندان کا فن صاحب ہے جو کوئی ملازم بیمار ہوتا ہے تو ایک ڈاکٹر معاینہ کے واسطے آتا ہے میری طبیعت جب علیل ہوتی ہے تو معالج خاص طبیب آتا ہے۔ ایسی سخت تکلیف ہے کہ جس سے دل تنگ اور پریشان ہو قید خانے کی کوٹھی بہت وسیع ہے مگر میرے کس کام کی ہر وقت دروازے بند گرمی سے دل تنگ ہے حالت تباہ ہے جب دروازے کھلتے ہیں تو دھوپ کی شدت سے جان بیزار ہوتی ہے۔ درجہ دسطی میں ہم قید ہیں۔ نیچے کا درجہ اور اوپر کا بالکل خالی ہے گویا معلق لٹکے ہوئے ہیں۔ کئی مرتبہ لاٹ صاحب کو شکایتی خطوط بھیجے مگر کسی کا جواب نہ ملا۔

ایک دن کرنیل صاحب نے ایک خط ہم کو قید خانے میں دیا جو وارو غہ میر واجد علی نے لکھنؤ سے بھیجا تھا۔ لکھا تھا کہ جب سے یہاں انگریزی بندوبست ہوا تمام مفسدین کے جو میلے نیست ہو گئے جن لوگوں نے غدر میں ہم اور رعایا لوگوں کو بچایا تھا وہ بخیر رہے باقی سب آفت میں مبتلا ہوئے۔ مذکورہ بالا زمرے سے میں بھی ہوں اس سلسلہ میں محلات کا دربان مقرر ہو گیا ہوں۔ خورد محل اور سلطان محل نے چیف کمشنر کی بیوی اور انکے بچوں کی جان بچائی تھی۔ اب انکی گورنمنٹ میں بڑی عزت ہے۔

اس وقت پہلا خورد محل، دوسرا محل سلطان جہاں بیگم، تیسرا شہنشاہ محل، چوتھا امیر محل، پانچواں فخر محل معہ شہزادہ قمر قدر بہادر، چھٹا چتر محل، ساتواں اعزاز محل، آٹھواں سیدہ محل ساتھ عزت و آبرو کے ہیں۔ ریذیڈنٹ کمشنر بہادر کی طرف سے بہت کچھ اعزاز حاصل ہے اور صاحب عصمت ہیں۔

بقیہ شہزادیوں کی حالت ناگفتہ بہ۔ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ نہ تن پہ کپڑا ہے نہ منہ کو روٹی۔ غدر میں در بدر تباہ پھرتی ہیں۔ خدا جانے کہاں سے کہاں نکلیں۔ اگر آپ یہاں کے کمشنر کو خط لکھ دیں تو یہ فلک زدہ فاقہ کش بھی انکی پرورش ہو جائیں گی کیونکہ یہ غریب بے قصور و بے گناہ ہیں کیا عجب کہ آپکی تحریر سے پچاس پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہو جائیں۔

ان آٹھوں محلوں کے نوٹ کھل جائینگے میں رپورٹ کروں گا کہ ان سب کا تمام مال و اسباب کوتوالی میں اٹھ گیا ہے۔ میری مہر لگی ہوئی ہے صاحب کمشنر نے وعدہ کیا ہے کہ واپس دیا جائیگا اس خط کو پڑھ کر جو کچھ میری کیفیت اور حالت ہوئی اس کا اندازہ وہ کر سکتا ہے جو اتنے بلند مرتبے سے قید اور بیکسی میں پڑا ہو۔ میں نے ایک خط لاٹ صاحب کو معہ اس عرضی کے بھیجدیا ماہ شوال ۱۲۷۵ھ کو گورنر جنرل کا جواب آیا کہ ہم سب محلوں کی خبر لیں گے اور دو لاکھ روپیہ میرے مصارف کے کونسل نے دیئے۔ ایک حکم نامہ دارو غہ میر واجد علی کے نام بھیجدیا۔

نواب اربٹ ہنیرل چارلس جان ارل کیننگ گورنر جنرل صاحب کی نوازش جو ہمارے حال پر ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے زمانہ سلطنت میں جو اعزاز ہمارا تھا وہ بدستور سابق قائم ہے، وہی القاب جو عہد سلطنت میں تھا اب بھی لکھا جاتا ہے، وہی زر افشاں کا غذ وہی عرض وہی طول وہی زربفت کا خریطہ اور وہی تمغہ مہر صرف خلد اللہ ملکہ کے بجائے دام مجدہ ہو گیا ہے لیکن قید خانے میں صرف ایک ہی خط آیا ہے۔

دیکھو دنیا ناپائیدار ہے کسی سے دل نہ لگائے۔ سو برس بھی اگر کوئی کسی پر فدا رہے وہ دم بھر میں چھٹ جاتا ہے چونکہ ہماری قسمت میں صدمے پر صدمے اور رنج پر رنج لکھے ہوئے تھے ایک دن خبردار نے پرچہ دیا کہ آج خجستہ محل بارہویں ذیقعدہ کو مٹیا برج سے نکل گئی۔ وہ پندرہ برس سے میرے پاس تھی اب جعفری بیگم کی خالہ کے یہاں ہے۔ سنا ہے پہلے لکھنؤ جائیگی پھر وہاں سے کربلا جائیگی۔ سو روپیہ مہینا اب بھی انکو دیا جاتا ہے حال میں پانچسو روپیہ یکمشت دیا گیا البتہ زمان سلطنت میں ڈھائی ہزار روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ میں نے ہر خدمت ساخت کی کچھ پذیرائی نہ ہوئی غور کا مقام ہے یہ دنیا کی بے وفائی کا نمونہ ہے۔ برے وقت میں کوئی کام نہیں آتا مصیبت میں کوئی صورت نہیں دکھاتا۔

جو کچھ اس قید میں صرف کیا ہے اس کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔ آج ۱۲۷۵ھ ذیقعدہ ۲۱ تاریخ جمعہ کا دن ہے۔

## فرد خرچ قید خانہ

| | |
|---|---|
| منشی صفدر صاحب | پانچ ہزار |
| برائے سفر خرچ والدہ و برادر روانہ لندن | چالیس ہزار پچیس |
| الیضاً بار دیگر | اناسی ہزار تین سو |
| خاص محل صاحبہ | پینتالیس ہزار پانچسو |
| مجاہد الدولہ | گیارہ ہزار |
| محبوبہ خاص | پچیس ہزار چار سو |
| جعفری بیگم | چھ ہزار تین سو |
| ذوالفقار الدولہ | پانچ ہزار |
| محمد رضا | ایک ہزار |
| آغا جان | پانچسو |
| مرزا جعفر | پانچسو |
| اختری محل صاحبہ | تیس ہزار |
| ملکہ ملک | تیس ہزار |
| ملکہ قیصر | گیارہ ہزار |
| خجستہ محل | ایک ہزار |
| صرف قید خانہ | چار ہزار |
| نذر سادات | ساڑھے پانچسو |
| تقسیم تنخواہ ماہوار | دس ہزار |

اب صرف ایک لاکھ روپیہ نقد ہماری تحویل میں ہے وہ بھی چند روز میں ختم ہو جائیگا پھر خدا جانے کہاں سے آئیگا اور متعلقین ملازمین کیونکر جئینگے۔ خدا سے دعا ہے کہ میرے احباب میرے غمخوار مجھے ملیں جو دور میں قریب ہوں۔

الٰہی تیری ذات سے نجات ہے تو مختار ہے تو کردگار ہے تو رازدار ہے تجھی سے امید ہر فرد کو ہے تو قیع زن و مرد ہے مٹی کو تو نے رنگ دے کر کلابتو بنا دیا ہے تو کیڑے کو تو دیتا ہے ریشم بنا کر تجھ سے امید ہے کہ عمر کوتاہ کو دراز کر دے گدا کو تو تخت پر بٹھا سکتا ہے اعدا کے تیر بدن پر سپر ہو سکتے ہیں تجھ کو ممتاز کر دے رزق کا دروازہ کھولدے اور تو چاہے تو دل ظالم کو تباہ کر دے شاہ کو چاہے فقیر کر دے فقیر کو دم بھر میں امیر کر دے گل کو تجھ سے آب و تاب ہے چمن ہرا ہے درختوں میں آب ہے ہر گل میں تیری بو ہے سب فنا ہیں باقی تو ہے اشارے سے جہاں پیدا کیا۔ تمام ولی اور امام تیرے حکم کے تابع ہیں۔ نکارہ اختر کی التجا ہے کہ یہ بیگناہ قید ہوا ہے شب و روز زنداں میں آہیں کیا کرتا ہے۔ **

# جنگل میں

## گائی ڈی موپاساں کا ایک شباب انگیز شاہکار

از جناب افسر ماہ پوری

میں قدرت کی رنگینیاں دیکھکر بے قرار ہو جاتی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ جنگلوں میں درختوں کے سایہ تلے سبزہ زار پر بیٹھ کر اپنے خاوند سے پیار و محبت کی باتیں کروں۔ اگرچہ میرے چہرے پر بڑھاپے کی شکنیں اُبھر آئی تھیں لیکن میری سرکا عورت کا دل کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ دُنیا نے ہم پر بدگمانی کی۔ لیکن . . . .

میتور ناشتے کے لئے بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ غلام نے آکر اطلاع دی "چوکیدار ہوٹل ڈویل میں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ دو مجرم بھی ہیں" ناشتہ سے فارغ ہو کر میتور فوراً ہوٹل ڈویل پہونچا۔ بوڑھا چوکیدار مجرموں کو حقارت آمیز نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

مجرموں میں ایک مرد تھا دوسری عورت۔ مرد بوڑھا ہو چکا تھا اور موٹاپے سے اس کا دم پھول رہا تھا۔ اس کے بال سفید ہو گئے تھے اور اس کی ناک پر عجیب قسم کی سرخی تھی۔ اس کے جھریدار چہرہ پر خوف و ہراس کے آثار نمایاں تھے۔ عورت مطمئن نظر آتی تھی۔ گو بارہ پیری سے اس کی کمر خمیدہ ہو چکی تھی لیکن اس کے رخسار سفید لال اور چکنے تھے۔ وہ غیر معمولی بےباکی سے بوڑھے چوکیدار کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کیا بات ہے ہوشیدٹ! انہیں کیوں گرفتار کیا؟" میتور نے افسرانہ انداز میں پوچھا۔

چوکیدار نے کھنکار کر پہلے گلا صاف کیا۔ اس کے بعد کہنے لگا "آج صبح کو حسب معمول میں اپنے پہرہ پر جا رہا تھا۔ میرا حلقہ سیمپکس کے جنگل سے آرگن ٹرال کی سرحد تک ہے۔ جب میں جنگل کے قریب پہونچا تو بوڑھے بریڈل کے لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ وہ انگور کے کھیت کی طرف جا رہا تھا۔ دن خوشگوار تھا۔ اور گیہوں کے کھیت لہلہا رہے تھے جب میں کچھ آگے بڑھا تو بریڈل کے لڑکے نے چلا کر کہا "کدھر جا رہے ہو چچا ہوشیدٹ! کچھ خبر بھی ہے۔ ذرا اس جنگل میں تو جا کر دیکھو کیا تماشہ ہو رہا ہے اور یہ بھی سن لو............"

چنانچہ میں جنگل کی طرف بھاگا کہ معاملہ کی تفتیش کروں۔ میں جنگل میں داخل ہوا تو کچھ ایسی آوازیں سننے میں آئیں۔ جن سے میرے دل میں شکوک پیدا ہو گئے۔ کچھ اور آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ نابکار (مجرموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سیاہکاری میں مصروف ہیں۔ میں نے فوراً انہیں "اخلاقی مجرم" کی حیثیت سے گرفتار کر لیا"

میتور نے مجرموں کو حیرت سے دیکھا کیونکہ مرد کی عمر قریباً ساٹھ برس کی ہوگی۔ اور عورت کی پچپن برس کی۔ میتور نے پہلے مرد سے پوچھ گچھ شروع کی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"نیکولاز باورین" مجرم نے بہت ہی کمزور آواز میں جواب دیا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"پیرس میں"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"تجارت کرتا ہوں"

"یہاں جنگل میں کیا کر رہے تھے؟"

باورین خاموش رہا۔ اس کی آنکھیں اس کی توند پر مرکوز تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھ اس طرح فلک سے تھے گویا انہیں سانپ سونگھ گیا ہے۔ میتور نے پھر پوچھنا شروع کیا۔

"کیا تم اس الزام سے انکار کرتے ہو جو چوکیدار نے تم پر عائد کیا ہے؟"

"جی نہیں"

"گویا تم اقبال جرم کرتے ہو"

"جی ہاں"

"کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں"

"تمہیں یہ آبرو باختہ عورت کہاں سے ملی؟"

"معاف کیجئے، یہ میری بیوی ہے"

"کیا وہ تمہاری بیوی ہے؟"

"جی ہاں"

"پھر — پھر — کیا تم پیرس میں ساتھ نہیں رہتے؟"

"ہم لوگ ساتھ ہی رہتے ہیں"

"میرا خیال ہے تم دیوانے ہو۔ کیا تمہیں دن کی روشنی میں — — — کیا تمہیں شرم نہیں آتی؟"

فرط ندامت سے باورین کے منہ سے چیخ نکل جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے ہوش و حواس فوراً بجا کئے اور کہا۔

"اسی نے مجھے ترغیب دی۔ ترغیب ہی نہیں بلکہ مجبور کر دیا۔ میں لاکھ کہتا رہا کہ دُنیا کیا کہیگی۔ مگر اس نے میری ایک نہ سُنی اور اپنی ضد پر قائم رہی۔ — جب عورت کسی چیز کا عزم کر لیتی ہے تو اسے دُنیا کی کوئی پروا نہیں رہتی"

میتور نہایت خوش مزاج آدمی تھا۔ مذاقاً بولا۔ "تو تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری بیوی کا ارادہ اسی حد تک محدود رہتا تو تمہیں یہ گھڑی دیکھنا نہ پڑتی!"

باورین کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھا تم نے! کسقدر ذلت! اب ہمیں عدالت میں جانا ہوگا۔ دکان بند کرنی ہوگی اور نہ جانے کیا کیا کرنا ہوگا — اُف — خدا"

اس کے بعد میڈم باورین آگے بڑھی۔ وہ بےباک معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میتور کو مخاطب کرتے ہوئے نعرہ دار لہجہ میں کہا۔

"بےشک جناب! ہم سے جو گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ کیا آپ مجھے اجازت دینگے کہ میں اپنے حالات ایک وکیل کی حیثیت سے نہ سہی ایک غریب عورت کی حیثیت سے بیان کر دوں۔ میں امید کرتی ہوں کہ آپ میری داستان سننے کے بعد مجھے عدالت کی ذلت سے ضرور بچا لینگے"

"برسوں قبل جب میں جوان تھی تو اسی پڑوس میں میری اور مسٹر باورین کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک کپڑے کی دکان میں ملازم تھے۔ میں بھی ایک کپڑے کی دوکان میں ملازمت کرتی تھی۔ اس وقت کی باتیں مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے کل ہی ہوئی ہیں۔ میں اکثر اتوار کی تعطیل اپنی ایک دوست روز کے ساتھ اسی پڑوس میں گزارتی تھی۔

"ہم دونوں ایک ہی کمرہ میں رہتی تھیں۔ روز سیمن سے بیحد پریم کرتی تھی سیمن بھی روز کا پروانہ تھا۔ دونوں شراب محبت میں مخمور و وارفتہ تھے۔ میرا کوئی ہمراز نہ تھا۔ میں محبت کی بھوکی تھی اور روز کی قسمت سے رشک کرتی تھی۔ ایک روز سیمن نے کہا کہ اتوار کے دن میں اپنے ایک دوست کو بھی ہمراہ لاؤں گا۔ یہ الفاظ اس نے مجھے بنانے کے لئے کہے تھے۔ اس لئے میں نے اس کی اس تجویز کو اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ فی الحقیقت میں حسن و عشق کے دام میں پھنسنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"دوسرے روز اسٹیشن پر اتفاقیہ ہماری ملاقات مسٹر باورین سے ہوئی۔ اس وقت مسٹر باورین جوان تھے۔ اور نہایت حسین و جمیل۔ ان کی آنکھوں میں مقناطیسی قوت تھی۔ ان کے تبسم میں سحر پنہاں تھا۔ لیکن میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی طرف ملتفت نہ ہونگی۔ میں نے کیا بھی ایسا ہی۔

پھر ہم لوگ اتوار گزارنے کے لئے اس پڑوس میں چلے آئے۔ دن نہایت خوشگوار تھا۔ اور فضا سرور انگیز اس وقت بھی جب کبھی دن فرحت ناک ہوتا ہے۔ تو میں اپنے ہوش و حواس کا توازن قائم نہیں رکھ سکتی۔ اور اتفاقاً اگر دیہات میں رہتی ہوں تو دیوانی ہو جاتی ہوں۔ ہرا بھرا سبزہ، زمزمہ سنج طیور، بھینی بھینی پھولوں کی نکہت، صاف شفاف چشمے، اور کلیوں کا دلربا تبسم میرے جذبات کو برانگیختہ کر دیتے ہیں۔

"ہاں تو موسم بہار آفریں تھا اور فضا سرود شباب کی رنگینیوں سے معمور تھی۔ روز اور سیمن جذبات محبت سے بےخود ہو کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ ان کے ہونٹ بوسہ کی حلاوت سے لطف اندوز ہونے لگے۔ میں نے انہیں اس عالم میں دیکھا اور ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ میں اور مسٹر باورین ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ خاموش۔ کیونکہ ابھی ہمارے درمیان تکلف حائل تھا۔ مسٹر باورین مجھے کچھ مرغوب معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کے چہرہ پر ایک عجیب قسم کی گھبراہٹ نمایاں تھی۔ مجھے اُن کی اس حالت پر ایک موہوم کی مسرت ہو رہی تھی۔ بالآخر ہم لوگ اس چھوٹے سے جنگل میں داخل ہوئے۔ جنگل کی زمین غیر معمولی سرد اور روح افزا تھی ہم لوگ سبزہ پر بیٹھ گئے۔ روز اور سیمن مجھے چھیڑنے لگے۔ کیونکہ میں کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ سیمن بار بار روز کو اپنے آغوش میں بھینچ لیتا۔ اس طرح گویا ہم وہاں موجود ہی نہیں۔ اس کے بعد وہ دونوں اُٹھے اور جنگل کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔ اب مسٹر باورین اور میں تنہا رہ گئے۔ تھوڑی دیر تک ہم خاموش رہے مگر خاموشی سے تنگ آکر بات چیت کرنے لگے میں نے مسٹر باورین سے ان کے ذریعۂ معاش کے متعلق دریافت کیا جیسا کہ میں اوپر کہہ چکی ہوں، اُنہوں نے جواب دیا "دکانداری" تھوڑی دیر تک ہماری گفتگو جاری رہی۔ مسٹر باورین اب کچھ بےتکلف ہو چکے تھے اور انہوں نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش بھی کی مگر میرے تیور دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ یہی بات ہے نا مسٹر باورین؟"

مسٹر باورین خاموش اپنے پیروں کو گھور رہا تھا۔ اس لئے اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر اس نے یہ کہنا شروع کیا "جب مسٹر باورین نے یہ دیکھا کہ مجھے لہو و لعب سے نفرت ہے تو مجھے پاک جذبے سے محبت کرنے لگے۔ ان کی محبت حرص و ہوس سے پاک تھی۔ اب وہ ہر اتوار کو بلاناغہ مجھ سے ملنے لگے۔ کیونکہ مجھے ان کو دیکھے

باقی بر صفحہ ۴۴

۱۵۶/۴۶

# ملاپ

بقیہ صفحہ ۲۴

جن ہاتھوں کیپروں نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے اُسے ہاسپٹل کے ٹریٹمنٹ کے شفاخانہ میں داخل کردیا تھا۔ وہ تین دن تک بے ہوش رہی۔ جب ہوش و حواس بحال ہوئے اور اس سے دریا میں گرنے کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے صرف اتنا کہا۔ میں پشتے پر کھڑی دریا کا نظارہ کر رہی تھی اتفاق سے پاؤں پھسل گیا۔ یہ وہ خود بیان تھی کہ اس نے حقیقت حال کا اظہار کیوں نہیں کیا اور وہ کونسی اندرونی طاقت تھی جس نے اسے سچ بولنے سے باز رکھا۔ اس نے اس مسئلہ پر بہت کچھ غور و خوض کیا۔ مگر کوئی خاص وجہ اسکی سمجھ میں نہ آئی۔

اس ناگہانی واقعہ کے بعد لینا کی حالت بالکل تبدیل ہو گئی۔ وہ زندہ دلی و خوش طبعی، جو اسکی فطرت کی نمایاں خصوصیت تھی، یکسر مفقود ہوگئی۔ اور اسکی جگہ ایک مستقل افسردگی و پژمردگی نے لے لی۔ اب وہ ہر بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے لگی تھی۔ بار بار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے ایسا شخص جو اس سے بے انتہا محبت کرتا تھا اسقدر متنفر ہوگیا اور اس کا دشمن جان بن گیا۔ شاید یہ نتیجہ تھا بے انتہا محبت کا۔ کبھی وہ یہ سوچتی تھی کہ اگر اب وکٹر سے ملاقات ہوجائے تو کیا وہ اس سے اسی طرح محبت کریگا جس طرح پہلے کرتا تھا۔

وہ اپنے موجودہ خیالات و محسوسات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکتی تھی، مگر اُسے اس بات کا یقین تھا کہ اب وہ وکٹر کی سنگدلی سے نفرت نہ کرتی تھی اور وہ اس کا حال معلوم کرنے کے لئے بیتاب نظر آتی تھی۔ وہ ایک بار اس جگہ بھی گئی جہاں وکٹر رہتا تھا۔ مگر مکان کے اندر جانے یا کسی ہمسایہ سے کچھ دریافت کرنے کی جرأت نہ کرسکی۔ اس نے سوچا کہ خدا معلوم اس خطرناک و غم انگیز مفارقت کے بعد ملاقات کا انجام کیا ہو۔ شاید وکٹر اس کو بھوت سمجھے اور خوفزدہ ہوکر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جو میری یا اسکی زندگی کیلئے مضر ہو۔

کبھی وہ سوچتی تھی کہ جبتک آدمی زندہ رہتا ہے تو تمام عزیز اور دوست اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے رنج و غم اور خوشی و مسرت میں شریک رہتے ہیں۔ مگر اس کے مرنے کے بعد چند روز اس کا ماتم کیا جاتا ہے اور پھر اس کو بالکل فراموش کردیا جاتا ہے۔ وہ بھی مر گئی تھی اور اب دوبارہ زندہ ہوکر یہ دیکھنے کے لئے دنیا میں آئی ہے کہ اس کے دوستوں اور عزیزوں کو اس کی جدائی کا کسقدر رنج ہوا۔ اور کیا وہ کبھی اس کو یاد کرتے ہیں یا بالکل بھول گئے ہیں؟

جب کبھی وہ گھر سے باہر نکلتی اور اتفاقیہ کوئی شناسا مل جاتا تو وہ اس سے اس کی مزاج پرسی کرتی اور ادھر اُدھر کی بیکار باتیں کر کے رخصت ہو جاتی۔ اس کے تمام دوستوں نے اس سے ملنا جلنا ترک کردیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اب اس کی شکل و صورت میں وہ اگلی سی دلکشی باقی نہ رہی تھی اور اسکی گفتگو میں بھی سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر لینا کی آنکھیں بکھل گئیں اور اُسے یقین ہوگیا کہ دنیا صرف ظاہر پرست و خود غرض ہے اب اُسے پہلے سے زیادہ وکٹر کا خیال رہنے لگا اور اس سے ملنے کی آرزو میں اضافہ ہوگیا۔

وکٹر اکثر لینا کے مکان کی طرف جاتا اور رستہ میں کہیں بیٹھ جاتا کہیں کھڑا ہوتا۔ مگر لینا نظر نہ آتی اور وہ ناکام واپس چلا آتا۔ ایک روز جبکہ وکٹر لینا کے گھر کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ وہ دروازہ پر اس انداز سے کھڑی ہے جیسے کسی کی آمد کا انتظار ہو۔ وکٹر کا دل دھڑکنے لگا اور پاؤں لغزش کرنے لگے۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نہایت ادب سے لینا کو سلام کیا۔ اور نگاہیں نیچی کرکے دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ بالکل اس طرح جیسے ایک مجرم حاکم کے روبرو اعتراف جرم کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر لینا کے زرد رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ اسکی بلند آنکھیں چمکنے لگیں مگر لبوں پر مہر سکوت لگی رہی۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے مگر کسی کو یارائے گویائی نہ تھا۔

وکٹر نے ڈرتے ڈرتے لینا کی طرف دیکھا۔ نگاہیں ملیں اور دونوں نے ایک دوسرے کی قلبی کیفیت کا اندازہ کیا۔ لینا نے وکٹر کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اور دونوں پائیں باغ میں جاکر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ مگر ہنوز زبان خاموش تھی اور نگاہیں گویا۔ آخر کار لینا نے قفل خموشی وا کیا۔

"کیا تم کہیں باہر چلے گئے تھے؟"

"جی ہاں، میں گھر چلا گیا تھا"

"تمہاری ماں اور بہن اچھی ہیں؟"

"جی ہاں"

کچھ دیر تک اسی قسم کی رسمی باتیں ہوتی رہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنوز ایک دوسرے کے خیالات و محسوسات کا جائزہ لے رہے تھے۔ جب وکٹر طالب محبت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا تو لینا کا چہرہ چمک اُٹھتا اور وہ نگاہیں نیچی کرلیتی۔ وکٹر ایک عالم بیم و رجا میں بیٹھا تھا۔ اور حرف مطلب کو زبان پر لانے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔

یکایک لینا اپنی جگہ سے اُٹھی اور گلاب کے تختہ میں سے ایک نہایت خوشرنگ و شگفتہ پھول توڑ کر آہستہ آہستہ جھجکتی، لچکتی وکٹر کے پاس واپس آئی اور ایک ادائے خاص سے اس کی جانب دیکھا۔ وکٹر سرو قد کھڑا ہوگیا۔ لینا نے خاموشی کے ساتھ گلاب کا پھول اس کو نذر کیا۔ دونوں کے دل بھر آئے۔ اور آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ ع

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے کہ صلح ہوجائے جنگ ہوکر

---

# بیوقوف کا روزنامچہ

بقیہ صفحہ ۳۱

کی ضرورت پڑی تو تمہاری خدمت حاصل کرلوں گا!

"میری" اس نے اچانک میری طرف بلی کی طرح گھورا، اور مجھے چلے جانے کو کہا۔

۲۷ راپریل ۔ مرحوم ڈاکٹر کی بیوی نے آج مجھ سے ملاقات کی۔ اس نے کہا کہ کل مجھ سے جو ناشائستہ حرکت سرزد ہوئی اسے معاف کردیجئے شوہر کے صدمہ کی وجہ سے اس کا دماغ صحیح نہ تھا اور اس کے بعد مجھے یاد دلایا کہ پہلے میں اسے کتنا پیار کرتا تھا اور اس کے گھر میں ملنے کے لئے کسقدر بیچین رہا کرتا تھا۔ جب ڈاکٹر گھر میں نہیں ہوتا تھا تو ہم دونوں کیا یہ دعائیں مانگتے تھے کہ ڈاکٹر کو کوئی شیر کھا جائے تو اچھا ہے!

میں سمجھ گیا ——— وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی، وہ اب تک محبت کرتی تھی لیکن مجھے شادی کا خیال بھی نہ تھا۔ اور نہ ابھی کچھ عرصہ تک "پابند سلاسل" ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ جب بھی مجھے شادی کی ضرورت ہوگی تو سب سے پہلے حق تمہارا ہوگا۔

اس کے بعد اسے اس کی ماں کے گھر بھیجدیا۔

۲۸ راپریل ۔ آج پھر مجھ پر "دردِ شکم" کا حملہ ہوا۔

۲۹ راپریل ۔ آج پھر یہی درد رہا۔ میں نے ایک ڈاکٹر کو فون کیا کہ مجھے اس کے علاج کے لئے کہاں جانا چاہئے! ——— وہ بہت متعجب ہوا اور اس نے مجھ سے "فون نمبر" پوچھا۔

میں نے فوراً بتلا دیا، اس کے بعد ڈاکٹر نے پوچھا کہ کیا یہ "پاگل خانہ" ہے۔

میں نے کہا "نہیں" بلکہ یہ میرے اپنے گھر کا نمبر ہے، تھوڑی دیر تک وہ فون پر عجیب و غریب آوازیں نکالتا رہا۔ اور پھر یہ جواب دیا کہ گھر سے بڑھ کر اس کیلئے اور کوئی جگہ بہتر نہیں۔

۳۰ راپریل ۔ درد کی شدت بڑھتی جارہی تھی ——— ہش!

میں نے اب شادی کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا ——— فوراً شادی!

یکم مئی ۔ گذشتہ شب میں نے خواب دیکھا کہ مرحوم ڈاکٹر کی بیوی میرے پاس آئی اور اس نے اپنا ہاتھ میرے پیٹ پر رکھا یا شاید خود پیٹ پر بیٹھ گئی (یہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں)

اس کے بعد ہی درد غائب ہوگیا ——— ہمیشہ کے لئے چلا گیا!!

"اسی لڑکی سے میں شادی کروں گا" میں نے اُٹھتے ہوئے چیخ کر کہا۔

اور تب ہمارے درمیان بذریعہ "منزوی تار" حسب ذیل بات چیت ہوئی:۔

میرا تار ۔ "تنہائی محسوس کررہا ہوں"

اسکا تار ۔ "یہاں بھی یہی حال ہے"

میرا " ۔ "تو کیا میں آجاؤں؟"

اسکا " ۔ "واقعی شادی! کہیں میری نسلٹ تو نہیں کر رہے ہو"

میرا " ۔ "جان جہاں" خفا نہ ہو! یہ حقیقت ہے۔ مجھے "تہذیبیا" کی ضرورت ہے۔ کیا تم میری مدد کروگی؟"

اسکا تار ۔ "اچھا یہ بات ہے۔ قاضی جی کو بلا لیجئے۔ دیر ہی کیا ہے۔ اب؟ میں تیار ہوں۔

میرا تار ۔ "کل ہی بلاؤں گا۔ میں پیٹ کے بل بستر پر ہوں۔

۲ رمئی ۔ آخر کار میں نے اپنی "جان جہان" ——— مرحوم ڈاکٹر کی بیوی سے شادی کرلی۔ وہ بہت خوش و خرم تھی اور بڑی پیاری نظر آرہی تھی میں نے اس سے پوچھا "ہم دنیا کا سفر کریں تو کتنا اچھا ہو؟"

"اس "وسیع الخیالی" کے کیا کہنے" اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر پیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

جیسے ہی اس نے یہ "عمل محبت" کیا میرا "دردِ شکم" "مفقود" ہوگیا۔

میں اب "سلکِ ازدواج" میں منسلک ہوکر "طاق" سے "جفت" ہوگیا ہوں اس لئے "روزنامچہ" لکھنا بند کررہا ہوں!

---

# جنگل میں

بقیہ صفحہ ۴۴

۹ بجے صبح اس جنگل میں ہم لوگ آئے۔ ہماری محبت کا آغاز اسی جنگل میں ہوا تھا۔

"جب میں اس جنگل میں پہونچی تو ہرنی کی طرح چوکڑی بھرنے لگی۔ آپ جانتے ہیں عورت کا دل کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ آج مجھے اپنے خاوند میں عجیب دلکشی محسوس ہوتی ہے ——— وہی دلکشی جو ایام شباب میں تھی ——— جب ہم جنگل میں پہونچے تو میں اپنے شوہر کا بے اختیار بوسہ لینے لگی۔ وہ میری اس حرکت سے گھبرائے اور غصیلی آواز میں کہنے لگے "یہ کیا وحشت ہے، دیوانی ہو گئی ہو کیا؟" مگر میں نے ان کی ایک نہ سُنی میرے کانوں میں میرے دل کی آواز آرہی تھی میں انہیں گھسیٹ کر جنگل میں لے گئی ———"

"میں نے تمام واقعات من وعن بیان کر دئے ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھیں، کریں"

تیور نہایت زیرک آدمی تھا۔ اس نے میڈم باؤرین کے دلی جذبات کا صحیح اندازہ لگایا اور مسکراتے ہوئے بولا ———

"آپ پریشان نہ ہوں خاتون! آپ کسی سزا کی مستحق نہیں ——— میں تو آپ سے درخواست کرونگا کہ پھر کبھی اس جنگل کو رونق بخشیں"

---

# فرانس کا شعلۂ بار انقلابی عشق کی آگ میں

## روسیو کی داستانِ محبت

اگرچہ ژین ژیکوس روسیو انقلاب فرانس کی ابتداء سے نو برس قبل فوت ہو چکا تھا۔ لیکن اگر کسی شخص کو اس انقلاب کا باعث قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ شخص روسیو کی ذات ہے اُسکی تحریروں میں اُسنے غرباء ملک کے مساویانہ اور آزادانہ شہری حقوق کے حق میں آواز بلند کی تھی عوام پر بیکس لگیرا و بلیغانی اثر کی حامل تھیں۔ اُس نے اپنی تصانیف میں نہ صرف معاشرتی خرابیوں کو بےنقاب کیا ہے۔ بلکہ تعلیمی نظریات کو بھی جدت کا لباس پہنا کر ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔

روسیو کی زندگی الامحالہ اپنے غیر فانی جذبات و فتوحات اور بیدار جنوں کی ایک زندہ تصویر ہے۔ جسپر قومیں جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ انقلاب فرانس سے پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اُس انقلاب کا حقیقی باعث روسیو ہوگا۔ لیکن اسکے برخلاف روسیو آنے والے انقلاب کا خواب دیکھ رہا تھا اگرچہ اُسوقت کے ناسازگار حالات نے اُسکے بار ہا زندگی کی خطرناک راہوں پر پھینک دیا۔ لیکن اُسکے دل زندہ اور نگاہ عشق نے ہمیشہ اُسکی رہنمائی کی اور اُسکے خوابوں کو حقیقتوں میں تبدیل کرکے اُسکو حیاتِ جاوداں بخش دی۔

روسیو ۲۸ جون ۱۷۱۲ء کو جنیوا میں پیدا ہوا اُس کا باپ ایک گھڑی ساز تھا اُسکی ماں اُس کی پیدائش سے چند دن بعد ہی اس دنیا سے کوچ کرگئی تھی اسلئے روسیو نے اپنی زندگی کے اولین دس برس اپنے باپ اور پھوپھی کی زیرِ سرپرستی نہایت مسرت و راحت سے بسر کئے۔ چنانچہ پرورش کا وہ خلا جو اُسکی ماں کے مرجانے سے پیدا ہو چکا تھا اُسکی پھوپھی کی شفقت نے اُسکے سپرد کیا۔ ۱۷۲۲ء میں جب روسیو آدبیاتِ کہنہ" اور اپنے عہد کے افسانوی ادب کی مسرتوں میں گم تھا اُسکے والد ایک ذاتی لڑائی جھگڑے میں شمولیت کے باعث لنز میں جلاوطن کردیا۔ اب روسیو چچا کے ہاں پرورش پانے لگا۔ اُسکا چچازاد بھائی بھی روسیو کا ہم عمر تھا چنانچہ روسیو کے چچا نے اُن دونوں کو باسی کے مشہور فاضل ادب لمبیرسیر کے پاس بھیجدیا، جہاں وہ اپنی نوجوان ماہ وش بہن کے ساتھ رہتا تھا، روسیو کی اُس باہمی اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکو لمبیرسیر کی بہن سے محبت ہوگئی۔ روسیو اپنی اس محبت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے "چونکہ یہ محبت ایک غیر شعوری جذبے کے تحت کی گئی تھی اسلئے

بچپن کے اُن جذبات نے میری زندگی پر ایک گہری اثر ڈالا۔ چنانچہ اسکی اس اولین جذباتی کشمکش نے اُسکے بچپن کو جوش و طوفان کا ایک مرکز بنا دیا۔ جسکا بلاواسطہ اثر اُس پر یہ پڑا کہ چھ سال کے بعد اُسکے خیالات میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا ہوگیا۔

اسی دوران میں وہ اپنے چچا زاد کے ہاں واپس چلا آیا۔ جہاں اُس نے تین سال کندہ نقش کاری کی تعلیم میں صرف کئے۔ لیکن روسیو کی دلیر طبیعت کو نقش کاری کا عمل اور محدود ماحول ابھی نہ بھایا اور بجائے اسکے کہ وہ اس طویل عرصہ میں فن پر قابو پالیتا اُسنے اپنے آپ کو بچپن کی معصوم غلطیوں میں کھو دیا اُستاد کی پیہم کوششوں کے باوجود وہ وہاں سے بھاگ نکلا اُس کا خیال تھا کہ دنیا اُسکے اس فعل کو دائمی زندگی کے قیود کے خلاف بغاوت سمجھ کر اُسکی داد دیگی مگر اُس کا یہ خیال غلط نکلا چنانچہ وہ ایک بھکاری کی حیثیت میں تنگدستی سے کچھ عرصہ تک در بدر پھرتا رہا ایک فاصلے پر ہے۔ وہاں اُسکی ملاقات کیتھولک فرقے کے ایک پادری سے ہوگئی جس نے مذہب کی اہمیت کو اسقدر صاف اور شاندار الفاظ میں پیش کیا کہ روسیو کے وہم و گمان سے بندھے ہوئے تمام خیالات ایک ایک کرکے کھل گئے۔ اور اُس نے دنیا میں ایک اہم حیثیت حاصل کرنیکی ٹھان لی۔

ایک مشورے کے زیرِ اثر وہ انسی چلا گیا جہاں اُسکو ایک عیسائی عورت میڈم ورنز نے پناہ دی جس نے اُسکی مذہبی تعلیم کو مکمل کرا دینے کا ذمہ اُٹھایا۔ روسیو نے اُسکے جواب میں اُسکا منشیر خاص ہونا منظور کیا۔ روسیو کی عمر اسوقت ۱۶ برس کی تھی۔ اُسکی چمکتی ہوئی آنکھیں، سیاہ اور گھنگھریالے بال، سپید چہرہ، اعضا کی مناسبت اور اس پر اُسکے خیالات کی خودداری قیامت کا اثر رکھتی تھیں۔ اُسکی مالکہ ۲۸ برس کی ایک امیر اور فراخ دل عورت تھی، وہ روسیو کی ملتفت تاب نگاہوں کی منتظر تھی روسیو اُس سے ضرور ملتفت ہوا لیکن اُس کا یہ التفات نوجوانی کی بےرُخی سے نہ بچ سکا اور اُسکی خودداری جو بڑھ کر غرور کی حد تک جا پہنچی تھی تعلقاتِ محبت کے حق میں نہایت مہلک ثابت ہوئی۔

کچھ عرصہ کے بعد روسیو انسی سے تورن چلا آیا جہاں اُسکو ایک ہسپتال میں جگہ ملگئی۔ لیکن اتفاق سے ایک پیری کے سلسلے میں ہسپتال کے مالک نے اُسکو ملازمت سے برطرف کردیا۔ اسکے بعد وہ کونٹ گوون کے ہاں پناہ گزین ہوا جس نے اُسکے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے سلوک کیا اور اُسکو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ لیکن ایک قلیل عرصہ کے بعد اُسکے سر پر میڈم ورنز کو دوبارہ ملنے کا جنون سوار ہوا چنانچہ وہ ملازمت کو چھوڑ چھاڑ کر انسی واپس چلا گیا۔ میڈم ورنز نے اُسکی واپسی پر اُسکا خوش آمدید کہی لیکن بہت جلد اُسکو سینٹ لیزاں تعلیم کی تکمیل کیلئے بھیج دیا۔ میڈم ورنز اور روسیو کے باہمی تعلقات نہایت عجیب و غریب تھے وہ اُسکے ہاں ملازم اور ایک قلیل تنخواہ کا مالک لیکن اُسکے علاوہ میڈم ورنز اُس کے تمام تعلیمی اخراجات برداشت کرتی تھی اور ساتھ ہی روسیو کو نہایت ذوق و شوق سے موسیقی سکھایا کرتی تھی۔ دراصل بات یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کچھ اس طرح بھا گئے تھے کہ روسیو باوجود ہزار کوشش کے اُس سے علیحدگی اختیار نہ کرسکا۔ روسیو آنے کو تو سینٹ لیزاں میں آگیا لیکن اُسکو شہر کی فضا راس نہ آئی، لیزاں سے وہ سوکر ملا آیا جہاں سے وہ ایک فرانسیسی سفیر کا ایک تعارفی خط لیکر پیرس چلا گیا جہاں اُس نے اُونچی سوسائٹی میں اُٹھنا بیٹھنا شروع کردیا اور اپنی اُن نمدہ [illegible] عادات کو جنکے باعث وہ اپنے دوستوں میں ہمیشہ غیر مقبول رہا بہت حد تک سنوارنا شروع کردیا۔ بیس برس کی عمر میں وہ دوبارہ میڈم ورنز کے ہاں چمبرے میں چلا آیا اُن دونوں کی یہ باہمی ملاقات گزرے ہوئے واقعات کا اعادہ ثابت ہوئی۔ روسیو پھر اُس سے محبت کرنے لگا۔ ۱۷۳۸ء میں روسیو سخت بیمار ہوا، میڈم ورنز نے اُسکی علالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُسکو لس چارمیٹز میں لیجانا چاہا۔ لیکن روسیو کی منشاء مونٹ پلیر جانے کا تھا۔ میڈم ورنز کو کہیں سے معلوم ہوگیا کہ روسیو کا مونٹ پلیر میں جانے کا مطلب میڈم لارنیگ کی حسین محبت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ نے اُنکے باہمی تعلقات کو ہمیشہ کیلئے ایکدوسرے سے منقطع کردیا۔ لیکن میڈم لارنیگ سے روسیو کی طبیعت بہت جلد بھر گئی۔ اور وہ لس چارمیٹز میں چلا آیا۔ جہاں سے ۱۷۴۱ء میں وہ پیرس چلا گیا۔ یہاں سے اُس کی فطنت کے نقوش اُبھرنے شروع ہونے میں۔

پیرس میں اُس کا تعارف
انسائیکلوپیڈیا

کے مدیر معاون ڈڈروٹ ورنز کے احباب ڈومیبنر سے بہت کارآمد ثابت ہوا کیونکہ آنرا انداز کی مدد سے اُسکو وینس میں فرانسیسی سفیر کی سکریٹری شپ مل گئی۔ جہاں سے وہ ۱۷۴۴ء میں فارغ ہوکر واپس پیرس لوٹ آیا اس عرصے میں اُس نے بہت سے موسیقانہ نظریات کی اختراع کی لیکن اکاڈمی نے اُسکے ان نظریات کو زیادہ تحسین کی نگاہوں سے نہ دیکھا۔ کچھ دنوں کے بعد اُسکا ایک ڈرامہ "لس موزز گیلینٹس" سٹیج کیا گیا۔ جو بہت مقبول ہوا ڈرامے کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ڈڈروٹ نے اپنے اخبار کیلئے اُس سے مقالات لکھنے کی فرمائش کی ——— دُنیا کسقدر شہرت پرست ہے۔ ———

۱۷۴۶ء میں اُسکو ہم زبان فارسی ایک "سیمیں بدن" سے عشق ہوگیا جس کا نام تھریسی۔لی۔ وسر تھا جس کیساتھ روسیو نے بعد ازاں شادی کرلی اُسکی مشہور تصنیف "کاردبارٹ" سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُنکے یہ تعلقات کہاں سے پیدا ہوئے۔ بہرکیف روسیو کی یہ محبت پانچ بچوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

وہ مسلسل چار پانچ برس سے مختلف رسائل و جرائد میں موجودہ وقت کی تعلیمی حالت اور عوام کے حقوق پر زبردست مقالے لکھ رہا تھا ۱۷۵۰ء میں ڈیجن اکادمی سے ایک مضمون پر جس کا عنوان تھا "آرٹ اور سائنس کی ترقی نے اخلاقیات کو سُدھارنے اور بگاڑنے میں کہاں تک امداد دی ہے" پہلا ایک انعام حاصل کیا۔ اُسکی دوسری تحریری کامیابی ایک مختصر ڈرامہ لی۔ڈیون۔ڈیو۔ ورلیج کی تخلیق تھی۔ جسکے باعث اُسکو دربار فرانس سے ایک گراں مایہ عطیہ عطا ہوا۔ اور دربار میں اُسکو عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ لیکن روسیو نے اپنے اصولوں کی خاطر اس عطیے اور عزت کو ٹھکرا دیا۔ فرانسیسی دربار کے خیالات و حالات [illegible] روسیو کی نگاہوں سے پنہاں نہیں تھے اسی خیال کے زیرِ اثر اُس نے اُن کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ گو اُس کا یہ انکار بعد ازاں اُسکی [illegible] کا باعث ثابت ہوا۔

کچھ عرصے کے بعد اُس نے [illegible] اور ۱۷۶۲ء میں ہیلی۔ اور [illegible] شائع کرائیں جو نہایت کامیاب [illegible] نے اخوان کو فکر کتاب کو [illegible] سخت ناپسند کیا کیونکہ اس میں روسیو نے

از جناب اثر چکوالی بی اے

صاف صاف الفاظ میں غریبوں کے حقوق پر زور دیا تھا اور اُن کے حقوق کو فوقیت کا باعث بنایا تھا۔ ۱۷۶۲ء میں اُس نے معاہدہ کنٹریکٹ سوشل شائع کی جس میں اُس نے لکھا کہ حکومت کی تعمیر عوام کا ایک قدرتی اقدام ہے۔ اس کتاب میں اُس نے جمہوریت کے حق میں نہایت زبردست دلائل پیش کئے۔ آزادی، مساوات اور اخوت کی اہمیت پر لکھے الفاظ ... جو بعد ازاں ایک نعرۂ انقلاب فرانس بن گئے۔ اسی سال اُس نے ایک اور کتاب ایمیل ... شائع کرائی جس میں اُس نے امر کی تعلیمات کے حق میں انقلابی خیالات پیش کئے۔ اُس کے الفاظ ... نہایت اچھوتے اور نئے انداز میں ... یہ کتاب اُس وقت کے تمام مروجہ جسمانی، ذہنی اور اخلاقی طریقوں کے خلاف بغاوت تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کو حکومت وقت نے مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور روسو اس خوف سے کہ کہیں وہ قید نہ کر دیا جائے، وہاں سے بھاگ کر ... پہنچا اور پھر وہاں سے سوئٹزرلینڈ کی ریاست ... میں آیا۔ جس کا حکمران آرٹ کا مشہور سرپرست فریڈرک دی گریٹ تھا۔ لیکن سوئٹزرلینڈ بھی روسو کے لئے خطرے سے خالی نہ تھا چنانچہ وہاں سے وہ انگلستان دوڑ آیا۔ ان تمام مشکلات میں اُس کی بیوی تھریسی نے اُس کا ساتھ دیا۔ روسو انگلستان میں ڈیوڈ ہیوم کے ہاں اقامت پذیر ہوا لیکن روسو دوستوں کے حق میں ہمیشہ سے غیر مقبول چلا آرہا تھا چنانچہ ڈیوڈ ہیوم سے بھی اُس کا ایک شدید جھگڑا ہوا اور وہ ۱۷۶۷ء میں واپس فرانس چلا آیا۔ اور اپنے محبوں اور سرپرستوں کے دروازوں پر بھٹکتا ۱۷۷۰ء میں وہ کئی دشواریوں کے بعد پیرس واپس جانے میں کامیاب ہو سکا جہاں اُس نے بہت سا عرصہ خاموشی کی حالت میں گزارا۔ اس عرصہ میں اس نے کتاب ... کی تکمیل کی۔ اور ... ان ... شہرت کی ... حوادث نے ... سے اُس کی تمام تصانیف سے زیادہ ... ۱۷۷۸ء میں اُس کو ایک مشہور سرمایہ دار نے اپنی رہائش کیلئے ایک مکان پیش کیا۔ روسو کسی قدر آرام چاہتا تھا مگر تھریسی کی ایک اصطبلی ... کے ساتھ آشنائی اُس کے دل کو مجروح اور اُس کی دہشت کو اور زیادہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ لیکن آہ! بجائے اس کے کہ دنیا تھریسی کو ملامت کرتی روسو کی شدید ترین دشمن بن گئی۔ ۱۷۷۸ء کی دوسری کو وہ مردہ پایا گیا۔ ڈاکٹر یہ نہ بتا سکے کہ اُس کی موت قدرتی طور پر واقع ہوئی تھی یا اُس نے خودکشی کر لی تھی۔ یہ تھا افسوسناک انجام دنیا کے ایک عجیب و غریب مصلح کا ــــ جو انجام کار انقلاب فرانس کا موجب ہوا۔

## جنگل میں ـــــ بقیہ صفحہ ۴۱

بغیر چین نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل رہتے۔ میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی رہتی۔ وہ جوانی میں غیر معمولی شکیل و جمیل تھے۔ چند دنوں کے بعد ہم دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے اور ہم نے ایک دکان کھول لی۔"

"برسوں تک ہم حوادث زمانہ کا پامردی سے مقابلہ کرتے رہے۔ قریب تھا کہ ہمارا کاروبار فیل ہو جاتا مگر ہم نے استقلال کا دامن نہ چھوڑا۔ زمانہ جلد جلد گزر رہا تھا اور ہم لوگ غیر محسوس طور پر بڑھاپے کی طرف جا رہے تھے۔ کسی شخص کو اپنے نقصان کا اس وقت تک احساس نہیں ہوتا جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ اس نے کیا کھو دیا ہے۔

"اس کے بعد جناب! ہم لوگوں کا کاروبار پھر چمکا اور پہلے کی طرح ہم لوگ مطمئن ہو گئے پھر میں نہیں کہہ سکتی کہ میرے دل میں کیا کیا جذبات پیدا ہونے لگے۔ میں پوری سچائی کے ساتھ کہتی ہوں کہ جب میں پھولوں سے بھری ہوئی چھوٹی چھوٹی گاڑیوں کو جو راستہ میں مالی کھینچتے پھرتے ہیں دیکھتی تو میں بے قرار ہو جاتی۔ گلاب کی مدہوش کن خوشبو میں وارفتہ ہو جاتی اور میرا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ میں جب پیرس کی سڑک سے آسمان کو دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سمندر کی طرح پیرس کی اس طرف بہہ رہا ہے اور اس کی پہنائیوں میں پرندے اس طرح اڑتے دکھائی دیتے تھے جس طرح پانی میں رنگ برنگ کی مچھلیاں ـــــ میں اس منظر سے بہت متاثر ہوتی تھی اور میرا دل جذبات سے معمور ہو جاتا تھا۔ یقیناً آپ میری عمر کو دیکھتے ہوئے میری باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ زندگی میں ایک ایسا بھی لمحہ آتا ہے جب انسان ماضی کی رنگینیوں میں گم ہو جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہ سکی۔ میں چاہتی تھی کہ جنگلوں میں درختوں کے سایہ تلے سبزہ زار پر لیٹ کر محبت کی باتیں کروں۔ میرے دل میں جذبات کا طوفان برپا رہتا اور میں شب و روز اسی خیال میں محو رہتی۔ میں چاندنی کا تصور کر کے مچل جاتی تھی۔

پہلے تو مجھے ایسی بات مسٹر باڈرین سے کہنے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ خیال تھا کہ وہ مذاق اڑائیں گے۔ مسٹر باڈرین نے آج تک میری کوئی بات رد نہ کی تھی۔ خود میں اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ کر شرما جاتی تھی۔ میرے چہرہ پر بڑھاپے کی شکنیں ابھر ـــــ آئی تھیں۔

لیکن میں اپنی آرزو کو پورا کرنا چاہتی تھی چنانچہ ایک روز میں نے مسٹر باڈرین کے سامنے یہاں کی سیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ وہ متفق ہو گئے اور آج

# طوفان کی رات

از جناب ظہیر انصاری کامٹوی

ایامِ طفلی میں میں سوشیلا کے ساتھ کچھ دنوں ایک ہی اسکول میں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھار ہم لوگ آپس میں دولہا دلہن کا کھیل بھی کھیلا کرتے تھے میں جب سوشیلا کے مکان پر جاتا تو اس کی ماں مجھے بڑے پیار سے بٹھاتی۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ کھیلتا دیکھ کر اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی اور اکثر اوقات کہہ بھی اٹھتی کہ "کیا اچھی جوڑی ہے"..... میں اگرچہ نادان اور ناسمجھ تھا۔ لیکن اس جملے کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا اور سوشیلا کی ماں کی طبیعت کا اندازہ مجھے بخوبی معلوم ہوگیا تھا۔ اب مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ دوسروں کی بہ نسبت سوشیلا پر میرا خاص حق ہے۔ میں اس حق کے غرور میں کبھی کبھار سوشیلا پر اپنی حکومت بھی جتایا کرتا تھا۔ سوشیلا نہایت صبر اور تحمل سے میری زیادتیوں کو برداشت کرتی اور میرا ہر حکم بجا لاتی تھی۔ تمام لوگ اس کی خوبصورتی اور حسن کی تعریف کرتے بعض اسے "گاؤں کا چاند" کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن میں ناقدرشناس لڑکا تھا میری نظروں میں مشتاقی نام کو نہ تھی۔ میں تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سوشیلا میری ہی حکومت قبول کرنے کے لئے اپنے والدین کے یہاں پیدا ہوئی ہے اور اسی وجہ سے خاص طور پر بے قدری کی مستحق ہے۔

میرے والد گاؤں کے چودھری تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب میں اچھی طرح لکھ پڑھ لوں تو وہ مجھے کاروباری معاملات کی تعلیم دلوائیں تاکہ میں بھی گاؤں کا منیجر یا چودھری بن جاؤں۔ لیکن میں دل ہی دل میں اس کو ناپسند کرتا تھا۔ میرے پڑوس کا ایک لڑکا چار جماعتیں انگریزی پڑھ کر کلکٹر صاحب کا ناظر بن گیا تھا اور ایک دوست پرائمری اردو پاس کرکے نارمل اسکول کی ٹریننگ حاصل کر چکا تھا اور اب وہ ایک اسکول میں مدرس تھا۔ میرا نصب العین بھی بلند ہوگیا۔ میں نے بھی اپنے دل میں یہ عزم بالجزم کر لیا کہ جج کا ہیڈ کلرک بن کر رہونگا۔ میں ہمیشہ دیکھتا تھا کہ میرے والد عدالت کے ناظروں، کلرکوں وغیرہ کی بہت قدر کرتے تھے۔ ساگ، پھل پھول، گوشت، انڈے، روپیہ پیسہ وغیرہ سے بھی ان کی خاطر تواضع کی جاتی تھی۔ اس لئے میرے دل میں عدالت کے ادنیٰ چپراسیوں تک کی عزت تھی۔ یہ ہمارے دیش کے قابلِ پرستش دیوتا ہیں۔ ۳۵ کروڑ دیوتاؤں کے چھوٹے چھوٹے جدید ایڈیشن ہیں۔ مال کے مقدمات میں کارساز گنیش دیوتا کی طرح سب سے پہلے ان ہی کی پوجا ہوتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ دیہات کے لڑکوں کی طرح یہاں انگریزی پڑھنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے نیز میں نے دیہات میں سب سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ اس لئے دیہات سے بھاگ کر کلکتہ چلا گیا۔ اور اپنے دیہات کے ایک ملازم کی قیامگاہ پر پہنچا۔ گھر سے کافی روپیہ پیسہ لے کر آیا تھا۔ اس لئے اخراجات کی تنگی نہ تھی بعد میں خود والد صاحب خرچ دینے لگے۔ اب میں انگریزی پڑھنے میں بہت زیادہ جدوجہد کرنے لگا۔ اس کے علاوہ مذہبی سوسائٹیوں اور سیاسی جلوسوں میں بھی شریک ہوتا۔ اس بات کے یقین کرنے میں مجھے مطلق شک نہ تھا کہ ملک پر جان دینا ملک کے ہر باشندے پر فرض ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ یہ اہم کام کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے۔ میری اس لاعلمی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگ زبانی جمع خرچ زیادہ کرتے تھے۔ مگر مجھے اس جوش میں بظاہر کوئی کمی واقع ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ ہماری مجلس میں بڑے بڑے قابل لوگ لکچر دیتے تھے۔ "انقلاب زندہ باد"۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔ ہم لوگ بھوکے پیاسے دوپہر کی جھلسا دینے والی دھوپ میں جلسے کے اشتہارات تقسیم کرتے اور جلسہ گاہ میں کرسیاں میزیں صاف کرکے انہیں ترتیب سے رکھتے تھے۔ دورانِ تقریر میں اگر کوئی شخص ہمارے لکچرار یا مقرر کو کچھ برا بھلا کہتا تو ہم لوگ لڑنے مرنے پر کمربستہ ہو جاتے تھے۔ اس پر شہر کے لڑکے ہمارا مذاق اڑاتے اور ہمیں بیوقوف بناتے تھے جب میں نے میٹرک پاس کیا تو میری عمر اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ اب میرے دماغ میں ناظر بننے کا خیال نہ رہا۔ بلکہ میرے خیالات بہت بلند ہوگئے اور مجھ پر وکیل بننے کا خبط سوار ہوا۔ ان ہی دنوں میرے والد اور سوشیلا کے باپ کے درمیان یہ فیصلہ ہوگیا کہ اب ہمیں سلکِ ازدواج کی کڑی میں منسلک کر دیا جائے۔ چنانچہ میرے والد نے بذریعہ خط اس کی اطلاع دی لیکن میں نے انہیں لکھ دیا کہ جب تک میں وکیل نہ بن جاؤں ہرگز شادی نہیں کرونگا۔ میرا خیال تھا کہ میں ایک خودمختار پیشہ اختیار کرکے قوم اور ملک کی خدمت..... کرسکونگا۔ اس وقت کی فوری شادی میری اس آزادی میں خلل انداز ہو جائیگی۔

چند مہینے بعد مجھے خبر ملی کہ سوشیلا کی شادی ایک وکیل سے ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کا ہر فرد بشر آزادیٔ ہند کے لئے کوشاں نظر آتا تھا۔ اور میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے لئے چندہ وصول کرنے میں مصروف تھا۔ اس لئے اس خبر کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہ پڑا اور نہ ہی میں نے کوئی پروا کی۔

میں ایف۔ اے کے دوسرے سال کی تعلیم نہایت تندہی سے کر رہا تھا کہ میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے فوت ہو جانے سے خاندان کے تمام اخراجات کا بار میرے سر آن پڑا۔ اسلئے طوعاً و کرہاً مجھے تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کرکے ملازمت کی تلاش کرنی پڑی حسنِ اتفاق سے ایک مڈل اسکول میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹری کی جگہ مل گئی۔ میں نے سوچا چلو میرے مذاق کے مطابق پیشہ مل گیا۔ تقریر و تحریر کے ذریعہ سے ہر طالب علم کا حوصلہ اس قدر بلند کر دونگا کہ وہ "مادرِ ہند" کی صحیح معنوں میں خدمت انجام دیں گے۔

> رسم و رواج نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا تھا لیکن اس کی ... ایک موج ہمیں موت کے آغوش میں ... کر رہا تھا ... زیادہ ... شوہر کے ساتھ عیش و آرام کی ... زندگی ...

کام شروع کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے اس کا احساس کہ لڑکوں کو امتحانات کے لئے تیار کرنا "بھارت ماتا" کی خدمت اور ملک کو آزاد کرانے سے زیادہ اہم کام ہے۔ اگر میں طلبہ سے گرامر اور الجبرا کے علاوہ کوئی دوسری بات کہتا تو ہیڈ ماسٹر صاحب ناراض ہو جاتے تھے۔ دو تین مہینے کے اندر ہی اندر میرا تمام جوش سرد پڑ گیا۔ اور بھارت ماتا کی خدمت اور مادرِ ہند کی آزادی کا خیال خواب ہوگیا۔ شاید مجھ ایسے ہی نکمے آدمی گھر میں بیٹھ کر طرح طرح کی خیال آرائیاں اور ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن میدانِ عمل میں کندھے پر ہل رکھے ہوئے بیل کی طرح پیچھے سے تو ناری اور ڈنڈے برداشت کرتے ہیں اور اس طرح ہمیشہ مٹی کے ڈھیلے توڑنے کا کام کرکے شام کو انہیں جو آدھا پیٹ گھاس پھونس نصیب ہوتا ہے۔ اسی پر قانع رہتے ہیں۔ ان میں پھر [illegible] نہیں ہوتا ہے۔

ہمارے اسکول میں یہ قاعدہ تھا کہ روزانہ ایک ماسٹر کو بورڈنگ کے طلبہ کی نگہداشت کے لئے اسکول میں سونا پڑتا تھا۔ اور چونکہ میں ابھی غیر شادی شدہ تھا اس لئے یہ کام زیادہ تر میرے ہی سر منڈھا جاتا تھا۔ میرا مکان اسکول سے بہت قریب تھا اسکول کے قریب ایک چھوٹا سا خوبصورت تالاب تھا اور اس کے چاروں طرف ناریل وغیرہ کے لمبے لمبے درخت اُگے ہوئے تھے۔ میرے صحن میں بھی نیم اور ناریل کے بہت سے درخت تھے۔ گرمی کے موسم میں ان کا سایہ آرام و راحت کا باعث ہوتا تھا۔

میں نے ابھی تک سوشیلا کے شوہر کا نام نہیں بتایا۔ اس کا نام رام لال تھا۔ اتفاق کی بات آجکل وہ میرے مکان کے قریب ہی سکونت اختیار کئے ہوئے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری بچپن کی رفیق سوشیلا اس مکان میں رہتی ہے۔

ایک دن شام کو جب میں ٹینس کھیل کر واپس آرہا تھا تو وہ مجھے کچھ فاصلے پر جاتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ لیکن وہ مجھے نہ دیکھ سکی۔ آواز دینا مناسب نہ تھا اور قریب جاکر بات کرنے کا موقع نہ تھا۔

رام لال بابو کی مجھ سے کچھ شناسائی نہ تھی۔ ایک دن اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ دورانِ گفتگو میں میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میرے ہی محلہ میں ان کی سسرال ہے۔ لیکن میں نے یہ نہ بتایا کہ سوشیلا بچپن میں ہی مجھ سے منسوب کی جا چکی تھی۔

چند دنوں بعد میں رام لال بابو کے مکان گیا۔ مجھے اچھی طرح خیال ہے کہ اس دن ہم دونوں کے درمیان "ہندوستان کا مستقبل" اور "بھارت ماتا کی آزادی" کے موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ اسی اثنا میں مجھے چوڑیوں کی جھنکار اور نازک قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایسا معلوم ہوا کہ دروازے کی اوٹ میں دو آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں

یکایک میرے دل میں دو بڑی بڑی اور سیاہ آنکھیں۔ کس قدر نشیلی۔ کس قدر خوبصورت اور پرخمار آنکھیں۔ خدا جانے قدرت نے انہیں کہربا سے بنایا تھا یا مقناطیس سے۔ وہ آنکھیں جن میں سے کبھی الفت کی کرنیں یا محبت کی شعاعیں نکلا کرتی تھیں۔ اور اکثر میرے دیکھنے کے لئے بیقرار و مضطرب رہا کرتی تھیں۔ لیکن آج میں اپنے تصور کی مدد سے انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک میرا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

میں اپنے گھر واپس آگیا۔ لیکن میرے بیقرار اور گھائل دل میں ایک قسم کی سوزش بدستور تھی۔ میں اس خیالِ خام کو دل سے مٹانے کے لئے کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ لیکن ع

آنکھوں میں پھر رہی ہے شبیہِ جمال دوست

رات کو سوتے وقت میں نے اپنے مضطرب

دل کو ایک ناکام تسلی و تشفی دی اور دل سے سوال کیا۔ اے دل تجھے کیا تکلیف ہے؟ دل نے ایک قہقہہ بلند کیا جس سے فضا گونج اٹھی اور سوال کیا۔ "بتاؤ تمہاری بچپن کی رفیق سوشیلا کہاں ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "اسے تو میں نے اپنی خوشی سے دوسرے کے پہلو میں جانے دیا۔ کیا اتنے دنوں تک وہ میرا انتظار کر سکتی تھی۔ اب خواہ تم کچھ بھی کہو۔ لیکن تمہیں اس پر اپنی نگاہ ڈالنے کا بھی حق نہیں ہے تم نے اپنے بچپن کی رفیق سوشیلا کی چوڑیوں کی جھنکار سنی اس کے قدموں کی آواز تمہارے کانوں تک پہنچی اور تم نے اسی فضا میں کچھ دنوں تک سانس لیا۔ ہاں اب سوشیلا بے شک ہے لیکن اب تم میں اور اس کے درمیان ایک آہنی دیوار حائل ہے جو کسی طرح بھی ہٹائی نہیں جا سکتی۔

"اگر ایسا ہے تو مجھے اس کی مطلق پروا نہ کرنی چاہئے وہ اب میری کوئی نہیں ہی ہے" میں نے کہا۔

میرے دل نے کہا "آہ ...... یہ سب کچھ درست ہے لیکن کیا وہ تمہاری نہیں ہو سکتی تھی"

"بالکل ٹھیک ہے۔ وہ میرے رنج و غم اور خوشی و مسرت کی شریک ہوتی۔ دل و جان سے زیادہ عزیز ہوتی۔ لیکن افسوس اب وہ میرے لئے ایک اجنبی اور غیر عورت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس کا تصور کرنا۔ اسے دیکھنے کی خواہش کرنا۔ اس سے بات کرنے کا خیال کرنا میرے لئے اب ایک ایسا گناہ ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ لیکن پھر بھی نہ معلوم کیوں مجھے چین نصیب نہیں"

مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہے۔ میں نے اپنے بے قرار دل کو بہت تسلی دی۔ لیکن

ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جان پر
دل ناکام محبت کی یہی تاثیر ہوتی ہے

روزانہ دوپہر کے وقت جب اسکول کے لڑکوں کو کھانا کھانے کی چھٹی ملتی اور وہ خوش و خرم ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق اور آپس میں باتیں کرتے تو میرے دل میں ایک خلش ہوتی اور قلب میں ایک ہوک اٹھتی مجھے نہیں معلوم یہ کیسی خلش تھی۔ لیکن اب مجھے اس کا یقین ہو گیا تھا کہ صرف لڑکوں کو امتحانات کے لئے تیار کرنے اور ان کے دلوں میں آزادی کی روح پھونکنے اور ہندوستان کا مستقبل سوچنے سے میری زندگی نہیں گزر سکتی۔

ہماری موجودہ آزاد خیال انجمنوں میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو فطرت کے منشا کے مطابق ہو۔ انسان کس قدر ناسمجھ اور نادان ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کی اپنے دل میں خواہش کرتا ہے جو اسے حاصل نہیں ہو سکتی لیکن اس خواہش کی تکمیل میں اس کی زندگی تلخ ضرور ہو جاتی ہے۔ اگر میں چاہتا تو سوشیلا کو اپنی شریک زندگی بنا لیتا اور آج وہ میری رانی ہوتی اور میں اس کا راجہ۔ لیکن اس وقت تو مجھ پر ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر بننے کا جنون سوار تھا۔

ہمارے ملک میں ۹۰ فی صدی شادیاں اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہیں کہ اس کی بیوی محض امور خانہ داری کی نگراں اور اس کی خادمہ ہے چنانچہ یہی برتاؤ رام لال بابو کا سوشیلا کے ساتھ تھا اس کے لئے سوشیلا جیسی حسین و جمیل لڑکی میں کوئی خاص کشش نہ تھی۔ وہ سوشیلا کو عام لڑکیوں کی طرح سمجھتا تھا محبت جیسی بیش بہا چیز اسے حاصل نہ تھی۔ وہ روپیہ پیدا کرتا اور سوشیلا اس کے لئے لذیذ سے لذیذ کھانا پکاتی۔ اگر کسی دن کھانا پکانے یا برتن صاف کرنے میں اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو وہ اسے جھڑک دیتا اور خوش ہوتا تھا تو اسے چوڑیاں بنوا دیتا اور ساڑی خرید دیتا۔

ایک دن رام لال بابو کسی ضروری مقدمہ کی پیروی کے لئے باہر گیا تھا اور سوشیلا اپنے مکان میں تنہا تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن صبح سے آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور قریباً دس بجے سے بارش بھی ہونے لگی تھی۔

پیر کا دن تھا۔ موسم کے خراب آثار دیکھ کر ہمارے ہیڈ ماسٹر نے اسکول بند کر دیا۔ اسکول کا بند ہونا تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ تمام دن اور رات پانی برستا رہا۔ دوسرے دن دوپہر سے بارش کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ بارش کے تیز ہوتے ہی ایک ہنگامہ خیز طوفان بھی آیا۔

جوں جوں رات ہوتی گئی طوفان اور بارش بڑھتی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں سونے کی کوشش کرنا بالکل بے سود تھا۔ اس وقت یکایک میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس خوفناک و ہولناک رات میں سوشیلا اپنے مکان میں تنہا ہوگی اس وقت اس کا کوئی معاون و مددگار نہ ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں کانپ اٹھا۔ دل نے یہ تقاضا کیا کہ جا کر اس کے حالات معلوم کروں لیکن خوفناک رات اور ہنگامہ خیز طوفان کا خیال آتے ہی باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑتی۔

رات کے دو بجے مجھے دریا کی پرشور لہروں کی خوفناک آواز سنائی دی، اور گاؤں کے باہر بہنے والے دریا کا پانی تیزی سے گاؤں کا رخ کر رہا تھا۔ اب مجھے سوشیلا کی تنہائی کا بہت زیادہ احساس ہوا دل مضبوط کر کے ہمت و استقلال کے ساتھ گھر سے نکل پڑا۔ اور سوشیلا کے مکان کی طرف بھاگا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو تالاب پانی سے لبریز ہو چکا تھا اور سڑک بھی دریا بن چکی تھی۔ اسکول کی سطح زمین کی سطح سے بہت زیادہ اونچی تھی۔ مگر پھر بھی پانی تیزی سے سکول کی طرف چڑھ رہا تھا۔ میں جونہی بھاگ کر دوسرے کنارے کے قریب پہنچا، مجھے اپنی طرف کسی کا سایہ آتا دکھائی دیا۔ آہ وہ کون تھا؟

اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ میرے جسم کا ہر عضو کانپ رہا تھا اور میری بے حس روح بیدار ہو چکی تھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں اس کے پاس گیا اور وہ میری طرف بڑھی۔ ہم دونوں ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔

اس وقت کائنات کے ذرہ ذرہ پر سکوت چھایا ہوا تھا اور چاروں طرف تاریکی کی سلطنت تھی۔ ہم دونوں ایک جگہ خاموش کھڑے تھے۔ رسمی طور پر ہم نے ایک دوسرے کی خیریت بھی نہ پوچھی۔ وہ سراپا غم کی تصویر بنی تھی تو میں حیرت و استعجاب کا مجسمہ۔ ہم ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے اور موت کا خوفناک منظر طوفان کی شکل میں ہمارے پیش نظر تھا۔

آج سوشیلا تمام دنیا سے کنارہ کش ہو کر میرے پاس کھڑی تھی۔ میرے سوا آج اس کا کوئی شریک نہ تھا۔ آج میرے بچپن کی رفیق سوشیلا جس کے ساتھ میں کبھی دولہا دلھن کے کھیل کھیلا کرتا تھا۔ ایک طویل مدت کے بعد ملی تھی۔ شادی کی رسم و قیود نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ لیکن اس طوفان کی خونی لہروں نے بچھڑے دو ٹوٹے ہوئے دلوں کو اکٹھا کر دیا تھا۔

اس سے قبل ہم دو جداگانہ ہستیاں تھے اور طوفان کی ایک لہر ہم دونوں کو موت کی آغوش میں دے کر ایک کر سکتی تھی۔ لیکن میرے دل سے یہ آواز نکل رہی تھی کہ "خدا کرے وہ لہر کبھی نہ آئے۔ سوشیلا اپنے عزیز شوہر کے ساتھ عیش و مسرت کی کامیاب زندگی بسر کرے۔ عزیز و اقارب اور لڑکے لڑکیوں کے درمیان زندگی کے لامحدود سال گزارے۔ میں نے صرف ایک رات یعنی "طوفانی رات" میں سوشیلا سے مل کر مسرت جاودانی حاصل کر لی ......"

رات ختم ہو گئی۔ طوفان اور بارش تھم گئی۔ ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے یہ صحیح ہے کہ میں ناظر۔ ہیڈ کلرک یا وکیل نہ بن سکا اور اس وقت ایک اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر ہوں لیکن اس رات نے میری زندگی کو ہمیشہ کے لئے مسرور بنا دیا۔ اور اس نے میرے سامنے حقیقتوں کی ایک نئی دنیا کھول دی۔ اس رات کو میں کبھی نہیں فراموش کروں گا۔ یہ طوفانی مگر مسرت بخش رات میری زندگی کی تمام راتوں سے زیادہ مسرت بخش ہے۔

(ٹیگور)

# غزل

از محترمہ زیب عثمانیہ لودیانوی

ضعف سے ہاتھ گریباں پہ لایا نہ گیا
موسمِ گل سے کوئی لطف اُٹھایا نہ گیا

خاک پر ہی مرے آنسو ہیں نہ دامن میں کہیں
جو تری راہ میں کھو گیا پایا نہ گیا

سببِ خندۂ گل گل کو نہیں خود معلوم
اس طرح بھی کوئی دیوانہ بنایا نہ گیا

پردۂ شمس و قمر پردۂ دل پردۂ گل
کوئی پردہ ترے چہرے سے ہٹایا نہ گیا

کہہ دیا مصلحتِ عشق زمانے نے اُسے
اہلِ دل سے جو کوئی راز چھپایا نہ گیا،

رکھ دیا خلق نے نام اس کا قیامت اے زیبؔ
کوئی فتنہ جو زمانے سے اُٹھایا نہ گیا،




از جناب پروفیسر سید اختر اورینوی ایم اے

کبھی یونہی اتفاقی طور پر نگاہیں متصادم ہو جاتی تھیں۔ یہ کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن نگاہوں میں ایک لطیف شرم آگیں انفعالیت کی جھلک سی —— کیوں؟ —— اور نگاہیں بھی چار ہوتی ہیں لیکن وہ اس رنگینی کے ساتھ محجوب نہیں ہوتیں۔ یہ عجائبِ انفعال غیریت کے سبب ہوگا۔ بیگانگی سی بیگانگی تھی ——

فرحانہ اور شاہد جمیل ایک دوسرے سے پہلے کبھی نہیں ملے تھے۔ ایک مشترک رشتہ دار کے یہاں انکی پہلے پہل ملاقات ہوئی تھی۔ غیریت اور حجاب لازم و ملزوم چیزیں ہیں لیکن حجاب کے ساتھ احساسِ لطیف کیوں پیدا ہو۔ شاید اسلئے کہ دونوں لطیف مزاج اور شیریں ادا تھے۔

یوں ہی غیر ارادی طور پر نگاہیں ملتی اور علیحدہ ہوتی رہیں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وصالِ نگاہ کی جستجو اور شیرینی غیر ارادی طور پر بہت بڑھ گئی۔ اتنی زیادہ کہ اب ارادی طور پر نگاہیں متصادم ہونے لگیں۔ یہ محض دلچسپ کھیل تھا۔ اس کھیل پر کھیل ہی مشغلہ بنتا ہے اور یہی مشغلہ ایک مستقل دلچسپی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ نگاہیں بھی کیسی غمازہ ہوتی ہیں۔ انہوں نے رازِ [illegible] کا اعلان [illegible]۔ فرحانہ نے شاہد جمیل کے دل کی [illegible] موجوں کو اپنے دل کی رنگین و لطیف امواج سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا۔ اس تصادم و انفعال سے نہایت ہی روح افزا نغمے نہایت ہی کومل [illegible] پیدا ہونے لگے۔ شاہد جمیل اور [illegible] احساسِ موسیقی کی لرزشِ کیف پرور میں گم ہوتے جاتے تھے۔ اب خوشگوار [illegible] ترنم ریز [illegible] کلام خاموش [illegible] رہتیں —— —— رہے

اب [illegible] وہ [illegible] تھے نظر جوان رہی تھی ایک نغمہ [illegible] تھی اور نافہمی میں گزر گیا۔

اس [illegible] پر [illegible] زمانہ کے بعد فرحانہ خواب سے چونکی۔ کیسی بات تھی، وہ شادی شدہ تھی نہ + فرحانہ شاہد جمیل سے مجتنب رہنے لگی۔ اب وہ نگاہیں تو شاکی تھیں اور وہ گریز کناں۔ اس گریز و التجا سے بھی تعلق ہی ظاہر ہوتا ہے اور فرحانہ چاہتی تھی کہ شاہد جمیل سے بالکل بے تعلق بنے۔ فرحانہ کو اپنی کمزوری کا احساس تھا۔ وہ جس طرح سہیلیوں سے ملتی تھی شاہد سے اس طرح نہیں مل سکتی تھی۔ کھل کے ملنے میں کشش اور شکست کا خطرہ تھا اور اندازِ اجتناب بھی افشائے راز کا ایک ذریعہ ہے۔ فرحانہ پریشان تھی اور شاہد بیتاب۔

آخرکار فرحانہ نے علیحدگی ہی کو مناسب سمجھا۔ وہ شاہد سے علیحدہ رہتی تھی لیکن مطمئن نہ تھی۔ اس کے جذبات میں گرہ سی پڑنے لگی۔ [illegible] روح [illegible] محسوس کرتی تھی۔ نگاہیں [illegible] اور جذبات کا رستہ ہیں۔ فرحانہ کی نگاہیں الجھی ہوئی اور بیزار سی رہتیں۔ شاہد نہایت استقلال کے ساتھ نگاہوں سے فرحانہ کی رہنمائیوں کا تعاقب کرتا رہا۔

جذبات کی تقیید [illegible] ناممکن سی بات ہے۔ انسانی فطرت [illegible] ہر وقت [illegible] اور [illegible] نہیں ہو سکتے۔ فرحانہ کو ایسی ہی ہونے لگی۔ شاہد اپنی تمنا [illegible] فرحانہ کے حسن کو پیام [illegible] پہنچاتا رہا [illegible] پیام اُسکی روح کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے۔ اُنکی لطافت و شیرینی کو محسوس کرتی اور اپنی الجھنوں سے اُسے شدید نفرت ہونے لگی۔ وہ ان سنہرے پیغامات کے نقرئی نغموں میں گم ہو جانا چاہتی تھی مگر انکے خروش آثار سے خائف تھی۔ فرحانہ کی نگاہوں میں خوف کے سائے تیرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

فرحانہ شادی شدہ تھی۔ حال ہی میں اُس کی شادی ہو گئی تھی۔ لیکن اُس کی ازدواجی زندگی کی ابتدا رسم و رواج کی غیر شاعرانہ اور بے روح فضا میں ہوئی تھی۔ ہر زندہ لڑکی چاہنا اور چاہا جانا چاہتی ہے۔ فرحانہ کا شوہر عقل سے چاہے جانے کی چیز ہو تو ہو، دل سے محبت کئے جانے کی شے نہ تھا۔ نوجوانی میں دل کی حکومت ہوتی ہے۔ فرحانہ [illegible] تھی حسین تھی۔ وہ حسن و نوجوانی کی ایک پیکرِ رنگین و دل آویز تھی۔ اُسکا صبیح رنگ، اُسکی معصوم سی آنکھیں، اُسکا چونکا ہوا بھولاپن، اُسکا نکھرا ہوا شیریں اندازِ تکلم اور اُسکے بہت سے محسوس مگر بے نام شیوے جمیل نوجوان دلوں کو سیلابِ تمنا میں غرق کر دینے کیلئے کافی سے بہت زیادہ تھے۔ فرحانہ کی نگاہوں میں زندگی مچلتی نظر آتی تھی۔ اُسکی نظر دل نے شادی کی آغوش میں زندگی کو نہیں بلکہ رسمیت کی فرسودگی کو دیکھا تھا اور اب وہ شاہد کی شکل میں زندگی کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ زندگی، زندگی کو کھینچتی ہے

فرحانہ اور شاہد جمیل ایک دوسرے کی طرف نامعلوم انداز سے کھنچنے لگے تھے۔

شاہد جمیل نوجوان تھا، کنوارا تھا اور [illegible] بڑھکر وہ شوخ اور زندہ دل تھا مگر اُسکی شوخی متانت سے ہم آغوش رہتی تھی اور زندہ دلی خوشگوار سنجیدگی سے [illegible] تعلیم یافتہ تھا اور مہذب۔ [illegible]

وہ ملنسار تھا مگر بیباک نہیں [illegible] گندمی رنگ [illegible] آنکھیں [illegible] اور نکلتا ہوا قد جسمانی طور پر بھی اُسے ممتاز کئے دیتے تھے۔ [illegible] نوجوانی جوانی کو محسور کرتی ہی رہتی ہے لیکن شاہد کا حسن و شباب [illegible] لطیف [illegible] کشش کا باعث تھا۔ شاہد قریباً سبھی نوجوان الہڑ نگاہوں کا مرکز بنا رہتا تھا اور فرحانہ [illegible] کون ایسا نوجوان دل تھا جو اُسے دیکھ کر ایک شیریں [illegible] کا احساس کیساتھ دھڑک نہ اٹھتا۔ روزِ اول ہی سے نگاہوں کی کیفیت نے یہ پیشگوئی کر دی تھی کہ فرحانہ اور شاہد ایک دوسرے کے لئے عمومیت سے زیادہ معنی رکھتے ہیں +

تو ہاں ابتدائی سرشاریت کے بعد فرحانہ کی نگاہوں میں خوف کا دھواں سا پایا جانے لگا + فرحانہ شاہد سے [illegible] کر رہتی لیکن جب سامنا ہو جاتا تو شاہد کی نگاہیں شکوہ سنج و ملتجی ہوتیں اور فرحانہ کی نظریں فریاد کناں و معذرت خواہ۔ یہ تناؤ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ تناؤ کا انجام فطری شکست ہے۔ لیکن فرحانہ اس حد تک جھک جانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ اُسکے آرزو مند دل نے اُسے بتلایا کہ شاہد

سے شیریں ہے اپنے فرحانہ اسطرح چاندنی نگاہوں کی

وہ اسکی آنکھوں کا عیب ہی تھا ایک بیت [illegible]
کے لئے ریحانہ ایک ناقابل حصول چیز تھی
کیونکہ وہ صرف اس کی محبوب و وابستہ
نہ تھی بلکہ ایک اور ہستی بھی ریحانہ کا [illegible] تھا
[illegible] اور شاہد [illegible] علیحدہ کر دیا اور
زمانے نے انہیں [illegible] شاہد کی نگاہیں
اب جب وہ ملتے تو شاہد کی [illegible]
نہ ہیں اور [illegible] ......
تھی
مستغنی

قطع تعلق کرنا ایک فتنہ [illegible] کا پیش خیمہ [illegible] تک [illegible] پہنچ جانے کے بعد اُس سے گریز کرنا [illegible] لہذا نگاہوں نے اپنی روش بدلی اور ایک بے پناہ سرشاریت کا دور آیا۔ اور شاہد کی نگاہیں ایک دوسرے میں غرق ہو جایا کرتی تھیں جیسے رو پہلی [illegible] میں سطحِ دریا اور آغوشِ دریا میں مچلتی چاندنی کی [illegible] لرزش سے فضا میں محبت [illegible] موجیں لیتی رہتیں اور ان دو گم گشتگانِ محبت کے دل ان امواجِ لطیف کو محسوس کرتے رہتے تھے۔ [illegible] درمیانی زمانہ گزر جانے کے بعد جذبات کے دھارے تیز و تند ہو کر بہنے لگے۔ شاہد و ریحانہ قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ ریحانہ اپنا زیادہ وقت شاہد کی معیت میں گزارتی اور شاہد اس نوازشِ پیہم کی [illegible] سپردگی [illegible] گم تھا ——
ریحانہ مختلف بہانے کر کے شاہد کے [illegible] پان [illegible] اور شاہد طرح طرح کے [illegible] ریحانہ کے قریب پہنچتا۔ پانی کا گلاس لیتے اور دیتے ہوئے کبھی نادانستہ اور کبھی دانستہ طور پر دونوں کی انگلیاں مس کرنے لگیں۔ کبھی یونہی کھیل کھیل میں ایک کے ہاتھ میں دوسرے کا ہاتھ اس طرح چلا جاتا جیسے دو سفید کبوتر خوش فعلیاں کرتے کرتے ہم مل جائیں۔ دونوں پہروں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ادھر ادھر کی باتیں، اکثر حقیر سی باتیں، لیکن وہ انکے لئے بہت ہی بامعنی ہوتیں۔ نگاہوں کی گویائی ادنیٰ باتوں میں وسیع مفہوم کا اضافہ کر دیتی تھی۔

سارے خاندان میں [illegible] کے درمیان شاہد و ریحانہ کے تعلق کے چرچے ہونے لگے۔ بیکار [illegible] نے [illegible] گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے۔ ظن و قیاس سے بہت سی ایسی باتیں بھی پیدا کر لی گئیں جنکا کوئی وجود نہ تھا۔ باوجود ان [illegible] ریحانہ نے اپنے خلوص میں کوئی کمی نہ کی بلکہ وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتی ہی رہی۔ اسکی نگاہیں محبت کے دامن کو اور زیادہ وسیع کئے دیتی تھیں اور محبت کے پھیلے ہوئے دامن پر شاہد کی نظریں [illegible] کے پھول برساتی تھیں۔

شاہد کان کے کسی حصے [illegible] ریحانہ اپنے کمرے کے دریچے [illegible] نگاہوں سے کھوج رہتی اگر وہ سیر کو باہر جاتا تو اس کی آمد سے قبل ریحانہ دروازے پر اُسکے انتظار میں [illegible]

باقی برصفحہ ۵۲

# ہم سفر گھٹاؤں سے

از حضرت جلال ملیح آبادی

شام ہے بنگال پہ ہے اودی گھٹا چھائی ہوئی
جا رہا ہوں عزم شملہ لکھنؤ کو چھوڑ کر
جا رہی ہے جنگلوں میں بل پہ بل کھاتی ہوئی

روح ہے میری ہجوم غم سے گھبرائی ہوئی
کتنی رنگیں صحبتوں کی خُلد سے منہ موڑ کر
اک بتِ رنگیں کی پیہم یاد دلواتی ہوئی

ابر کے سائے میں ہر منظر ہوا جاتا ہے ماند
داغ دل کی طرح طالع ہو رہا ہے زرد چاند

آ دلاسے کافر گھٹاؤ میرا پیچھا چھوڑ دو
کوہ کے دامن میں جی بھر کر رُلا لینا مجھے
لیکن اِس شامِ اودھ میں اب تڑپاؤ مجھے
ہچکیوں سے کون رویا تھا! تمہیں بھی ہے خبر
کس کے اشکوں کے ستارے میرے دامن میں تھے گم
یہ کہا تھا کس نے "مجھ پر رحم فرماؤ گے کب"
یہ کہا تھا کس نے! رخساروں سے آنسو پونچھ کر
"جھوم کر جب ابر آئے گا اندھیری رات میں
یہ کہا تھا کس نے "میری خوں فشانی کی قسم!

اپنا رخ للہ کہساروں کی جانب موڑ دو
جب پہنچ جاؤں میں شملے، تم ستا لینا مجھے
یاد اُس بت کی وفاؤں کی نہ دلواؤ مجھے
وقتِ رخصت تھک کے کس نے دوشِ پر رکھا تھا سر
کس نے رو کر یہ کہا تھا "بھولنا مجھکو نہ تم"
کس نے پوچھا تھا تڑپ کے "لوٹ کر آؤ گے کب"
"آپکی فرقت میں مجھکو خوں رُلائیگا یہ گھر"
میرا مونس کون ہوگا اس بھری برسات میں"
اب جاؤ تم کو میری نوجوانی کی قسم"

ہجر کی راتوں میں دنیا سے گذر جاؤں گی میں
تم جو جاؤ گے تو تنہائی میں مر جاؤں گی میں

# شہنا ہو سے

از جناب علی احمد صاحب علی

میری شہنا کیوں مرے نزدیک تم آتی نہیں
سانس بنکر کیوں مری رگ رگ میں لہراتی نہیں

اُف تمہاری نوجوانی کسقدر مغرور ہے
کس قدر نازو نیازِ عاشقی سے دور ہے

جیسے آدابِ محبت جانتی ہی تم نہیں
جیسے "چاہت" کی خلش پہچانتی ہی تم نہیں

رفتہ رفتہ دور مجھ سے کس لئے ہونے لگیں
درسِ بیداری مجھے کیوں دیکے خود سونے لگیں

کیا مری پیہم پرستش کا یہی انجام تھا
کیا محبت کا مری ٹوٹا ہوا ہی جام تھا
ہاں وفا کرنے کی قسمیں تم نے کھائیں کس لئے
مستیاں بنکر مری ہستی پہ چھائیں کس لئے

آجتک اُف میں بیابِ آرزو کھاتا رہا
دل کے ارمانوں میں اک چھوٹا سکوں پاتا رہا

کیا تمہیں میری جوانی پر ترس آتا نہیں
کیا تمہارا دل مرے دکھ سے لرز جاتا نہیں

آہ! او تنہا زندگی تم بن وبالِ دوش ہے
اک چراغِ کشتہ ہے اک محفلِ خاموش ہے

# مہراجن

از جناب منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

(۱)

پنڈت ماتا دین کی چوپال میں آج بڑی چہل پہل ہے۔ وہاں لکھنؤ والے شکلوں کی برات ٹھہری ہے۔ پیلی پتی صاف دیواروں پر چاندنی رات میں گیا فونس جھلک رہا ہے۔ دالان کے سامنے بیسوں چارپائیاں پڑی ہیں جن پر براتی لیٹے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنا ریشمی کوٹ اتار کر ٹرنک میں رکھنے کی فکر میں ہے کوئی اپنے موزے اتار کر جوتے چارپائی کے نیچے سرکا رہا ہے۔ چھوٹے بچے اپنے بڑوں کے کان میں کہہ رہے ہیں کہ بھوک لگی ہے۔ دلہن کے متعلقین بھی برات کی آؤ بھگت میں لگے ہوئے ہیں۔ کہار کنوئیں پر پانی کھینچ رہے ہیں۔ جہاں دیہہ بڈھے آنکھیں گڑو کر دیکھ رہے ہیں کہ شربت کے بڑے گھڑے پتل کے ہیں کہ تانبے کے۔ بچے خوش ہو رہے کہ شربت آگیا۔ لیکن نوجوان براتیوں کو ان باتوں کے دیکھنے کی فرصت کہاں۔ وہ چندر شیکھر پر پھبتیاں کس رہے ہیں۔ ایک نے کہا: یار چندر، بھابی سے ہمارا تعارف ضرور کرا دینا۔ دوسرے نے کہا: کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ تیسرے نے کہا: کیوں بابو، شیکھر نہیں۔ بیاہ میں چندر جتنے روپے چرائے ان سے کانپور پہنچکر یاروں کی دعوت کرنے۔ چندا ہنس ہنس کر سب کو جواب دے رہا ہے۔ اُس کا دل اسوقت مسرت و شادمانی سے پُر ہے۔ وہ دل ہی دل میں دلہن کے حسن و جمال کی بلائیں لے رہا ہے۔ اُس کا گورا رنگ ہوگا، کالے کالے ناگن کے ایسے بال ہونگے، کنول کی ایسی آنکھوں میں سمندر لہراتا ہوگا۔ تعلیم یافتہ اور خوش مزاج ہے ہی بس، میری زندگی بڑے آرام سے کٹیگی۔ اُس کے لئے میں یہ کرونگا، وہ کرونگا۔۔۔۔ چندر شیکھر انہیں خیالات میں اُلجھا ہوا تھا کہ اسی اثنا میں شربت آگیا۔ براتیوں نے شربت پی کر پوڑیوں کی راہ دیکھنا شروع کی۔ مگر انکے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دس بجتے بجتے پوڑیاں اور شکر بھی آپہنچی۔

(۲)

لوگ بہت دیر میں سوئے تھے، اور جب دن چڑھے آنکھ کھلی تو برات کا رنگ اور ہی نظر آیا۔ چندر شیکھر شامیانے کے ایک گوشے میں بہت اُداس اور رنجیدہ بیٹھا ہوا تھا۔ اُسکے والد، بدری وشال بھی بپھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے نائیوں اور کہاروں کو دری غالیچے سمیٹنے اور شامیانے کی رسیاں کھولنے کا حکم دے رہے تھے۔ اسی اثنا میں شکل جی دست بستہ حاضر ہوئے آتے ہی اُنہوں نے مشر جی کے قدموں میں ٹوپی رکھ دی اور بڑی منت سے کہا: مہاراج غصہ نہ کیجئے۔ ہم پر رحم فرمائیے اور دروازے پر سے برات نہ لوٹائیے۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ آپ دے دیا اور جو کچھ اسکا دینا ہے اب دیدینگے۔ لیکن برات کو واپس نہ لیجائیے۔

لیکن بدری وشال جی اسوقت ایسے نہ تھے۔ انہوں نے ہونٹ چبا کر جواب دیا۔ باتیں بناتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اپنی لڑکی بتا کر ہمارے سر منڈھ دیا۔ کیا ہمارے لڑکے کیلئے ذلیل خاندان کی لڑکی رہ گئی تھی؟ لگن میں کیا دیا ہے۔ بالکل ہی دئیے ہیں نا، پیسہ نہ کوڑی، سلام کرتے دور ہی اسی دم داعیہ پر بھکیوں کا بی اسے پاس لڑکا پہنے بیٹھے تھے۔ ایک تو دھوکا دیا اور اوپر سے باتیں بناتے ہو۔۔۔۔۔۔ دوسری طرف حکم دیا۔ اُتارو جی شامیانہ۔ اب برات ہرگز نہیں رک سکتی!

شکل جی گڑگڑاتے رہے: مہاراج! بے ماں باپ کی لڑکی تھی۔ اُسکے خاندان میں کوئی اور نہ تھا جو اُس کا بیاہ کرتا۔ اس لئے اسکے بیاہ کا بار میں نے اپنے سر لیا تھا۔ اب تو وہ آپ کی بہو ہے اور آپ اُس کے سسر۔ اسکو لے کر ہی جائیے۔

لیکن مشر جی نے ایک نہ سنی۔ تمام بستر بندھ گئے۔ سامان گاڑی پر لد گیا، اور لوگ مختلف جذبات کیساتھ گاڑیوں پر سوار ہونے لگے۔ چندا کے والد مشر بدری وشال کو گاؤں کے لوگوں نے بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ پسیجے۔ بہو کو رخصت کرانا انہیں منظور نہ ہوا۔ گاڑیاں اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئیں۔

لوگوں کے چہرے اُداس تھے۔ ہر شخص کسی نہ کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ مشر جی سب کو دم دلاسا دے رہے تھے کسی بات کی فکر نہ کرو۔ ایک ہی مہینے کے اندر چندا کا بیاہ ٹھیک نہ کر دوں تو کہنا۔ چندا الگ اُداس بیٹھا تھا۔ اُسکو رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ جس روز پھلدان آیا تھا، میں کتنا خوش ہوا تھا۔ برات کی روانگی والے دن میرے دل میں کیسی کیسی اُمنگیں اُٹھ رہی تھیں۔ آہ! وہ ساری خوشیاں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ شکل جی نے اپنے ہتھکنڈوں سے اپنا نام روشن کرنا چاہا تھا۔ اُنکا تو بھانڈا پھوٹا اور سزا مل رہی ہے ایک بیچاری یتیم اور معصوم لڑکی کو۔ برادری کی طرف سے اب وہ کسی سکھ کی مستحق نہیں کیونکہ صرف اسلئے کہ وہ مفلس اور بے یار و مددگار ہے دنیا میں اب اُسکے لئے کوئی سہارا باقی نہیں رہ گیا۔

(۳)

برات چلی گئی۔ کچھ دیر پہلے جہاں جہاں شامیانے تنے ہوئے تھے، غالیچے بچھے ہوئے تھے، بڑی شان والے بیٹھے تھے، اب وہاں خاک اڑنے لگی۔ دھوپ سے بچنے کیلئے کتوں نے کونوں کھدروں میں بیٹھ کر ہانپنا شروع کر دیا۔ چوپال کے دروازے پر بیٹھو اور سیتیہی نے چلم پیتے ہوئے ٹکھاری (نیشکر) کے بونے کی بات چیت چھیڑ دی۔

رام سینہی نے جب سنا کہ برات چلی گئی تو اُسکی وہی کیفیت ہوئی جیسے کوئی کلی بن کھلے مرجھا جائے۔ وہ اسی سوچ بچار میں تھی کہ شکلائن رام سینہی کی بھاوج نے آکر کہا: بیٹا گاڑی تیار ہے اپنی کو بیمار چھوڑ کر آئی تھی۔ جاکر انہیں کی دیکھ بھال کر۔ اب یہاں کیا دھرا ہے؟

رام سینہی نے اپنے کپڑے لتوں کی چھوٹی سی گٹھری باندھی اور ہمسایہ کی عورتوں کی طرف عاجزانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ اسکی بدقسمتی پر آنسو بہا رہی تھیں۔ اسی اثنا میں بہلی گاڑی بان نے آواز دی: دھوپ بڑھ رہی ہے۔ اور زیادہ دیر نہ کرو۔

شکل جی بیٹھے بڑبڑا رہے تھے۔ کیا زمانہ ہے۔ ہون کرتے ہاتھ جلتا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ ماموں کی بیٹی ہے۔ بے یار و مددگار ہے، لاؤ پاؤں پڑ جاؤں۔ لیکن اُلٹی آفتیں گلے پڑ گئیں۔ اب سب مجھ کو الزام دیتے ہیں۔ پہلے کسی کے منہ میں زبان نہ تھی۔

رام سینہی اپنی بڈھی چچی کے پاس جا رہی تھی۔ اُسکی آنکھوں سے آنسو لگاتار بہہ رہے تھے۔ کہ جب اُسکی بیوہ ماں کی آنکھیں بند ہوئی تھیں تو رام سینہی دو برس کی تھی۔ اسی چچی نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔

(۴)

پنڈت بدری وشال مشر کانپور کے رہنے والے تھے، اُنکی ماہانہ آمدنی ایک سو روپیہ کے لگ بھگ تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام چندر شیکھر تھا۔ عام طور سے وہ چندا کے نام سے مشہور تھا۔ چندر شیکھر نے بڑی کوشش اور محنت سے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ماب بطالت کا امیدوار تھا۔

مشر جی پرانے خیال کے آدمی تھے۔ دل میں بڑی بڑی تمنائیں تھیں یہی وجہ تھی کہ انہوں نے چندا کو تعلیم دلائی تھی۔ اُنکی لمبی چوڑی شرائط کے باعث چندا کی شادی ابتک نہ ہو سکی تھی لیکن شکل جی کی چکنی چپڑی باتوں اور انکے سبز باغ کے خیالی منظروں نے مشر جی کو پھسلا کر بات پختہ کر لی تھی۔

برات واپس نہ جاتی کہ مشر جی چاہتے تھے کہ تاؤ ٹھنڈا نہ ہونے پائے۔ وہ بہت جلد چندا کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ چندا جب سے برات کیساتھ واپس آیا تھا، اُسکو چپ سی لگ گئی تھی۔ اُس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ ایکدن مشر جی بھونچکے ہو کر رہ گئے۔ بات یہ تھی کہ چندا کی موجودگی میں انہوں نے اُس کی شادی کا تذکرہ چھیڑا تو چندا نے سر نیچے کر کے باپ سے عرض کی کہ اب میری شادی کی فکر نہ کیجئے میں شادی نہیں کرونگا۔ اُنہوں نے یہ بھی دیکھا کہ چندا کے الفاظ محض درخواست ہی نہیں بلکہ ان میں استقلال اور مضبوطی بھی ہے۔

(۵)

چندا کی حالت دیکھ کر مشر جی متفکر رہنے لگے۔ چندا سارے دن چارپائی پر پڑا رہتا۔ کبھی اُسکے ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی کبھی یونہی کسی خیال میں مستغرق ہوتا۔ مشر جی نے اُسکو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ شادی کرنے کو سمجھایا بجھایا، آنکھیں بھی دکھائیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کیرم کھیلنے کا اُسکو بہت شوق تھا۔ لیکن کیرم بورڈ اب گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔

> چندرا بابو آرام کی غرض سے اپنے کمرہ میں پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں دلہن بھی شرماتی لجاتی ہوئی آئی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی دلہن کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا: آپ۔۔۔ ارے بابو جی آپ۔۔۔
> اور چندرا بابو نے بھی اُسے حیرت سے دیکھا۔ ارے مہراجن تم! اور دونوں ایک دوسرے سے چپٹ گئے۔۔۔!

[illegible] بہت [illegible] ہو [illegible] تھا [illegible] آنکھ [illegible] ہیں اُٹھ [illegible] پڑے تھے ۔ دوست [illegible] ہو گیا تھا ۔

[illegible] نے [illegible] دیا وہ [illegible] بیٹھے گئے ۔ [illegible] باقی [illegible] پانی [illegible] کے پتے اور [illegible] بہت دیکھ بھال اور خدمت کی [illegible] مگر [illegible] بیماری [illegible] موت کے پنجے سے نہ بچا سکے ۔

[illegible] آنکھیں بند [illegible] کی آنکھیں [illegible] جب اُنکو والدہ کی [illegible] تو اُنکو اپنی [illegible] کا بڑا غم ہوا [illegible] اور [illegible] بیمار [illegible] تھیں [illegible] سے [illegible] اُنکو [illegible] ہوا [illegible] اور [illegible] ہوتی ۔

(۶)

رام [illegible] کے [illegible] سے روانہ ہوئی اور پھول بیاتی [illegible] آئی اور پہنچی گھر میں داخل ہوئی ۔ تو بڈھی پچی بستر پر [illegible] میں اُسکا سہارا اپنی اولاد نہ تھی ماں کے مرنے کے بعد اُسکو پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی

رام سینہی کے پیروں کی چاپ سُن کر پچی نے آنکھیں کھولیں اور اُسکو دیکھ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے ۔ رام سینہی بھی پچی سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ پچی نے اُسکو دیکھ کر گویا اطمینان کی سانس لی ۔ لیکن نہیں ، وہ اُسکی زندگی کی آخری سانس تھی ۔ رام سینہی چیختی چلاتی رہ گئی ظالم قدرت نے اُسکا وہ سہارا بھی چھین لیا ۔

پچی کی موت کے بعد رام سینہی کو فکر معاش لاحق ہوئی ۔ جب تک پچی زندہ رہی اُس نے رام سینہی کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا ۔ لیکن اب نکلے بغیر کام نہ چل سکتا تھا ۔ وہ زمینداروں اور بڑے رئیسوں کے یہاں سے کوٹنے پیسنے کو غلہ لے آتی اور کسی طرح [illegible] روٹی کا انتظام کرتی لیکن بڑی تنگ ترشی سے گزارہ ہوتا تھا کبھی کبھی کوٹنے پیسنے کو نہ ملتا تو بیچاری بہت پریشان ہوتی ۔

ایسے وقت میں رام دیئی کی بیٹیا بنا اُس کے کام آتی ۔ وہ رام سینہی کے گھر کی کوئی چیز بازار میں بیچ آتی اور آٹے دال کا انتظام کر دیتی ۔

چندا کی ماں رام دیئی لکھنؤ میں کسی بابو کے یہاں چوکا برتن کرنے پر ملازم تھی اس بار وہ دو برس کے بعد لکھنؤ سے آئی تو چندا نے رام سینہی کی مصیبت کی داستان اُسے سنائی دوسرے دن رام دیئی خود رام سینہی کے گھر گئی ۔ پہلے تو دونوں گلے مل کر خوب روئیں پھر رام دیئی نے کہا بیٹی یہاں پڑی پڑی کیوں تکلیف اُٹھاتی ہے ۔ اب تیرا [illegible] کون ہے ۔ میرے ساتھ لکھنؤ چل کسی شریف خاندان میں چوکا برتن کریگی تو بھوکی نہ رہیگی "

رام سینہی نے [illegible] ہوئے کہا : " چاچی [illegible] سنا ہے کہ شہر میں کسی کے دُکھ سکھ میں کوئی ساتھ نہیں دیتا ۔ اور کہتے ہیں کہ شہر کے آدمی من کے بھی کھوٹے ہوتے ہیں " ۔

رام دیئی نے رام سینہی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا : بیٹی دنیا میں کون کسی کا دوست اور کون کسی کا دشمن ، میں تو یہ جانتی ہوں کہ اگر میں ہوں گی تو کوئی ماں کا لال بیا [illegible] نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا ۔ اور رہی یہ بات کہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تو میں یہ جانتی ہوں کہ آپ بھلے تو جگ بھلا ۔ اگر ہمارے من میں کھوٹ نہیں تو کسی کی ہمت نہیں کہ ہماری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے ۔ چندا کے باپ کو مرے آج چار برس ہوئے ، تب ہی سے میں شہر میں رہتی ہوں لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھتا ۔ ست [illegible] جس کی [illegible] اُس کی [illegible]

آخر میں رام سینہی آمادہ ہو گئی ۔ اور تیسرے دن رام دیئی کے ساتھ لکھنؤ چلی گئی ۔

(۷)

چندا جب لکھنؤ پہنچ کر پہلے دن دفتر میں گیا ۔ بارہ بجے سے کام سمجھتے سمجھتے شام کے چار بج گئے تب کہیں جا کر چھٹی ملی ۔ ہیڈ کلرک صاحب نے فرمایا کہ کل دس بجے آ کر اپنا کام شروع کر دیجئے ۔ دفتر سے نکلا تو دوسری فکر سوار ہو گئی ۔ آ کر دھرم شالہ میں بستر وغیرہ رکھ کر مکان کی تلاش میں پھرنے لگا ۔ کم کرایہ کے مکان کی تلاش تھی ۔ لیکن ایسی جگہ جہاں ہر قسم کا آرام بھی ملحوظ تھا کہ کہیں بالائی منزل پر نظر تھی کہیں مکان دیکھ کر کسی میں کچھ نقص نکلا اور کسی میں کچھ ۔ چراغ جلنے کا وقت ہو گیا ۔ تو مجبوراً دھرم شالہ کی راہ لی ۔ اس وقت جس کسی کو وہ اپنے گھر جاتے دیکھتا تھا ۔ اُسی کو سب سے زیادہ سکھی تصور کرتا تھا ۔ بازار میں کچھ کھا پی کر دھرم شالہ میں جا کر پڑ رہا ۔

صبح ہوئی ۔ اُٹھتے ہی پھر وہی فکریں چندا کو پریشان کرنے لگیں ۔ پھر گلی کوچوں میں مکان کی تلاش شروع کی ۔ بالآخر ایک مکان پسند آیا ۔ مالک مکان بھلا آدمی تھا ۔ کرایہ بہت جلد طے ہو گیا ۔ چندا نے دھرم شالہ سے اپنا سامان لا کر مکان میں رکھ دیا ۔

ماں نے برتن وغیرہ ساتھ کر دیئے تھے ۔ صندوق میں سے برتن نکالے ۔ قریب ہی کہار رہتا تھا ۔ وہاں سے ایک مہری کو بلایا ۔ مہری نے چوکا لگا کر [illegible] صفائی اور بنیئے کی دکان بھی قریب ہی بنئے کی دکان تھی ۔ چندا نے دال چاول لا کر کھچڑی چڑھا دی ۔

کھانے کے بعد دفتر جاتے وقت چندا نے مہری کو [illegible] کہا : " مہری مجھے کھانا بنانا نہیں آتا ۔ دو چار مہینے کیلئے کسی مہراجن کا انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہے بازار کا کھانا مجھے پسند نہیں "

مہری نے مایوسانہ لہجہ میں جواب دیا بابو جی یہاں تو کوئی مہراجن نہیں رہتی ۔ رام [illegible] یہاں ایک مہراجن ہے اُس سے پوچھوں گی " ۔

پانچ دن گذر گئے ۔ اسی دوران میں چندا کو یقین ہو چکا تھا کہ چولہے کے آگے بیٹھنا اُسکے بس کا روگ نہیں ۔ مہری تو آگ سلگا کر اپنے دوسرے ٹھکانوں پر چلی جاتی تھی اور چندا جیسے تیسے کچی پکی روٹیاں سینکتا ۔ کبھی کبھی چولہا بجھ جاتا تو پھر جلنے کا نام نہ لیتا ۔ چندا آگ پھونکتے پھونکتے پسینے میں شرابور ہو جاتا ۔ آنکھیں بہنے لگتیں ۔ وہ جھلا کر لکڑیاں اور آٹا اُٹھا کر سڑک پر گائے کیلئے ڈال دیتا ۔ اور خالی پیٹ دفتر کی راہ لیتا ۔

شام کا وقت تھا ۔ مہری دو عورتوں کو ساتھ لے کر آئی ۔ ایک عورت ادھیڑ عمر کی تھی اور دوسری نوجوان ۔ مہری نے آتے ہی کہا : " بابو یہ مہراجن رسوئی کرنے آئی ہیں ۔ آپ بات چیت کر لیجئے "

چندا کے سر سے بوجھ اُتر گیا ۔ کہنے لگا :

" اچھی بات ہے صبح سے کام شروع کر دیں ۔ تنخواہ جو مانگیں وہ دی جائے گی " ۔

لیکن وہ ادھیڑ عمر عورت یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ " بابو یہ میرا سہارا ہے اور آپ سے کم ہی کام نہ ہوگا ۔ ہاں ایک بات اور کہے دیتی ہوں کہ اسکو ان کاموں کا زیادہ تجربہ نہیں ہے ۔ کبھی کبھار غلطی ہو جائے تو سمجھا دیجئیگا ۔ بات سننے کی اسے عادت نہیں ہے " ۔

دوسرے دن سے مہراجن کھانا پکانے لگی ۔ اُسنے بڑی ملامت سے چندا کو کہا کہ مہینے بھر کی رسد اکٹھی لا کر رکھ لینا زیادہ اچھا ہوگا ۔ ایسا ہی ہوا چندا کی ساری پریشانیاں اور تکلیفیں دور ہو گئیں کسی قسم کی فکر باقی نہ رہی ۔ گھر کا ایسا آرام ملنے لگا ہر مہینے کے پہلے اتوار کو وہ آٹا ، دال ، چاول ، گھی شکر ، مسالہ وغیرہ سب چیزیں لا کر رکھ دیتا اور پھر مہینے بھر کیلئے بے فکر ہو جاتا ۔ دونوں وقت کھانے کو لذیذ کھانا مل جاتا ۔ مہراجن کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ ہوگی ۔ لیکن کھانا پکانے میں بہت ہوشیار تھی ۔ مہراجن کی وجہ سے چندا کی بہت سی مشکلیں آسان ہو گئیں ۔

(۸)

کانپور سے لکھنؤ آئے چندا کو دس مہینے ہو گئے ۔ والدہ کے خطوط برابر آتے تھے ۔ وہ بار بار یہی لکھتی کہ بیٹا یہاں اکیلے میرا جی نہیں لگتا ۔ اُدھر تم بھی تکلیف اُٹھاتے ہو گے ۔ آنکھوں کے سامنے ہر وقت تمہاری صورت رہتی ہے ۔

چندا سوچتا کہ کانپور کے مکان کو فروخت کر دوں یا کوئی اور قابل اطمینان انتظام ہو جائے تو اماں کو یہاں لانا ٹھیک ہوگا ۔ ابھی تک وہ عارضی آسامی پر تھا ۔ لیکن گذشتہ ماہ سے مستقل ہو گیا تھا ۔ ماں کی بیقراری کا خیال کر کے اُسنے یہی مناسب سمجھا کہ ماں کو بھی لکھنؤ لے آئے ۔

شام کا وقت تھا کل سے دسہرہ کی چھٹیاں شروع ہونگی ۔ مہراجن اپنے کام سے فارغ ہو کر جانے لگی ۔ تو چندا نے آواز دی : " مہراجن ! " مہراجن آ کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی ۔ چندا نے کہا : " کل میں اپنی ماں کو لینے جا رہا ہوں ۔ اب تمہاری ضرورت نہ ہوگی ۔ تم نے میرے یہاں دس مہینے کام کیا اور تمہاری ذات سے مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی ۔ تمہاری بات چیت اور طور طریق سے میں نے اندازہ کیا ہے کہ تم مصیبت زدہ ہو ۔ میں خود بھی مصیبت میں ہوں ۔ اسلئے مجھے تم سے ہمدردی ہے ۔ یہ لو یہ تمہاری اس مہینے کی تنخواہ ہے اور اسکے ساتھ دس روپے تمہیں انعام کے طور پر دیتا ہوں ۔ تمہیں الگ کرتے ہوئے مجھے خود بھی افسوس ہے " ۔

مہراجن خاموشی سے سنتی رہی اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا ۔ دھوتی کے آنچل سے آنکھوں کو پونچھتی ہوئی وہ گھر سے باہر ہو گئی ۔

(۹)

گھر پہنچ کر رام سینہی نے رام دیئی سے کہا : " چاچی آج بابو نے جواب دیدیا ۔ اب وہ رسوئی نہیں بنوائیں گے "

رام دیئی نے جلدی سے پوچھا : " کیوں کچھ غصہ ہو گئے کیا ؟ وہ تو بڑے سیدھے معلوم ہوتے ہیں "

رام سینہی نے سنجیدگی سے جواب دیا : " نہیں اب اُن کی ماں آ کر ساتھ رہیں گی ۔ اسلئے مہراجن کی ضرورت نہیں ہوگی " ۔

رام دیئی : " اچھا یہ بات ہے ! "

رام سینہی نے بڑے اشتیاق سے کہا : " چاچی گاؤں سے آئے دس گیارہ مہینے ہو گئے کیوں نہ گاؤں چلے چلیں ۔ یہاں سے تو اب جی اُچاٹ ہو گیا ۔

رام دیئی نے جواب دیا : " کیا ہرج ہے رام بابو بھی بنارس جا رہے ہیں ۔ پندرہ دن میں لوٹیں گے ۔ اُسوقت تک ہم لوگ گاؤں ہو آئینگے "

(۱۰)

چندا نے دروازے پر قدم رکھا ہی تھا ۔ کہ ماں نے لپک کر کلیجے سے لگا لیا ۔ چندا نے دیکھا کہ گذشتہ دس ماہ میں ماں کی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے ۔ بیوگی کے غم اور بیٹے کے فراق دونوں نے مل کر اُسکو بالکل بڑھیا بنا دیا ہے ۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر جب ماں بیٹے بیٹھے تو ماں نے کہا : " بیٹا میرا بڑھاپا آ گیا ہے ۔ چوکا برتن کرنے میں اب مجھے تکلیف ہوتی ہے جس فرض کو میں نے زندگی بھر ادا کیا ہے اُس سے سبکدوش ہونے کو جی اب بھی نہیں چاہتا ۔ تمہیں اسی اُمید پر تو پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا ۔ کہ اس سیوا کے بدلے ایکدن میوا ملیگا ۔ " اُن " کے سامنے تو میری چلتی ہی نہ تھی ۔ کہ شہزادپور والوں کا تذکرہ چھیڑتی ۔ دوسری شادی کرنے پر تم رضامند نہ تھے ۔ لیکن میں پوچھتی ہوں کہ اُس لڑکی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ اُسکی زندگی خراب کر رہے ہو ! بیاہ کو تین برس ہو گئے اور تم نے اُس بیچاری کی خبر تک نہ لی ۔ تم تو پڑھے لکھے ہو ۔ ذرا سوچو تو ..... "

چندا نے بچوں کی طرح ماں کی گود میں سر

باقی بر صفحہ ۵۲

# نغمۂ ندیم

از جناب احمد ندیم صاحب قاسمی بی اے

جب چرخ پہ تارے مجھے کرتے ہیں اشارے
جاگ اُٹھتے ہیں کچھ خاکِ تمنا میں شرارے

آنکھوں سے اِدھر اشک ٹپکتے ہیں ہمارے
گردوں پہ اُدھر ٹوٹتے جاتے ہیں ستارے

ساحل ہے نہ موجیں ہیں نہ طوفاں نہ تلاطم
کشتی تو لگا سکتا ہوں دریا کے کنارے

تھی اُن کی نگاہوں میں بہت دور کی منزل
منزل پہ پہنچتے ہی جو منزل سے سدھارے

جیسے ہوں کسی معبدِ خاموش میں فانوس
یُوں دل میں چمکتے ہیں تصور کے شرارے

قطرہ ہو سمندر بھی اگر تیری نظر میں
قطرے میں نظر آئیں سمندر کے نظارے

پنہاں تری رفتار میں ہے رُوحِ قیامت
مشاطۂ قدرت نے ترے ناز سنوارے

کیوں تیرے تغافل کو نہ دُوں رنگ کرم کا
لیتے ہیں اگر ڈوبتے تنکوں کے سہارے

تاخیر کے اسرار مجھے تو نہیں معلوم
کیوں کانپ رہے ہیں ترے ہونٹوں کے کنارے

راتوں کو ندیم اُٹھتی ہے آواز یوں دل سے
جیسے کوئی بھٹکا ہوا منزل کو پکارے

# نگاہیں — بقیہ صفحہ ۱۷

شاہد کبھی کبھار جی بھر کے ان بہتی ہوئی آنکھوں سے باہر ہو جاتا تھا لیکن نگاہ سے دامن بچا کر بڑی ہی خوبی سے نکل جاتا اور وہ [illegible] کا پیاسہ اور وہ ملال ہو جاتا۔

[illegible]

[illegible]

پلنے پاتی تھی لیکن اس کا جواب یہی ہے کہ محبت کا پیالہ تمام اٹھی نگاہوں نے پیچ دار بیچارہ ہو گئے۔

لیکن ابھی تک کسی نے اظہار محبت نہ کیا تھا۔ یا فوراً نگاہوں ہی نگاہوں میں آنا آنکھ بہ چکا تھا۔ گویا یہ خاموش مکمل محبت پر یہ شناسا ہے تم۔

"میں تمہیں کہنا چاہتی ہوں کہ تم۔۔"

اسکے آگے وہ کچھ نہیں بول سکی اور شاہد بھی نہ [illegible] البتہ اس کی نگاہوں میں جانثاری کی [illegible] ریحانہ نے پیش کی تھی۔ اب انفعال شاہد کی [illegible] تھا جیسے قدرت خود انسان آنکھیں بند کر لیتی ہے اسی طرح شاہد بت کے مشرب میں چند دن رہ گیا۔ شاہد کی خاموشی نے ریحانہ کو بیتاب کر دیا۔ وہ اپنی محبت کی کامیابی کا ہر طرح یقین چاہتی تھی۔ وہ ایک نوجوان محبت کرنا اور پوچھا جانا چاہتی تھی۔ وہ ایک آفت کی پرکالہ تھی اور اپنی الوہیت کے مکمل اقرار کی متمنی، وہ خدا بھی بنی پرستش و نمائش کی بھوکی ہوتی ہے۔ اس سکوت نے رو کے نہ [illegible] ریحانہ کی تمناؤں کو اور پر شور بنا دیا اور اب وہ مکمل فتح کے لئے نازنیانی کے سارے اسلحوں سے شاہد کے دل کا محاصرہ کرنے پر تل گئی۔ گرمی کی آیت۔ ساکن وہ پہلو بدل رہی تھی لیکن ایک [illegible] اور محبت بے آغوش خط شاہد کو دیا لیکن شاہد نے اسکا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ شعلے اور بھڑکنے لگے۔ ریحانہ کی نگاہوں میں محبت کے شعلے کی شدت اور زیادہ روشن ہو کر کانپنے لگی۔ شاید اس شعلے نے کب تک سلگ اٹھنا ایک ماہ بعد شاہد نے بھی ریحانہ کے حضور محبت کا اقرار مکمل طور پر کر لیا لیکن اس اظہار کے بعد وہ ریحانہ سے علیحدہ علیحدہ رہنے لگا اور چند ہی دنوں کے بعد دونوں ایکدوسرے سے عرصہ دراز کے لئے علیحدہ ہو گئے۔

جب وہ پھر ملے تو ایک زمانہ بیت چکا تھا لیکن اب تک لگی ہوئی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ ریحانہ کی فطرت میں چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کی تمنا تھی اور شاہد بھی اسکی بہیں ہیں جذبہ عبودیت تڑپ رہا تھا۔ ریحانہ کی تمنا ہنوز تشنہ تکمیل تھی لہٰذا اس نے ایسے بندے کی تلاش کی اور اسمیں وہ کامیاب ہوئی لیکن وہ ایسے حسن و جمال کی عبادت ہوتی ہوئی دیکھنا چاہتی تھی۔ شاہد کو ایک آستان مل گیا تھا اور اس نے ترک کر کے [illegible] اپنا نگاہی دیکھ

ریحانہ مجھے اور شاہد پوجنے کی لذت حاصل کر رہے تھے نا ہموار تو ہو کے اس اتصال میں صرف دل و نگاہ ہی شریک نہ تھے بلکہ لب و عذار اور آغوش و بازو بھی دخیل تھے۔ ریحانہ پرستیدہ ہونے کے سرور میں مطمئن تھی اور شاہد نوا فراد کی بھی پیدا نہیں کر رہی تھی لیکن بہت [illegible] جسم و رضا بھی آمادہ نہیں کبھی کبھی خود انکار کا [illegible] ایک [illegible] بچہ پیدا [illegible] تھا کے پوجا کے جذبہ کو شکست [illegible] اب حسن کی مکمل فتح ہو چکی تھی [illegible] پرستش [illegible] باقی نہیں رہی [illegible] کی ہو چکی [illegible] شاہد کے سحر و روح [illegible] ریحانہ کی پوجا کر رہا تھا۔ ریحانہ نے اس [illegible] ایک عرصہ تک لطف اٹھایا اور پھر اس نے [illegible] ریحانہ کی نگاہوں میں بے قراری کے شعلے بجھ گئے اور اب ان میں آسودگی کی ٹھنڈک تھی۔ شاید کہ شاہد ریحانہ کی ایک نا قابل حصول چیز رہی کیونکہ وہ صرف اس کی معبود نہیں تھی بلکہ ایک ساتھی بھی رہی تھی سے وابستہ تھی اور شاید تو قدر ریحانہ کا تمام زمانہ نے انہیں علیحدہ کر دیا اور اب جب وہ ملے تو شاہد کی نگاہیں ملتجی ہو رہیں اور ریحانہ کی مستغنی ۔

# مہاراجن — بقیہ صفحہ ۵

ڈال کر کہا: اماں، تمہاری بات میں نے کب ٹالی ہے۔ ایک دفعہ چاہنے والی کی نہ سنی ہو مگر تمہاری بات میں نے کبھی نیچی نہیں ہونے دی۔"

ماں نے پُر اشتیاق لہجہ میں پوچھا: "تو میں بہو کو بلا لوں؟"

چندا نے کمرے سے جاتے جاتے جواب دیا: "جو کچھ مناسب سمجھو کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

ماں نے چندا کی رضامندی پا کر اپنے بھتیجے درگا کو بلوایا۔ اسکی دکان بادشاہی ناکے پر تھی وہ آیا تو دوسرے ہی دن اسکو شہزادپور روانہ کر دیا کہ جا کر بہو کو لے آئے۔

رام سینہی کو لکھنؤ سے آئے تین دن ہو گئے تھے۔ لیکن اسکو نہ اطمینان حاصل تھا نہ سکون۔ وہ ہر وقت پژمردہ رہتی تھی۔ کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا گھنٹوں بُت بنی رہتی۔ نہ جانے اسکے خیالات اُسے کہاں سے کہاں لئے پھرتے تھے۔

شام ہو چکی تھی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ رام سینہی اپنی دہلیز کے دروازے پر بیٹھی تھی۔ ہمسایہ میں جانور سانی کھا رہے تھے۔ انکے گلے کی گھنٹیاں رہ رہ کر بج اٹھتی تھیں۔ دوسری طرف دودھ دوہنے کی آواز آ رہی تھی۔ چراغ بتی کا وقت کبھی کا ہو چکا تھا لیکن رام سینہی اپنے خیالات میں کھوئی تھی۔ کندھوں پر ہل رکھے ہوئے کسان سامنے سے گذر رہے تھے۔ شاید وہ انہیں کی زندگی پر غور کر رہی تھی ٹھیک اسی وقت قریب کے چبوترے کے پاس ایک یکا آکر ٹھیرا اور ایک جوان نے اتر کر کسی راہگیر سے دریافت کیا: "کیا سیر سیہی کا کی کا مکان یہی ہے؟"

جواب میں "ہاں" سُن کر وہ رام سینہی کے گھر کے دروازے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ رام سینہی سنّ ہو کر چاپ کر اندر بھاگی۔

جوان نے دالان میں آکر کہا: "میں ہوں چندا بابو کا بھائی۔ بھابی! مجھ سے کیوں شرماتی ہو، میں تو تمہارا دیور ہوں۔"

چراغ روشن کرتے کرتے رام سینہی نے گھونگھٹ کو ذرا اور سر کا لیا۔ اور چارپائی پر دری بچھا کر دھیمی آواز میں دریافت کیا: "وہاں سب خیریت ہے نا؟"

درگا نے کہا: "سب خیریت ہے۔ ماں نے بلایا ہے۔ شری جی چل بسے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں اماں نے بلایا ہے۔ کل صبح ہی چلنا ہوگا۔"

رام سینہی یہ سنتے ہی بھونچکی سی ہو کر رہ گئی۔ بعد ازاں وہ اس نے درگا کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا اسکی بات کو جھوٹ سمجھ رہی ہے۔ درگا بھی رام سینہی کی الجھن کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد رام سینہی نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا: "چلو میرا خیال تو ہوا۔"

چندا کے گھر میں خوب چہل پہل تھی دروازے پر دوست احباب کا جمگھٹا تھا ہنسی مذاق ہو رہا تھا لوگ چندا بابو کو مبارکباد دینے آئے تھے۔ بیٹھک میں گراموفون بج رہا تھا۔ مہمانوں کی خاطر و تواضع ہو رہی تھی۔

اندر کہیں زیادہ رونق تھی۔ عورتیں ساڑیوں میں ملبوس ادھر اُدھر جا رہی تھیں کسی کے ہاتھ میں گلوریوں کی تھالی تھی کسی کے ہاتھ میں مٹھائی کا تھال آنگن میں گانا بجانا ہو رہا تھا کچھ عورتیں بہو کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ بہو کا منہ دیکھنے کیلئے آج گویا ٹکٹ لگ گیا تھا۔ کوئی عورت شرما شرمی بھی دیتی تو ناعہ سے کم نہ دیتی تھی۔ یہ رقم بہو کی رونمائی کی فیس تھی! باہر آدمی جمع تھے اور اندر عورتیں۔ ادھر بچوں کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ وہ اندر باہر اچھلتے کودتے پھر رہے تھے۔

مشری کی وفات کے بعد آج پہلی مرتبہ چندا کی والدہ کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ آج ان کا قدم بھی ایک جگہ نہ جمتا تھا۔ کبھی کوٹھری میں جا کر مٹھائی نکال کر دیتیں کبھی جا کر دیکھتیں کہ برف تو ختم نہیں ہو گئی۔

رفتہ رفتہ بھیڑ چھٹی۔ دوستوں نے اپنی اپنی بائیسکلیں اٹھا کر اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ عورتوں نے بھی اپنی چادریں سنبھال کر گھروں کا رُخ کیا چندا بابو دن بھر کے تھکے ماندے تھے کھانا کھا کر آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں دُلہن بھی لجاتی شرماتی ہوئی آگئی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی دُلہن کے منہ سے بیساختہ نکل پڑا: "ارے بابو جی آپ!"

اور چندا بابو نے بھی حیرت سے کہا: "ارے مہاراجن! تم!"

دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔۔۔۔

# وصل اور وصال بقیہ صفحہ ۴۵

گر تری تحریر سے پیدا ہوا اسباب وصال
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

اصغر بھی بڑے صوفی منش شاعر تھے گر اُنھوں نے بھی چاہے اس سے ان کو عشق نہ ہو گر دنیاوی ہی وصال کا تذکرہ کیا ہے

کیا درد ہجر اور یہ کیا لذت وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

اور اگر ان سبھوں کے گرو میر حسن کی اس غیر فانی کتاب کو جو "نفاست کمتر بقیمت بہتر" کی مصداق اور نمایاں تصویر ہے صحیح سمجھی جائے تب تو یہ ماننا ہی پڑے گا کہ "وصال" کے معنی مرنا نہیں بلکہ زندگی کا لطف اُٹھانا ہے۔

اور وہ بھی یوں ؎

لگے پینے باہم شراب وصال
ہوئے نخل اُمید سے وہ نہال
لبوں سے ملے لب دہن سے دہن
دلوں سے ملے دل بدن سے بدن
لگی آنکھ سے آنکھ خوشحال ہو
گئیں حسرتیں دل کی پامال ہو
لگی جاکے چھاتی جو چھاتی کے ساتھ
چلے ناز و غمزہ کے آپس میں ہاتھ

جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے یا یہ ہوا کہ ؎

کسی کی گئی چولی آگے سے چل
کسی کی گئی چین ساری نکل
غم و درد و دامن کشیدہ ہوئے
وہ گل نارسیدہ، رسیدہ ہوئے

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ "وصال" کے معنی "مرنا" تو کجا اس میں تو وہ معنوی لذت ہے کہ اگر کسی مردے کو بھی (اگر وہ سُن سکتا ہو) یا سے سُنیا جاسکے وصال کی بشارت دی جائے تو وہ اُٹھ بیٹھے گا۔ بقول شاد ؎

بے مژدۂ وصال نہ چونکیں ترے شہید
سو بار اگر فرشتۂ رحمت ندا کرے

ورنہ یوں تو کتنے سرپھرے ایسے بھی ہیں جو "وصال" کو "مرگ" کہنا تو کجا "وصل" کو بھی "موت" سمجھتے ہیں ؎

ہر ایک کام ہو مشکل تو کیا کرے انساں
مجھے تو جان کا دینا بھی "وصل یار" ہوا

بہرکیف میری دانست میں "وصل" اور "وصال" دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ نام ہے ایک ایسے ہی سکرآگیں لمحات کے مجموعہ اور ایک ایسی ہی نشیلی کیفیتوں کے مرقع کا جس میں دنیا کے اہم ترین لذائذ اور افضل ترین حظائظ کی بہترین جلوہ باریاں اور ضیا پاشیاں پنہاں ہوتی ہیں بس

[illegible]

لے چنانچہ میرے اس خیال کی تصدیق اس شعر سے بھی ہو سکتی ہے کہ فارسی کے اس شعر میں "وصل" اور "وصال" دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے ؎

# "وصل" اور "وصال"

## اس موضوع پر اردو کے بیحد دلچسپ اشعار

از جناب عطاء اللہ صاحب پالوی

دور مقصد نہ منزل دل سے
"وصل" بھی ہے یہیں وصال بھی ہے

یہ شعر جگر مرادآبادی کا ہے اور اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ "وصل" اور "وصال" دو بالکل علیحدہ کیفیتوں اور جداگانہ حالتوں کے نام ہیں۔ لہٰذا آئیے اس پر غور کریں کہ آخر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

"وصل" کے متعلق کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ سارے لوگ جانتے ہیں کہ "وصل" نام ہے بادۂ کیف و سرور سے محبت کے جام زرّیں بھر جانے کا۔ "وصل" نام ہے سحاب عشق سے حسن کی رعنائیوں کے ڈھک جانے کا۔ "وصل" نام ہے حسن مردانہ کی ضیا پاش کرنوں سے فانوس نسائیت کے روشن ہو جانے کا۔ اور "وصل" نام ہے ایک گوشت پوست والے پرستار جمال اور مست شباب مرد پر ایک گوشت پوست والی مجسم ناز حسینہ اور غارتگر تمکین عورت کے اس دوحانی یکتا غالب ہو جانے کا جس کا جنسی کشش اور فطری رجحان کی بنا پر عمل پذیر ہونا عین فطرت ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے اس کی ایک ہلکی تصویر یوں کھینچی ہے۔

وصل سے محروم ہوں میں ورنہ گستاخی معاف
بوسہ لیتا ہے تصور آپ کی تصویر سے

دوسرے صاحب نے لذت وصل کا تذکرہ یا اس تمنا کا اظہار یوں کیا ہے ؎

مزہ ہو وصل کی شب اس طرح ہوں پیار کی باتیں
ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن میں

ایک صاحب نے اس کی تعریف کسی قدر وضاحت کے ساتھ یوں فرمائی ہے ؎

پوچھو نہ روز وصل کی آزادیوں کا حال
باہر تھا یار جامہ سے ہم اختیار سے

ان تفصیلات سے آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ "وصل" میں کیا کیا ہوتا ہے۔

اردو زبان کے تقریباً کل تلامیذ الرحمٰن اس کے گرویدہ رہے ہیں، اور انھوں نے صرف وصل کا تذکرہ کرنا تو کجا جہاں تک ان سے ہو سکا ہے اپنی اپنی "شب وصل" کی رپورٹ تک سنائی ہے۔ مرزا سودا نے تو "وصل" کو مرض عشق کی دوا ہی کہہ دیا ہے ان کا خیال ہے کہ ؎

مجھ مریض عشق کی دارو نہیں کچھ غیر وصل
اے طبیب اپنی دوا سے تو یہ بیمار رکھ

خواجہ میر درد جو بڑے پایہ کے سجادہ نشین بزرگ ہوئے ہیں وہ بھی وصل کا شمار ادویہ ہی میں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

کوئی بھی دوا اپنے تئیں راس نہیں ہے
جز وصل سو ملنے کی بھی آس نہیں ہے

جناب تاباں ہر چند کہ "وصل" کی چنداں پرچا کرتے نظر نہیں آتے مگر اس کی لذت سے ناآشنا نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

کس کس طرح کی دل میں گزرتی ہیں حسرتیں
ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار میں،

رند تو اسی غم میں مر گئے کہ ؎

وصل کی شب بھی نہ ارمان ہمارے نکلے
ان کا چھوٹا سا کلیجہ جو دھڑکتے دیکھا

لیکن میر صاحب جو سب سے بڑے غمناک

کی بھی ہوئی ہے فرماتے ہیں ؎

وصل قسمت میں نہیں ہے کیا کریں
آپ کھو جائیں اگر مل جائیں وہ

تشنہ واقع ہوئے ہیں ان کی بھی نشاط انگیز گفتگوئے شب وصل سن ہی لیجئے۔ فرماتے ہیں ؎

کچھ تو کچھ وصل کی پھر رات چلی جاتی ہے
دن گزر جاتے ہیں پر بات چلی جاتی ہے

شاید آئندہ کی راہ نکلوا رہے تھے۔

میاں جرأت چاہے جتنا بھی پر عظمت تخلص اختیار کریں مگر ان سے جس وقت میں نے یہ سنا کہ ؎

شب وصل یہ قلق تھا پہ وہ سو گیا تو منہ سے
نہ ذرا بھی میں دوپٹہ زرہ حجاب اٹھا

تو میری ساری عقیدت کافور ہو گئی۔ پھر جب دوسری مرتبہ بھی آپ کو ایسی گھڑی نصیب ہوئی تو اس وقت بھی آپ کا یہی حال ہوا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

دم وصل اس نے رخ سے جو نہ تک نقاب اٹھا
یہیں لگ گیا دم اس دم بہ حد اضطراب اٹھا

بالکل اسی طرح کی حالت مولانا صفیر بلگرامی

انشا کا ذکر تو خیر بیکار سا ہی ہے کیونکہ وہ بیچارہ تو اسی میں پریشان رہا کہ ؎

کیا وصل میں ہو لطف سبھی عیش و طرب کا
دھڑکا ہے سر شام ہی سے آخر شب کا

اصغر علی صاحب کا فلسفۂ زندگی ملاحظہ ہو ؎

سبھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار
ولے حاصل عمر ہے وصل یار

بوڑھے مصحفی نے شب وصل کی روداد یوں سنائی ہے۔ ؎

تب ہو عاشق کی شب وصل تسلی اے گل
صرف بوسہ ہو جب گل دہن سرخ ترا

مگر اس کی نوبت ہی شاید نہ آئی کیونکہ صاحب موصوف یہ حسرت اپنے ساتھ لے گئے ؎

رشک ہے حال زلیخا پہ کہ ہم سے کمبخت
لطف پیری میں بھی نہ کبھی وصل سے مسرور ہوئے

بطور حفظ ما تقدم ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مضمون میں کوئی عریانیت نہیں ہے کیونکہ "وصل" اور "وصال" ایک ایسا موضوع ہے جو عین قانون قدرت کے مطابق ہے اور اس وجہ سے از آدم تا ایں دم دنیا کے سارے جاندار افراد اس دور سے گزر چکے اور گزرتے ہیں ؎

حدیث وصل اگر گوئی گناہ نیست
گناہ اول ز حوا بود و آدم (سعدی)

البتہ یہ ضرور ہے کہ زبان سے کوئی بار عام کہتا اور کوئی نہیں کہتا ہے ؎

ہیچکس بے دامن تر نیست اما دیگراں
بازمی پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

لہٰذا اس کے خلاف کسی آواز کے بلند ہونے کی نہ ضرورت ہے نہ اہمیت۔

عطاء اللہ

ناسخ کی روداد صرف اتنی ہے کہ ؎

وہ منہ چھپاتے ہیں جب تک حجاب شب وصل
عذار صبح سے شب کا نہ دور گھونگھٹ ہو

آتش صرف اسی میں خوش ہیں کہ ؎

آنکھوں میں اپنی دولت بیدار ہیں یہ خواب
ہوتی ہیں تیرے وصل کی جن میں بشارتیں

ذوق کا ذوق حیات ملاحظہ ہو ؎

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امید وصل میں برسوں گوارا ہو گیا

اب غالب کا سوال سنئے۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

مومن کا بھی ذکر کرنا بیکار ہی ہے کیونکہ اس بیچارے کا رونا ہے کہ ؎

مسجد میں وصل کا وعدہ تھا یہ حسرت دیکھو
مر گئے ہم دم آغاز سحر آخر شب

اور جب خدا خدا کر کے ان کو بھی "دوبارہ" اس کا موقع آیا تو اس وقت بھی کمبخت کا یہی حال ہوا ؎

وصل کی شب شام سے میں سو گیا
جاگنا ہجراں کا ستم ہو گیا

امیر مینائی صاحب ہر چند کہ نیند کو وصل یار پر ترجیح دیتے ہیں مگر ان کی انفرادیت قابل ملاحظہ ہو، بڑے بھولے پن سے پوچھتے ہیں ؎

ہوش اڑتے تھے تو اڑتے تھے خبر وصل سے پر
نیند کیوں اڑ گئی آنکھوں سے خبر کی صورت

داغ کے بھی اگلے پچھلے واقعات سن لیجئے ؎

اس لئے وصل سے انکار ہے ہم جان گئے
یہ نہ سمجھے کوئی کیا جلد کہا مان گئے

جلد نہ سہی بدیر ہی مگر اس نے مانا جس کی یاد انھیں یوں ستا رہی ہے ؎

یاد آتے ہیں اب مجھکو شب وصل کے احسان
جو عین کرم تھا وہ مرے حق میں ستم تھا

بوڑھے حالی جوانوں میں مصلح قوم کی حیثیت سے چاہے جتنی بھی انفرادیت کے حامل اور تمام شعراء سے منفرد سمجھے جاتے ہوں لیکن اسا نامحدود حظ نفس کے سلسلے میں کیسے بے نیاز ہو سکتے تھے ارشاد ہوتا ہے ؎

وصل کا اس سے دل زار تمنائی ہے
نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

اور جس وقت وصل نصیب ہوا اس وقت آپ کا شوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ آپ کو کسی کا پہلو بدلنا بھی گوارا نہ تھا ؎

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعوےٰ ہے شکیبائی کا

حد یہ ہے کہ اقبال بھی اس لذت سے ناآشنا نہیں ان کا تجربہ ہے کہ ؎

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

بھلا جب اقبال سا صوفی شاعر بھی اس لذت

ستے ناآشنا نہیں تو اس کے بعد دوسرے کس منزل میں ہیں اور ان کی لذت وصال کون سی حد تک رکھتی ہے جو پیش کی جائے۔

---

یہ "وصل" کی تفصیل و تشریح ہوئی۔ رہا "وصال" سو اس کا حال یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے وصل سے صرف علیحدہ چیز ہی نہیں بتاتے بلکہ اسے "وصل" سے صرف ایک علیحدہ چیز ہی نہیں گنتے بلکہ اسے بالکل متضاد کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں ان کی دنیا علیحدہ اور ان کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "وصال" زندہ رہ کر کسی عورت کے [illegible] ہمکنار ہونے کا نہیں بلکہ مر کر قبر کی مٹی اور سوندھی دیواروں سے ہم آغوش ہونے کا نام ہے اور ثبوت میں کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔ دیکھیے

امانت ؎

اب تو جینے کی توقع نہیں یہ غیرت ہے حال
صدمۂ ہجر سے اغلب ہے کہ ہو جائے وصال

میر ؎

ہجر میں بستر کا وصال ہوا
اب تو قصہ ہی انفصال ہوا

ظفر ؎

گیا نہ ہجر کا دل سے غم و ملال اک روز
امید وصل میں یوں ہی ہو گیا وصال اک روز

داغ ؎

نہ بچی جان ان اداؤں سے
وصل میں بھی وصال ہو ہی گیا

اکبر ؎

بہت ہوئے ہیں زمانے میں لوگ شادی مرگ
شب وصال ہے اپنا کہیں وصال نہ ہو

فانی ؎

آج روز وصال ہے فانی
موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

دریافت کرنے پر اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ معروف ؎

ہے فنا میں کمال درویشاں
وصل حق ہے وصال درویشاں

اور ؎

ہو نہ جب تک وصال اے معروف
کوئی ممکن ہے وصل یار کبھی

اصطلاح تصوف میں "وصال" نام ہے وحدت میں فنا ہو جانے کا اور یہ اشعار چونکہ متصوفانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں لہذا ان میں "وصال" اپنے صحیح معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہر چند کہ بات صاف تھی مگر میرا اطمینان نہیں ہوا اور میں نے جب اس کے متعلق غالب سے استفادہ کیا تو اس نے اس کے معنی کچھ اور بتائے۔ وہ کہتا ہے کہ ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو؟

جب زیادہ الجھن ہوئی تو سعدی جی سے پوچھا جو بڑے پائے کے بزرگ مانے جاتے ہیں انھوں نے وصال کی تعریف یوں کی ؎

وصال دلبراں بیخ است بہ دیوار

سب سے آخر میں خیال آیا کہ کیوں نہ صوفی اعظم حضرت مولانا روم ہی سے دریافت کر لیا جائے کہ "وصل" اور وصال میں کیا فرق ہے؟ چنانچہ ان سے جب دریافت کیا تو انھوں نے ڈانٹا کہ ؎

تو برائے "وصل" کردن آمدی
نے برائے "فصل" کردن آمدی

مجھے یہ بات لگ گئی اور میں نے اسے تسلیم کر لیا کہ درحقیقت "وصل" اور "وصال" ایک ہی چیز ہے اور ان دونوں میں کسی طرح کا کوئی "فصل" کرنا گناہ ہے۔ رہے متقدمین یا متصوفین کے اقوال تو انھوں نے بھی چاہے الفاظ ظاہر نہ کرتے ہوں مگر وہی معنی مراد لئے ہیں جو سارے لوگ سمجھتے اور جانتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہم لوگ "وصل" کا لفظ ارضی اور دنیاوی پرانی تمناؤں کے حقیقی جسموں سے لطف اندوز ہونے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور وہ "وصال" کے لفظ کو ذہنی اور بہشتی حور شمائلوں کی عکسی تصویروں سے اکتساب حظ کے معنی میں جس کا بھانڈا آتش نے اس طرح پھوڑا ہے ؎

منزل گور میں وصال ہوا
گوشے میں چھپکے ہو گیا مطلب

ذوق کہتے ہیں ؎

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

داغ کی روئیداد ہے کہ ؎

گذری ہے باتوں باتوں میں آدھی شب وصال
میرے حضور شام ہے ان کے حضور صبح

غالب کو دیکھیے زندگی ہی میں "وصال" کا متمنی تھا ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

مومن کے معشوق کی دھوکا بازی بھی قابل ملاحظہ ہے ؎

جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقت وصال
دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آ گیا

حالی کا المیہ تھا کہ ؎

گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال
سن لینگے وہ حال شب انتظار کا

اکبر کی استدعا تھی ؎

سوچئے حضرت ناصح کوئی تدبیر وصال
حیف چارہ نہ کرے آپ سا دانا دل کا

شاد کے پاس بھی اسی دنیاوی وصال کے پیام آتے تھے ؎

پیغام آ رہے ہیں تواتر وصال کے
ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا

اقبال تک نے یہیں کے وصال سے بحث کی ہے۔

# ایک دوشیزۂ عرب کی رومان انگیز داستان

مصری افسانے کا عربی سے براہ راست ترجمہ

ازجناب ملک نذیر احمد صاحب ریاض مولوی فاضل "جامعہ"

"عرب کا قبیلہ "بنو عذرہ" حسن و عشق کی شعلہ باریوں اور شرر انگیزیوں میں اپنی مثال آپ تھا! کیونکہ اس میں لاتعداد ماہ جمال اور پری پیکر دوشیزائیں اور اُن کے جانثار عشاق پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے ادعائے عشق کے مطابق وہ حیرت انگیز کارنامے اور فقید المثال قربانیاں صفحۂ ہستی پر دکھائیں جو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ اس قبیلہ نے شعر و شباب میں ڈھلی ہوئی وہ جوانیاں پیش کیں جن کا تذکرہ بھی ایک بار پھر تہلکہ بپا دینے کو کافی ہے۔ ہم نے ان واقعات کو پڑھ کر جہاں تک نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسانی جذبات کا مطالعہ کیا ہے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص ان افسانوں کو پڑھے اور محبت انگیز جذبات اس کی رگ رگ میں محشر ستاں بپا نہ کردیں۔

ہم اس فرصت میں قارئین "خیام" کی خدمت میں قبیلہ بنو عذرہ کی اُن تمام نیر فغنسم داستانہائے حسن و عشق میں سے جو ان نازنینوں کے حسین تذکرہ سے لبریز ہیں۔ ایک ماہ وش اور پری جمال دوشیزہ (ظریفہ) کا دلچسپ رومانی افسانہ درج کریں گے۔

"ظریفہ" صفوان بن وائلہ عذری کی بیٹی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے وقت میں ملکۂ حسن تھی۔ اس کا ابھرا ہوا سینہ اور تین شنجرفی لب، اس کی جادو نگاہی اور قیامت خرامی، اس کا سحر آفریں ترنم اور شباب میں ڈھلا ہوا ترانہ ایسی جذبات انگیز چیزیں تھیں جنہوں نے اسے یکتائے قبیلہ اور رفزیدۂ عصر ثابت کردیا تھا۔ اس کا دلربایانہ انداز اس قدر دلکش تھا کہ ہر ایک کو موہ لیتا۔ اس کا معصوم تبسم دل و دماغ پر بجلیاں گرا دیتا۔ اور اُس کی نگاہِ ناز سینے کی مطمئن خلوتوں کو تموّج و اضطراب سے لبریز کر دیتی تھی۔ غرضکہ وہ حسن کا ایک قدرت تھی جس نے ایک دنیا کو تڑپا دیا تھا۔ وارفتہ و بیقرار کر دیا تھا۔

ایک روز یہ قبیلہ بنو عذرہ کی بہت سی نازنینوں کے ہمراہ ایک تالاب پر جو آبادی سے دور تھا پانی لینے کے لئے گئی۔ باقی سب تو تالاب میں اتر کر کھیلنے اور مشکیزوں کو بھرنے میں مصروف ہوگئیں لیکن "ظریفہ" تالاب کے کسی بلند مقام پر بیٹھ کر معصومانہ انداز میں اپنی حسین لٹوں کو کنگھی سے سلجھانے میں منہمک ہوگئی۔ دو خوبصورت زلفیں اس کے حسین و جمیل چہرے پر بکھری ہوئی ایسی بہار دیتی تھیں جیسے چودھویں رات کا چاند کو کوئی سیاہ فام بدلی ڈھانپ لے۔ ابھی اس نے اپنی عنبریں زلفوں کو مانگ کے ذریعے چہرہ سے ہٹایا ہی تھا کہ عین اسی وقت اس قبیلہ کا شریف زادہ "زرعہ" پیکر شباب و رعنائی تیر کمان جوڑے گھوڑے پر سوار ایک ہرن کا تعاقب کرتے ہوئے ادھر آنکلا تالاب کے کنارے پر پہنچا ہی تھا کہ اچانک اس کی نگاہ "ظریفہ" کے رُخ انور پر پڑی۔ اسی کے ساتھ ظریفہ کی نگاہیں بھی اس کی طرف اٹھیں۔ سے اعلیٰ وہ تموج جو خمارانہ چشم میں مستور و پنہاں تھا بلکہ رستے سے رہا تھا۔ نوجوان کو عقل و خرد سے بیگانہ کر گیا۔ وہ آن مہ پارہ فریب آنکھوں کی تاب نہ لا کر ہاں اُس کی نگاہِ ناز کا شکار ہو کر دفعتہً گر پڑا۔ اور بیہوش ہوگیا۔!

معصوم "ظریفہ" یہ المناک نظارہ نہ دیکھ سکی۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور قتیل عشق کے پاس پہنچی۔ ہر چند اس کو ہوش میں لانے کی سعی کی لیکن ناکام رہی۔ آخر تالاب سے پانی لا کر اُس کے منہ پر چھڑکنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد تیر نگاہ کے گھائل نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ پیاری ظریفہ کو مشفقانہ انداز میں اُن نازک ہاتھوں سے جنہیں نسیم سحر کا ایک ہلکا سا لمس بھی گھائل کر دے مصروف علاج دیکھ کر بولا "یہ قاتل ہی مقتول کا علاج بھی کر رہا ہے" ظریفہ مسکرائی اور جواب دیا کہ "پھر تمہیں شکایت ہی کس بات کی ہے" اب زرعہ کے حواس بالکل درست تھے۔ وہ محبوبہ کی محبت بھری میٹھی میٹھی باتوں میں مخمور نظر آتا تھا۔ آخر فرط شوق کے ساتھ ہیجان جذبات سے مجبور ہو کر اٹھ بیٹھا۔ پھر دونوں دیر تک اُن دلفریب باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے جن کو یونان کا دیوتا کیوپڈ اہل مغرب کے عاشقوں اور معشوقوں کے کان میں کہہ دیا کرتا ہے۔

آخر ظریفہ اس خیال سے کہ کہیں دیر ہو جانے پر سہیلیاں بدگمان نہ ہو جائیں۔ وہ اٹھی۔ اور اُس کے ساتھ زرعہ بھی یہ کہہ کر اٹھا کہ جو شکار آیا تھا آکر ہو گیا خود شکار۔ پھر اپنے ان طبعزاد اشعار کو نہایت ترنم سے الاپنے لگا۔

خرجت اصید الوحش صادفت قانصا
من الريم صادتنى سريعا حبائله

ترجمہ۔ میں وحشیوں کا شکار کھیلنے نکلا تھا مگر ایک گورے غزال نے مجھے فوراً ہی اپنی کمند میں پھانس لیا۔

فلما رمانی بالنبال مسارعا
اقانی وهل مثبت بداويه قاتله

ترجمہ۔ پھر جب تیر نگاہ سے گرا چکی تو وہ دیکھ کر مجھ پر دعائے صحت دم کردی اور بھلا یہ بھی کہیں دیکھا ہے کہ مردے کا علاج خود اس کا قاتل کرے۔

الا فی سبيل الحب حتفٌ قد انقضى
سريعا ولم يبلغ مراداً يحاوله

ترجمہ۔ مبتلائے عشق راہ محبت میں جلدی تمام ہوگیا اور وہ تمنا پوری نہ ہوسکی جس کا وہ آرزومند تھا۔

پھر زرعہ نہایت کرب و اضطراب کے عالم میں بمشکل تمام گھر تک پہنچا۔ اور پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا۔ کھانا پینا ترک کر دیا۔ رنگ زرد پڑ گیا۔ تمام دن بے حس و حرکت پڑا رہتا۔ ماں باپ نے ہر ممکن طریق سے علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن سہ

مریض عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اب اُس کی حالت غیر سے غیر تر ہوتی جارہی تھی۔ آخر جب وہ اپنی زندگی سے ناامید ہوگیا اور ایک ایک ساعت اس کو موت کا پیغام دینے لگی تو اُس نے مایوس ہو کر آہستہ سے اپنی ماں کے کان میں کہا کہ

"آپ بیکار میرے علاج میں مصروف ہیں۔ بھلا مجھ ایسے مریض عشق کو کہیں دنیا کے مادی علاج بھی کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ مجھے "ظریفہ" کے ترنج اذرک کے علاوہ کوئی چیز فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اگر میری زندگی مطلوب ہے تو اُسے بلا کر مجھے اس روحانی اذیت سے آزاد کردو"

ماں کا جذبہ والہیت و محبت اپنی اولاد کے لئے ایک طبعی و فطرتی امر ہے۔ ماں کی مامتا ان کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتی۔ ماں باوجود اس امر کو اچھی طرح جاننے کے کہ "ظریفہ" کے خاندان والے اس نسبت کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ اپنے نوجوان بیٹے کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر صبر و قرار کھو بیٹھی اور انتہائی بیتابانہ انداز میں "ظریفہ" کے خیمے کی طرف دوڑ کر گئی اور اُسے علیحدگی میں بلا کر کہا۔

"بیٹی میری یہ جراءت قابل مواخذہ نہ ہو میں اس وقت بیخودی کے عالم میں ہوں۔ تمہیں علم ہے میرا بیٹا زرعہ تمہاری حسین و جمیل صورت کو دیکھ کر دیوانہ ہوگیا ہے۔ تمہارے بغیر اس کرۂ ارضی پر کوئی متنفس اس کا علاج نہیں کرسکتا۔ ہاں تواب وہ جاں بلب ہے"

یہ کہہ کر وہ انتہائی درد و غم سے اس کے قدموں پر گر پڑی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "بیٹی تمہیں اس کی جان تمنا ہو۔ اگر گھڑی بھر کے لئے اس کی تسلی کو آجاؤ تو بہت ممکن ہے اس کی زندگی کو سہارا مل جائے"

اس المناک منظر نے "ظریفہ" کے جذبات غم و الم کو بھڑکا دیا اور اُس کے اندر ایک محشر بپا کر دیا۔ جلدی ہی اس کو اٹھایا اور اپنے مرمریں سینہ سے لپٹا لیا۔ پھر ایک آہ کھینچ کر اشکبار آنکھوں سے یوں کہا! "ہائے میں اپنی رسوائی کو کیسے چھپاؤں۔ آپ نے سازِ عشق کے ایک ایسے تار کو چھیڑا ہے جس کی ہر حرکت میرے اندر ٹیس لے رہی ہے۔ جس آگ میں آپ کا بیٹا بھسم ہو رہا ہے وہی صدمہ میرے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ انھوں نے تو کہہ بھی دیا لیکن میں کمبخت کس سے کہوں کس کے پاس جا کر آہ و زاری کروں اور اس غم بھری داستان کا دکھڑا سناؤں۔ میں آپ کے بیٹے کے پاس سر آنکھوں کے بل بن بلائے چلی آتی مگر آہ چغلخور ہر طرف تاک میں بیٹھے ہیں میرے اضطراب سے کسی کو شبہ تک بھی ہوگیا تو خیر نہیں۔ ایسے نازک حالات میں میرا کہیں جانا کیونکر ممکن ہے۔ اگر بے حیائی اور وارفتگی کے عالم میں چلی بھی گئی تو سب لوگ مجھ سے زیادہ آپ کے بیٹے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں وہاں آؤں۔ لیکن ہاں میں اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر بھیجتی ہوں شاید یہ تدبیر باعث تسکین ثابت ہو"

زرعہ کی ماں اس لٹ کو لیکر اس کے پاس پہنچی اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ یہ بال کیا تھے گویا زرعہ کے لئے پیغام حیات تھے انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھیں روشن ہو [illegible] بہجت و شادمانی [illegible]

اپنے گاؤں واپس پہنچے۔ پر خوش نصیب [illegible] رہنے لگا۔ اُن کو بار بار سونگھتا۔ آنکھوں سے اشک بے اختیاری جاری ہی رہتا۔ غرضکہ رفتہ رفتہ وہ اچھا ہو گیا بیماری دور ہو گئی۔ بھوک کھلنے لگی۔ وہ جو بے حس بنے ہوئے تھے۔ ایک عضو تک کے ہلانے کی بھی سکت نہ تھی۔ اب اچھی طرح چلنے پھرنے لگا تو زرعہ کا خیال اور بھی ستانے لگا۔ "زرعہ" بھلا اپنے گاؤں میں کیونکر بھول سکتا تھا۔ اب چھپ چھپ کر "ظریفہ" کے خیمے تک جاتا۔ اور وارفتگی کے انداز میں دونوں ایک دوسرے کی ملاقات سے سرشار و مخمور رہتے۔ گویا یہ ملاقاتیں اُن کے جینے کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔

لیکن فلک کج رفتار کو پہلے کب کسی کا بیٹھا بھلا لگا جو اب یہ برداشت کر لیتا۔ غرضکہ فلک بے مہر ان دو محبت کرنے والے دلوں کی گھاتیں۔ اور اُن کی شب و روز کی دلربایانہ گفتگو [illegible] عشق کے تابانہ مشغلہ اور الفت سے لبریز جوانیوں کی وہ اصلیت ایک آنکھ نہ دیکھ سکا۔

اب کیا تھا "زرعہ" اور "ظریفہ" کے باہمی تعلقات کی شہرت قبیلے کے بچے بچے کی زبان پر ہو گئی۔ تمام اہل قبیلہ نے اس کے قتل کی ٹھان لی کیونکہ عرب میں محبت کی شادی قبیلہ کی ناک کٹ جانے کے مترادف تھی۔ مجبوراً "زرعہ" کو اپنے خویش و اقارب، اعزا و رفقاء اور خصوصاً اپنی محبوبہ دلربا سے جدائی اختیار کرنا پڑی۔ یہاں سے بھاگ کر وہ یمن جا پہنچا۔ اس کی زندگی کی تمام تر کائنات وہی بال تھے۔ جنہیں وہ حرز جان بنائے ہوئے تھا۔ انتہائی وارفتگی کے عالم میں بار بار انہیں نکالتا۔ محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔ بیقرارانہ سونگھتا۔ والہانہ انداز سے چومتا اور بعض دفعہ تو شوق اس قدر بڑھتا کہ ضبط کی تاب نہ لا کر اُن کو منہ میں ڈال لیتا۔ اور آتش عشق تسلی ہو جاتی غرضکہ اس کی روحانی و جسمانی تازگی کا ذریعہ تھے تو یہی بال۔ اس کی زندگی کا سہارا تھا تو انہیں کی بدولت۔ زرعہ کی ان پیہم و متواتر [illegible] زاریوں میں ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ ایک دن وہ کہیں ضرورت سے جا رہا تھا کہ شومئی قسمت سے وہ بال گر گئے۔ اس کے اندر ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اُلٹے پاؤں واپس لوٹا۔ اور انتہائی کرب سے ان کی تلاش میں چلتا چلا گیا۔ راستہ کی [illegible] خاک چھان ماری۔ چپا چپا دیکھ ڈالا لیکن اُن کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر اُن کی [illegible] میں اس کا تمام جسم نڈھال ہو گیا۔ قوی مضمحل ہو گئے۔ اب اس میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ کہیں جا سکے۔ بقول میر ؎

گلی تک اُن کی لایا تھا ہمیں شوق
کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک

اگرچہ بہت منت اصرار کیا کہ چلئے گھر میں بیٹھ کر سوچئے گا کہیں نہ کہیں تو مل ہی جائیں گے۔ اگر بفرض محال نہ ملے تب بھی بہت ممکن ہے آپ کی تسکین کی کوئی صورت نکل آئے۔ زرعہ نے کہا "دوستو! اب میں جانبر نہ رہ سکوں گا! آپ سب چلے جائیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ اگر میری قسمت میں جینا ہے تو ضرور زندہ رہوں گا۔ ورنہ آپ مجھے بچا نہیں سکتے۔"

سب لوگ چلے گئے لیکن زرعہ نے ایک لڑکے کو اپنے چند اشعار یاد کرائے۔ اور یہ ہدایت کی کہ قبیلہ بنی عذرہ میں فلاں مقام پر پہنچ کر جب ہر طرف خاموشی ہو اور کوئی انسان نظر نہ آئے انہیں اونچی آواز سے پڑھنا جن کا ترجمہ ذیل میں درج ہے۔

"مریض عشق ایک بڑی بیکسی و [illegible] کے سامنے پڑا تڑپ رہا ہے۔ اس کی نہ کچھ دوا ہے اور نہ کچھ علاج۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم اس کی عیادت کو آؤ گی تو وہ جی جائے گا۔ اور اس ماہ جبیں سے اگر ہم مہربانی کی درخواست کریں گے تو وہ تامل نہ کرے گی۔"

یہ لڑکا آیا اور اسی مقام پر پہنچا ہر طرف سے سناٹا کا عالم پا کر وہی شعر گانے لگا۔ "ظریفہ" اضطراب عجلت سے زار و قطار روتی ہوئی خیمہ سے باہر آئی۔ اور اپنے برجستہ چار اشعار گائے۔ جن کا ترجمہ ذیل میں درج ہے

"خدا رحم کرے اس پر جس کا دل محبت میں مبتلا ہے۔ اور جس کے شوق میں میرا جی چاہتا ہے کہ اڑ کر پہنچ جاتی اگرچہ دل میں کثرت سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ مگر چغلخور لگانے بجھانے والے بھی بکثرت پھر رہے ہیں۔ اور اگرچہ خاندان والوں کے ڈر سے میں جسمانی طور پہ تو تمہاری ملاقات کے لئے نہیں آسکتی مگر دل تمہارے پاس روز جاتا اور زیارت کر آتا ہے۔"

لڑکے نے یہ جوابیہ اشعار بھی فوراً یاد کر لئے اور جلد ہی سے آکر زرعہ کو سنائے یہ سنتے ہی وہ بیہوش ہو گیا۔ پھر آنکھ کھول کر دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ۔

"معلوم نہیں اس محبوبہ نازنین کا عشق میری جان لے لے گا۔ نہیں معلوم میرے بنی اعمام میرے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ اور افسوس میرا خون مفت میں ضائع ہوا۔"

اسی عرصہ میں "زرعہ" کے ہموم و غموم کی زیادتی کا باعث یہ چیز ہوئی کہ "ظریفہ" کے ماں باپ نے اس کی شادی قبیلہ کے ایک شخص کے ساتھ کر دی بس پھر کیا تھا یہ خبر ابھی "زرعہ" تک پہنچی ہی تھی کہ وہ مارے دم بریدہ کی مانند تڑپنے لگا۔ اور اسی عالم میں بیہوش ہو گیا۔ آخر اسی غم میں اس حرماں نصیب عاشق کی روح اس کے جسم سے پرواز کر گئی۔

ادھر "ظریفہ" کی یہ حالت تھی کہ جس شخص کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا اس کے ساتھ وہ کسی طرح بھی مانوس نہ ہوتی۔ نہ التفات کرتی نہ محبت سے پیش آتی۔ غرضکہ ان میں باہمی موانست کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ گو زبانی طور پہ تو خاموش رہی لیکن عملاً اس نے یہ ثابت کر دیا۔ اس کا یہ شعر و شباب میں ڈوبا ہوا گداز جسم، اس کی مست نگاہیں اس کا دلفریب تبسم، اس کی شیریں گفتگو اور اس کا مرمریں سینہ بجز زرعہ کے اور کسی کیلئے نہیں۔ اس دوران میں "ظریفہ" کو بھی "زرعہ" کی وفات کی خبر پہنچ گئی۔ گویا ایک مصائب کا پہاڑ تھا جو اس پر آن پڑا تھا۔ اب تو اس کا شب و روز آنسوؤں کے ہار پرونے کے سوا کوئی مشغلہ تھا۔ خاوند بیچارہ خاموشی سے اس کی تمام حرکات کو دیکھتا اور دل ہی دل میں حیران پریشان ہوتا۔ ابتداً اس نے "ظریفہ" کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن لاعلاج سمجھ کر اس نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ لیکن نگرانی ضرور کرتا رہا۔

ایک دفعہ اس کے خاوند نے نصف شب کے قریب ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ کہ "ظریفہ" اپنے بستر سے اٹھی اور باہر نکل کر ایک سمت روانہ ہو گئی۔ خاوند بھی پیچھے پیچھے ہو لیا تا کہ دیکھے کہاں جاتی ہے اور کیا کرتی ہے۔ جاتے جاتے وہ ایک وادی کے کنارہ پر پہنچی جو کثرت باراں سے ان دنوں خوب زوروں پر تھی۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے ندی میں چھلانگ لگائی اور پانی میں غائب ہو گئی شوہر بھی پانی میں کودا۔ آخر ڈھونڈ نکالا لیکن ابھی وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ اپنے خیمہ میں اٹھا لایا۔ رات بھر وہ بے ہوشی کے عالم میں پڑی رہی۔ صبح کو دیکھا تو کچھ سانس باقی تھا۔ ماں نے آکر رونا پیٹنا شروع کیا۔ اور آہ و زاری کو انتہا تک پہنچا دیا۔ ظریفہ نے پانی مانگا۔ لوگوں نے پانی کا برتن منہ سے لگا دیا۔ ابھی اس کی محبوبہ "زرعہ" نے دو گھونٹ ہی پئے تھے کہ فراق جاناں میں جان دے دی اور اپنے حرماں نصیب عاشق کے پاس پہنچ گئی۔

پہلے تو قبیلہ کی زمین میں دفن کر دی گئی پھر انہی بے رحموں کو ترس آیا تو اس کی لاش نکال کر لے گئے۔ اور جہاں "زرعہ" دفن تھا اس کے پہلو میں لٹا دیا ــــ!

# میخانۂ وارث کا ایک جام

از جناب آغا [illegible] شاہ وارثی برادر زادہ حضرت ریاض مرحوم

ساقیا لا کہاں بادہ و پیمانہ ہے ــ سُن کے آیا ہوں کہ یہ محفل رندانہ ہے
ہو نہ ہو ان کی زباں پر مرا افسانہ ہے ــ ہچکیاں آتی ہیں مضطر دل دیوانہ ہے
انکے جلووں سے وہی اب یہ سیہ خانہ ہے ــ کہ تجلی گہ حسن رخ جانانہ ہے
یہ اگر سچ ہے کہ دل یار کا کاشانہ ہے ــ پھر تو اس عرش کا افسانہ ہی افسانہ ہے
واہ کیا فیض کرم مرشد میخانہ ہے ــ حشر ہے بیہوشی و ہی لغزش مستانہ ہے
کم نہیں دشت اسے بربادی دل کا منظر ــ اب یہی اپنا بیاباں یہی ویرانہ ہے
مرکے ساقی سے نہ دیکھی گئی تشنہ دہنی ــ اس پہ صدقے عجب انداز کریمانہ ہے
اس کا نشہ تو نہ اترا ہے نہ اترے گا کبھی ــ در میخانۂ وارث کا جو مستانہ ہے

سخن وارثی کیا لخت جگر ہے حاضر
کر لے مقبول اسے نذر فقیرانہ ہے

قطعہ

[illegible]

نیر سیفی

# مارکو پولو کا سفرنامہ

تیرھویں صدی کا وہ سیاح جس نے پرانی دنیا کا انکشاف کیا

از جناب شبیر احمد خان صاحب

۱۲۹۵ء میں تین خستہ حال مسافر وینس پہنچے وہ سیدھے سینٹ جان کرسوسٹم کی طرف روانہ ہوئے - اور ایک بلند عمارت کے سامنے رک گئے - انھوں نے دروازے پر دستک دی "آخر کار ہم لوگ اپنے گھر پہنچ گئے" جونہی دروازہ کھلا انھوں نے کہا -

مکین ان مسافروں کو تعجب سے دیکھنے لگے کیونکہ ان کی پوشاک بوسیدہ ہونے کے علاوہ غیر ملکی تھی "تم کون ہو"؟ انھوں نے سوال کیا "ہمارا نام پولو ہے - ہم مشرق سے آئے ہیں"

اس مکان کے رہنے والوں کا بھی خاندانی نام پولو تھا - وہ اور بھی متعجب ہوئے - انھوں نے بہت مدت گزری سنا تھا کہ دونوں بھائی نکولو اور میفیو پولو اور نکولو کا لڑکا مارکو اپنے جہاز میں خیالی دنیا کیتھے کی طرف روانہ ہوئے - لیکن یہ چوبیس برس پہلے کی بات ہے - اور مدت ہوئی انہیں مرحوم تصور کر لیا گیا تھا -

مسافروں نے انہیں ہر طرح یقین دلایا کہ ہم وہی گمشدہ پولو ہیں - آخر کار ان کے رشتہ دار مطمئن ہو گئے - اسی خوشی میں ان لوگوں نے اپنے تمام اقارب اور دوستوں کو ایک عظیم الشان دعوت میں بلایا - تینوں مسافر نہایت بیش قیمت سرخ اطلسی قبائیں ملبوس تھے - جب تمام مہمان بیٹھ گئے تو انھوں نے اپنی اطلسی قبائیں علیحدہ کر دیں - اور سرخ مشجر کی قبائیں پہن لیں - اور اطلسی قبائیں نوکروں میں تقسیم کر دیں - کھانا شروع ہوا تھوڑی دیر بعد پھر پولو اٹھے - یہ لباس اتار پھینکا نوکروں کو دے دیا - اور سرخ مخملی قبائیں پہن لیں - کھانا ختم ہونے کے بعد انھوں نے معمولی لباس پہن لیا - انہیں اپنی دولتمندی کا مظاہرہ کرنا تھا سو مقصد پورا ہو گیا - تمام مہمان حیران رہ گئے - تینوں مسافر جو فقیروں کے بھیس میں آئے تھے دراصل کروڑپتی تھے - مارکو اپنے پرانے کپڑے اٹھا لایا جنہیں پہن کر انھوں نے یہ خطرناک سفر طے کیا تھا اور یہاں تک بخیر و خوبی پہنچ گئے تھے - تب نکولو اور میفیو نے مل کر اس کی سلائی اکھاڑی - جواہرات گرنے شروع ہوئے اور ڈھیر لگ گیا - ایسے جواہرات جس نے وینس کے دولتمندوں کو چکرا دیا - یہ تھا ان کی سیاحی کا ثمر -!

پولو نے اپنے سفر کے عجائبات بہت ہی مختصر بیان کیے - لیکن پھر بھی ان کی دولت کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی - لوگ ان سے مشرق کے حالات سننے کے لیے بیتاب رہتے تھے - لوگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ واقعی مشرقی ممالک اس قدر امیر ہو سکتے ہیں - مارکو کو الفاظ نہیں ملتے تھے کہ وہ چین کی شان و شوکت اور امارت بیان کر سکے - وہ اپنی گفتگو میں ہمیشہ ہر چیز کی لاکھوں کی تعداد میں بتلاتا تھا - لاکھوں میل سفر کیا لاکھوں عجائبات دیکھے - اسی وجہ سے اس کا نام مارکو لکھ پتی پڑ گیا تھا -

مارکو پولو ایسا آدمی نہیں تھا جو گھر میں چین سے زندگی گزارتا - اس کے آنے کے تین سال بعد جینوا اور وینس کے درمیان لڑائی چھڑ گئی - مارکو نے وینس کا ساتھ دیا - اور اپنے جہاز لیکر جزیرہ کرزولا کی لڑائی میں شرکت کی - بہت بہادری سے لڑا لیکن بدقسمتی سے جینوا کے لوگ فتحیاب ہوئے اور مارکو پولو گرفتار کر لیا گیا - مارکو نے اپنی سیاحت کے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات جیل میں اپنے ایک قیدی ساتھی پیسا کے ادیب رسٹی سیانو کو سنائے - اس نے اپنی رہائی کے بعد اس داستان کو ہر جگہ مشہور کر دیا اور یہی داستان مارکو کی غلطی کا سبب بنی -

کتنی عجیب کہانی تھی! ۱۲۶۰ء میں جب مارکو کی عمر صرف چھ برس کی تھی نکولو اور میفیو نے جو قسطنطنیہ میں مشترکہ تجارت کرتے تھے - بغرض تجارت کریمیا کا سفر کیا - اور وہاں سے بخارا کی طرف بڑھ گئے - یہاں وہ خان اعظم کبلا خاں شہنشاہ سلطنت منگولیا (جو چین سے یورپ کی سرحد تک پہنچتی تھی) کے دربار میں کسی طرح پہنچ گئے - خان اعظم نے کبھی کسی فرنگی کو نہیں دیکھا تھا - اس نے نکولو اور میفیو کی بہت قدر کی - جب وہ لوٹنے لگے تو خان اعظم نے انہیں چند خطوط لکھ کر دیئے جن میں اس نے پادریوں سے درخواست کی تھی کہ اس کی سلطنت میں آکر اپنے مذہب کی تعلیم دیں -

۱۲۶۹ء میں پولو بحفاظت تمام آکر ی پہنچ گئے - لیکن چونکہ کلیمنٹ چہارم کی وفات کے بعد اس کا کوئی جانشین مقرر نہ ہوا تھا - اسلئے پولو اپنے وطن وینس چلے گئے -

قریباً دو سال تک انھوں نے انتظار کیا لیکن ہنوز نیا پوپ مقرر نہ ہوا - نکولو اور میفیو دوبارہ مشرق کی طرف عازم سفر ہوئے - اس مرتبہ ان کے ساتھ نکولو کا سترہ سالہ لڑکا مارکو بھی تھا - جونہی وہ لوگ روانہ ہوئے، انھوں نے سنا کہ نئے پوپ کا تقرر ہو گیا ہے - اسلئے وہ واپس لوٹ آئے - تاکہ خان اعظم کا پیغام پہنچائیں - گریگری دہم نے خان اعظم کے خطوط بہت شوق سے پڑھے - اور بے انتہا خوش ہوا - لیکن اصل معاملہ میں اس نے کوئی پرجوش عملی حصہ نہ لیا - خان اعظم نے ایک سو مشنری کی درخواست کی تھی لیکن اس نے صرف دو مبلغ بھیجے - جو طویل مسافرت اور مشرقی ممالک کی جنگجو ریاستوں سے پریشان ہو کر واپس لوٹ آئے - عیسائیوں نے یہ سنہری موقع ہاتھ سے کھو دیا - کیونکہ جب مبلغ نہ پہنچے تو خان اعظم نے بودھ مذہب اختیار کر لیا اور تمام رعایا بودھ مذہب کی پیرو ہو گئی -

۱۲۷۱ء میں وہ اکرہی سے دوبارہ خان اعظم کی سلطنت کی طرف روانہ ہوئے - انہیں درمیانی لڑائی پسند ممالک سے گزرنے میں بے انتہا خطرات کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری -

جب وہ اکّی سے ہرمز پہنچے تو ان کا ارادہ ہوا کہ خلیج فارس سے ہوتے ہوئے بذریعہ جہاز چین جائیں لیکن بعد ازاں بحری سفر کا ارادہ منسوخ ہو گیا اور وہ فارس سے ہوتے ہوئے کرمان پہنچے - پھر خراسان سے گزر کر بلخ میں ٹھہرے - یہاں چند روز قیام کیا - اب مشرق کی طرف بڑھے اور بدخشاں ہوتے ہوئے سطح مرتفع پامیر پہنچ گئے -

پامیر کا نام یورپ میں پہلی مرتبہ پولو کی زبانی سنا گیا - اس سے پولو کی عالی ہمتی اور اولوالعزمی کا پتہ چلتا ہے - کہ انہوں نے کتنا کٹھن سفر ان ملکوں کے درمیان طے کیا جن کا نام کسی یورپی نے ۱۸۳۸ء سے پہلے جب لفٹنٹ جان وڈ نے اس خطہ کی سیاحت کی نہ سنا تھا -

وہ پامیر کو طے کر کے جنوبی مشرقی سمت بڑھے کاشغر اور یارقند ہوتے ہوئے ختن پہنچے ۱۸۶۰ء سے پہلے کوئی دوسرا یورپی اس راستہ سے نہیں گزرا -

ختن سے ان لوگوں نے شمالی مشرقی راستہ اختیار کیا اور لبنار پہنچے - اب وہ صحرائے گوبی میں داخل ہو گئے - وہ اس ریگستان کے سفر سے بخوبی آگاہ تھے - انہیں مشکلات اور خطرات کا بھی علم تھا - اسی وجہ سے انھوں نے یہ ریگستان بخیریت تمام پار کر لیا - مارکو اپنی کتاب میں لکھتا ہے "جو تاجر اس ریگستان سے گزرنا چاہتے ہیں وہ اپنی تمام ضروریات کا مکمل انتظام کر لیتے ہیں - اگر ریگستان میں رسد ختم ہو جاتی ہے تو گدھے اور اونٹ مار کر کھا جاتے ہیں - وہ لوگ عام طور پر اونٹ استعمال کرتے ہیں - کیونکہ اس پر زیادہ بوجھ لادا جا سکتا ہے - اور مسافت بھی زیادہ طے ہوتی ہے - عموماً مسافر ایک ماہ کی رسد کا انتظام کرتے ہیں - کیونکہ وہ ریگستان کو عرضاً طے کرتے ہیں - اگر طولاً طے کیا جائے تو قریباً ایک سال میں سفر ختم ہو - سفر کارواں کے ساتھ ہوتا ہے - اس ریگستان میں پرند اور چوپائے بالکل نہیں پائے جاتے - البتہ کئی قسم کے سانپ ملتے ہیں - ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس ریگستان میں شیطانی روحیں پائی جاتی ہیں جو مسافروں کو بھٹکا کر مار ڈالتی ہیں اسلئے وہ لوگ جانوروں کے گلے میں گھنٹیاں باندھ دیتے ہیں - اور ہر جائے قیام پر نشان ڈال دیتے ہیں"

آخر کار بہت روز کے سفر کے بعد ۱۲۷۵ء میں پولو چین کی شمالی مشرقی سرحد پر پہنچ گئے - ساڑھے تین سال کی طویل مسافت کے بعد وہ لوگ شانگ تو پہنچے - یہاں خان اعظم موسم گرما گزارتا تھا -

خان اعظم نے انہیں بہت عزت کے ساتھ بلوایا - اور اپنے خط کا تسلی بخش جواب سنکر بہت خوش ہوا - حالانکہ پوپ نے لکھنے کے مطابق عمل نہ کیا تھا -

"یہ کون ہے"؟ خان نے مارکو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گرمجوشی سے پوچھا - "حضور عالی" نکولو پولو نے جواب دیا "یہ غلام زادہ ہے"

ان کی آمد کی خوشی میں خان اعظم نے شاندار دعوت کی اور وہ بہت جلد دربار کے دربار میں جگہ پا گئے -

مارکو نے چند ہی روز میں اس ملک کی زبان سیکھ لی اور ملکی خدمات میں حصہ لینے لگا بخصوصہ ان عہدوں میں آہستہ آہستہ اعلیٰ ملازمت بنا دیا گیا۔

خان اعظم کے برعکس مارکو پولو بہت ذہین اور فہیم تھا اور ملازمت کے ہر کام میں دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے اپنے سفر کے واقعات قلمبند کئے۔ دربار میں جاتا تو خان اعظم سے بات کرنے کی بجائے ملازمت پر بحث کرنے کے بجائے سفر کے دلچسپ اور دلچسپ واقعات سناتا جس سے خان بہت خوش ہوتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خان نے اس کا مرتبہ اور بڑھا دیا۔ ملکی انتظامات کی غرض سے مارکو نے تمام سلطنت کا دورہ کیا۔ اور شانسی شینسی۔ زیچوان بلکہ مغرب میں تبت کی سرحد تک اور جنوب میں شمالی ... تک سفر کیا۔

اس نے ان صوبوں کا انتظام نہایت حسن و خوبی سے سنوارا۔ اور اسی وجہ سے اسے یانگ چاؤ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ اس عہدہ پر وہ تین سال تک متعین رہا۔

پھر شاہی احکام بجالانے کے لئے اسے پھر طول طویل سفر کرنا پڑا اور وہ کانگ چاؤ اور ھمراٹ کوبی کے درمیان سے ہو کر قراقرم پہنچا۔ اور کوچین سے کوریا تک دورہ کیا۔ یہاں

اس کے باپ اور چچا کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ لوگ خان اعظم کے ساتھ دریائے یانگ کے کنارے سیانگ یانگ کے محاصرے میں موجود تھے۔ اور جنگی مشین بنانے میں مصروف تھے۔

اس وقت تک پولو بہت امیر ہو گئے تھے لیکن انہیں وطن کی یاد پھر ستانے لگی۔ خان اعظم بھی ضعیف ہو گیا تھا۔ انہیں خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ان کا حافظ خان اعظم نہ رہے۔ وطن بہت دور تھا لیکن خان اعظم انہیں کسی طرح بھی جدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

آخر کار سترہ برس کے قیام کے بعد انہیں غیر متوقع موقع مل گیا۔ ۱۲۸۶ء میں خان اعظم کے بھتیجے ارغون خان فارس کی رفیقہ حیات کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وصیت تھی کہ ایک منگول نسل کی لڑکی اس کی جانشین بنے۔ تین سفیر فارس سے پیکن پہنچے۔ مارکو نے لکھا ہے کہ شہر پناہ کی چار دیواریں تھیں۔ ہر دیوار چھ میل طویل تھی اور ان میں بارہ پھاٹک تھے۔ ہر دروازے پر ایک ہزار پہرے دار موجود رہتے تھے۔ دشمن کے خوف سے نہیں بلکہ شاہ کی تعظیم کے لئے اور رعایا کو رہزنوں کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لئے) سفیروں نے پیغام پہنچایا اور ایک سترہ سالہ دوشیزہ کوکاچن نامی منتخب

ہوئی۔ قافلہ فارس آنے کے لئے تیار ہوا۔

بری راستہ بہت طویل اور مشکل گزار تھا جنگ کی وجہ سے اور بھی خطرناک ہو گیا تھا۔ اسلئے سفیروں نے بحری راستہ پسند کیا۔ پولو کی ملاقات ان سے شاہی دربار میں ہوئی۔ جب سفیروں کو معلوم ہوا کہ یہ جہاندیدہ سیاح ہیں تو انھوں نے شاہ سے بہت منت سماجت کر کے انہیں اپنے ہمراہ لے لیا۔

خان اعظم نے عظیم الشان پیمانے پر بحری سفر کا انتظام کیا۔ پولو کو جواہرات اور گراں بہا اور اعلیٰ تحفے کثرت سے دینے کے علاوہ چند دوستانہ خطوط بھی دیئے جو پاپائے اعظم۔ شاہان فرانس اسپین اور انگلستان کے نام تھے ۱۲۹۲ء میں بندرگاہ اموائے سے ان کا بیڑہ روانہ ہوا۔ بیڑے میں چودہ جہاز تھے۔ اور ہر جہاز میں ۲۵۰ ملاح تھے۔ تین ماہ بعد وہ جاوا پہنچے۔ موسم طوفانی تھا اسلئے قریباً پانچ ماہ تک ساحل سماترا پر ٹھہرے رہے۔ اسی طرح کچھ عرصہ تک انہیں سیلون میں رکنا پڑا۔ تین سال کی مدت کے بعد وہ تبریز پہنچے۔ اثنائے سفر میں دو سفیر مر گئے۔ ارغون خاں کا بھی انتقال تین سال ہوئے ہو گیا تھا۔ اس کا جانشین اس کا بھائی مقرر ہوا تھا۔ معاملات پیچیدہ ہو گئے کیونکہ لڑکی ارغون خاں کے لئے لائی گئی تھی۔ لیکن شہزادہ غازان

پسر خان فارس ... نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ اس طرح معاملات سدھر گئے۔ پولو اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گئے۔ تبریز سے ہوتے ہوئے طربزند۔ قسطنطنیہ اور پھر وینس۔

یہ ہے اس عجیب و غریب داستان کا خلاصہ جو مارکو پولو نے ادیب رستی سیالو سے جیل جینوا میں بیان کی تھی۔ اور اسی داستان کی بنا پر اسے ۱۲۹۹ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ اور وہ وینس بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی کے واقعات کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ اس نے ڈونیٹا نامی لڑکی سے شادی کر لی جس سے تین لڑکیاں ہوئیں فینٹینا۔ بلیلا اور مورٹیا۔ ۱۳۲۴ء میں مارکو کا انتقال ہو گیا۔

چودھویں صدی کے نقشہ جات اور یورپ اور ایشیا کی تجارتی راہیں مارکو پولو کی محنت کا ثمرہ ہیں۔ اس نے اپنے ملک کے لوگوں کو مشرقی ممالک سے تجارت کا شوق دلایا۔ ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ اور ان میں سیاحی کی روح پھونک دی۔ کولمبس کے سفرنامے میں نئی دنیا کا انکشاف ہے۔ لیکن مارکو نے پرانی دنیا کا پتہ لگایا جو کسی طرح بھی کولمبس کے سفرنامے سے کم نہیں۔

---

# ساغر کی کھنک

وہ سبق آموز افسانہ جس پر مجلس امتناع مسکرات صوبہ بمبئی نے مصنف کو پچاس روپے کا اوّل انعام دیا

از جناب محمد فاروقی مالیگانوی بی اے

ومسند کی کثرت اور ہوا کی قلت سے اس روز فضا میں غیر معمولی کثافت تھی، اور میں تیزی سے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بابو رام دیال کی دکان کے پاس پہنچ کر میں یکایک رک گیا، اور دکان کی چیزوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ تین عدد سائیکل رِنگ جن پر زنگ چڑھ چکا تھا ڈوری کی مدد سے عین دکان کے وسط میں لٹک رہے تھے۔ ایک بنچ پر دیا سلائی کی ڈبیاں، بیڑیوں کے بنڈل، بجلی کے جلے ہوئے بلب، کچھ پرانے اخبار اور رسالے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔ سامنے دیوار سے لگے ہوئے لکڑی کے بوسیدہ خانوں میں بچوں کے ٹوٹے کھلونے، کچھ فانوس اور لیمپ سٹینڈ احتیاط سے دھرے تھے۔ دکان کی کل کائنات کا مرکز یہی لکڑی کے خانے تھے جنہیں شوکیس کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ایک کونے میں پرانے کوٹ، قمیص اور جیکٹ ڈوری پر لٹک رہے تھے۔ اور ان کے نیچے زمین پر خالی بوتلیں، بوٹ پالش کی ڈبیاں اور پرانی تصویریں بے پروائی سے پڑی ہوئی تھیں۔ دکان میں مٹی کے تیل کی ایک بتی جل رہی تھی جس کی دھیمی روشنی میں یہ کل چیزیں خوفناک بھوتوں کی طرح گھور رہی تھیں۔ بتی کے اردگرد جلے ہوئے پروانوں کو ڈھونڈتی ہوئی رِنگ رہا تھا۔ چھت پر ایک چھپکلی اپنے سامنے بیٹھے ہوئے جھینگر پر لپکی اور راستے میں تڑپ کرتے ہوئے چھت سے غائب ہوگئی۔

"آئیے آئیے بابو جی!" دیال بابو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں دکان میں داخل ہوگیا کیونکہ اسی روز میرے کمرے کے برقی لیمپ میں کچھ نقص ہوگیا تھا اور مجھے عارضی طور پر ایک فانوس یا لیمپ سٹینڈ کی ضرورت تھی۔

"کیا قیمت ہے اس کی دیال بابو؟" میں نے سامنے والے خانے سے ایک لیمپ سٹینڈ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ابی سرکار یہی جائیے، آپ سے کیا لینا ہے!" انہوں نے اخباروں کے ڈھیر میں سے ایک کاغذ نکال کر سٹینڈ کو لپیٹتے ہوئے کہا۔

"گھر میں سب خیریت ہے نا؟" میں نے سٹینڈ لے کر تھیلی میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کی دیا ہے!" انہوں نے معمول کے جملے کو دہرا دیا۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

دیال بابو سے میری ملاقات چھ سات ماہ پیشتر ہوئی تھی۔ ایک روز میں بازار میں پرانی کتابیں خرید رہا تھا، دیر تک الٹ پلٹ کرنے کے بعد ایک مفید کتاب میرے ہاتھ لگ گئی، میں اس کے متعلق قیمت طے کر رہا تھا کہ وہ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر خود دکان والے سے قیمت ٹھہرانے لگے، میں ان کی اس حرکت سے جھلّا اٹھا، مگر میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ مجھے کتاب دے کر کہنے لگے۔

"دس پیسے بابو جی! انہیں دس پیسے دیجئے۔" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور دکاندار کو پیسے دے کر جب دکان سے باہر نکلا تو وہ جا چکے تھے۔

میں اپنے خیالات میں محو آہستہ آہستہ اپنے مکان کی طرف جانے لگا، یکایک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میرا پیچھا کر رہا ہے۔

"معاف فرمائیے بابو جی ———" میں پلٹ کر دیکھنے لگا، یہ وہی چہرہ تھا جسے میں نے ابھی ابھی دکان میں دیکھا تھا، وہ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے تھے مگر کوئی خاص موضوع نہ مل سکا۔

"یہ کتاب ——— اگر آپ خود یہ کتاب خریدتے تو آٹھ دس آنے سے کم میں نہ ملتی ——— یہ دکاندار اجنبیوں کو اسی طرح لوٹتے ہیں۔" ان کے لہجے میں ایک خاص تلخی تھی، دور تک وہ میرے ساتھ چلتے رہے، پھر یکایک کہنے لگے۔

"مطالعہ بڑی اچھی چیز ہے بابو جی! وقت آسانی سے گزرتا ہے، میں نے بھی بہت کتابیں پڑھی ہیں۔ میں اس وقت الٰہ آباد میں تھا، میری کتاب کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔"

آخری جملے پر پہنچ کر اُن کی آواز میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ میں اس تمام گفتگو کے دوران صرف "ہاں" اور "اچھا" پر اکتفا کر رہا تھا۔ مگر آخری جملے پر ذرا چونک گیا، لیمپ کی روشنی میں پہنچتے ہی انہوں نے دوبارہ کہا۔

"ذرا بتائیے تو یہ کتاب" اور میرے ہاتھ سے کتاب لیکر سرورق الٹ کر روشنی میں کچھ پڑھنے لگے۔

"دیکھئے بابو جی! یہ کتاب ایک روز میری ملکیت تھی!" میں نے صفحے پر نظر ڈالی، اس پر "دیال بکڈپو الٰہ آباد" کی مہر لگی ہوئی تھی۔ میری دلچسپی بڑھنے لگی۔

"تو اب آپ کی دکان کہاں ہے؟" میں نے پوچھا، میرے سوال سے وہ ذرا گھبرا گئے، پھر سنبھل کر بولے۔

"اب میری کتاب کی کوئی دکان نہیں، بابو جی! البتہ ایک چھوٹی سی دکان ہے جس میں پرانی چیزیں بیچتا ہوں، اب تو پرانی باتیں خواب و خیال ہوگئی ہیں!" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔

لکشمی روڈ کے ناکے پر پہنچ کر وہ رک گئے اور ایک چھوٹی سی پست چھتوں والی دکان کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔ "اب یہی میرا کل اثاثہ ہے۔ دو چار ٹوٹی پھوٹی چیزیں بیچکر گزارہ کر لیتا ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور آئیگا!" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر "آداب عرض ہے!" کہتے ہوئے تاریک گلی میں غائب ہوگئے۔

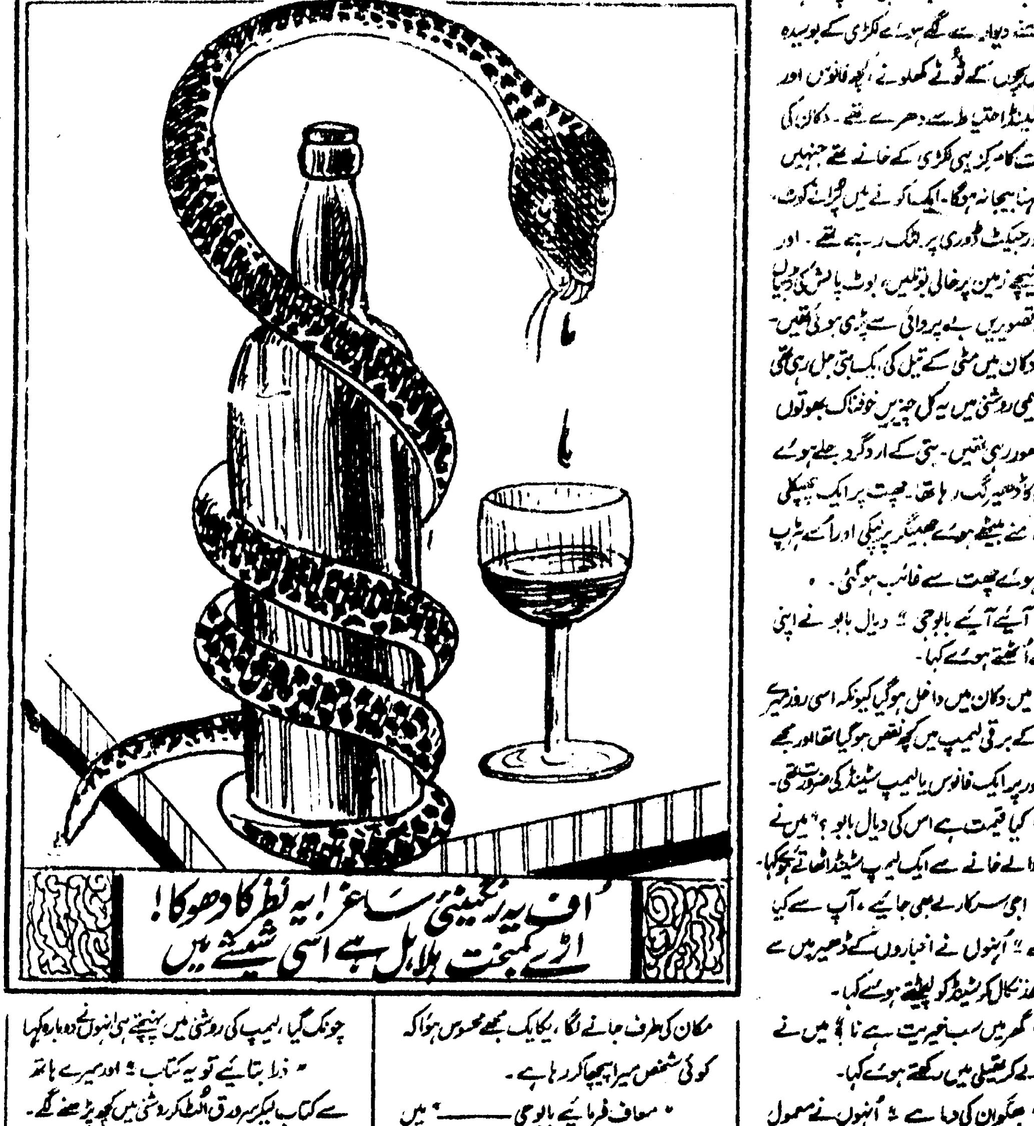
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

اس روز سے میں اپنی ضرورت کی چیزیں اکثر انہیں سے خریدتا اور اگر ان کے پاس کوئی چیز موجود نہ ہوتی تو وہ بازار سے سستے داموں خرید کر لا دیتے۔ ابتدا میں دکان کی حالت کچھ بری نہ تھی، مگر دن بدن حالت خراب ہوتی گئی اور دکان کا اثاثہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ اسے محض کساد بازاری کا نتیجہ سمجھتے ہوئے میں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔

دیوالی کی تعطیل میں میں وطن چلا گیا اور واپسی پر متواتر کئی دنوں تک دیال بابو کی دکان پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ایک شام میں سینما سے واپس لوٹ رہا تھا کہ یکایک اُن سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

"اوہو! دیال بابو، خیریت تو ہے؟" میں نے بیتابانہ اُن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکھڑائے میں نے دوڑ کر انہیں ہاتھوں کا سہارا دیا اور وہ سنبھل کر کھڑے ہوگئے۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت قلق ہوا کہ ان کے منہ سے شراب کی بدبو آرہی تھی جس کی وجہ سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے سہارا دیتے ہوئے انہیں دکان پر پہنچا دیا اور مکان لوٹ آیا۔

دیال بابو کی زندگی بھی ایک افسانے سے کم نہ تھی الٰہ آباد میں ان کی کتاب کی بہت بڑی دکان تھی، آمدنی بھی معقول تھی مگر چند عیش پسند اور رنگین مزاج دوستوں کے پھندے میں پھنس کر پینے پلانے کے عادی ہوگئے اور بیوپار سے بے پروائی برتنے کی وجہ سے ایسے خسارے میں آئے کہ وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ الٰہ آباد سے سیدھے پونا آگئے، یہاں پیشتر سے دو چار بیوپاریوں سے تعلقات تھے اس لئے یہاں آکر ایک دوسری دکان کھول لی، مگر یہاں بھی اپنی طبیعت سے مجبور رہے، اخراجات کی مد آمدنی سے ہمیشہ بڑھی رہتی، چنانچہ بہت جلد مہاجنوں اور ساہوکاروں کا شکار ہو [illegible] اور ان کی وضعداری، جمعیت اور کردار کی پختگی [illegible] کی بھینٹ چڑھنے لگے۔



اف یہ رنگینیٔ ساغر! یہ نظر کا دھوکا!
ارے کمبخت ہلاہل ہے اسی شیشے میں

[illegible] بیوی تھی جو ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور جسے خود سے زیادہ اپنے شوہر کی فکر رہتی۔ دیال بابو کی ملازمت ختم ہو جانے کے بعد وہ زندگی کی مصیبتوں [illegible] پوری طرح آمادہ ہو گئی تھی [illegible] اپنے دو بچے ہو گئے [illegible] کی خوفناک لہروں میں [illegible] کے سبب [illegible] فراغت [illegible] اور حادثات کے پے در پے حملوں نے [illegible] اور وہ دماغی [illegible] اس نے بیٹی [illegible] کپڑے سی کر زندگی کے دن گذارنے شروع کئے [illegible] اپنے شوہر کو [illegible] شام کو جب دیال بابو [illegible] پیسے کی کمائی ہوتی [illegible] کر دیتی۔ ایک روز میں نے اس سے کہا:

"اگر آپ اخراجات اور پیسے کے تمام معاملات اپنے ذمہ لے لیں تو [illegible] روز کی پریشانی سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے"

میرے الفاظ سے وہ چونکی۔ شاید اسے برا بھی معلوم ہوا۔

"شوہر کی خوشنودی ہی عورتوں کی نجات ہے" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ بولی۔

---

ایک روز شام ہی سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں [illegible] بیٹھا ہوا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا [illegible] پاؤں تک شرابور [illegible] کمرے میں داخل [illegible] ہاتھ میں ایک ٹوٹی چھتری تھی جس کا ہونا نہ ہونے کے برابر تھا۔ پانی کے قطرے پیشانی سے [illegible] اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں جذب [illegible] اور وہ اپنی بھیگی ہوئی آستین کو بار بار آنکھوں پر پھیر رہے تھے۔

"خیر تو ہے دیال بابو، ایسی بارش میں آنے کی کیا ضرورت [illegible]" [illegible] ان کے ہاتھ سے لے کر کرسی پر [illegible] کہا، بیٹھے تو ذرا بھیگے۔ پھر جی کڑا کر کے [illegible]

"[illegible] بابو جی، مہینہ بھر مکان میں [illegible] اس لئے کچھ کام نہ ہو سکا۔ [illegible] تھوڑی بہت جو آمدنی تھی وہ بھی دوا دارو پر صرف [illegible] کیول چند کا سخت تقاضا ہے کہتے تھے اگر [illegible] پیسہ نہ ملا تو دکان قرق کروا لی جائے گی۔"

[illegible] ان کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ بار بار کھانس [illegible] تھے۔

"ارادہ تھا [illegible] سے کچھ پیسے لے آؤں [illegible] پیشگی اُجرت مل چکی ہے [illegible]" [illegible] ٹوپی اتار کر ایک طرف [illegible]

میں سوچنے لگا [illegible] ایک کوٹ سلوانا ہے۔ موزے بالکل پھٹ چکے ہیں۔ لائبریری کی فیس ——— کلب کا چندہ ——— اور جیب میں پانچ پانچ کے صرف دو نوٹ ———"

دیال بابو سمجھے شاید میں ان کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ یکایک اٹھ کھڑے ہوئے۔

"معاف کیجئے بابو جی، آپ کو تکلیف ہوئی" انہوں نے ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھئے دیال بابو، بارش تھم جائے تو جانا، جلدی کیا ہے؟" میں نے پاکٹ سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، نوٹ لیتے وقت ان کا سر ندامت سے جھک گیا، اس شرابی کی طرح جو اپنے ضمیر کی ملامتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی بار شراب خانہ میں داخل ہوتا ہے۔

---

اس کے بعد میں لگاتار تین چار روز تک ان کی دکان سے گزرا مگر دکان بند ہی رہی، معاً مجھے خیال ہوا کہ شاید دیال بابو کے مکان پر طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے چنانچہ میں ایک روز شام کو ان کے مکان پر گیا۔ آواز دینے پر کوئی جواب نہ پا کر میں اندر داخل ہوا، مٹی کا ایک دیا جل رہا تھا جس سے سیاہ دھواں اُٹھ اُٹھ کر کمرے کو اور بھی تاریک بنا رہا تھا۔ کمرے کا سامان نہایت بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ زمین پر پڑی ہوئی ٹوکری میں تمباکو، بیڑیاں اور کٹے ہوئے پتے دھرے تھے۔ ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑے ہوئے بوسیدہ اور کثیف گودڑیوں کے ڈھیر سے یکایک آواز آئی۔

"آئیے بابو، بڑی کرپا کی آپ نے ———"

مریضہ کی آواز بالکل ایسی تھی جیسے لکڑی کے دو خشک ٹکڑے آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔

"چار روز سے دکان نہیں کھلی، کیا حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی؟" میں نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

"چار روز سے؟ مگر انہوں نے مجھ سے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا" وہ حیرت زدہ ہو کر بولی، اس کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا، جیسے اندر ہی اندر اسے کوئی بہت بڑی تکلیف محسوس ہو رہی تھی، مجھے سخت افسوس ہوا، میں نے پانچ روپے کے نوٹ کا ذکر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا، اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے واپس لوٹنے لگا، دروازے پر دیال بابو سے مڈبھیڑ ہو گئی، ان کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے اور چراغ کی دھندلی روشنی میں ان کی ہیئت عجیب معلوم ہو رہی تھی۔

میں نے چارپائی پر پڑی ہوئی مریضہ کے خشک چہرے کو دیکھا، پھر مٹی کے چراغ کی طرف جس کے گرد جلے ہوئے پروانوں کا ایک ڈھیر لگ رہا تھا چھت پر ایک چھپکلی، اپنے سامنے بیٹھے ہوئے جھینگر پر جھپٹی اور اُسے ہڑپ کرتے ہوئے چھت میں غائب ہو گئی۔

دیال بابو مجھے دیکھ کر ذرا جھینپ گئے۔ بغیر کچھ کہے میں مکان لوٹ آیا۔

میرا پانچ روپے کا نوٹ ان سب باتوں کا ذمہ دار تھا۔

---

دو روز بعد میں اپنے دوستوں کے ہمراہ بازار سے گذر رہا تھا، دیال بابو کی دکان پر کچھ بھیڑ دکھائی دی۔ کیول چند مہاجن دو ایک بنیے اور ایک سپاہی لئے ہوئے دکان خالی کروا رہا تھا، دیال بابو سر جھکائے کسی گہری سوچ میں کھڑے تھے۔ میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے دوستوں کے ہمراہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

اسی روز شام کو دیال بابو میرے پاس آئے وہ خلافِ معمول کچھ مطمئن نظر آ رہے تھے، میرے کہے بغیر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

"آج میری دکان کا تمام اسباب قرق ہو گیا کیول چند کا قرض ——— صرف سود کی رقم باون روپے چھ آنے، اصل کی مجھے خبر نہیں ———"

وہ تھوڑی دیر تک کھانستے رہے پھر کہنے لگے۔

"ہم لوگ عرصہ سے اپنے دیس جانے کی فکر میں تھے۔ دنیا میں میری بیوی کی صرف یہی ایک خواہش تھی، اور شاید وہ اسی خواہش پر اب تک جی رہی تھی مگر دکان قرق ہونے کے بعد وہ اُمید بھی جاتی رہی، دو روز سے اس نے ایک دانہ بھی منہ میں نہیں ڈالا، اور دکان قرق ہونے کی خبر سننے کے بعد سے تو اس کی آنکھوں کا آنسو تھما ہی نہیں"

دیال بابو کے لہجے میں حقارت تھی، اس جفاکش مزدور کی طرح جسے دن بھر کی محنت شاقہ کے بعد بھی پوری مزدوری نہ ملی ہو۔

"آپ نے دکان کا ذکر ان سے کیوں کیا؟" میں نے ترش رو ہو کر کہا۔

"کب تک نہ کرتا بابو جی؟" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا، پھر آپ ہی آپ کہنے لگے۔

"اب یہ نیا پار لگتی نظر نہیں آتی بابو جی، جیون کی یہ ساتھی بھی گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہے"

"کیا؟ باقی جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے؟" میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"ہاں کہنا تو یہی چاہئے ——— ارادہ تھا ڈاکٹر لے آؤں مگر ڈاکٹر مفت تھوڑا ہی چلا آئے گا" وہ زہر خندہ ہنسی ہنس کر بولے۔

میں نے فوراً دو روپے جیب سے نکال کر ان کے ہاتھ پر دھر دئے، روپے دیکھ کر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"آپ روپے لے کر فوراً ڈاکٹر کی طرف جائیے میں ہوٹل سے کھانا کھا کر ابھی آتا ہوں ———"

میں پورے طور سے جملہ بھی ادا نہ کر سکا تھا کہ وہ کمرے سے غائب ہو گئے۔

میں نے جلد جلد لباس تبدیل کیا اور ہوٹل میں پہنچ کر کھانا کھانے لگا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ میں پھر ایک بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہوں "دیال بابو اور نقد روپے؟" مجھے اس روز کا واقعہ یاد آ گیا، اور جوں توں کھانا ختم کر کے بھاگا ہوا دیال بابو کے مکان پر پہنچا، دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہ پا کر اندر داخل ہوا، مٹی کا وہی دیا جل رہا تھا مگر اس میں روشنی نام کو بھی نہ تھی، کمرے کا بیشتر سامان غائب تھا، میں نے دوبارہ آواز دی مگر اس مرتبہ چارپائی پر پڑے ہوئے گودڑی کے ڈھیر سے کوئی جواب نہ ملا۔

"باقی جی" میں نے آگے بڑھ کر آواز دی مگر

باقی برصفحہ ۹۲

## کیفِ سحر

(از جناب مظفر رضوی)

سحر کی دیوی سیاہ زُلفیں رُخِ حسیں سے ہٹا رہی ہے
اٹھا رہی ہے رباب دُرج کا اور کچھ گنگنا رہی ہے
عروسِ مشرق کے پھول سے رُخ پہ ہے ہویدا حیا کی سرخی
پہن کے کرنوں کی زرد ساڑی ادائیں اپنی دکھا رہی ہے
چمن میں اعلان کر رہے ہیں طیورِ خوش لحن صبحِ نو کا
جگا رہی ہے حسین کلیاں، گلوں کو انگڑائی آ رہی ہے
دھلا دیا ہے گلوں نے شبنم سے دہن، اذانِ طائراں سن کے اٹھ کر
جھکے ہیں سجدے میں اہلِ گلشن، نمازِ بلبل پڑھا رہی ہے
جو چند مست شباب کلیاں ابھی جوانی کی نیند میں ہیں
نسیم شوخی سے گدگدا کر انہیں بھی گویا جگا رہی ہے
سحر کی دیوی کی آمد آمد سے شادماں ہو رہا ہے عالم
ہر ایک ذی روح کے لبوں پر جھلک تبسم کی آ رہی ہے
کوئی فرشتہ حریمِ ربّ العلیٰ کے پردوں کو دھو رہا ہے
وہ شرق سے سیلِ نور آیا، زمانہ پُر نور ہو رہا ہے

# دردِ تلاش

از حضرت احسان دانش کاندھلوی

بجا ہے فطرت نے مجھکو ذوقِ ادب سے دلشاد کر دیا ہے
مگر حقیقت یہ ہے کہ احساس دے کے برباد کر دیا ہے

اگرچہ منزل گہِ جہاں میں کوئی مرا ہمسفر نہیں ہے
وہ کونسا جادۂ نہاں ہے کہ جس پہ میری نظر نہیں ہے

کبھی تصور جو تھا اُسے میں بڑھا کے تصویر کر چکا ہوں
مٹا ہوں اس طرح سے کہ اپنا جہان تعمیر کر چکا ہوں

کیا ہے میں نے نیازمندی سے اک انداز نیاز پیدا
ضمیرِ فطرت میں میرے سوزِ کلام سے ہے گداز پیدا

بپا کئے ہیں زمینِ شعر و سخن میں وہ انقلاب میں نے
دیئے ہیں بجھتے ہوئے چراغوں کی گود میں آفتاب میں نے

جواں ستاروں کی گردشوں میں یہ دلِ حزیں جواں کیا ہے
الم میں ڈوبی ہوئی نگاہوں کو رفتہ رفتہ زباں کیا ہے

مرا تخیل ہے مقصدِ قدرت، سرودِ فطرت بیان میرا
بلند ہے مہر و ماہ سے بھی بلند تر آسماں ہے میرا

قضا بھی آئے تو مر سے پاکِ حیات تشنہ ہوئے جائے
مرے تصور کی طرح تنویر پارہ و تابندہ ہوکے جائے

مگر یہ اس وصفِ زندگی میں کمی سی محسوس کر رہا ہوں
نظامِ فکر و نظر میں اک برہمی سی محسوس کر رہا ہوں

یہ آرزو ہے کسی کو رازِ حیات کا رازداں بنا لوں
کسی سے رودادِ شوق کہہ دوں کسی کو ہمداستاں بنا لوں

جو میرے جبریلِ شاعری کو اصولِ پیغمبری سکھا دے
جو میرے قصرِ یقیں کو صدق و صفا کی شمعوں سے جگمگا دے

جو میری محروم فرصتوں کو نویدِ مہر و وفا سنائے
جو میری مغموم خلوتوں کو حصارِ کیف و طرب بنائے

جو میرے اشکوں کا عکس دیکھے شبابِ تازہ کی آرسی میں
جو شمعِ مستقبل آکے روشن کرے مقدر کی تیرگی میں

خرابۂ دل کی ظلمتوں کو ضیائے جاوید کر کے چھوڑے
فضائے ہستی کے ذرے ذرے کو رشکِ خورشید کر کے چھوڑے

جو میری خودداریوں کے ہاتھوں میں کامیابی کا آئینہ دے
جو میری دشواریوں میں آسانیوں کا آنے کا راستہ دے

جو میرے داغِ دلِ حزیں کو سپہرِ ہستی کا ماہ سمجھے
وفا شعاری کو فرض جانے جفاگری کو گناہ سمجھے

جو میری مغرور مفلسی کو بساطِ غم سے بلند کر دے
جو ذوقِ شعری کو مقصدِ ذوقِ شعر سے بہرہ مند کر دے

جو اپنی ہستی کے نقش قائم کرے شریکِ حیات ہو کر
جو میری آنکھوں کی پتلیوں میں رہے مری کائنات ہو کر

میسر آجائے ایسی ہستی تو کیا بتاؤں کہ کیا کروں میں
نہ ہو غلامی کا ننگ جس میں وہ سجدہ بر ملا کروں میں

متاعِ نام و نشان سونپوں اپنے نام و نشاں بنا لوں
جہان بھر سے بچا کے دامن اسی کو اپنا جہاں بنا لوں

اسی کو طاری کروں نظر پر اسی کو قندیلِ جاں سمجھ لوں
اسی کو اپنے شعورِ شعر آفریں کی روحِ رواں سمجھ لوں

خرام گاہوں میں اس کے نقشِ خرام کو کہکشاں بنا دوں
اگرچہ احسان میں ہوں فانی مگر اسے جاوداں بنا دوں

## ساغر کی کھنک بقیہ صفحہ ۶

وہاں دھندلے چراغ اور ... کے سوا کچھ نہ تھا۔ موت کے خاموش اور پر سکون ہاتھ نے دیال بابو کی ... کو ... کرنے کیلئے ... اٹھا لیا تھا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا دروازے سے اندر داخل ہوا اور ... وہ چراغ بجھ کر رہ گیا۔ میری نظروں سے کمرے کی تمام چیزیں یک لخت غائب ہو گئیں ——— چراغ میں بجھے ہوئے پروانے۔ کثیف گودڑی کا ڈھیر اور بائی جی کا خاموش چہرہ سب ——— میں گھبرایا ہوا باہر آیا۔ پڑوسیوں کو بلوا کر روشنی کا انتظام کیا اور ضروری ہدایات دے کر دیال بابو کی تلاش میں نکل پڑا۔ شہر کے تمام شراب خانے جنہیں میں جانتا تھا چھان مارا مگر ان کا کہیں پتہ نہ ملا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے مارا مارا پھرتا رہا اور ناامید ہو کر واپس لوٹ رہا تھا کہ راستے میں کچھ لوگ حلقہ باندھے کھڑے نظر آئے۔ میں آگے بڑھ کر دیکھنے لگا ———

دیال بابو نشہ میں بُری طرح قے کر رہے تھے اور دیوانوں کی طرح بے سرو پا باتیں بک رہے تھے۔ میں نے فوراً تانگہ بلوایا اور انہیں بٹھا کر گھر کی طرف لے چلا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ ذرا ہوش میں آئے۔

"دیال بابو! بائی جی ——— بائی جی ———!"

میں جملہ پورا نہ کر سکا میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

"ہاں، ہاں بابو جی رُک کیوں گئے؟ بولو، بائی جی سورگ باش ہو گئیں، تم یہی کہنا چاہتے ہو نا ———؟"

وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگے۔

"بہت اچھا ہوا ——— بیچاری کو موہ جال سے بہت جلد چھٹکارا مل گیا، بہت جلد ——— اب وہاں کوئی اُسے دُکھ نہیں پہنچا سکتا کوئی نہیں ——— کیول چند بھی نہیں اور میں ——— میں بھی نہیں"

وہ زور زور سے کھانسنے لگے، میں نے تانگے والے کو جلدی ہانکنے کیلئے کہا، اور وہ سرپٹ گھوڑا دوڑانے لگا۔ دیال بابو نشے میں چُور تھے، اور میں راستہ بھر خاموش ہی رہا۔

مکان واپس آنے تک پڑوسیوں نے تمام انتظام مکمل کر لیا تھا، میں تانگے سے اُتر پڑا۔

"جلدی کیجئے دیال بابو بہت دیر ہو گئی" میں نے کہا، مگر وہ بدستور میری طرف گھورتے رہے۔

"دیال بابو! سُن رہے ہیں آپ؟" میں نے انہیں جھنجھوڑتے ہوئے دوبارہ کہا، یکایک ان کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔

"دیال بابو یہ سونے کا وقت نہیں، سُنا آپ نے ———؟"

مگر میرے سوال کا جواب دیال بابو نے دوبارہ کبھی نہیں دیا۔

---

اس واقعہ کو ایک عرصہ گذر گیا، میرے پاس دیال بابو کی صرف ایک نشانی باقی رہ گئی ہے۔ اُن کا دیا ہوا لیمپ شیڈ، میرا تبادلہ پونا سے اب ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہو گیا ہے وہاں بجلی کی روشنی کا کوئی انتظام نہیں، اس لئے میں اسی شیڈ کو استعمال کرتا ہوں، اور اس کے استعمال میں بیحد احتیاط برتتا ہوں۔

آج بھی ساون کی راتوں میں جب پروانے اس کی روشنی میں آ آ کر گرتے ہیں تو دیال بابو کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے۔

روشنی ...... پتنگے ...... دیال بابو ......
بائی جی ...... مہا پجی ...... جھینگر ...... کیول چند
مہاجن ...... دیال بابو ......

قدرت کے کاموں میں کتنی مناسبت!

ملک میں دیال بابو کی بیوی کی طرح نہیں معلوم کتنی عورتیں ہر سال پروانوں کی طرح اپنے شوہروں پر قربان ہو جاتی ہیں اور دیال بابو کی طرح نہیں معلوم کتنے غریب کیول چند جیسے مہاجنوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

مگر آخر اس کا ذمہ دار کون ہے؟

دیال بابو ———؟
یا کیول چند مہاجن ———؟
شاید شراب ———!

---

(بہ اجازت مجلس اشاعت مسکراہت بمبئی)

## کیتھرائن پار بقیہ صفحہ ۶۷

کی طرح کالا"

شاہ ہنری۔ بیشک۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ میں جھوٹا ہوں۔

کیتھرائن۔ میں یہ تھوڑا ہی کہتی ہوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ البتہ تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ اور یہ صحیح ہے۔

شاہ ہنری۔ مگر میں کہتا ہوں کہ میرا اس معاملہ میں غلطی پر ہونا ناممکن ہے۔ میں تو اس حقیقت کو اتنی صحت اور اتنے وثوق سے جانتا ہوں جتنا کہ خود اپنا نام جاننے میں ہو سکتا ہے۔

کیتھرائن۔ تمہاری یادداشت خطا کر رہی ہے، ابھی ابھی کیتھرائن ہاورڈ کی ماں کا نام بھی تمہارے ذہن سے اُتر گیا تھا۔

شاہ ہنری۔ اس بارے میں یہ بات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دوسرے مجھے یقین ہے کہ میں غلط نہیں ہوں۔ ذرا میں کسی کسی بات کو جلدی ذہن میں نہیں لا سکتا۔ لیکن یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے اور ساری عمر مجھے اس کا اسی طرح علم رہا ہے۔

کیتھرائن۔ میں بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہوں کہ تمہاری یادداشت کبھی کبھی غلط ہوتی ہے۔ تمہیں نام بھی تو بے شمار یاد رکھنے پڑتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاید تم شاہ الفریڈ کے سفید گھوڑے کے دھوکے میں اسکندر کے گھوڑے کے سفید ہونے پر اصیل مرغے کی ایک ٹانگ بنے ہوئے ہو۔

شاہ ہنری۔ ادہو۔ شاباش! اگر تم نے تعلیم پر سر سری گفتگو کی ہوتی تو ہرگز ایسی باتیں نہ کرتیں۔ یہ نتیجہ ہے مذہب و تعلیم سے نابلد ہونے کا اور لاطینی زبان نہ جاننے کا۔ لاطینی تعلیم سب سے اچھی ہے خود این آف کلیوز بھی لاطینی جانتی تھی۔

کیتھرائن۔ خدا کا شکر ہے کہ میں لاطینی نہیں جانتی۔ ناہیات! توہم پرستوں کی زبان جو صرف متعصبوں اور درویشوں کے کام کی ہے۔

شاہ ہنری۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے متعصب سمجھتی ہو ——— کیوں؟

کیتھرائن۔ اس کے لئے تو تم آزاد ہو کہ کسی کی باتوں سے جو مطلب بھی چاہو اخذ کر لو۔ ورنہ میرا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اسکندر کا گھوڑا کالا تھا۔

شاہ ہنری۔ لاطینی کافر و ملحد ہونے سے متعصب ہونا بہر حال بہتر ہے۔

کیتھرائن۔ تم جانتے ہو کہ تم غلطی پر ہو اور خواہ مخواہ ہی نباہ کی کوشش کر رہے ہو اور یہ صریح ہٹ دھرمی ہے۔ کوئی ہٹ دھرم اپنی تردید اور اصلاح پسند نہیں کرتا۔ بلکہ معقولیت سے بھی انکار کرتا ہے۔

شاہ ہنری۔ میں تم سے کہوں گا کہ میرے خاندان کی توہین نہ کرو۔

کیتھرائن۔ تم نے بھی میرے خاندان کی توہین کی ہے جو کہیں زیادہ بزرگ و باوقار ہے۔ میرے خاندان کی ڈھال پر نحوست کا داغ نہیں۔

شاہ ہنری۔ اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔

(وہ اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ دروازہ کھولتا ہے اور پکارتا ہے) ڈیٹی! بٹس! غلام! کون ہے وہاں؟

(ایک غلام داخل ہوتا ہے)

غلام۔ حضور والا!

شاہ ہنری۔ جاؤ اور لارڈ چیمبرلین سے کہو کہ وہ سابق ملکہ کو قلعہ لیجانے کیلئے ضروری انتظام کریں۔

غلام۔ (ششدر و حیران) بہت اچھا عالیجاہ! کیا عالیجاہ کا مطلب مرحوم ملکہ کے سامان و اسباب سے ہے؟

شاہ ہنری۔ میں نے کہا سابق ملکہ۔ کمینے ——! ملکہ کیتھرائن پار۔

غلام۔ بہت اچھا عالیجاہ!

شاہ ہنری۔ اور قلعہ کے حاکموں کو یہ حکم دے دینے کو بھی کہہ دو کہ وہ ڈگ سابق ملکہ کے قتل کے لئے کل انتظامات مکمل رکھیں۔

غلام۔ کیا اسی جشن کی نقل کی جائے۔ عالیجاہ! جو ملکہ کیتھرائن ہاورڈ کے معاملے میں ہوئی تھی؟

شاہ ہنری۔ ہاں! آخر میں بجائے دو کے صرف ایک ہی نقارہ ہو (غلام دروازے کی طرف جاتا ہے) اور راستے میں ڈاکٹر بٹس سے یہ بھی پوچھ لینا کہ اسکندر کا گھوڑا سفید تھا یا کالا۔

کیتھرائن۔ وہ کالا تھا (غلام سر تسلیم خم کرتا ہے اور چلا جاتا ہے) خیر قتل ہونے سے پہلے میں تم سے یہ اجازت چاہتی ہوں کہ جا کر اپنی چیزیں اکٹھا کر لوں۔ کل غیر ارادی طور پر تم نے اپنی بیاض میری نشستگاہ میں چھوڑ دی تھی۔ میں اسے نیچے لے آؤں گی۔

شاہ ہنری۔ ذرا ٹھہرو، اتنی جلدی کیا ہے؟

کیتھرائن۔ میں منت کرتی ہوں۔ مجھے بہت سے خطوط لکھنے ہیں اور وقت بالکل مختصر ہے۔

شاہ ہنری۔ (پس و پیش کرتے ہوئے) اور میں نے جو موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کی تھی۔

کیتھرائن۔ مجھے یقین ہے کہ اب میرے ساتھ گانے کی خواہش تمہیں نہیں ہو گی۔ کسی اور کو اس کے لئے منتخب کر لو تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔ روئے زمین پر اپنی ہستی کے گنے گنائے لمحات میں مجھے بہت کچھ سوچنا ہے۔

شاہ ہنری۔ (بہ اضطراب ہنسی ہنستے ہوئے) میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میری جان! تم نے بالکل سچ ہی سمجھ لیا۔

کیتھرائن۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں ایسا مکروہ اور ہولناک مذاق پسند نہیں کرتی۔

شاہ ہنری۔ آؤ آؤ۔ گئی گذری باتوں کو دل سے نکال دو۔ آؤ ہم دونوں بھر موسیقی میں غرق ہو جائیں میں اپنا ہی گیت گاؤں گا۔

(غلام کمرے میں داخل ہوتا ہے)

غلام۔ عالیجاہ! میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ لارڈ چیمبرلین سے میری ملاقات نہیں ہوئی اور ڈاکٹر بٹس نے اسکندر اعظم کے گھوڑے کے رنگ کے بارے میں کہا ہے کہ عالیجاہ حق بجانب ہیں۔

شاہ ہنری۔ (خوش ہو کر) بہت اچھا۔ تم جا سکتے ہو۔ لارڈ چیمبرلین تک اب یہ خبر لے جانے کی ضرورت نہیں (غلام جھکتا ہے اور چلا جاتا ہے) اور اب میری پیاری چلو اپنا گیت گائیں۔ دیکھو میں نے کہا تھا کہ گھوڑا سفید تھا۔

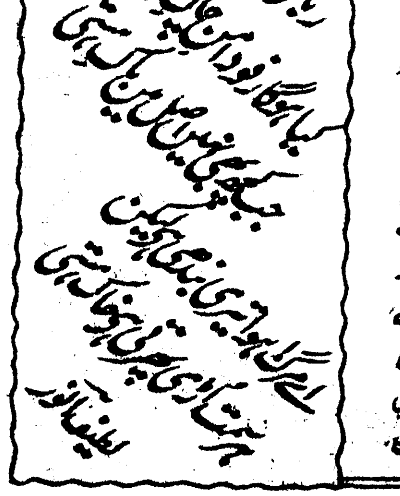
(شاہ ہنری ایک کمان سے دروازہ کھولتا ہے)

کیتھرائن۔ وہ کالا تھا ——— یہ صحیح ہے۔

شاہ ہنری۔ (شفقت و مہربانی سے، جیسے کسی بچے کے ساتھ بات کر رہا ہے) ہاں ہاں پیاری بے شک وہ کالا ہی تھا۔ لیکن چلو پہلے اپنا گیت تو گا لیں۔

(دونوں باہر جاتے ہیں)

——— پردہ۔



فرانسیسی ادیب بالزک کی ایک دلآویز تحریر کا ترجمہ

# جلاد

از جناب سید احسان علی شاہ صاحب بی اے

جینڈا کے چھوٹے سے گاؤں کے گھنٹہ گھر نے نصف شب کا گجر بجایا۔

نوجوان فرانسیسی افسر دیہاتی حویلی کے باغ کے گرد دوڑ ستون ہوئے چبوترے کی نچلی دیوار کے قریب کھڑا تھا۔ یہ افسر ایک سہل انگار اور "زیادہ خیال" سپاہی ہونے کے باوجود متفکر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ رات ایسا موسم اور ایسا رومان پرور منظر تفکر کے لئے موزوں ترین تھا۔

اسپین کا حسین و جمیل آسمان اپنی نیلگوں پہنائیوں کے ساتھ اس کے سر پر گنبد کی طرح تنا کھڑا تھا۔ روشن جبیں ستاروں کی ہلکی روشنی اور چاند کی سیمیں لہریں زیریں وادی کو سیلاب نور سے بھر رہی تھیں۔ نوجوان افسر نارنگی کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت کا سہارا لئے سو فٹ کی بلندی پر سے جینڈا کے گاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ گاؤں پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شمالی ہواؤں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہنے کے لئے گاؤں کے لئے ایسا مقام تجویز کیا گیا ہے۔ دوسری طرف سمندر کا پانی زمین کے گرد ایک عظیم الہیبت خنجر کی طرح پڑا جگمگا رہا تھا۔ قلعے میں چاروں طرف روشنی ہی روشنی نظر آتی تھی۔ دور سے رقص کی مستانہ آوازیں۔ جذبات انگیز موسیقی فوجی افسروں اور ان کے ساتھیوں کے بے باک قہقہے سمندر کے دھیمے ترنم سے ہم آہنگ ہو کر اس کے کانوں میں شہد ٹپکا رہے تھے۔ نوجوان افسر دن کو آفتاب کی شعلہ باریوں کا مقابلہ کرتے کرتے تھک کر چور ہو گیا تھا۔ لیکن رات کی نزہت بار ہوا نے اسے پھر تازہ دم کر دیا۔ درختوں میں سے خوشبوؤں کی لپٹیں آ رہی تھیں اور نارنگی کی تیز مشام نواز خوشبو ہوا کے ذرے ذرے میں اس طرح سما گئی تھی کہ نوجوان افسر اپنے آپ کو رنگ و بو کے دریا میں نہاتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

یہ دیہاتی حویلی ایک اسپینی امیر کی ملکیت تھی۔ جو اپنے سارے کنبے کے ساتھ اس میں مقیم تھا اس امیر کی سب سے بڑی لڑکی نوجوان افسر کو تمام شام ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جن میں دلچسپی اور حزن کے ملے جلے جذبات دکھائی دیتے تھے شاید لڑکی کے یہ لطیف احساسات افسر کے اس استغراق کی تفسیر ہوں!

کلیرا ایک حسین و جمیل دوشیزہ تھی اور گو اس کے تین بھائی اور دو بہنیں اور بھی تھیں تاہم مارکوئیس ڈی لیگانز کی وسیع جائداد سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وکٹر مارچنڈ کو کافی دولت ہاتھ لگے گی۔ لیکن کون تھا جو یہ خیال کرنے کی بھی جرأت کر سکے کہ اسپین کے سب سے زیادہ متکبر اور مغرور مزاج نواب کی بیٹی کو پیرس کا ایک بقال زادہ جیت سکے گا۔ اس کے علاوہ اسپین اور فرانس میں ہمیشہ جنگ ہی کی ٹھنی رہتی تھی اسپین کے بسنے والے بونا پارٹ کو سخت ترین نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ فرانسیسی جنرل جی ——— جو اس صوبے کا والی تھا مارکوئیس کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا اس کا خیال تھا کہ مارکوئیس فرڈی ننڈ ہفتم کو دوبارہ تخت پر لانا چاہتا ہے اور اس لئے ملک کے طول و عرض میں باغیانہ خیالات کی تبلیغ کر رہا ہے۔ اسی خیال کے زیر اثر اس نے وکٹر مارچنڈ کی زیر سرکردگی ایک فوجی دستہ جینڈا میں متعین کر دیا تھا تاکہ اس گاؤں میں اور اس کے نواح میں امن قائم رہ سکے۔ حال ہی میں مارشل نے کے مراسلات سے معلوم ہوا تھا کہ برطانیہ عظمیٰ کا جنگی بیڑا اسپین کی طرف آ رہا ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس وقت یہ بیڑا اسپین کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو۔ اس کے ساتھ یہ افواہ بھی گرم تھی کہ مارکوئیس مذکور حکومت برطانیہ کے ساتھ ساز باز کرنے میں مشغول ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر وکٹر مارچنڈ کو مارکوئیس کی دوستانہ مہمان نوازی کے باوجود چوکنا رہنا پڑتا تھا۔

افسر چبوترے کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مارکوئیس اس پر اتنی عنایات کر رہا ہے ان مہربانیوں کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے اور پھر اپنے جنرل کے شبہ کو کہاں تک جائز قرار دیا جائے لیکن بہت جلد اس کا ذہن اس قسم کے تمام خیالات سے یکسر خالی ہو گیا۔ شہر میں آج معمول سے زیادہ شمعیں جلتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اسلئے افسر کے ذہن پر احتیاط اور تجسس کے جذبات چھا گئے۔

آج سینٹ جیمز کا میلہ تھا۔ اور شہر میں چراغاں ہونا تھا۔ لیکن سیاسی وجوہ کی بنا پر وکٹر نے حکم دے دیا تھا۔ کہ تمام روشنی مقررہ وقت پر گل کر دی جائے۔ اس کے سپاہیوں کی برہنہ برچھیاں اِدھر اُدھر چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ لیکن ایک ہمہ گیر خاموشی شہر پر مسلط تھی اور کسی طرح بھی یہ شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہ اسپین کے رہنے والے پہلے کی بہجت آفریں سرمستیوں میں گم ہیں ان تمام باتوں کے باوجود وہ غیر شعوری طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اس کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی ہو رہی ہے اس پر جب اسے یہ خیال آتا کہ اسکے ماتحت افسر اسکے ہر لفظ کی تعمیل کرنے کیلئے اپنی اپنی جگہوں پر مستعد ہیں تو یہ پُراسرار اور بھی پیچیدہ اور لاینحل سا بن جاتا وہ حیرانی کے غیر ذمہ دارانہ جوش میں بھرا ہوا پہاڑیوں پر سے گذر کر چلا گیا نشیب کے دہانے کے قریب اپنی چوکی میں جانے کیلئے سمندر کے ایک تنگ راستے میں گذرنا چاہتا تھا کہ ایک دھیمی آواز سن کر یکدم رک گیا۔ یہ ریت پر چلتی ہوئی کسی نازک اندام دوشیزہ کی چاپ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا البتہ سمندر غیر معمولی طور پر دمک رہا تھا۔ نوجوان افسر اس پُراسرار انقلاب کو دیکھ کر دہشت سے ششدر رہ گیا۔

حد نظر تک پھیلا ہوا وسیع و عریض منظر اسقدر اسرار خیز نظر آتا تھا کہ وہ حیرت سے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ دور ایک جہاز کے سفید بادبان چاند کی روپہلی شعاعوں میں جگمگاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ اور غیر شعوری طور پر سوچنے لگا۔ کہ یہ سب کچھ فریب نظر کے سوا اور کچھ نہیں

اس وقت ایک بھرائی ہوئی درشت آواز نے اس کا نام پکارا۔ افسر نے گھبرا کر رخنے کی طرف دیکھا وہاں ایک سپاہی کھڑا تھا۔

"آپ ہیں جناب!"

"ہاں ——— کیا ہے؟" افسر نے سانس روک کر جواب دیا۔ اسے کسی آنے والی ناگہانی مصیبت کے غیر شعوری احساس نے محتاط کر دیا تھا۔

"یہ بدمعاش دیمک کی طرح ہمیں فنا کر دینے میں مصروف ہیں مجھے اجازت دیجئے کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے عرض کر دوں"

"کہو" مارچنڈ نے کہا۔

"میں نے ابھی ابھی حویلی کے ایک نوکر کا پیچھا کیا۔ یہ کمبخت لالٹین اٹھائے تھا۔ اس بھدی لالٹین کی صورت دیکھتے ہی مجھے شک ہوا۔ آپ جانتے ہیں حضور بھلا ان کو اپنے کمرے میں روشنی کرنے کی ایسی کونسی مصیبت پڑی تھی میں نے سوچا یہ ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے سائے کی طرح اس کا پیچھا کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چند قدموں کے فاصلے پر ایک غار سی میں فولادی چھروں کا ایک بڑا گٹھا چھپا ہوا ہے"۔

دفعتہً گاؤں میں سے ایک فیامت خیز چیخ گونجی اور سپاہی خاموش ہو گیا چند لمحوں کے اندر اندر قریب کی گھاٹیوں میں کھانے چھوس اور لکڑیوں میں سے آگ جا بجا شعلے نکلنے لگے جن کی روشنی میں افسر کا سارا بشرہ نظر آنے لگا۔

ایک گولی سپاہی کے سر میں اتر گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ رقص گاہ کی موسیقی اور بے پناہ قہقہے یکدم خاموش ہو گئے۔ سمندر پر گولے کے پھٹنے کی آواز سنائی دی اور دور تک لہروں پر روشنی کی ایک بھی سی لکیر دوڑ گئی۔ اب مسرت آفریں قہقہوں اور خوشی کے شور و شغب کی جگہ موت کی سی خاموشی مسلط ہو گئی۔ اس وحشت انگیز منظر کو دیکھ کر افسر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آئے۔ وہ نہتا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس کے سپاہی بے دریغ قتل ہو رہے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ انگریزی سپاہ شہر میں آ چکی ہے اور اگر وہ زندہ بھی بچ گیا تو فوجی دستور العمل کے مطابق اسے انتہائی ذلیل کیا جائے گا اس خیال سے وہ اتنا پریشان ہوا کہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گیا وہ اپنے آپ کو پہاڑیوں پر سے گرا کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔ کہ کلیرا کے ہاتھوں نے اسے روک لیا۔

"بھاگ جاؤ" وہ بولی "میرے بھائی تمہیں پکڑنے کے لئے میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ نیچے اتر جاؤ۔ دیوار کے ساتھ تمہیں جوانیو کا گھوڑا تیار ملے گا"

افسر نے حیرت انگیز نظروں سے کلیرا کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور حفاظت نفس کے اس ہمہ گیر جذبے سے متاثر ہو کر جو بڑے بڑے شہزوروں کو میدان چھوڑ دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پائیں باغ کی طرف بھاگ گیا۔ اسے اپنے پیچھے کلیرا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جو اس کا پیچھا کرنے والوں کو غلط راستے پر لگا رہی تھی۔ اس کے ساتھ گھوڑوں کی خوفناک ٹاپیں فضا میں برہمی پیدا کئے دیتی تھیں۔ گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے کان کے قریب سے گذری جا رہی تھیں۔ لیکن وہ زخمی ہوئے بغیر دیوار کے قریب پہنچ گیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر بجلی کی سی رفتار سے نکلا چند گھنٹوں کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ جنرل جی ——— کے کوارٹروں میں پہنچ گیا۔ جہاں جنرل اپنے احباب کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھا۔

وہ مضمحل اور سر بگریبان ہو کر کمرے میں داخل ہوا اور نقاہت زدہ آواز میں بولا "میں اپنا سر لایا ہوں" یہ کہہ کر بیٹھ گیا اور اپنا خوفناک قصہ سنایا۔ وہ دفعہ سنتا رہا۔ اور تمام لوگ بات سن کر خاموش بیٹھے رہے۔

جنرل نے اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرے خیال میں تم پر ملامت ... اور

بدنصیب مور اہلیانوں کی بداطواریوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ میری طرف سے تم معاف کئے جاتے ہو۔ اب باغیوں کے انجام پر سکے برعکس نتائج کی توقع کیجیئے۔

بدنصیب افسر یہ الفاظ سن کر کچھ مطمئن نہ ہوا۔

"لیکن" وہ بولا "جب یہ خبر شہنشاہ کے کانوں تک پہنچے گی"

"شاید" جنرل نے جواب دیا "منہ میں گردن ماری جائے گی۔ یہ تو دیکھا جائے گا۔ اب انتقام لینے کا کوئی منصوبہ ہونا چاہیئے۔ ایسا انتقام جس سے شہر کا بچہ بچہ کانپ جائے۔ یہ ابتدائی توجنگلیوں کی لڑائی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔"

ایک گھنٹہ کے بعد پیدل فوج کا دستہ سواروں کا ایک جتھہ اور چند توپیں سڑک پر نظر آئیں۔ فوجیوں کو بتایا گیا تھا کہ ان کے ساتھی اس غیر ملک میں اس طرح گفتہ کی بہت ما رے جا رہے ہیں۔ یہ باتیں سن سن کر سپاہیوں کے خون کھول رہے تھے۔ اور کوارٹینہ اور منیڈا کا درمیانی راستہ حیرتناک سرعت سے طے ہو گیا۔

راستے میں چند گاؤں ملے تھے۔ جن کے بسنے والے اس جنگ آزادی میں شرکت کرنے کے لئے اسلحہ بند ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے انہیں کا محاصرہ کیا گیا۔ اور بدنصیب شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

بعض اوقات بدنصیبی اتفاق کی ناقابل فہم صورت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ ہسپینی باغیوں کے ساتھ بھی اسی اتفاق نے ایک خونی کھیل کھیلا۔ انگریزی بیڑے کسی نامعلوم وجہ سے رک گئے اور وقت پر مدد کے لئے نہ پہنچ سکے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جو جہاز سمندر پر نظر آیا تھا وہ جنگی بیڑا نہیں تھا۔ بلکہ تجارتی جہاز تھا۔ اور کسی خاص وجہ سے دوسرے جہازوں سے آگے نکل آئے تھے۔ اس طرح منیڈا کا شہر بے یار و مددگار رہ گیا۔ انگریزی جہاز کو دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا تھا۔ کہ برطانیہ عظمیٰ اپنے وعدہ کے مطابق ان کی مدد کو آ رہی ہے اسی امید پر انہوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔

لیکن حالات کے یک بیک پلٹ جانے سے منیڈا والوں کو بالکل بے دست و پا کر دیا۔ اور جب فرانسیسی سپاہ نے شہر کا محاصرہ کر لیا تو انہوں نے مزید مزاحمت کئے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ لوگ جنرل جر۔۔۔ کی سفاکانہ فطرت سے بخوبی واقف تھے اور انہیں علم تھا کہ جنرل اپنے سپاہیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لئے منیڈا کے بچے بچے کو قتل کر دیگا اور شاید شہر کو بھی شعلوں میں بدل دے لہٰذا جنہوں نے فرانسیسیوں کے قتل میں خود حصہ لیا تھا رضاکارانہ طور پر قتل کے لئے پیش ہو گئے جنرل نے یہ شرط مان لی۔ اور ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا کہ حویلی میں رہنے والوں کو مارکوئیس سے لیکر ادنٰے ترین ملازم تک، کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو جنرل نے وعدہ کیا کہ شہر کے کسی اور آدمی کا بال بیکا نہ ہوگا۔ اس کے سپاہی شہر میں لوٹ مار مچانے اور آگ لگانے سے روک دیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اہلیان شہر پر بہت بڑا جرمانہ کیا گیا۔ نتیجۃً شہر کے چیدہ چیدہ لوگ قید کر لیے گئے اور وعدہ کیا گیا کہ اگر یہ رقم چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر وصول ہو گئی تو انہیں رہا کر دیا جائیگا۔

جنرل نے اپنے فوجی سپاہیوں کی حفاظت اور محاذ شہر و بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ کرنے کے تمام فرائض ختم کئے۔ اور جب اس کے سپاہی اپنے خیموں میں محفوظ ہو کر بیٹھ گئے تو وہ چیف آدمیوں کو ساتھ لے کر حویلی میں گیا۔ لیگانیز خاندان کے تمام افراد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑ لیا گیا اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں خاص کمرے میں قید کر دیا گیا۔ بعض کمرے میں افسران کی مجلس مشاورت عمل میں آئی اور بدلہ لینے کی راہ کو تمام کرنے کے لئے تجویزیں سوچی گئیں۔ ابھی مالیات سرکاری کو بھیجنا مالیات ارسال کرنے اور ساحل پر توپیں نصب کرنے کے بعد جنرل نے قیدیوں کا سوال پیش کیا۔

انہیں سے دو سو ملیا ملوں کا فیصلہ ہوا اور جنرل کے حکم کے مطابق حویلی کی دیوار کے سائے میں پھانسی کے تختے لگائے گئے جتنے آدمی قتل گاہ میں موجود تھے شہر کے جلاد کو حاضر ہونے کا حکم دیا گیا کھانے سے پہلے وکٹر مارچنڈ قیدیوں سے ملنے کے لئے گیا۔ لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔

"میں آپ سے" اس نے اکڑتے ہوئے لہجے میں کہا "ایک مہربانی کی بھیک مانگنے آیا ہوں"

"تم!" جنرل نے طنزاً پوچھا۔

"جی ہاں" وکٹر نے جواب دیا "میں آپ سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ ایک حسرتناک مہربانی کی بھیک۔ مارکوئیس نے پھانسی کے تختوں کو دیکھ کر ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ اس پر ایک مہربانی فرمائیں۔ اس سزا کو بدل دیں۔ پھانسی کی بجائے انہیں تلوار سے قتل کیا جائے"

"اچھا" جنرل نے جواب دیا۔

"وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے پاس ایک پادری متعین کیا جائے۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے جائیں وہ بھاگنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ وعدہ کرتے ہیں"

"میری طرف سے اجازت ہے۔ لیکن اگر وہ بھاگ گئے تو اس کی جواب دہی تمہارے سر ہوگی" جنرل نے جواب دیا۔

"بوڑھا مارکوئیس یہ بھی کہتا ہے کہ اگر اس کا سب سے چھوٹا بچہ زندہ چھوڑ دیا جائے تو اس کے بدلے اس کی ساری جائداد کے مالک آپ ہونگے"

"خوب! لیکن یہ جائداد تو پہلے ہی شاہ جوزف کے حقوق میں منتقل ہو چکی ہے!"

جنرل ایک لمحے کے لئے خاموش رہا اور پھر نفرت آمیز لہجے میں بولا "میں یہ خواہش بھی پوری کئے دیتا ہوں۔ یہ خواہش واقعی قابل التفات ہے۔ اس کا خاندانی نام زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اسپین اس بغاوت اور اس بغاوت کے بھیانک نتائج کو اپنی عمر کے آخری سانسوں تک یاد رکھے۔ وہ جس لڑکے پر ہاتھ رکھ دے اسی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن ایک شرط پر جس کو زندہ رہنا ہو وہ جلاد کا کام بھی کرے اب جاؤ تم۔ اور ایسی ویسی باتوں سے پریشان مت کرو"

کھانا چنا گیا۔ اور دوسرے افسر جو تکان کی وجہ سے بھوکے تھے کھانے پر پل پڑے۔ صرف وکٹر مارچنڈ غیر حاضر تھا۔

رقص میں داخل ہوتے وقت اسے بڑی دقت کا سامنا ہوا۔ آخر بڑی مشکلوں سے اپنے جذبات پر قابو پا کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ جس میں لیگانیز کا مغرور خاندان پریشانی اور بدحواسی میں گرفتار پڑا تھا۔ یہ حسرتناک منظر نوجوان کی رگ رگ میں اندوہ کی لہریں دوڑا گیا۔ گذشتہ شام یہی دو بہنیں اور تینوں بھائی والز ناچ کی بے پناہ مسرتوں میں کھوئے ہوئے جاتے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ اور آج یہی سر جلاد کے ذرا سی بے رحمی سے ان کی خوبصورت گردنوں سے علیحدہ ہونے والے تھے۔ باپ ماں بھائی اور بہن رسیوں سے بندھے منقش کرسیوں پر بے حس و حرکت بیٹھے تھے آٹھ ملازم جن کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے خاموش کھڑے تھے۔ بے چارگی اور ناکامی کی مایوسیاں مل جل کر ان کے چہروں پر عجیب تاثرات چھوڑ گئی تھیں۔ چند سپاہی دروازے پر متعین تھے۔ لیکن ان کی طبعی سفاکی دلہن کی اس بے کسی کو دیکھ دیکھ کر احترام کے جذبات میں بدل گئی تھی۔ وکٹر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان اسیران بلا کی متجسس نظریں وکٹر کی طرف کھنچ گئیں۔ اس نے اندر جاتے ہی ان لوگوں کے بند کھول دینے کا حکم دیا اور خود حسین کلیرا کو آزاد کرنے کے لئے اس کے قریب گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پژمردہ سی اداس مسکراہٹ چھا گئی۔ وہ اس لڑکی کی گھنی سیاہ زلفوں اور متناسب جسم کو دلچسپی کی نظروں سے دیکھتا تھا اس لئے رسیوں کی گرہ کھولتے وقت غیر شعوری طور پر اس کا ہاتھ اس کے گداز گدراز بازو پر پھیرنے لگا۔ کلیرا کا حسن اسپینی خصائص کا حامل تھا۔ اس کی اسپینی رنگت اور سیاہ لمبی لمبی نوکیلی پلکوں والی کوے کے پر جیسی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں اُسے پورے طور پر اسپینی نژاد ثابت کر رہی تھیں

"آپ کامیاب ہوئے" اس نے اُسی افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک خاص انداز سے پوچھا جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ شاید کے اس جگر خراش بوجھ کے باوجود لڑکی ابھی تک جوان ہے دکر مرکے ہونٹوں سے بے ساختہ آہ نکل گئی۔ اور پھر باری باری اس کی نظریں تینوں بھائیوں پر پڑیں سب سے بڑا لڑکا جس کا نام جوانیٹو تھا۔ سو برس کا تھا۔ باوجودیکہ وہ پست قامت اور نحیف البدن آدمی تھا تاہم اسکی حرکات و سکنات سے ایک خاص انداز وقار مترشح تھا۔ اور وہ اعلے درجے کی ذہانت جو اس زمانے کے اسپینی رؤسا میں عام پائی جاتی تھی۔ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

منجھلے لڑکے کا نام فلپے تھا۔ اس کی عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اور شکل و صورت میں کلیرا سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا سب سے چھوٹا آٹھ برس کا تھا۔ جس کی شکل و صورت سے جمہوری روم کے امیرزادوں کا پتہ چلتا تھا اور بوڑھے مارکوئیس کا سفید سر ٹرلیو کی تصاویر کے مشابہ تھا۔

ان لوگوں کو دیکھنے سے افسر کو یقین ہو گیا کہ جنرل کی بے معنی شکایت ان کے لئے ناقابل قبول ہو گی۔ تاہم اس خبر کو کلیرا سے کہہ دینے کا تہیہ کر لیا۔

کلیرا یہ سن کر ایک لمحے کیلئے کانپ گئی۔ لیکن جلد ہی اپنے اوپر قابو پا کر اٹھی اور باپ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی

"جوانیٹو سے قسم لیجیئے کہ وہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ پھر ہم مطمئن ہو جائیں گے"

مارکوئیس کی بیوی امید و بیم کے جذبات سے کانپتی ہوئی خاوند کی طرف جھکی لیکن یہ خوفناک خبر سن کر بے ہوش ہو گئی۔

جوانیٹو ان سب باتوں کو سمجھ چکا تھا۔ وہ غصے سے آگ بھبھوکا ہو گیا اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح جو اپنے پنجرے میں پیچ و تاب کھانے لگے۔ کمرے میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر پھرنے لگا۔

مارکوئیس نے وکٹر کو تسلی دلا دی کہ جوانیٹو اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ اسلئے تمام محافظین کو رخصت کر دیا گیا۔ ملازموں کو جلاد کے سپرد کر دیا گیا۔ جس نے انہیں سولی پر کھینچ دیا۔

جب اکیلا وکٹر ہی رہ گیا تو بوڑھا باپ اٹھا۔

"جوانیٹو" اس نے کہا

جوانیٹو نے سر کی ہلکی سی اثباتی جنبش سے جس میں انکار کا عنصر زیادہ تھا جواب دیا۔ اور پھر کرسی پر سیدھا لیٹ گیا اور اپنے والدین کی طرف دہشتناک بے روح نگاہوں سے دیکھنے لگا

کلیرا اٹھ کر بھائی کی گود میں بیٹھ گئی اور اپنی مرمریں باہیں اس کی گردن میں حمائل کر کے اس کے پپوٹوں پر بوسہ دے کر بڑے ہی سرور لہجے میں بولی ———

"جوانیٹو! کاش تم سمجھ سکتے کہ تمہارے ہاتھوں سے آئی ہوئی موت میرے لئے کتنی روح افزا ہوگی۔ میں کسی غیر شخص کے جلاد کے ہاتھوں سے مرنا نہیں چاہتی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں کسی دوسرے کے ہاتھوں میں سونپ دی جاؤں! تم مجھے ان تمام مصیبتوں سے بچا لو جو مستقبل میں میرے لئے موجود ہیں ——— مجھ پر احسان کرو مجھے دوسرے کے ہاتھوں میں نہ جانے دو"

یہ کہکر اس نے وکٹر کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا تاکہ نفرت کا وہ جذبہ جو اس کے بھائی کے دل میں پہلے ہی سے موجود تھا دوچند ہو جائے۔

"بہادر بنو" اس کے بھائی فلپے نے کہا۔

"ورنہ ہمارا خاندان —— شاہی خاندان —— دنیا پر سے نیست و نابود ہو جائے گا"

دفعتہً کلیرا سرو قد ہو گئی۔ وہ لوگ جو جوانیو کو چاروں طرف گھیرے کھڑے تھے سمٹ کر ایک طرف ہو گئے۔ اور نوجوان نے جو اپنی بہن اور بھائی کی اس عجیب خواہش کو ٹھکرا دینے میں حق بجانب تھا۔ بوڑھے باپ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا اس کے کانوں نے لرزتی ہوئی آواز کو کہتے سُنا۔

جوانیو! تمہیں یہ کرنا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے۔"

جب بیٹے نے کسی خاص جذبے کا اظہار نہ کیا تو باپ اس کے قدموں میں جھک گیا جس کو دیکھ کر فیرا مینول۔ اور فلپے بھی دو زانو ہو گئے۔ ان سب نے اُس ہستی کے سامنے ہاتھ پھیلا دئے جو اس خاندان کے نام کو باقی رکھنے کے لیے زندہ رکھا جا رہا تھا ان سب کے خاموش اور متفکر چہرے با... التجا دُہراتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"بیٹا! کیا تمہارے ہیں اتنی بہادری اور بھی محبت کا جس کے لیے اسپین مشہور ہے کوئی جذبہ نہیں؟ کیا تم اس بوڑھے سر کو ... تک اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو گے؟ تم ... اپنی زندگی اور اپنے ہی ... کا پاس ہے؟ کیا یہ میرے بیٹے کے چلن ہیں؟" اس نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے ختم کیا۔

"ان کیا ہے" اُس نے! جوانیو کی ماں نے مایوسی کے لہجہ میں پکار کر کہا۔ کیونکہ جوانیو کے ہونٹوں نے کچھ ایسے انداز میں جنبش کی تھی۔ جس کو اس کی ماں کے سوا اور کوئی سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا

دوسری لڑکی مارکو ٹیسٹ اسی طرح ماں کے اپنے ... بازوؤں میں سہارا دئے بیٹھی رہی۔ جب اسکی معصوم آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو مینول نے ... ڈانٹ کر خاموش ہو جانے کو کہا۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد جنرل کا خاندانی پادری بھی آ گیا۔ اور خاندان کے سارے افراد اُسے اپنے حلقے میں لیکر جوانیو کے قریب چلے گئے۔

وکٹر زیادہ دیر تک اس جگر خراش منظر کو نہ دیکھ سکا اور کلیرا کو اشارہ کر کے جنرل سے آخری مرتبہ رحم کی درخواست کرنے کے لیے چلا گیا۔ جنرل اس وقت خوش معلوم ہوتا تھا اور ماتحت افسروں کے درمیان بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

ایک گھنٹہ کے اندر مینڈا کے سو سر برآوردہ شہری جنرل کے احکام کے مطابق فصیل کے قریب آ کھڑے ہوئے تاکہ لیگانیز کا باعزت خاندان لوگوں کے سامنے قتل ہو۔ یہ لوگ پھانسی کے تختوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ یہاں تک کہ سولی پر لٹکتے ہوئے مجرمین کے پاؤں ان کے سروں کو چھو رہے تھے فوجی سپاہیوں کا ایک دستہ ان لوگوں کو ضابطے میں رکھنے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ ان سے تیس گز کے فاصلے پر لکڑی کا ایک بڑا کُندا رکھا ہوا تھا۔ جس کے قریب ایک برہنہ تلوار پڑی تھی۔ قریب ہی جلاد کی خوفناک صورت نظر آتی تھی۔ تاکہ اگر جوانیو انکار کر دے تو کام میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ چاروں طرف موت کی بھیانک خموشی طاری تھی دفعتہً فوجیوں کے پیچھے سے قدموں اور ہتھیاروں کی دھیمی جھنجھناہٹ کی آواز سنائی دی۔ جس طرح رقص گاہ میں سے گونجتے ہوئے قہقہے یک دم تاریک ترین بناؤ کی لہروں میں ڈوب گئے تھے بالکل اسی طرح یہ ابدیہ آوازیں فوجی افسروں کے قہقہوں میں گم ہو گئیں۔

ساری آنکھیں دیہاتی حویلی پر جم گئیں۔ اور ان ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں نے شاہی خاندان کو خود اعتمادی کی پوری شان میں آتے ہوئے دیکھا۔ ان سب مرنے والوں کے چہرے پر مکمل اطمینان و سکون کے آثار ہویدا تھے۔ لیکن جس کی قسمت میں زندہ رہنا لکھا تھا۔ وہ خزاں دیدہ پتّے کی طرح زرد اور کملایا ہوا سا نظر آتا تھا۔ وہ پادری کا سہارا لئے تسلی کا ہر وہ لفظ بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ جو مذہب نے پادری کو سکھایا تھا۔ جلاد سمجھ گیا کہ جوانیو نے آج کے لیے اسکا کام سنبھال لیا ہے بوڑھا مارکویس۔ اس کی بیوی کلیرا اور اس کے دونوں بھائی مقتل سے تھوڑے فاصلے پر دو زانو ہو گئے۔ اور جوانیو پادری کے ساتھ کُندے کے قریب چلا گیا۔ جب وہ کُندے کے قریب پہنچا تو جلاد نے اس کے بازو کو چھوا اور اُسے ایک طرف لے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے کچھ بتانا چاہتا ہے پادری نے مجرموں کے ایسے طریقے سے کھڑا کیا کہ وہ ایک دوسرے کے قتل کو نہ دیکھ سکیں لیکن یہ لوگ حقیقی معنوں میں اسپینی تھے۔

وہ سیدھے کھڑے رہے اور کسی کے چہرے پر خوف و ہراس کا کوئی نشان نہ تھا۔

کلیرا سب سے پہلے اپنے بھائی کے پاس گئی۔

"جوانیو" اس نے کہا "میرے بھائی! دل پر رحم کھاؤ اور سب سے پہلے مجھی کو قتل کرو۔"

اس وقت کسی آدمی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ وکٹر نے مقتل کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ اس کی حسین کلیرا لکڑی کے قریب دو زانو بیٹھی ہے اور اسکی سفید مرمریں گردن تلوار کا انتظار کرنے کے لیے کُندے پر رکھی تھی۔ وکٹر کا رنگ فق ہو گیا لیکن اس نے اپنی قوتوں کو مجتمع کیا اور جھپٹ کر اس کے قریب پہنچی۔

"اگر تم میرے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہو جاؤ تو جنرل تمہاری جان بخشی کرتے ہیں"۔ اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔

اسپینی لڑکی نے غصّے اور نفرت سے لبریز نگاہوں کے ساتھ فرانسیسی افسر کو دیکھا اور دھیمی آواز میں جو اس کے دل کے عمیق ترین گوشوں میں سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی بولی "جوانیو! اپنا کام کرو"

اور اس کا سر لڑھکتا ہوا وکٹر کے قدموں میں گر گیا۔ مارکویس کی بیوی یہ خوفناک آواز سُن کر سمٹ گئی۔

"میں ٹھیک ہوں نا! جوانیو!" ننھے مینول نے اپنے بھائی سے پوچھا۔

"تم رو رہے ہو" جوانیو نے جواب دیا۔

"ہاں" بچہ بولا "میں سوچ رہا ہوں کہ تم ہمارے بغیر کس طرح زندہ رہ سکو گے"

چند لمحوں کے بعد مارکویس کا پُرشکوہ سراپا ظاہر ہوا۔ اس نے اپنے بچوں کے بکھرے ہوئے خون کی طرف دیکھا۔ پھر سہمے ہوئے تماشائیوں کی طرف بازو پھیلائے اور بلند آواز سے بولا۔

"اسپین کے رہنے والو! میں اپنے بیٹے پر وہ ساری رحمتیں بھیجتا ہوں جو ایک باپ اپنی اولاد پر بھیج سکتا ہے۔ مارکویس بلاخوف و خطر تلوار چلاؤ۔ تم بے گناہ ہو"

لیکن جب جوانیو نے اپنی ماں کو پادری کا سہارا لئے مقتل کی طرف آتے دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھا "اس نے مجھے جنا تھا"

اسکی آواز سن کر لوگوں کے منہ سے خوف و دہشت کی ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ اتنی بلند ہنگامہ خیز کہ اس میں خون کے نشے میں چُور بیٹھے ہوئے افسروں کے فلک گیر قہقہے بھی ڈوب گئے۔ مارکویس سمجھ گیا کہ اس بیٹے کی ہمتیں جواب دے گئی ہیں۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور اپنے آپ کو چٹانوں پر پھینک کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تحسین و آفریں کا ایک بلند آوازہ غلغلہ بلند ہوا۔ اور جوانیو بے ہوش ہو کر گر گیا۔

"جنرل" ایک شرابی افسر نے کہا "مارچند نے ابھی ابھی مجھے اس قتل کے متعلق ایک بات سنائی ہے۔ میں شرط بدتا ہوں۔ ایسا ذلیل کام تمہارے احکام سے نہیں ہوا ہوگا"

"آپ بھول گئے ہیں!" جنرل نے جواب دیا۔ "ایک مہینے میں فرانسیسیوں کے پانچ سو خاندان تباہ ہو جائیں گے۔ اور ہم اسپین میں ہیں۔ کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی ہڈیاں واپس نہ جائیں"

اس گفتگو کے بعد ساری مجلس میں کوئی ایسا بہادر نہ تھا۔ جس میں گلاس کو خالی کر دینے کی جرأت ہو۔

باوجودیکہ لوگ اس کی عزت و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ اور شاہِ اسپین نے از راہِ لطف و عنایت اسے "جلاد" کا خطاب عنایت کیا تھا۔ تاہم مارکویس ڈی لیگانیز ہمیشہ ملول اور افسردہ خاطر رہتا ہے اُسے تنہائی کی زندگی پسند ہے اور وہ شہری زندگی میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیتا۔ اس عجیب غریب جرم کے احساس نے اسے ادھ موا کر دیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی بے تابی سے اپنے دوسرے بیٹے کی پیدائش کا انتظار کر رہا ہے۔ تاکہ جلد از جلد وہ ان روحوں کے گروہ میں شامل ہو سکے۔ جو ہر وقت اور ہر گھڑی اس کا پیچھا کئے رہتی ہے۔

# مناظرات

جناب منشی محمد احمد صاحب صریر مینائی مرحوم خلف اکبر
حضرت امیر مینائی رح

ہر دل میں ترے رُخ کی تنویر نظر آئی
ہر آئینے میں تیری تصویر نظر آئی

آہ دلِ دیوانہ جا پہنچی ہے کاکل سے
زنجیر سے البتہ زنجیر نظر آئی

غربت میں کبھی مُڑ کر جب سُوئے وطن دیکھا
اِک تعشرِ کفِ پا کی زنجیر نظر آئی

قسمت کو جگایا تھا بیدار ہوئے فتنے
اُلٹی مرے نالوں کی تاثیر نظر آئی

دیوانہ کیا جب سے اُس گُل کی نزاکت نے
آنسو کی لڑی مجھ کو زنجیر نظر آئی

حسرت بھری آنکھوں نے ارمان بھرے دل میں
ہر گھر میں ہمیں تیری تصویر نظر آئی۔

کس مُنہ سے صریر ان کو اعجاز کا دعویٰ ہے
باتوں میں تو جادو کی تاثیر نظر آئی

# کیتھرائن پار

ایک ایکٹ کا ڈراما

مصنفہ موریس بیرنگ

مترجمہ جناب [illegible]

**افراد**

شاہ ہنری ہشتم ~~~~~~~~~~~~~~~~
ملکہ کیتھرائن پار ~~~~~~~~~~~~~~~~
ایک شاہی خادم ~~~~~~~~~~~~~~~~

**منظر:**— لندن محل کے اندر ناشتہ کے کمرہ میں شاہ ہنری ہشتم اور کیتھرائن پار میز پر آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ شاہ ہنری ایک اُبالے ہوئے انڈے کو توڑتا ہے ——————

شاہ ہنری۔ انڈا ٹھیک سے اُبالا نہیں گیا۔ بالکل خراب ہے۔

کیتھرائن۔ کل تم نے انڈے سخت ہونے کی شکایت کی تھی

شاہ ہنری۔ بالکل ٹھیک۔ زیادہ سخت یا زیادہ گیلے انڈے مجھے پسند نہیں ہیں۔ چاہتا ہوں کہ وہ صحیح قاعدے سے پکائے ہوئے ہوں

کیتھرائن۔ تمہیں خوش رکھنا بہت مشکل ہے۔ انڈے ساڑھے تین منٹ تک کھولتے ہوئے پانی میں اُبالے گئے ہیں۔ میں نے خود اُبالے ہیں۔ بہتر یہ مجھے دے دو۔ مجھے ایسے ہی پسند ہیں۔ تمہارے لئے دوسرے انڈے اُبالے دیتی ہوں۔

شاہ ہنری۔ اب کافی دیر ہو چکی ہے ——— بہرحال بھی۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تم انڈے اُبالنے کا تجربہ نہیں رکھتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کام تم باورچیوں کو کرنے دو۔ اور اس کا انتظام باورچی خانہ ہی میں ہو

کیتھرائن۔ اگر یہ باورچی خانہ میں اُبالے جائیں تب بھی تمہیں شکایت ہے کہ جب تم پہنچ آتے ہو تو وہ یہاں موجود نہیں ہوتے اور اگر موجود ہوتے ہیں تو تم ان کے سرد اور بے مزہ ہونے کی شکایت کرتے ہو۔

شاہ ہنری۔ اس قسم کی کوئی بات میں کبھی نہیں کرتا۔ باورچی بڑی خوبصورتی سے انڈے اُبالتا ہے۔

کیتھرائن۔ کل سے وہی اُبالے گا۔

شاہ ہنری۔ تمہاری جیسی عورت کے متعلق اتنا خیال تو ضرور ہو سکتا ہے کہ کم از کم وہ انڈے اُبال سکتی ہے۔ مجھے تر اور گیلے انڈوں سے نفرت ہے۔ (فکرمند ہو کر) تو بیچاری پیاری کیٹی کیسے اچھے انڈے اُبالتی تھی۔

کیتھرائن۔ کیا تمہارا مطلب کیتھرائن ہاورڈ یا کیتھرائن آف آراگون سے ہے؟

شاہ ہنری۔ میرا اشارہ بیچاری کیٹی ہاورڈ کی طرف تھا کیتھرائن آف اراگون ہرگز میری بیوی نہ تھی اس کے ساتھ میری جائز شادی نہ تھی۔

کیتھرائن۔ ہاں کیتھرائن ہاورڈ کی ماں چونکہ باورچن تھی۔ اسلئے انڈے اُبالنے کا تجربہ اس کیلئے لازمی تھا۔

شاہ ہنری۔ بالکل غلط اس کی ماں باورچن نہیں تھی۔

کیتھرائن۔ تب تم این بولین کے بارے میں کہہ رہے ہو۔

شاہ ہنری۔ ہاں ہاں یقیناً کیٹی کی ماں قلعہ باز تھی۔

کیتھرائن۔ تمہیں جین سیمرسٹ کا خیال آ رہا ہے۔

شاہ ہنری۔ ہرگز نہیں جین سیمرسٹ کی بہن تھی۔

کیتھرائن۔ کچھ بھی ہو مگر میں تو یہی جانتی ہوں کہ کیتھرائن ہاورڈ کی ماں باورچن تھی۔ میرے خیال میں میرے سامنے اس کا تذکرہ بالکل غیر ضروری ہے شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ کاش وہ زندہ ہوتی اور یہ کہ میری نسبت تمہیں اس سے زیادہ محبت تھی۔

شاہ ہنری۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرے کہنے کا بس اتنا ہی مطلب تھا کہ وہ انڈے اُبالنے کا تجربہ رکھتی تھی۔

کیتھرائن۔ تمہارے کہنے کا واضح مطلب تو یہ تھا کہ وہ ان تمام صفات کی حامل تھی۔ جن سے میں محروم ہوں۔

شاہ ہنری۔ تم بھی کچھ عجیب سی ہو۔ میں نے اس طرح کی کسی بات کے اظہار کی کوشش نہیں کی اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں کہا کہ گیلے انڈوں سے مجھے نفرت ہے۔ اور آج کے انڈے اچھی طرح اُبالے نہیں گئے۔

کیتھرائن۔ (غصہ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) صاف بات تو یہ ہے کہ تم مجھ سے چھٹکارا پا کر کسی ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتے ہو جو انڈے اُبالنا جانتی ہو۔

شاہ ہنری۔ کیتھرائن یہاں آؤ۔ میں تمہیں صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ تمہیں تو انڈے اُبالنا خوب آتا ہے

کیتھرائن۔ (بیٹھتے ہوئے) کسی پُر مسلسل طنز کی بوچھار ہوتی رہے۔ اور یہی اس کے لئے شکرانہ ہو۔ یہ نہ سمجھو کہ آئندہ میں تمہارے لئے انڈے اُبالا کروں گی۔ ہرگز نہیں۔

شاہ ہنری۔ میرا خیال تھا کہ آج ہم لوگ کسی قدر موسیقی سے لطف اندوز ہوں۔ میں نے ایک نیا گیت بنایا ہے۔ جس کو تمہارے ساتھ گانا چاہتا ہوں۔ یہ بین پر گانے کا ہے۔ آؤ کوشش کریں۔

کیتھرائن۔ مجھے بالکل فرصت نہیں۔ اس گیت کا نام کیا ہے؟

شاہ ہنری۔ اس کا عنوان "محبت کی فتح" ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے۔

آؤ دیوتائے اعظم کے غیر فانی فرزند اسکندر کے کارنامے سنو۔

جو برف ایسے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر بابل میں آیا۔

کیتھرائن۔ مگر قافیہ بے جوڑ ہے۔ اس لئے موسیقی نہیں پیدا ہوتی۔

شاہ ہنری۔ یہ کوئی بات نہیں۔ ہم آہنگی تو موجود ہے۔

کیتھرائن۔ کیا تمہارا اشارہ اسکندر اعظم کی طرف ہے

شاہ ہنری۔ بیشک!!

کیتھرائن۔ تو سب سے پہلی بات تو یہ رہی کہ اس کا گھوڑا کالا تھا۔

شاہ ہنری۔ نہیں۔ میری پیاری۔ تم غلطی پر ہو۔ اس کا گھوڑا سفید تھا۔

کیتھرائن۔ کالا ——— رنگ کوئلے کی طرح۔

شاہ ہنری۔ لیکن مجھے نہایت باوثوق طور پر معلوم ہے کہ اس کا گھوڑا سفید ہی تھا۔

کیتھرائن۔ اسکندر کا گھوڑا کالا تھا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ گھوڑا کالا ہی تھا۔

شاہ ہنری۔ وہ سفید تھا۔ جس سے جی چاہے پوچھ لو۔

کیتھرائن۔ ہرگز نہیں۔ گھوڑا کالا تھا بلکہ کالے گھوڑے کے نام سے اسکندر مشہور تھا۔ ایسی سینکڑوں تصویریں موجود ہیں جن میں اسکندر کالے گھوڑے پر سوار ہے۔ ایک تصویر میرے باپ کے پاس بھی ہے۔

شاہ ہنری۔ تب یہ مصور کی غلطی ہے۔ پلوتارک ایکس نونان اور ارسطو سبھی اس کے گھوڑے کا رنگ سفید بتاتے ہیں۔

کیتھرائن۔ ہرگز نہیں۔ گھوڑا سیاہ رنگ کا تھا۔

شاہ ہنری۔ لیکن پیاری ——— تم کتنی ہٹیلی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا گھوڑا سفید تھا۔

کیتھرائن۔ میں کہتی ہوں۔ سیاہ کوئلے کی مانند سیاہ۔

شاہ ہنری۔ تم نے ایکس نونان کی کتاب پڑھی ہے؟

کیتھرائن۔ تم کچھ اور ہی سمجھ رہے ہو ہم لوگ جب بچے تھے۔ تو میرا باپ مجھے اسکندر کے کالے گھوڑے کی تصویر دکھایا کرتا تھا۔

شاہ ہنری۔ اچھا میں ثابت کر کے بتاتا ہوں۔ کتب خانہ میں پلوتارک کا ایک جلد ہے۔ (کتب خانہ میں جا کر کتاب نکالتا ہے)

کیتھرائن۔ مجھے یہ بات خاص طور پر اس لئے بھی معلوم ہے کہ میرے بھائی کا ایک سیاہ گھوڑا تھا جس کو ہم لوگ اسکندر کے گھوڑے کے نام پر "بیوسی فلس" کہا کرتے تھے۔

شاہ ہنری۔ (کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے) اگر وہ کالا تھا تو اسے ہرگز بیوسی فلس نہیں کہا جا سکتا۔ کسی سیاہ گھوڑے کو بیوسی فلس پکارنا بہت بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔

کیتھرائن۔ اتنا بھونڈا تو نہیں ہوتا جتنا ایک سفید گھوڑے کو بیوسی فلس کہہ کر پکارنے سے معلوم ہوتا ہے۔

شاہ ہنری۔ اُس نے اپنے لئے ہرگز سیاہ گھوڑا پسند نہیں کیا ہوگا۔ وہ حد درجہ توہم پرست تھا۔

کیتھرائن۔ جس طرح تم توہم پرست ہو۔ پیروں سے عقیدت رکھتے ہو۔ اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہو۔ اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھتے ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے اپنا سیاہ گھوڑا محض یہ دکھانے کے لئے منتخب کیا تھا کہ توہم پرستی کا شائبہ تک اس کے دل و دماغ میں موجود نہیں تھا۔

شاہ ہنری۔ دیکھو لکھا ہے "گھوڑا بالکل وحشی تھا۔ اس کو مطیع کرنا بہت دشوار تھا۔ واقعی اس میں اس دور کے تھسلیائی سفید گھوڑے کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔

کیتھرائن۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ گھوڑا سفید تھا اور تھسلیائی گھوڑے اپنے سیاہ رنگ کے لئے مشہور ہیں

شاہ ہنری۔ فی الحقیقت تم بہت ضدی اور اڑیل ہو۔ میں تمہیں ایکس نونان سے ثبوت دیتا ہوں۔ اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ گھوڑے کا رنگ سفید تھا۔ یہ بالکل تاریخی واقعہ ہے۔ کسی نے آج تک اس پر بحث و اعتراض نہیں کیا۔

کیتھرائن۔ مگر پلوتارک تو عملی طور پر بتا رہی ہے کہ وہ سیاہ رنگ کا تھا۔

شاہ ہنری۔ پلوتارک میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اب مجھے یاد آیا کہ ایک قابل متعلم والزی بھی وہی کہا کرتا تھا جو میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز اس نے کہا تھا "بیوسی فلس کی طرح سفید" طالبعلموں میں یہ محاورہ عام ہے۔

کیتھرائن۔ ضرور اس نے کہا ہوگا "بیوسی فلس

باقی بر صفحہ ۶۲

# شاعر کا المیہ

از حضرت اختر بریلوی

میں شاداب نظارے سے شادابی اڑاتا ہوں
ستاروں کی چمک سے موجِ بیتابی اڑاتا ہوں

ہر اک دنیا کی شے سے کچھ نہ کچھ میں اخذ کرتا ہوں
میں دامانِ نظر گلہائے نظارہ سے بھرتا ہوں

مرا شیوہ محبت میری فطرت مستقل وحشت
میں آزادی کا خواہاں کبر و نخوت سے مجھے نفرت

رہا کرتی ہے مجھ پر بیخودی و سرخوشی طاری
مری حدِ تخیل تک نہیں آتی ہے عیاری

میں جو کہتا ہوں کھلکر اور بالکل صاف کہتا ہوں
کسی کو میں دباتا ہوں نہ خود میں دب کے رہتا ہوں

مرا دل صاف ہے، اور ایک سا ہے ظاہر و باطن
لگی لپٹی نہیں رکھتا ہوں۔ مجھ سے مکر ناممکن

میں دکھ سہتا ہوں لیکن دکھ کسی کو دے نہیں سکتا
برائی سے کسی کا نام ہرگز لے نہیں سکتا

میں جب محفل سے ہٹ کر جنگ کے میداں میں آتا ہوں
غزل کو بھول جاتا ہوں رجز پڑھ کر سناتا ہوں

رجز ایسے کہ جن سے تن بدن میں آگ لگ جائے
سپاہی جن کو سنکر لشکرِ دشمن سے ٹکرائے

زمیں سیراب کر دے خون سے ناپاک دشمن کے
لڑے گھوڑا بڑھا کر جوش میں آ کے تن تن کے

ہر اک اسکا قدم آگے بڑھے پیچھے نہ ہٹ آئے
نہ روکے ہاتھ قبل از فتح لڑتے لڑتے مر جائے

تنِ تنہا ہو لیکن لشکرِ دشمن پہ بھاری ہو
تھکا ماندہ ہو زخمی ہو مگر ضرب اسکی کاری ہو

مرے مضبوط ہاتھوں میں دبی ہیں قوم کی باگیں
مجھے دیکھیں تو فوجیں دشمنوں کی نوکِ دم بھاگیں

کبھی میں حسن کی اک اک ادا پر جان دیتا ہوں
کبھی میں گولیاں کھانے کو سینہ تان دیتا ہوں

کبھی پھولوں کے منہ میں چومتا ہوں صحنِ گلشن میں
کبھی گولی چلانے کیلئے تیار ہوں رن میں

مری تعریف یہ ہے صاحبِ سیف و قلم میں ہوں
کبھی شمشیر زن میں ہوں کبھی گوہر رقم میں ہوں

غرض یہ ہے زمانہ دیکھ کر میں کام کرتا ہوں
مگر کرنے پہ آ جاؤں تو سب کچھ کر گزرتا ہوں

# حوصلے

از جناب عزیز احمد صاحب عزیز

ہر سوزِ دل کی ساز بنانے لگا ہوں میں
ہستی کو ایک راز بنانے لگا ہوں میں

مر مر کے تیری یاد میں جیتا ہوں بار بار
افسانے کو دراز بنانے لگا ہوں میں

ہر گام پہ تلاشِ حقیقت نہیں مجھے
ہر رنگ کو مجاز بنانے لگا ہوں میں

بیچین ہر نفس ہے پریشان ہر نظر
پتھر کو پُرگداز بنانے لگا ہوں میں

کیفیتِ تصورِ جاناں نہ پوچھیے
دل کو فسوں طراز بنانے لگا ہوں میں

دل کو پُراضطراب بنانے لگا ہوں میں
ذرے کو آفتاب بنانے لگا ہوں میں

باغوں میں گنگناتا ہوں کیا گیت حسن کے
ہر پھول کو گلاب بنانے لگا ہوں میں

ہر محشرِ خیال ہے وجہِ سکونِ دل
تسکیں کو اضطراب بنانے لگا ہوں میں

گم ہوں کسی کے جلوۂ رنگیں میں اسقدر
اس زندگی کو خواب بنانے لگا ہوں میں

بیخود ہوا ہوں عشق کا افسانہ چھیڑ کر
ہر سانس کو رباب بنانے لگا ہوں میں

کیفِ سخن کی ہوش رُبائی نہ پوچھیے
ہر شعر کو شراب بنانے لگا ہوں میں

# جنونِ محبت

بہترین جرمن افسانہ نگار کا بہترین رومان پرور افسانہ

از جناب عزیز احمد صاحب عزیز

الفت کا جب مزا ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار ؛ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

## لیپٹن فلکس کی طرف سے ولمر کے نام

چیٹو ولیم بلون سنہ ۱۸۲۰ء

پیارے دوست ولیم۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے حالات تمہیں جلد لکھوں گا۔ تمہیں چھوڑے ہوئے مجھے صرف دو گھنٹے ہوئے ہیں اور اب میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ میں بہت مستعد ہوں۔ مستقبل قریب میں چونکہ میں نوشہ بننے والا ہوں۔ اس لئے ضروری ہے کہ میں یہ خوبی اپنے اندر پیدا کر دوں، یہی وجہ ہے کہ میں اس پر فخر نہیں کرتا۔

دنیا بھر میں کسی دو چیزوں میں اتنا بڑا فرق نہیں ہے جتنا ایک آزاد طالب علم کی عاشقانہ زندگی اور ایک قانونی شادی میں ہے۔ اور بہت سی ایسی مثالیں ہیں۔ جہاں یہ معاہدۂ قانونی صرف چند روز میں ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرے ساتھ یہ ناخوشگوار حادثہ پیش نہ آئے گا۔ "جہاں قسمت کی سخت آزمائش نہیں وہاں زندگی کا لطف بھی نہیں"۔

تم یہ جانتے ہو کہ میرا خاندان اس بات پر اصرار کر رہا ہے کہ میں زندگی کی ذمہ داریوں کو محسوس کئے بغیر نوجوان گریفائن شلوز سے شادی کروں۔ ہمارے محترم والد نے میرے تمام انتظامات درست کر لئے ہیں۔ اس سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے میرے والد نے میرے تمام قرضوں کو جو ایک ہزار ڈالر کے قریب تھے بغیر کسی رد و قدح کے ادا کر دیا۔ میں دوبارہ انہیں اس مسرت آمیز زحمت کی دعوت دینا چاہتا ہوں کچھ بھی ہو یہ امر تو مسلم ہے کہ میری ہونے والی بیوی ایک فرشتہ ہے۔ اور جیسا کہ والد نے کہا ہے "وہ حیادار، نیک چلن، ستودہ اخلاق، دور اندیش اور دولت مند ہے۔"

مختصر یہ کہ اگر یہ تمام باتیں میرے والد نے صحیح کہی ہیں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک جسمانی اور روحانی مسرت میرا انتظار کر رہی ہے۔ غالباً تم خیال کرو گے کہ میں اس جسمانی اور روحانی مسرت کا صحیح تصور نہیں کر سکتا اور نہ اسے صحیح طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ میں اس کا اعتراف ضرور کر سکتا ہوں۔ اس وقت میں محبت کو ایک وقتی جوش کا نام دے سکتا ہوں۔ جب لوگ غیر فانی محبت اور گھر کی دنیا کی مسرت اور آسودگی کے تذکرے کرتے ہیں تو میں اس کو ایک رنگین خواب سے تعبیر کرتا ہوں۔ میں اب تک اس دردسری میں مبتلا نہیں ہوا اور مجھے یقین ہے کہ کسی عورت کی ضرب المثل "دلربائی" میرے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتی۔ میں اپنی خاموش اور سیدھی سادی زندگی کو ان تمام باتوں پر ترجیح دیتا ہوں۔

اب میں تمہارے سامنے اپنے سفر کا حال بیان کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میرے والد کے خیالات ہمیشہ سے رومان انگیز رہے ہیں۔ اور ان کی مرضی تھی کہ شریک زندگی سے میری پہلی ملاقات نیپلز کے حسین اور سحر آگیں مناظر کے آغوش میں ہو۔

مجھے معلوم ہوا کہ وہ وہاں تیسرے دن پہنچیں گی اس قلیل عرصہ میں میں نے اپنی آزادی کے ہر لمحہ کو گہوارۂ مسرت بنایا تاکہ شادی کی زنجیر میں جکڑے جانے سے پہلے میں ان قیمتی گھڑیوں کو ضائع نہ کر دوں۔ یہاں میں نے مسرت کی لاتعداد گھڑیاں گذاریں اور میں نے اپنی گذشتہ ناگوار زندگی پر بھی ایک نظر ڈالی اور پھر میں نے ایک ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جو میری نیک بیوی کی خوشی اور مسرت کا باعث ہو سکے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب رہا کہ وہ کیسی ہے اسے خط لکھنے کی مجھے اجازت نہ تھی کیونکہ میرے والد اسے محض فضول خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کا حسین نام بھی معلوم نہ تھا۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات تھی۔ لیکن اس کے باوجود میرے والد کا اعتقاد تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کریں گے اس کے برعکس کوئی تصور ان کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ چنانچہ میں خدا سے امید رکھتا تھا کہ ان کی آرزوئیں ناکام نہ ہوں اور میری شادی تباہی کا پیش خیمہ نہ ہو۔

تم نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اپنے سفر کی تفصیل سے تمہیں آگاہ کروں اور اپنے خوشگوار ماحول کا نقشہ تمہارے سامنے پیش کروں۔ میرے پیارے دوست، ذرا صبر سے کام لو۔ میں ابھی پرسکون حالت میں نہیں ہوں جیسا کہ مجھے ہونا چاہئے۔ میری دلہن کی ملاقات کا منظر میرے دل کو دھڑکا رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس مقام کی خاصیت اور اس ماحول کے کوائف ایک ایسے آدمی سے بیان کرنا جو کبھی ان سے واقف نہ ہو زیادہ دلچسپی کا موجب نہیں اس وقت تک نہ تمہارے اور نہ تمہاری دلنواز میری نے اپنے گاؤں سے باہر قدم نکالنے کی کبھی جرأت کی اس لئے اگر میں یہاں کے حالات بیان کروں اور یہاں کے مشہور مناظر و عمارتوں کا تذکرہ کروں تو کیا فائدہ؟

کیا تم یہاں کے پرشکوہ اور گرانقدر مناظر کا تصور کر سکتے ہو؟ ناممکن ہے۔ اس لئے فوراً یہاں چلے آؤ اور اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھو۔ یہاں کے عجائبات کا تذکرہ اگر میں تفصیل سے کروں تو وہ اس شخص کی سمجھ میں تو آ سکتے ہیں جو ایک دفعہ یہاں کی سیر کر چکا ہو۔ لیکن دوسروں کے لئے میرے الفاظ بالکل بے معنی ہوں گے۔

اچھا اب میں پھر تصورات کی دنیا میں کھو گیا ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اور میری تھکی ہوئی پلکیں کہہ رہی ہیں کہ میں نے آج پیدل بہت زیادہ فاصلہ طے کیا ہے۔ میری نیک تمنائیں تمہاری حسین ننھی بیوی کو پہنچیں۔ مجھے جلد لکھنا۔

## اساڈرا کی طرف سے جوزیفائن کو

یکم جولائی۔ پیاری جوزیفائن! سب سو گئے ہیں۔ سوائے تمہاری اساڈرا کے جو حسب وعدہ تمہیں اپنے سفر کے حالات بھیج رہی ہے۔ میں تم سے اپنے تصورات میں گفتگو کر رہی ہوں ہم اس وقت اپنے فرحت بخش کمرہ میں ہیں۔ تم کھڑکی کے پاس بیٹھی ہو اور میں آتشدان کے قریب۔ چراغ کی روشنی مدھم پڑ گئی ہے اور چاند کی زریں کرنیں کھڑکی کے شیشوں سے اندر آ رہی ہیں۔ میں اپنے خیال میں کھڑکی کے باہر لیموں کے پتوں کی سرسراہٹ سن رہی ہوں۔ ہر طرف مکمل خاموشی ہے۔ اور ہمارے محبوب کمرہ میں کامل سکوت طاری ہے۔ آہ! وہی کمرہ جسے میں نے انتہائی بے دلی سے چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ دنیا کے حوادث کا مقابلہ کروں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس پرسکون گھر کو چھوڑ کر اور اس مسرور زندگی سے جدا ہو کر میں کس طرح اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ سکتی ہوں۔ جب ہم آپس میں تنہا بیٹھ کر آنے والے دنوں کے متعلق گفتگو کرتے تو ہم ایک حسین تصویر کھینچتے اور ایک شاندار زندگی کا تصور کرتے اور اپنے چچا کے بیٹے سے شادی کرنے کا خیال میری زندگی کا جزو بنتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں اس تصوری ہستی کا ذکر کیا کرتے جو ہمارے تمام خوابوں کی تعبیر تھی۔ اب وہ دن قریب آ گیا ہے جب میری تمام امیدوں کو کروٹ لینا پڑے گی میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ میرے خوابوں کی بنائی ہوئی تصویر سے مختلف ہوگا۔ لیکن اگر وہ میرے تصورات کی بنائی ہوئی ہستی سے بالکل برعکس ہوا تو کیا میں خوش رہ سکوں گی۔ میرے والد نے اس کے متعلق مجھے بہت سی دلچسپ باتیں بتائی ہیں۔ لیکن غالباً یہ سب کچھ میرے اندیشوں کو دور کرنے کے لئے ہے۔ شاید ان کا خیال ہے کہ اگر ایک عرصہ تک مجھے سوسائٹی سے دور اور مردوں سے علیحدہ رکھ کر کسی مرد سے اچانک میری ملاقات کرائی جائے تو مجھ پر نہایت خوشگوار اثر ہوگا۔

ہم اپنے خاموش اور پرسکون کمرے میں جہاں کسی متنفس کی رسائی نہ تھی۔ نہایت جرأت سے آنے والے واقعات پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ آہ! اب وہ تمام خیالات کی دنیا ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ لیکن ہر حالت میں اپنے والد کی مرضی پر عمل کروں گی۔

تمام دن میں ناقابل برداشت طریقہ پر اپنا خوف اور اپنے جذبات والد سے چھپائے رہی ورنہ وہ انہیں پریشان کر دیتے جس سے میرا دل ٹوٹ جاتا۔ میں اس خیال سے کس قدر خوش ہوں کہ اپنے منگیتر کے آنے سے پہلے میں ابھی چند روز اور ان حسین مناظر سے لطف اندوز ہو سکتی ہوں شاید اس دوران میں میں دوبارہ وہ سکون اور اطمینان حاصل کر لوں جو مجھے کبھی اپنے گھر میں نصیب تھا۔ غریب اساڈرا اپنا وعدہ پورا کر رہی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ وہ اطمینان بخش حالت میں نہیں ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس آزمائش میں پوری اترنے کے لئے میں بہت کمزور اور نادان ہوں۔

ہم نے اس تمام کو ٹایلز کو چھوڑا اور والد کی رائے کے مطابق ہم نے اپنے ساتھ بہت ہی مختصر چیزیں لیں تاکہ ہم ایک سادہ اور قدرتی زندگی سے دل کھول کر ہمکنار عیش ہو سکیں۔ ہم آرنگ پہنچے تو الپس کے مناظر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ شہر پار کر کے ہم جکن اسٹرین کے اوپر پہنچے جو ایک پرانا کھنڈر ہے اور تفریح کے مقام کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ ناشتہ کے بڑے کشادہ کمرے میں بیٹھ کر تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ ہمارے نیچے ندی کی موجیں لہراتی تھیں اور میری نظریں ندی کی

نیز خاندان لوگوں کو پیچھا کرتی تھیں ... موقعہ تھا کہ میرے ... ان کی ... شرکت ہوئی ...

آج ہم ... بالکل پہلی ... اور پانی کی ... جلد ... ہو گئے۔ جلد ہی ... گزرنے لگی ... بعد کہ جہاں میدان ہی میدان نظر آیا ... ہر قدم پر منظر بدل رہا تھا۔ آخر لنچ کھانے کے لئے ہم سٹورڈل کے پاس ٹھہرے۔ جہاں کی خوبصورتی اور ندی کے ایک لمبے سفر کی مسرت نے میرے دل میں نئی امنگیں پیدا کر دی تھیں۔ اس کے بعد شیستمر کے محل کا مینار ہماری نظروں کے سامنے آیا اور جونہی ہم اس کے قریب پہنچے ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے تمام حسین جلووں سمیت یہاں دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک چٹان پر کھڑا تمام گاؤں پر حکومت کر رہا ہے۔ جیسے ہی ہماری کشتی چلی وہ دلفریب نظارہ تمام تر شان و شوکت کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آ گیا۔ ہم کشتی چھوڑ کر محل کے مینار پر چڑھ گئے۔ اور وہاں سے ہم نے کل گاؤں کا نظارہ کیا۔

سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ روسنبرگ کا منظر تھا۔ اُف وہ اس قدر دلفریب نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے دامن میں اتنی نیرنگیاں تھیں کہ میں بمشکل اپنے دل پر قابو پا سکی۔ محل کے باغات بہت دلنشین ہیں اور کانی عمارت سے بنائے گئے ہیں۔ جس چیز نے میری دلچسپیوں میں اضافہ کیا وہ ایلس کے سامنے کا پویلین تھا۔ ندی کے کنارے زندگی کی لاتعداد دلچسپیوں کا سامان موجود ہے۔ جہاں بہت سی کشتیاں اور چھوٹے جہاز لنگر انداز ہیں۔ تھوڑی دیر تک ہم پویلین کی خوشگوار چھت کے نیچے بیٹھے رہے۔ آخر کار میری پھوپھی نے شام کی بارہا خنکی کو برداشت نہ کرتے ہوئے ہمیں واپس لوٹنے پر مجبور کیا۔ ہمارا ہوٹل خوفناک طور پر میلا کچیلا تھا۔ بڑی مشکل سے میں اپنی بیزاری کو والد سے چھپانے میں کامیاب ہوئی۔ ہم سارے دن کے واقعات کو بہترین طور پر سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے ... نے اور ہم ... ہوئے ہونگے ... آج ہزار دفعہ اس ... عزیز کمرے کے متعلق اور اپنے پیارے ... کے متعلق خیال آرائیاں کیں۔ اچھا خدا حافظ ورنہ میری پھوپھی کہیں گی کہ میں اسقدر ... خط لکھ کر اپنی آنکھیں تباہ کر رہی ہوں۔ میری پیاری ... جو ... کے لبوں پر میرے ہزار بوسے۔ کل تمہیں پھر لکھوں گی ۔

# لچن فلس کی طرف سے ولمر کے نام

(۲ جولائی) —

میرے عزیز دوست ولمر! تم میری اس زندگی پر رشک کرتے ہو جو میں اس میدان انگیز ماحول میں گزار رہا ہوں یہ ایک مسرت بخش سرگذشت ہوگی۔ تمام چیزیں انتہائی طور پر حیرت انگیز ہیں اور اس ... ایک نئی دلچسپی کے ساتھ ... ان سب چیزوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔

مجھے ان حالات کو بیان کرنے کی اجازت دو جو مجھے اس درمیان پر ... پیش آئے ہیں۔ مارکٹ کے پاس کا ہوٹل جہاں میرا قیام ہے بہت آرام دہ جگہ ہے اسی وجہ سے میں بہت ... گزارتا ہوں اور اسی وجہ سے مجھے انتھول سے ہوتے ہوئے ونٹن برگ پرشیستمر جانے سے باز رکھا گیا اور میں سیدھا ولمن برگ گیا۔ اور پھر وہاں سے پرشیستمر۔ اس سفر کے درمیان میں سنہری ساعتوں میں گھرا رہا ...

اور میں ایک خوش نظر ہوٹل میں اترا۔ پاڈنگنے دیہات کی سیر کرنے کے بعد جو حسین اور خوبصورت خلیج کر ... جھیل کے کنارے واقع ہے قریب پہنچنے میں تازہ دم ہونے کے بجائے میں نے پر تکلف اور مزیدار دو پیالیاں کافی کی پیالیاں خالی کیں۔ اس طرح توانا ہو کر میں نے سیلک کا خرالیس کے کنارے جاری رکھا۔ اور ونشبرگ پہنچ گیا۔

میں یہاں کی خوبصورتی کے متعلق کچھ نہ کہونگا۔ یہاں کے مناظر اتنے حسین نہیں تھے جتنا کہ میں نے خیال کیا تھا اگرچہ مدرسے پہاڑی مناظر سے زیادہ جاذب نظر ضرور تھے۔ جیمس کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر میں کامل طور پر اطراف کے ماحول میں ڈوب گیا۔ میں اس حالت میں تھوڑی ہی دیر رہا ہونگا کہ میں نے کچھ دور چند آدمیوں کے بولنے کی آواز سنی اور ان کے چہروں میں تمیز کر سکا جب وہ قریب پہنچے تو میں اس دخل اندازی سے کچھ گھبرا سا گیا اور کھڑا ہو گیا اور پر تشکر کی طرف چل پڑا۔ اس کے بعد میں نے خود کو ایک باپ ایک ماں اور ایک بیٹی کے روبرو کھڑا پایا۔ لڑکی کے خوبصورت چہرہ پر پاکبازانہ معصومیت کھیل رہی تھی اور اس کی نیک سیرت کا پتہ اس کے سادے لباس سے ہوتا تھا پہلے تو میں گھبرا سا گیا۔ اس کے بعد میں نے ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا کیا تم خیال کر سکتے ہو اس لڑکی نے کس مہربانی سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اپنے ضمیر کے خلاف ان کے رخصت ہونے کے بعد دیر تک میں وہاں کھڑا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ جب تک وہ پورے طور پر درختوں کی اوٹ میں نہ چھپ گئے۔ لڑکی نے مڑ کر ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں اس کا پیچھا کرنے پر مجبور ہو گیا تاکہ کم از کم اس کے لباس سے مس ہو کر آنے والی ہوا کا میں بوسہ لے سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ پر ہنس رہے ہوگے۔ تمہاری

یہ ہنسی واقعی درست ہے۔ میں تمہیں حقیقت میں قابل یقین الفاظ سے کہتا ہوں کہ اب تک کسی دوشیزہ کی نظروں نے مجھے اسقدر متاثر نہیں کیا تھا۔ آخر کار گویا میں ایک خواب کی حالت میں پرشیستمر کی طرف روانہ ہوا جہاں دروازے کے سامنے ایک درخت کے نیچے مجھے ایک دستی ملی جس پر اساڈرا لکھا ہوا تھا۔ وہ اسقدر نفیس اور خوبصورت تھی کہ میں نے خیال کیا کہ وہ ضرور کسی حسن کی دیوی کی ملکیت ہوگی۔ جو ایک ... خوشبو میں بسی ہوئی تھی ... یقیناً وہ اسی کی تھی۔ میں نے احتیاط سے اسے اٹھا لیا اور بار بار میرے ہونٹوں نے اس کے پیارے نام کو دہرایا۔

کانوں کو بھلے معلوم ہونے والے ناموں میں ایک حیرت انگیز مسرت پوشیدہ رہتی ہے لیکن ... ریاستل۔ ... یا ... ناموں کی لڑکیاں میرے لئے کوئی مسرت کا پیغام نہیں رکھتیں اگرچہ وہ دنیا بھر کی مسرتوں سے ہمکنار ہیں۔ اساڈرا، اساڈرا کتنی دلفریبی۔ کتنی موسیقی اس حسین نام میں موجود ہے اور خود اس نام کی آواز نظروں کے سامنے ایک مجسم حسن و بہار ہستی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ میں پرشیستمر کے متعلق کیا بیان کروں اور ان اونچی پہاڑیوں نے مجھ پر جو اثرات مرتسم کئے ہیں میں تم سے بیان نہیں کر سکتا اور یہ ... متقابل ہستی اس طرح میرے ہوش و حواس پر قبضہ کر لیا ہے کہ میرا رہنما بیہودہ اطراف کے مناظر اور پہاڑیوں کے متعلق بک بک کرتا رہا۔ جس کا ایک حرف بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں پہاڑ کے اوپر پہنچ گیا جس کے بالکل سامنے خوش منظر خلیج نظر آ رہی تھی۔ لیکن میرا خیال اب تک اپنی نامعلوم ہیروئن کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ہرنٹ کریم کے راستہ میں لوہمن کے قریب ایلس پہنچا۔ جہاں میرے رہنما نے ایک چھوٹی کشتی فراہم کی جس پر ہم چند ورکیوف روانہ ہوئے کشتی کے ہلکے ہلکے ہلکوروں نے میرے سوئے ہوئے احساسات کو بیدار کیا اور میں ایلس کے دلفریب اور حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہوا اور میں نے دیکھا کہ خلیج کا پانی سورج کی رخصتی کرنوں میں چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ جب کہ ہم ٹیک سے گزرتے ہوئے سیکیسن کے پہلے گاؤں میں داخل ہوئے تو میں نے دوبارہ اپنے دوستوں کو دیکھا جو ایک دوسری کشتی میں سوار ہو رہے تھے۔ ان کی طرف نہ دیکھنے کا بہانہ کرتے ہوئے میں نے انہیں اپنے سامنے سے بلا توجہ کئے گزر جانے دیا اور جب ان کی کشتی دور نکل گئی تو کچھ دور رہ کر میں نے اپنی چھوٹی سی کشتی میں ان کا پیچھا کرنا شروع کیا۔ خلیج پر تاریکی چھانے لگی تھی کہ چاند نے اپنی تمام ضیا پاشیوں کے ساتھ طلوع فرما ہو کر اس رومانی فضا کو اور رومانی بنا دیا۔ باد کے ایک جھونکے سے تنکے کی طرح وہ لوگ میرے سامنے پانی پر گویا تیر رہے تھے۔ کبھی کبھی اس کی بات کرنے کی دھیمی مگر شیریں آواز میرے کانوں میں

آجاتی۔ میں نے سنا کہ وہ لوگ اُسے اساڈرا کے نام سے مخاطب کر رہے ہیں یہ سنکر میرے دل میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ جس کا مجھے اس سے قبل کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ صرف ایک جذبہ تھا۔ رقت انگیزی اور دلسوزی نہیں جس پر ہم ہنسا کرتے ہیں بلکہ ایک ... حسن اور ایک کامل شرافت کے لئے یہ ایک جذبۂ پرستش تھا ماحول کے حسین نظاروں نے میرے سلسلۂ بیان کو منقطع کر دیا۔

بہار آفریں چاندنی میں لمبی پہاڑیاں زمانہ قدیم کے دیوؤں کی طرح کھڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ جن کے سائے خلیج کے پانی کو سیاہ کر رہے تھے۔ سوائے چپو کی آواز کے اور آبشار کی نغمہ ریز صدا کے رات کے دلفریب سکوت میں کوئی چیز مخل نہیں ہو رہی تھی۔ دفعتاً میں نے اساڈرا کی آواز سنی ... وہ دلفریب انداز سے گا رہی تھی اور اس قدس فضا میں اپنے جذبات کی آمد وار تھی وہ ایک سادہ گیت گا رہی تھی۔ فردوسی طرز میں جو میرے دل کی گہرائیوں میں سما رہا تھا۔ گیت کے آخری حصے میں اسکی آواز پریشان اور نغم آلود معلوم ہو رہی تھی۔ اور ایک دکھ بھری صدا کی طرح میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ آہ کاش میں اس کی آنکھوں میں روحانی جذبات کی لہریں دیکھ سکتا۔

اس کے بعد ہم بہت جلد جنشد پہنچے اور آہ ... کیا تم میری مسرتوں کا اندازہ کر سکتے ہو۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس ہوٹل میں مقیم ہے۔ اس کا کمرہ میرے کمرے کے متصل تھا اس قدر متصل کہ میں اساڈرا کی آواز بلا کسی مزاحمت کے سن سکتا تھا۔ کس قدر دلچسپی کے ساتھ وہ ان مقامات کا ذکر کر رہی تھی جو اُس نے آج دیکھے تھے اور کس لطف سے وہ ان گہرے تاثرات کا حال بیان کر رہی تھی۔ جو ان جاذب نظر مناظر نے اس کے دل و دماغ پر ڈالے تھے۔ اُس دن مجھے یہ خبر ملی کہ اس کے والد نے کشتاں کی سیر کا پروگرام بنایا ہے۔ جس میں ان کے ساتھ مستورات بھی ہونگی۔ اُس وقت میں نے بھی ہوٹل کے مالک سے درخواست کی کہ میرے لئے ایک رہنما کا انتظام کرے تاکہ مجھے دوبارہ ان کے ساتھ ہونے کا قیمتی اور بہار آفریں موقع ملے آخر کار اُن کے کمروں میں خاموشی چھا گئی۔ اس لئے میں تمہیں ایک طویل خط لکھنے بیٹھ گیا۔

ولمر مجھے اس کے لئے برا بھلا نہ کہنا میں جانتا ہوں تم مجھے ضرور مجرم ٹھہراؤ گے۔

اگرچہ میں نے اپنی منسوبہ کو کبھی نہیں دیکھا لیکن پھر بھی میں خود کو ان حالات میں مجرم ٹھہرا رہا ہوں۔ میں نے اس بات پر اچھی طرح غور کیا کہ مجھ میں کتنا بڑا تغیر ہو گیا ہے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میرے طور طریق بہت حد تک بدل گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا بھی احساس ہوا۔ کہ یہ ایک وقتی جذبہ نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے میرے دل نے اسقدر جلد میرے دماغ پر قبضہ کر لیا ہے اور اب تک ایک ناممکن امر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ایک دوشیزہ کی نگاہ نیم باز سے

میری گذشتہ سکون پرور زندگی کو اس درجہ پریشان اور حیران کیا ہے۔ جواب اعتبار کی حدوں سے بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ بگریں غفلت اور نادانی میں آگ سے کھیل رہا ہوں۔ ولمر میں اب تک ناسمجھ بچہ کی طرح ہوں۔ تم نے اکثر مجھ سے اس بات کا اعادہ کیا تھا کچھ دیر اور میرے ساتھ صبر سے کام لو میں پہلے سے زیادہ قانع ہو جاؤں گا اور مسرور و شاد۔

## اساڈرا کی طرف سے جوزیفائن کے نام

صرف چند الفاظ پیاری جوزیفائن دن کے ختم ہونے سے پہلے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ آج ہم نے بہت سیر کی اور ہم وقت مصروف رہے اسقدر کہ میں بمشکل اپنے خوابیدہ احساسات پر قابو رکھ سکی۔ کاش میں تم سے آج دن بھر کی کل پرسوز اور دلنواز داستان بیان کر سکتی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تنگ رگ سے جو حسین ترین مناظر نے میرے دل پر کیا نئے اثرات مرتب کئے ہیں۔ میں ایک اعلیٰ سرزمین میں گھری ہوئی ہوں تم سے دور بہت دور نہ صرف تم سے بلکہ اپنی حسین بچپن کی یادوں سے دور۔

خوش منظر پہاڑ کے دامن میں ہم نے ایک خوش وضع جاذب نظر حسین نوجوان کو دیکھا اس نے تعظیم و احترام کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں دیر تک گھیرے رہا جب ہم اس سے رخصت ہو کر آگے بڑھے تو خلیج الپس میں کچھ دور تک وہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔ اور جب میرے والد نے اس سے کا[illegible] کی رہائش کی تو میرے جذبات میں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور اس خیال نے کہ وہ ابھی نوجوان میرا گمنام ہے مجھے بہت کم ہمت اور کمزور کر دیا اور آخر میں میری آنکھوں کا احوال پر فریب فضا کی ہمنوا ہو کر ایک نامعلوم خوف میں ڈوب گئیں۔ آج کے لئے صرف اتنا کافی ہے کل اس سے زیادہ ... ہاں اس اجنبی نوجوان کا گھر ہمارے گھر سے بہت قریب ہے۔

## لچئن فلس کی طرف سے ولمر کے نام

ولمر! ولمر! نئی زندگی کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے وہ پرانی اور منافرت کی ظلمت خواب سے بیدار کر رہی ہے۔ آج تو میرا دل بیٹھا جا رہا ہے دنیا کی سردمہری اور خشک تنہائی کے پیچھے ایک ایسی آواز سنی جاتی ہے۔ جو دل کے پاک جذبات اور احساسات کی فریاد کرتی ہے۔

مجھے سخت حیرت تھی کہ میں کس طرح زندگی کے اس ایک اور مقدس جذبہ سے ناآشنا رہ کر اب تک گزر رہا۔ اگر میں اب تک بھی اپنے والد کے حکم پر عمل کرتا تو کب ممکن ہے کہ میں اپنی آزادی اور اپنے مستقبل کی آرزوؤں کو حاصل کر سکتا۔ لیکن مزید قربانیاں کیوں۔ زیادہ میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھے والد کو صرف اپنی خوشی کا خیال ہے اور میرے فائدہ کے لئے ہی کام کرتے ہیں۔ انتہا ہی مجھے یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ مجھے اپنا ہر معاملہ آپ طے کرنا چاہیے۔ وہ بہت خفا ہو گئے اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے اپنی آئندہ زندگی کی مسرت کے لئے ان کی آرزوئیں پامال کر دیں میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں اپنی منسوبہ سے شادی نہ کروں گا۔ اور نہ کر سکتا ہوں کیونکہ میں اس سے بے وفائی کرنا نہیں چاہتا۔ بغیر اس خیال کے کہ اساڈرا میرے متعلق کیا فیصلہ کرتی ہے۔ میرا دل اس کا ہے اور ہمیشہ اس کا رہے گا۔ لیکن اگر اساڈرا کسی کے لئے ہیں بالکل خالی ہاتھ رہوں گا اور نہ صرف اس کی زندگی تباہ اپنی زندگی بھی تباہ کرونگا میرے لئے یہ قربانی کس قدر ہوگی اگر وہ مجھ سے پرخلوص محبت کرے۔ اور میں اس سے شادی کروں جس میں محبت کا شائبہ تک نہ ہو نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میں خوش نہیں رہ سکتا تو کم از کم انصاف پسند تو رہ سکتا ہوں۔ یقین رکھنے کہ میں کامل طور پر مسرت حاصل کرنے کے ناقابل نہیں ہوں۔ مجھ پر ان فوری تغیرات سے جو میری سرزمین اور غیرذکی تصورات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حیران ہو گیا ہے کہ مجھے اپنے دل پر کامل بھروسہ ہے اور میرا دماغ کبھی اس سے منحرف نہ ہوگا۔ ایک گھنٹہ قبل میں کنٹشال پہنچ گیا اور اندھیرا کافی ہو چکا تھا رہا اور اس رومان پرور فضا میں گم ہو گیا جو ان حسین نظاروں سے پیدا ہو رہی تھی اسی وقت میں نے اساڈرا اور اس کی پارٹی کی وہاں پہنچنے کی آہٹ پائی۔ رات بھر خواب میں اس کی تصویر میرے سامنے رہی اور اس حسن مجسم سے اتنی جلد ملنے کے خیال نے میرے دل میں ایک ایسی پرزور حیرانی پیدا کر دی تھی جسے میں بیان نہیں کر سکتا وہ جلد ہی تنگ راستہ پر چلنے لگی جو سب سے اونچی چوٹی پر پہنچتا ہے۔ اب تم اس کی نغمہ ریز آواز کو سن سکتے ہو۔ جب وہ ان دلکش مناظر کو دیکھ کر حیرانی میں چیخ اٹھتی تو مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کسی نے بربط کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔ اور اس کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر اس کی آواز سننے سے میرے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔

جو نہی اس نے پہاڑی کے تنگ راستہ پر اس کی آواز سنی جو اپنے والد کو اوپر پہنچنے کو کہہ رہی تھی جہاں سے وہ خلیج کا بہترین نظارہ کر سکیں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جب میں نے اس کے سفید اور نازک جسم کو پہاڑی کے اوپر چڑھتے دیکھا تو میں ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ اور اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تنہا اوپر آئی۔ دوسرے اس تنگ راستے سے گزرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ ایک حسین دختر معصومیت سے کھڑی ہو کر ان عجیب نظاروں کو مسرت سے دیکھنے لگی چند لمحوں تک وہ خاموش کھڑی ان کیف آفریں نظاروں میں محو رہی۔ میں اس کے قریب پہنچا اور اپنی زندگی میں ہوائے پیش نظر خیال سے اور کسی بات کا تصور نہ کر سکا۔ میری آواز نے اسے چونکا دیا لیکن مجھے دیکھ کر وہ مجوب ہو گئی پھر وہ بہت جلد اپنی اصلی حالت پر آ گئی اور اس بھولے پن سے اور اس انداز سے ان مناظر کی دلفریبی بیان کرنے لگی کہ جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ مجھ سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ آخرکار اس کے والد نے اسے آواز دی اور میں بھی اس کے ساتھ نیچے اترا اس کے والد نے میرے ساتھ غیر معمولی دوستانہ برتاؤ کیا اور ہم نے اپنی اچانک ملاقات پر بحث کی لیکن میں یہ سب کچھ تمہیں نہیں لکھ سکتا۔ وہ لمحے عجیب تھے جنکی یاد میرے لئے مقدس ترین شے ہے۔ لیکن کاغذ پر انہیں لانا ایک ناممکن ہوگا۔ میں ان کے ساتھ واپس ہوا۔ اور انہی کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس طرح سے نہ صرف مجھے اساڈرا کو جی بھر کر دیکھنے کا بلکہ اپنے ہمراز سکون دل سے جاننے کا بھی موقع مل گیا۔ کتنی عجیب لڑکی ہے کتنی فرشتہ صفت! لیکن مجھے اب تک معلوم نہ ہوا کہ وہ لوگ کون ہیں۔ انہوں نے میرا نام نہ پوچھا۔ اس لئے میں نے بھی ان کا نام پوچھنا خلاف تہذیب سمجھا۔ لیکن میں نے یہ معلوم کر لیا وہ لوگ بھی ڈسلڈن جا رہے ہیں تاکہ وہاں کچھ دن ٹھہریں۔ اساڈرا — حسین آسمانی ہستی — بعض وقت مجھ سے کہتی ہے کہ ہم نے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کو پا لیا۔ اس کی روح پرور نظریں میری نظروں سے اسقدر ہراسانی سے ملیں کہ میں خود کو اس کے قدموں پر گرانے میں کامیاب ہو سکا۔ اساڈرا — اساڈرا —

## اساڈرا کی طرف سے جوزیفائن کے نام

میری پیاری اچھی جوزیفائن! جب میں اپنے پیارے گھر میں تم سے رخصت ہوئی تھی اس وقت میرا خیال تھا کہ میں اپنی تمام مسرتیں اور تمام سکون اور شانتی سے کنارہ کش ہو گئی ہوں۔ یقین رکھو پیاری بہن! تمہاری اساڈرا دکھ اور درد کی دنیا میں گھر گئی ہے اور اب میرے ساتھ کوئی نہیں ہے جس پر میں بھروسہ کر سکوں۔ اگرچہ میں اپنے والد اور اپنی پھوپھی کو بہت چاہتی ہوں۔ لیکن میں ان سے اپنے دل کا تمام حال نہیں کہہ سکتی جیسا کہ میں تمہیں بتا سکتی ہوں۔ کاش تم مجھے مشورہ دینے کے لئے یہاں ہوتیں۔ سنو، پیاری! کنٹشال میں جہاں ہم آج گئے تھے ایک پہاڑی کے تنگ راستہ پر جو سب سے بلند چوٹی پر پہنچتا ہے اور جہاں سے تم خلیج کا منظر اچھی طرح دیکھ سکتی ہو۔ میں اکیلی اس راستہ سے گذری کیونکہ والد اور پھوپھی کو اس خطرناک راستہ سے گذرنے کی ہمت نہ پڑی۔ اوپر پہنچ کر جب کہ میں مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دفعتہً وہی اجنبی جو نہیں برسوں ملا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہوا۔ وہ ہماری اس دفعہ کی اتفاقی ملاقات سے بہت خوش دکھائی دیتا تھا میں شرمسار ہو گئی۔ کیونکہ اس کی صورت رات بھر میری آنکھوں میں رہی اور پہلے پہل تو میں اس کی اچانک آمد پر اسقدر گھبرا گئی۔ بمشکل میں اس کی باتوں کا جواب دے سکی لیکن ہم جلد ہی ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ وہ ایسی خوش گفتاری سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ کہ میں نے اب تک کسی کو ایسی گفتگو کرتے نہیں پایا۔ اس نے وہ باتیں کہیں۔ جن کو آکر میں اپنے تصور میں جگہ دیا کرتی تھی آخرکار میرے والد نے مجھے نیچے بلایا۔ وہ میرے والد اور پھوپھی دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے والد نے اسے اپنے ساتھ واپس ہونے کی دعوت دی اور بہت جلد وہ ہمارا ایک قدیم دوست معلوم ہونے لگا۔ وہ بہت حسین نظر آ رہا تھا — سرو قد اور سیاہ آنکھیں — جن کو دیکھنے کے بعد اپنے چچا کے بیٹے سے شادی کرنے کا خیال مجھے ناامیدی میں گھیرے ہوئے تھا۔ نہیں۔ مجھے اس خوبصورت نوجوان سے دوبارہ ملنا نہ چاہیئے ورنہ مجھ میں جرأت نہ رہے گی کہ میں اپنے والد کے ایما سے اپنا دل کسی اور کے نذر کروں۔ اگر میں تمہارے آغوش میں اس پاک مانوس کمرے میں سکون اور شانتی پا سکوں تو میں ان حسین دنوں کی یاد میں زندہ رہ سکوں گی۔ اگر میں آئندہ مسرت اور انبساط حاصل نہ کر سکوں۔ تو کاش سکون اور اطمینان ہی میسر آ جائے۔

نامراد اساڈرا۔

## لچئن فلس کی طرف سے ولمر کے نام

میرے قدیم عزیز دوست! اگر میں اس وقت تم سے نہ مل سکتا تو میری مسرتوں کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا۔ میں نہیں جانتا کہ اب میں کیا کروں۔ میں اتنی خوشی اور اتنی خوش قسمتی نہیں چاہتا۔ اب آگے پڑھنے سے پہلے اپنی حسین بیوی کو آغوش میں لے کر اس نشاط اور طرب کا خیال کرو۔ اس کے بعد تم اپنے عزیز دوست لچئن فلس کی سرگزشت کیا کہتا ہے۔ یہ اچھی طرح طے ہو گیا تھا کہ آج ہماری قسمت کا تصفیہ کر دیا جائے گا۔ اس لئے آج بہت نڈھال ہو کر میں اساڈرا کو لینے گیا تاکہ کچھ دیر ہم تفریح کے لئے باہر جائیں۔

وہ ایک تکلیف دہ اور مصیبت بھری رات تھی جس میں سوائے اس خیال کے مجھے اور کوئی شعر نہیں اور جس میں یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے یہاں سے جلد چل دینا چاہیئے چنانچہ میں نے اپنی تیاری مکمل کر لی تھی میرا خیال تھا کہ [illegible] بالکل آزاد ہو جاؤں گا۔ [illegible] ٹھیک اس وقت میں اپنے والد اور [illegible] ملنے کی امید کر رہا تھا۔ ہم نے [illegible] سے ختم کیا لیکن اب تک مجھے اساڈرا [illegible] اپنا اپنی الفت ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آخر میں نے تھوڑی دور تفریح کے لئے چلنے کی پیشکش کی تاکہ ہم کنٹشال سے خلیج الپس کا نظارہ کریں۔ اساڈرا اور میں ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔ دوسروں سے بھی ہماری [illegible]

لیکن ان کوششوں میں اُنھیں ایک اجنبی سے باتیں کرنے کے لئے رُک جانا پڑتا۔ مگر ہم دونوں برابر چلتے رہے۔

اساڈرا کی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ میری پریشانیوں سے واقف ہو کر خوش ہو رہی ہے۔

پھر ہم ایک جگہ ٹھہر گئے اور کانپتی ہوئی آواز میں میں نے کہنا شروع کیا "یہ پُربہار اور مسرت بھری ساعتیں تیزی سے ختم ہو رہی ہیں۔ اگر تم کبھی ان کیف انگیز لمحوں کو یاد کرو تو مہربانی کر کے مجھے بھول نہ جانا۔"

"اور تم بھی ہمیشہ مجھے یاد رکھنا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ان دنوں کی یاد میرے دل سے کبھی فراموش نہ ہوگی۔"

شرما کر اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ میں نے خود کو اس کے قدموں پر گرا دیا اور اپنا مقصد دل بیان کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے ہوئے دیکھے اور وہ جانے کے لئے پلٹی تھی کہ میں نے بڑھ کر اسے روک لیا۔ "مجھے معلوم کرنے دو" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میری آئندہ زندگی انہیں لمحوں پر منحصر ہے۔"

کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اشک بہاتے ہوئے اس نے کہا "میرے والد نے میری آئندہ زندگی کے متعلق پہلے ہی تصفیہ کر دیا ہے۔ میں اب کوئی تمہاری بات سننے کی جرأت نہیں کر سکتی"

میں سرد پڑ گیا اور میرے دل کو ایک جانکاہ دھکا پہنچا۔ اپنی حالت کو سنبھالتے ہوئے میں نے التجا کی "تم نے میرے پُر امید مستقبل کو تاریک کر دیا ہے۔ جواب میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ماضی کی رنگین یاد کو تازہ رکھنے کے لئے مجھے کوئی محبت کا تحفہ عنایت کرو۔ احساسات اور جذبات سے لرزتے ہوئے اس نے مجھے اپنی دستی دی جس پر اس کا نام کڑھا ہوا تھا۔ پھر ہم دونوں اشکبار ہو گئے۔

جذبات کی خاموشی میں میرے والد کی آواز سنکر ہم چونکے۔ "پیارے بچو تم آپس میں نہایت کامیابی کے ساتھ مقصد پر پہنچ سکے ہو" انہوں نے پلٹ کر کہا۔ ہم حیران ہو کر ایک دوسرے سے دُور ہٹ گئے۔ "ٹھیک ہے۔ میرے والد نے تمہارا کوئی وجہ نہیں کہ تم اس کے ہاتھ کا بوسہ نہ لو لیکن بچپن میں جنگیز نے دو بوڑھے پیشن فلس نے نہایت عمدگی سے تمہارے لئے یہ انتظام کیا تھا۔" میں نے اپنی باپ والد کی گردن میں حمائل کر دیں اور اساڈرا کے قدموں میں گر پڑا۔ "میرے منگیتر ایڈن فلس" وہ چلائی اور میری آغوش میں آگئی۔

اس طرح ہم نے ایک دوسرے کو پا لیا۔ اور میں دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان ہوں۔ اساڈرا میری ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اگر تم جب چاہو آ سکتے ہو آؤ۔ اور میری کو بھی اپنے ہمراہ لاؤ۔ ہماری شادی کی تقریب میں تمہیں سب انتظام کرنا ہے اپنی سرگرمی کے ساتھ ہماری عشرتوں میں شریک ہو۔ اور اپنی لاتعداد مہربانیوں سے اپنے قدیم دوست پیشن فلس کو خوش کرو اور اس کی زندگی کے سب سے مسرت انگیز لمحوں میں اُسے مبارکباد دو۔ جلد آؤ اور ہمیں اپنی عنایتوں سے سرفراز ہونے دو۔ ساتھ ہی میری امی کی طلبی میں شریک ہے۔

(تھوڈر کوئرنر)

## صہبائے مغرب بقیہ صفحہ ۵۹

## بے لوث محبت

از جناب "شمس" مظفر پوری

سرد ہوائیں پہاڑ کی بلندیوں کو چیرتی ہوئی طوفان برپا کر رہی تھیں — خوفناک جنگل بالکل بھیانک ہو رہا تھا — رات کی اس وحشتناک فضا میں ایک ماں اپنے بچے کے ساتھ جگر کاٹ رہی تھی — وہ اس برف آلود فضا میں افتاں و خیزاں چل رہی تھی — اور اس کا بچہ اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا —

ہوا کی خنکی میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا اور رات رفتہ رفتہ زیادہ تاریک ہو رہی تھی — برف بھی زیادہ مقدار میں گرنی شروع ہو گئی تھی اس کے دست و پا شل ہو چکے تھے اور اس کے جسم کی طاقت قریباً جواب دے چکی تھی

"اے خدا!" وہ غایت مایوسی سے چلا اٹھی "میری جان لینا ہی ہے تو لے لے — مگر میرے لال کی حفاظت کیجیو"

اس نے اپنا لبادہ اُتار لیا — اپنی چھاتی کو طوفان کی ستم ظریفیاں برداشت کرنے کے لئے عریاں کر دیا اور اپنے لختِ جگر کو اس میں لپیٹ لیا۔ یہ سوچکر اس کی روح کو فرحت پہنچی اور وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی کہ اب اس کا جگرپارہ بہرصورت محفوظ تھا۔ اس نے اپنے نورِ نظر کو ایک بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے بہا کر برف آگیں بستر پر دراز ہو گئی — (انگریزی سے)

## تخیلِ رومانی

از جناب قیصر عثمانی!

جب تیری شمع حیات فروزاں تھی
تو رندوں کی دنیا میں
"صبح کا ستارہ" تھی۔
اور اب جبکہ تیرا وجود اس دنیا میں نہیں
تو اس دنیا کے لئے اپنی نئی تابش کے

# بقراط کے عشق میں ایک یونانی دوشیزہ کی خودکشی

"بقراط" وہ مملکتِ حکمت کا تاجدار، ۴۶۰ قبل مسیح میں یونان کے ایک شہر "قو" میں اس عشرت آگیں رات کو پیدا ہوا جبکہ یونانی سرسبز دیوتا کا خاص جشن منا رہے تھے۔ اور یونان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں چراغاں ہو رہا تھا۔ اسوقت کس کو معلوم تھا کہ یہ "ایراقلیدس" کا یہ ننھا سا بچہ تمام دنیا کو اپنے کمالات سے محو حیرت کر دیگا۔ اور آسمانِ علم و حکمت پر اس کا نام رہتی دنیا تک روشن رہے گا۔

اس کی ماں "فرکیتیشا" نے اس کے روشن ماتھے پر تدبر کی چمک دیکھ کر پیشگوئی کی تھی کہ میرا بچہ بڑی زبردست قسمت کا مالک ہوگا۔ "فرکیتیشا" حکیم "ایرقلیس" کے خاندان کی شریف اور بلکہ متین عورت تھی۔ جب اس کے خسر نے اس کی یہ پیشگوئی سُنی تو اس نے بچے کی سیاہ خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک۔۔۔۔ اگو مقدس دیوتاؤں کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا لیکن اس کی آنکھوں میں میں بھی کسی غیر فانی شہرت کی چمک دیکھ رہا ہوں۔"

دادا کے نام پر بچے کا نام "ایفوقراطیس" رکھا گیا۔ (عرب کی طرح یونان میں بھی یہ رسم تھی کہ باپ دادا کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھتے تھے۔ بقراط کا اصلی نام "ایفوقراطیس" تھا جسے اہلِ عرب نے اپنی زبان میں "بقراط" بنا لیا اور پھر اسی نام کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی)

ابھی بقراط آٹھ نو سال کا ہی تھا کہ اس کے باپ "ایراقلیدس" نے اُسے اپنا خاندانی فن یعنی فنِ طب سکھانا شروع کیا کیونکہ کئی سو سال پیشتر ان کے آباؤ اجداد اسی فن میں اپنی زندگیاں گزار گئے تھے۔ چنانچہ بقراط کے دادا نے بھی اُسے وہ سبق دینا شروع کیا جو بڑوں نے اس کے قلب پر نقش کر دیا ہوا تھا۔

بارہ برس کی عمر میں بقراط ایک خوبصورت اور ذہین بچہ تھا جس کے گھنگھریالے بال سورج کی روشنی میں طلائی کنڈلوں کی مانند چمکتے اور شبِ سیاہ کی طرح تاریک آنکھوں میں جو مشرقی لوگوں کی خوش قسمتی کی دلیل ہیں۔ ذہانت کی روشنی دکھائی دیتی تھی سارے لوگ اسے پیار کرتے اور اس کے ہمعمر تو اس کے ساتھ دوستی پیدا کرنے میں روحانی مسرت محسوس کرتے لیکن وہ بہت کم بولتا بلکہ زیادہ تر اپنا وقت تعلیم میں صرف کرتا جس کی وجہ سے "قو" کے باشندوں میں اس کے متعلق بڑی دلچسپ روایتیں مشہور تھیں۔ اور ایک علم نجوم کے ماہر نے جو ایتھنز کے شاہی محل میں تین سال تک اپنی زندگی بسر کر چکا تھا اس کی منور پیشانی سے برستے ہوئے جلال کو دیکھ کر اس کی ماں کی پیشگوئی کی تائید کی تھی کہ:۔۔۔۔

"ایراقلیدس کا فرزند فخرِ وطن ہوگا۔"

سولہ برس کی مختصر تعلیم کے بعد بقراط نے اپنی زندگی کی نئی منزل میں قدم رکھا۔ اس کا باپ اور دادا رخصت ہو چکے تھے۔ جن کی جدائی کا صدمہ اس کے دل پر بہت عرصہ تک نقش رہا اور دراصل ان بزرگوں کی وہ اندوہگین یاد ہی تھی جس نے بقراط کو اپنے فن میں مہارت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی کہ اس سے اس کا اور اس کے آباء کا نام زندہ رہ سکے گا۔

وہ اکثر جنگلوں میں جاتا۔ کئی کئی دن مارا مارا پھرتا۔ جڑی بوٹیاں تلاش کرتا اور انہیں اپنے پاس محفوظ کر لیتا کیونکہ اسے یقین تھا کہ قدرت نے ان میں ہر بیماری کا علاج رکھا ہے۔ لیکن عوام الناس اسکے جاننے پر قادر نہیں۔

اپنے شہر سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ایک جنگل میں وہ اکثر گھومتا اس وقت اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ اور وہ اسقدر خوبصورت تھا کہ جب تیز دھوپ میں چمکنے والی جنگل کی سنہری ریت پر چلتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ شاید وہ یونان کا بے وطن کیا ہوا کوئی شہزادہ ہے۔۔۔۔ تنہا۔۔۔۔ تن تنہا وہ گھنٹوں جنگل کے درختوں سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا اور جڑی بوٹیوں کے متعلق پورے انہماک و استغراق سے غور کرتا تھا کہ فلاں بوٹی انسان کی کس بیماری کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

جب قو کے باشندے اسے شہر کے دروازہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتے تو وہ اپنی گردن جھکائے۔ بغیر ان کی طرف آنکھ اٹھائے ہوئے چپ چاپ چلتا اور اسوقت بھی جب لوگ اس سے سوال کرتے کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ اس کا خیال ان بوٹیوں کی طرف ہوتا جو اس کے کندھے پر ایک پوٹلی میں بندھی ہوئی لٹک رہی ہوتیں۔

سب دیکھتے کہ اس کی معنی خیز خاموشیوں میں استقلال اور اعلیٰ حوصلگی کا وہ جذبہ پنہاں ہے جس نے یونان بھر میں اُسے مشہور کر دیا اور دور دور سے مریض اس کے پاس شروع ہو گئے۔ اور بعض تو محض اس سے گفتگو کرنے کیلئے ہی بیماری کا بہانہ کرتے اور اس کی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔

انہی ایام کا ایک دلچسپ واقعہ ہے جبکہ وہ انسانی بیماریوں کی تشخیص میں ہر وقت منہمک رہتا تھا۔ تو شہر "رودس" کی رہنے والی ایک بوڑھی عورت اس کے پاس آئی جس نے بقراط سے استدعا کی کہ اس کی اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی اس وقت سخت بیمار ہے اگر وہ "رودس" میں اس کے ہمراہ چلے تو وہ اس کے عوض میں اُسے وہ قیمتی ہیرا پیش کریگی جو کئی ہزار سال پیشتر سے اس کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے۔

بقراط کو کسی چیز کا لالچ نہ تھا وہ تو خدمتِ خلق کر رہا تھا چنانچہ وہ بوڑھی کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ اور جب رودس میں آ کر اس نے اسکی بیمار لڑکی "ارسانا" کو دیکھا جو بخار کی شدت سے بے ہوش پڑی تھی تو وہ حیران رہ گیا۔ کیونکہ خوبصورت "ارسانا" کے چہرے پر جو یونانی دیویوں کی طرح معصوم اور بے حد حسین تھا۔ آہستہ آہستہ موت کی زردی کھنڈ رہی تھی۔ ارسانا کی ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ دردانگیز آواز میں بولی:۔۔۔

"میری بچی کی زندگی بچا لو اس کے بدلے میں اپنی ہر عزیز ترین چیز قربان کرنے کو تیار ہوں دیکھو اس کے گرد موت منڈلا رہی ہے۔ آہ میری۔۔۔ بچی"

بوڑھی بقراط کے قدموں پر گر پڑی حسین ارسانا لحظہ بلحظہ موت کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ بقراط نے دوائی پلائی۔ وہ تین روز تک وہاں رہا۔ اتنے عرصہ میں ارسانا صحتیاب ہو گئی۔ لیکن کسی کو کیا معلوم کہ اس کے سینے میں بقراط کے عشق کا زہر آلود تیر پیوست ہو چکا تھا اور وہ اس مرض میں مبتلا ہو چکی تھی جس کا علاج خود بقراط بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ارسانا یونان کے اس مشہور خاندان سے تھی جس کے افراد نے ایک سو سال پیشتر باغیوں سے ایک زبردست جنگ لڑ کر قلعۂ رودس کی دلیرانہ محافظت کی تھی۔ اس کے تابناک چہرے پر مقدس دیویوں کا سا دلربایانہ وقار تھا۔ مصری عورتوں کی مانند اس کی موٹی موٹی سیاہ مخمور آنکھوں میں شرابِ کیف و محبت کے جام چھلکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لعل پاش لبوں پر معصوم پریوں کا سا ہوش و حواس گم کر دینے والا تبسم اور سیاہ بھنوؤں کے درمیان باریک شکن روح کو اپنی قید میں جکڑ لینے کے لئے کافی تھے۔ یونان کی تاریخ میں اس خاندان کی بے حد عزت تھی۔ اس کے نوجوانوں نے بہادری اور جرأت کے بڑے بڑے کام کئے تھے۔ اور خطرناک مہموں کو سر انجام دیا تھا۔ شاید اس خاندان کا نام تک مٹ جاتا اگر ایتھنز کی مشہور لڑائی میں ارسانا اور اس کی ماں بچ نہ جاتیں۔ کیونکہ وہاں ایک ایسی خونریز جنگ چھڑ گئی تھی جس میں اس خاندان کے تمام افراد وطن کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

لیکن ارسانا کا ملکوتی حسن بقراط پر کوئی اثر نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اگر میں عشق و محبت کی



(بقراط)

از جناب قمر فاروقی اجنالوی

دنیا میں قدم رکھ دیجئے تو یہ کام بالکل اُدھورا رہ جائیگا - چنانچہ وہ چوتھے دن وہاں سے اپنے شہر میں آگیا - باوجود یکہ ارسانا اُسے روکتی رہی -

ارسانا دن بدن بقراط کے لازوال عشق کے سمندر میں ڈوبتی جاتی - ہوا کے دوش پہ تیرتے ہوئے " نوجوان حکیم " کے الفاظ اُسے ہر وقت سنائی دیتے تھے .......

تم حسن ہو لیکن میں عاشق نہیں ہوں سنو ارسانا! گو شروع شروع میں یہ ایک مقدس جذبہ ہے لیکن اس تقدس کی حدود کے آگے نفس کی آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں جن میں انسان کی خواہشات اعلیٰ ہوئی محبت جل کر راکھ ہو جاتی ہے ——

بقراط کا یہ فلسفہ محبت تھا جس نے ارسانا کو مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا تھا - تاہم وہ خیال کرتی کہ شاید سحر آلود خوابوں کا مظہر میرا شفق زار حسن اس کے خشک دماغ کو محبت کے سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جائے - لہٰذا وہ اس خوبصورت دیوتا کو اپنی طلسم آسا نگاہ دار کے محبت کے جال میں پھانسنے کے لئے شہر قوس کی طرف روانہ ہو گئی - اور اس مرتبہ اسے کامل یقین تھا کہ " کیوپڈ " کے تیر اُسے گھائل کئے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ ارسانا نے اس تزک و احتشام سے اپنے حسن کی نمائش کی تھی کہ غیر ممکن تھا کوئی اس ناگن کی طرف دیکھے اور ڈسا نہ جائے -

شام کے قریب جب دھوئیں کے بادل فضا میں لہرا رہے تھے - اور خوشگوار سمندری ہوائیں چل رہی تھیں وہ بقراط کو اس کے شاداب باغ میں ملی جو بقراط نے اپنی تفریح کیلئے بنایا تھا - اس وقت وہ یونانی حسینہ اپنے مرمریں شانوں پر ریشم کی مانند ملائم بالوں کو لہرا رہی تھی - اور اس کی نیم باز آنکھوں میں محبت کا ایک بیقرار اور مسحور کن جذبہ تھا - بیشک اس خوبصورت حکیم کو جس کی عمر ابھی بائیس سال کی تھی فریب عشق میں پھانس لینے کیلئے کافی تھا - لیکن " کیوپڈ " کے زہر محبت میں بجھے ہوئے تیروں کی انتہا اس " فلسفی جوان " کے سینہ سے ٹکرانے سے قبل ہی کند ہو جاتی تھیں - اور عین اس وقت جب وہ ارسانا کو آخری جواب دینے والا تھا - اس کا نوجوان شاگرد " ذوالیس " اس کے پاس آیا اور ایک قریب المرگ بیمار کے آنے کی اطلاع دی جس نے ارسانا کی امید کو ہنوز قائم رکھا -

لیکن جلد ہی ارسانا کو معلوم ہو گیا کہ بقراط اس کے دام محبت میں نہیں پھنس سکتا - آخر وہ ۴۳۸ قبل مسیح کو ایک افسردہ اور غمیں یاس شکستہ دل کو اپنے گھر واپس آگئی - جہاں اس کی بوڑھی ماں نے اُسے خوش کرنے کے لئے بے حد کوشش کی لیکن اس شہرہ آفاق حکیم کی یاد ایسی نہ تھی جو اتنی جلد دل سے محو کی جا سکتی - چنانچہ ارسانا دن بدن اسی فکر میں کمزور ہونے لگی - اسی سال جبکہ شاہ یونان کی ایک بیرونی حملہ آور سے جنگ چھڑ گئی تھی

ارسانا کی ماں کسی قدرتی تیر کا شکار ہو کر اپنی لڑکی کو تنہا چھوڑ گئی اور آج تک کوئی یونانی یہ نہیں جانتا کہ وہ تیر جس نے بڑھیا کو ہلاک کر دیا کس نے چلایا تھا - تاہم ایک مورخ کا قول ہے کہ وہ تیر ارسانا کی تباہی کی تمہید تھی -

اس کے بعد ارسانا کی وہ اندوہگین اور عبرتناک زندگی شروع ہوتی ہے جس نے متواتر چار سال تک روڈس کے باشندوں میں اس کی محبت کو مشہور کر دیا - اور لوگوں میں عام چرچے ہونے لگے - سب جانتے تھے کہ اس دیوانی لڑکی کی موت کے بعد اس کا خاندان ہمیشہ کے لئے نابود ہو جائیگا - اس آرزو میں کہ اس کی نسل کسی طرح قائم رہ سکے کئی نوجوانوں نے اس سے شادی کی درخواستیں کیں - لیکن اس کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا - چنانچہ اس نے صاف صاف کہدیا کہ " وہ سوائے بقراط کے کسی سے بھی شادی نہیں کریگی - خاندان مٹتا ہے تو مٹ جانے دو "

۴۳۴ قبل مسیح میں اس نے جبکہ وہ عشق بقراط میں گھل گھل کر از حد نحیف و نزار ہو چکی تھی ایک مرتبہ پھر اپنی قسمت آزمائی کیلئے شہر قوس کا سفر کیا لیکن آہ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ بقراط اپنی بیٹی " مالا ارسا " کو گود میں لئے پیار کر رہا تھا - اس وقت وہ منظر اس کیلئے کسقدر امید کش اور مایوس کن تھا - وہ بمشکل لوٹی - آخرکار ۴۳۴ قبل مسیح موسم بہار کے دوسرے مہینے کی ۱۰ تاریخ

کو غروب آفتاب کے وقت اس نے اپنا گلا گھونٹ لیا - اور ابھی رات بقراط کے گھر سے لڑکا پیدا ہونے کی خوشی میں مسرت کی صدائیں گونج رہی تھیں چند گڈریوں نے ارسانا کی لاش کی تجہیز و تکفین کی اور شہر قوس کی تاریخ میں اس کی موت کا حیرت انگیز واقعہ ایسے حسرت خیز الفاظ میں درج ہو گیا جنہیں پڑھ کر آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں -

---

رباعی

آلامِ ہستی سے کدورت کیا ہے

شایانِ ہستی کی ضرورت کیا ہے

ویرانۂ دیدۂ بینا انور

حیران ہے اپنی حقیقت کیا ہے

لطیف انور

# شاعر اور تنگدستی

از جناب محمد طفیل صاحب نیّر بی۔اے بی لٹ امرتسری

> شاعر خواہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے ہمیشہ تنگدست اور مفلوک الحال رہے ہیں۔ فرانس کے ایک شاعر نے کہا اگر میری جائداد سے میرا قرضہ بیباق نہ ہو تو میری لاش فروخت کر کے روپیہ ادا کیا جائے۔ عرب اور انگلستان کے کئی شاعر فاقہ کشی سے جان بحق ہوئے۔ غالب تو غربت سے اس قدر تنگ آ گیا کہ اس نے خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کہا ع
>
> ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
>
> اسی طرح آج کل شاعروں کی آشفتہ حالی اظہر من الشمس ہے۔

مشاہیر عالم کی سوانح حیات لکھنے کے لئے تاریخ کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ایک شاعر کے کوائف حیات اس کا اپنا دیوان ہی ہو سکتا ہے۔ دیوان سے حسب و نسب اور خاندانی حالات کا پتہ تو شاید ہی لگ سکے گا۔ لیکن عادات و خصائل سیرت، طرز بود و باند اور مالی حالت کا اندازہ اس کے اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے اس لئے شاعر کی زندگی کے حالات لکھنے کیلئے زیادہ دقت پیش نہیں آتی مگر اس بیان سے میرا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ میں شعراء کے حالات لکھنا چاہتا ہوں بلکہ میرا مقصد شعراء کی بدقسمتی اور ان کے حادثات پر تبصرہ و تصریح کرنا ہے اور بس!

تاریخ مشاہیر کے متعلق انگلستان کا ایک مصنف کہتا ہے کہ:-

"سوانح عمری چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح شور مچا مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ تم بھی دنیا میں ایسے کام کرو۔ لیکن برخلاف اس کے شعراء اپنے کفن پھاڑ پھاڑ کر اور چیخ چیخ کر پکارتے ہیں کہ آدمی شاعر نہ بنے۔ شاعر کی زندگی دنیا والوں کے لئے درس عبرت ہوتی ہے"

انگلستان کا مشہور بذلہ سنج شاعر گولڈ سمتھ اپنے ایک دوست کو شعرائے مغرب کے متعلق لکھتا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ شاعر کی سیرت ہر ملک میں تقریباً ایک سی ہوتی ہے یعنی حال کو خوشی سے گزارنے کا شائق اور مستقبل سے غافل۔ اس کے اقوال عاقلانہ اور افعال احمقانہ ہوتے ہیں۔ اس کے استقلال کی یہ کیفیت کہ اگر زلزلہ بھی آ جائے تو ٹس سے مس نہیں ہوتا مگر احساس کا یہ عالم کہ اگر چار کی پیالی ٹوٹ جائے تو ساتھ ہی اس کا شیشۂ دل بھی چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی سیرت ہے جو ہر لحاظ سے شاہراہ دولت کی طرف رہنمائی کرنے کے قابل تصور نہیں کی جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر میں آپ کو حال یا ماضی کے شعرائے مغرب کے حالات قلمبند کر کے ارسال کروں تو آپ ضرور یہ خیال کریں گے کہ یہ شخص انسانی بدبختی کی تاریخ مرتب کرنے کی غرض سے مسودہ بہم پہنچا رہا ہے"

ایک معاصر شاعر کے متعلق لکھتا ہے۔

"کسی کام کے بغیر مصروف رہنے کے فن میں مشتاق۔ بیکار مباش کچھ کیا کر کا مصداق۔ شہرت کے اندیشے میں دبلا، بہ حسب الاقتضاء۔ حال فراموش۔ سوگوار ماضی۔ بغیر فیس لئے لیلیٰ و مجنوں کا وکیل۔ دل و دماغ کی بے تعلقی کی دلیل۔ خیالات کے جال میں جذبات کو پکڑنے والا شکاری۔ آنکھ سے محجوب۔ احساس سے عاری۔ کل کائنات کا خواہ مخواہ رازدار۔ کسی بیماری کے بغیر بیمار۔ الغرض ایک خدائی فوجدار۔ غرض ع

آہ اور وہ کمینوں نے رسوا سر بازار کیے"

شعراء فی الحقیقت انسانی بدبختی کے مرقع ہوتے ہیں۔ گولڈ سمتھ تو صرف سیرت کے متعلق لکھتا ہے لیکن میں یہ کہوں گا کہ شاعر کی سیرت کے ساتھ اس کی قسمت بھی ہر ملک میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ روز ازل سے بدقسمتی شاعروں کے حصے میں آ گئی ہے کیونکہ جو بھی شاعر ہوا دنیا اس پر ہمیشہ تنگ رہی اور جو لوگ بدقسمت واقع ہوئے ان کو زمانے کے صدمات و آفات نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی قسمت واژگوں کا گلہ اور اپنی مرثیہ گوئی آپ ہی کرتے رہیں اور شاعر بن جائیں یہ وہ کلیہ ہے جو تاریخ اور شعراء کے تذکروں سے منضبط ہے اور ننانوے فیصدی شاعر بدقسمتی کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں شاعر خواہ شہزادے ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر شاعری انھیں بدقسمت نہ بنا دے تو وہ شاعر ہی نہیں۔ شیلے کی زندگی نہایت تنگدستی اور فلاکت میں بسر ہوئی حالانکہ وہ ایک امیر آدمی "ٹموتھی شیلے" کا بیٹا تھا۔ ظفر دہلوی بادشاہ بھی تھا اور شاعر بھی لیکن استعداد روزگار نے بادشاہی چھین لی اور وہ فقط اقلیم سخن کا بادشاہ رہا۔ جو صدمے اس نے اٹھائے ہیں وہ اہل بصیرت سے پنہاں نہیں۔

شاعر بدقسمت ہیں اور شاعری بدقسمتی کیونکہ شاعری کو عروج ہمیشہ قوم کی پستی کے زمانے میں ہوا۔ شاعر قوم کے انحطاط کی زندہ تصویر ہے۔ کوئی غم ہو یا شادی شاعر کی حسّی رگ پھڑک اٹھتی ہے اور وہ حسب موقع قصیدہ و مرثیہ کہہ دینے کا عادی ہے اور طرّہ یہ کہ اگر خوشی کا موقع ہو تو اپنی بدقسمتی کو بھی بھول جاتا ہے۔ شعرا کی تنگدستی کا تو یہ حال ہے کہ ہمیشہ زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں اور اگر کہیں خدمت کی ضرورت پڑے تو ہدیہ دل و جگر پیش کرتے ہیں۔ ورنہ بقول حافظ ع

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

دوسرے کے ملک و مال کو اپنی ملکیت سمجھ کر بخش دیتے ہیں۔

+ + +

شعرائے مغرب اپنے افلاس کے لئے ویسے ہی قابل ذکر ہیں جیسے اپنی مسلمہ قابلیت کے واسطے۔ ان بیشمار شفاخانوں میں سے جو غربا کے لئے قائم کئے گئے صرف ایک مفلوک الحال مصنفین کے استفادہ کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے بانی پوپ اربن ہشتم نے اس کا نام "مایوس العلاجوں کا مامن" یہ کہتے ہوئے رکھا کہ دوسرے مریضوں کے ساتھ ان مریضوں کی دوا کرنا بھی برابر ہی کا مشکل امر ہے جو اس دھن میں پھر رہے ہوں کہ انھیں کوئی پلائے اور وہ مریض خواہ مفلسی کے مریض ہوں خواہ شاعری کے۔

زمانہ قدیم کے شاعروں میں ہومر پہلا مشہور شاعر تھا۔ وہ اندھا تھا لیکن اس نے اپنی مشہور نظم "الیڈ" میں ایک شہر کے جلنے کا ہولناک نظارہ اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ نیرو شہر روم کو جلا کر اس کی نظم کی مثال پیش نہیں کر سکا۔ ہومر اپنا کلام گلیوں میں گاتا پھرتا تھا لیکن یہ اکثر دیکھا جاتا تھا کہ اس کا منہ بجائے روٹی کے شعروں سے زیادہ پُر رہتا تھا۔

ظریف طبع پلاٹس ہومر کی نسبت خوش قسمت تھا۔ وہ دو کام سرانجام دیتا تھا ایک یہ کہ تفنن طبع کے لئے شعر کہتا تھا دوسرے اپنی روزی کمانے کے لئے چکی پیسا کرتا تھا۔ ٹیرنس ایک غلام تھا اور بوتھیس کا جیل میں انتقال ہوا۔

اطالویوں میں "پالو بورگیس" قریب قریب تیسو جیسا اچھا شاعر تھا۔ وہ انواع و اقسام کی عمدہ دستکاریاں جانتا تھا مگر پھر بھی اس کشمکش میں راہی عدم ہوا کہ اسے کہیں بھی کوئی جگہ نہ ملی۔ تیسو جو ہر دلعزیز شعراء کی جملہ صفات کا مجسمہ تھا اکثر اپنے دوست سے ایک کراؤن قرض لینے پر مجبور ہوا تاکہ وہ ماہ گذشتہ کی خوراک کا بل ادا کرے۔ وہ ہمارے لئے ایک مثنوی چھوڑ گیا ہے جس میں اس نے بلی کو مخاطب کرتے ہوئے یہ درخواست کی ہے کہ وہ اسے لکھنے کے لئے آنکھوں کی روشنی دے کیونکہ وہ اس قدر مفلس ہے کہ ایک شمع بھی نہیں خرید سکتا لیکن غریب بنٹی واگلیو خاص کر ہمارے رحم کا مستحق ہے۔ اس کے لطیفے اطالوی زبان کے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہیں گے۔ اس نے ہر دلعزیزی اور خیرات کے کاموں میں اپنی تمام موروثی جائداد خرچ کر دی اور بڑھاپے میں اس قدر مفلس و نادار ہو گیا کہ اسے اس ہسپتال میں داخل ہونے سے روکا گیا جو اس نے خود تعمیر کرایا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ہسپانیہ میں مشہور سروینٹیز فاقہ کشی سے مرا اور یہ بھی یقینی ہے کہ شہرۂ آفاق کیمو آینز نے اپنے دن ہسپتال میں گزارے۔

اگر ہم فرانس کی طرف رجوع کریں تو ہمیں ملک کی قدر ناشناسی کی زیادہ زبردست مثالیں ملیں گی۔ واگیلاس جو نہایت سلیس لکھنے والا شاعر اور اپنے زمانے کا راست باز انسان تھا "آلو" کے نام سے موسوم تھا کیونکہ وہ قرض خواہوں کے تقاضوں کے ڈر سے دن بھر گھر میں رہنے پر مجبور تھا اور باہر صرف رات کے وقت نکلا کرتا تھا۔ اس کی آخری خواہش قابل ذکر ہے۔ وہ اپنی تمام جائداد قرضے کی نذر کرنے کے بعد مرنے کے وقت حسب ذیل وصیت کرتا ہے۔

"لیکن باوجود میری ساری جائداد فروخت ہو جانے کے بھی اگر بعض رقوم واجب الادا رہیں تو اس صورت میں میری آخری خواہش ہے ..........."

. . . . . . . . . .

. . . . . . . . . .

. . . . . . . . . کہ

میری لاش سرجن کے پاس
معقول معاوضے میں فروخت کر دینی
چاہئے اور اس کی قیمت میرے
قرض خواہوں کو دے دی جائے کیونکہ
میں اگر زندگی میں نہیں تو مر کر ہی
فائدہ مند ہو سکوں"

"کٹسن" اپنے زمانہ کے بڑے عالموں سے تھا لیکن اس کی لیاقت اس کے لئے خوراک پیدا نہ کر سکی۔ وہ لوگوں کی بے رحمی اور ان میں تغیر ہونے کے باعث اپنی بدبختی اور ناشکری کو خدا پر تھوپا کیا۔ وقت نزع جب پادری نے اس کو خدا کے انصاف پر بھروسہ رکھنے اور رحم مانگنے کی تلقین کی تو اس نے جواب دیا۔ "اگر خدا نے مجھے یہاں کوئی انصاف نہیں دکھایا تو کوئی وجہ نہیں کہ میں آئندہ کسی انصاف کی امید رکھوں۔" پادری نے کہا "انصاف کا علق ہونا اس کی حقیقت میں شبہ ڈالنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔ میں تم سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے خدا سے لو جو تمہارا باپ، خالق اور دوست ہے"

مگر اس بدبخت رنجیدہ شاعر نے جواب دیا "نہیں، اتم اس طریق سے تو واقف ہو جس میں اس نے مجھے زندہ رکھا ہے!" اور پھر اس گھاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس پر وہ پڑا تھا اس نے کہا۔ "کیا تم دیکھتے ہو کہ وہ کس حالت میں مجھے مرنے کے لئے چھوڑتا ہے"

لیکن شعرائے انگلستان کے مقابلہ میں دوسرے ملکوں کے شاعروں کے مصائب کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ سپنسر، آوٹ وے۔ بٹلر اور ڈرائیڈن وغیرہ شاعروں کے ناموں کا تذکرہ روزمرہ کی قومی ملامتوں میں کیا جاتا تھا۔ ان میں سے چند تو اتفاقیہ یا مشکوک تنگدستی کی حالت میں رہے اور باقی یقیناً فاقہ کشی سے ہلاک ہوئے۔

ولیم شیکسپیر انگلستان کا وہ مایہ ناز اور بلند پرواز شاعر اور ڈرامہ نویس تھا جس کے کلام کی بلاغت و فصاحت اور انوکھی لفظی ترکیبوں کو قائم رکھنے کے لئے انگریزی لغت میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ وہ ایک غریب آدمی جون شیکسپیر کا بیٹا تھا جس میں اتنی استطاعت بھی نہیں تھی کہ اپنے بیٹے کی تعلیم کو جاری رکھے۔ ولیم ایک دفعہ انتہائی افلاس کی وجہ سے اس قدر مجبور ہوا کہ اس نے سر تھومس کا ہرن چرا لیا جس کے الزام میں ماخوذ ہونے کے خوف سے سٹراٹ فورڈ سے لندن بھاگ کر چلا گیا۔ یہاں تھیٹر کے تماشائیوں کے گھوڑوں کی نگہبانی کیا کرتا تھا۔ اس کی شاعری اس کے لئے سامان خورد و نوش بہم نہ پہنچا سکی۔ اس لئے وہیں ایکٹری کا پیشہ اختیار کیا۔

ولیم بلیک اپنے ہمعصروں سے جداگانہ انداز رکھتا تھا۔ مغرب میں پہلا شاعر ہے جس نے تصوف پر شعر کہے وہ شعر میں ہر دعوے کے ساتھ دلیل پیش کرتا تھا پھر بھی اس کی زندگی اس کے لئے ایک راز ہی رہی اور ناداری کے باعث لوگوں نے اتنا بھی نہ جانا کہ وہ شاعر ہے۔

رابرٹ بلوم فیلڈ ایک کسان کا بیٹا تھا۔ یہ فطری مناظر کا شیدائی ورڈزورث سے کسی حیثیت میں کم نہ تھا لیکن باوجود سعی بلیغ کے وہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں مرا۔

لیہ ہنٹ نام و درم کے معاملہ میں تمام عمر اپنے دوستوں کا دست نگر رہا اور جب ایک اخبار کی ایڈیٹری سے پیٹ پالنا شروع کیا تو ازالۂ حیثیت عرفی کے ایک مقدمہ میں جیل کی ہوا کھائی۔

ورڈزورتھ انگریزی زبان کے مشہور شعرا میں سے تھا لیکن ؎

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

کی مثال اس شاعر پر صادق آتی ہے جس نے غریبی سے تنگ آ کر اپنے اصول کو خیرباد کہی اور اپنے سیاسی خیالات یکدم بدل ڈالے۔ براؤننگ کی نظم "کھویا ہوا لیڈر" کا اشارہ الیہ یہی ہے جس کا وہ کہتا ہے۔

"اس نے مٹھی بھر چاندی کے لئے
ہمیں چھوڑ دیا"

ڈاکٹر جانسن انگریزی علم ادب کے ماہرین میں نہایت ممتاز تصور کیا جاتا ہے۔ وہ شاعر نہیں تھا مگر شاعرگر تھا۔ لیکن اس کی حالت ایسی بری تھی کہ ایک جلسے میں جانے کے لئے اس کے پاس نکٹائی نہیں تھی۔ آخر اس نے کاغذ کی نکٹائی بنا کر گلے میں باندھی اور جلسے سے واپس آ کر پھاڑ کر پھینک دی۔

مشہور ظریف و ضاحک شاعر گولڈ اسمتھ "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کی آڑ لیتا ہوا شعراء کی غریبی پر ایک نہایت پرمغز اور بسیط مضمون لکھتا ہے لیکن وہ مضمون فی الحقیقت اس کی اپنی مالی حالت کا آئینہ دار ہے۔

شیلے ایسا انقلاب پسند شاعر تھا کہ کسی چیز کو اپنی اصلی حالت پر دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی اپنی قسمت نہ بدلی پر نہ بدلی۔ باپ نے گھر سے جواب دے دیا۔ مدت تک آوارہ و پریشان رہا اس نے اپنی عمر کا بہت سا حصہ اپنے ہمعصر لارڈ بائرن کی معیت میں گزارا جو اس کے اخراجات کا ہمیشہ کفیل رہا۔ آخر اٹلی میں جا کر مر گیا۔

جب شاعری انگلینڈ زرتوپ کے لئے ذریعہ معاش نہ بن سکی تو اس نے ایک گرجے کی امامت اختیار کی اور وہیں پیوند خاک ہو گیا۔

جون کیٹس اپنے زمانہ کا اچھا شاعر تھا۔ فطرت کے مناظر کو نہایت دلاویز پیرائے میں نظم کرتا تھا لیکن شومئ قسمت کو کیا کہئے کہ دنیا میں کہیں بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ سخت بیمار ہو کر اپنے ایک دوست کا محتاج ہوا اور اس کے ساتھ نیپلز کی راہ لی۔ روم پہنچ کر مادر زمین کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

امریکہ اور انگلستان بلحاظ شاعری اور زبان اصلاً اور نسلاً ایک ہیں امریکہ کی ملکی زبان انگریزی ہے اس لئے وہاں کے لوگ انگلستان کے شعراء کا کلام پڑھتے رہے ہیں۔ وہاں معدودے چند شاعر ہوئے ہیں ان میں والٹ وہٹمین مشہور ہے یہ اپنے زمانہ کی جمہوریت اور بنی نوع انسان کا سچا ہمدرد تھا۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ محض شاعر ہونے کے الزام میں قومی محکمے سے جہاں وہ کلرکی کا کام کرتا تھا نکال دیا گیا۔

---

اگر عرب اور عراق کے شعراء کا حال بیان کیا جائے تو اچھی خاصی مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ یہ تمام ملک جنگجو تھا اس لئے اس کے شاعر بھی سپاہی ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کی شاعری رجز خوانی سے شروع ہوئی۔ یہ سادہ لوح اور بہادر صحیفہ فطرت پڑھ کر شاعر ہوتے تھے اور تلامیذ الرحمٰن کہلاتے تھے مگر نابغہ ذبیانی پہلا شاعر ہے جس نے عرب میں مدح خوانی شروع کی جو وبائی مرض کی طرح اقصائے ملک میں پھیل گئی۔ صوبوں کے فرمانرواؤں نے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور شعراء اچھے خاصے بھانڈ بن گئے۔ قوم کا یہ عضو معطل امراء کے رحم و کرم پر زندہ رہنے لگا۔ یہاں تک کہ شاعری بھلے فن کے ایک پیشہ اور ذریعہ معاش قرار پائی۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ جن لوگوں نے شاعری کو بطور پیشہ اختیار کیا وہ نہایت عسرت اور تنگدستی میں مبتلا رہے اور جنھوں نے اسے بطور شغل و تفریح سمجھا وہ عافیت اور آرام کی زندگی بسر کرتے رہے۔ کہنے والا اس مفہوم کو کس خوبی سے ایک مصرعہ میں کہہ گیا ہے۔ ؏

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

اسحاق موصلی وہ مشہور شخص ہے جس نے موسیقی اور شاعری کو معراج کمال پر پہنچایا۔ اپنے ہمعصروں میں باعتبار شہرت، مقبولیت اور کمالات شاعری و موسیقی سب پر فائز تھا۔ ادب، انساب، روایات، فقہ، نحو اور دیگر علوم میں مجتہدانہ کمال رکھتا تھا لیکن یہ عبرت کا مقام ہے کہ موسیقی کے انتساب نے اسے صرف مغنی کے حقیر نام سے دنیا میں بدنام کیا۔ کیونکہ شاعری پیٹ پر پتھر باندھنے کے لئے مجبور کرتی تھی۔

ابونواس ایک جلیل القدر شاعر تھا۔ نشہ کے عالم میں بھی شعر کہتا تھا۔ مزاج میں مسخراپن بہت تھا اس کی کوئی بات نکتہ سنجی اور ظرافت سے خالی نہیں ہوتی تھی مگر باوجود اس علم و فضل کے اس کا ذریعہ معاش خلفائے عباسیہ کی مدح سرائی اور خاندان برامکہ کی قصیدہ گوئی تھا۔

سلم الخاسر۔ یہ خلیفہ مہدی کا درباری شاعر تھا اور فن شعر میں کامل تھا۔ تحصیل علوم و فنون کے بعد گردش فلک نے جب اسے بہت مجبور کیا تو اس کی حالت یہاں تک تباہ ہوئی کہ اس نے زہد و پارسائی کو چھوڑ کر فسق و فجور اختیار کیا۔ اور مذہب سے اس قدر دور ہو گیا کہ قرآن مجید فروخت کر کے طنبورہ خریدا اور گانے بجانے کا کسب اختیار کیا۔

ابوالتغول حمیری۔ اس باکمال شاعر نے ایک مرتبہ فضل برمکی کی ہجو لکھی۔ لیکن تنگدستی کی وجہ سے پھر دربار میں حاضر ہوا۔ فضل نے پوچھا اب کس منہ سے میرے سامنے آتا ہے؟ حمیری نے جواب دیا اس منہ سے جس کے ساتھ خدا کے سامنے جاتا ہوں۔ حالانکہ جتنا خدا کا گنہگار ہوں اتنا تمہارا نہیں۔ فضل نے اس گدائے متکبر کے حال پر رحم کیا اور کچھ دے کر چلتا کیا۔

علاوہ اسحٰق کل تصبی۔ سیف۔ کلثوم اور رقاشی کے سیکڑوں شعراء کا جمگھٹ امرائے عراق و عرب کے دروازوں پر رہتا تھا۔ یہ سب امراء کی سخاوت اور فیاضی کے طفیل دنیا میں زندہ تھے۔

ایران کی شاعری کی ابتداء قصیدہ گوئی سے ہوئی۔ شعرا ہمیشہ امراء کے انعام و اکرام سے مالا مال ہوتے تھے لیکن وہاں بھی یہ طبقہ حاجتمند رہا۔ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں چار سو شاعر تھے جن میں سے بیشتر ایران سے وارد ہوئے تھے یہ سب اس کے خوان کرم سے خوشہ چینی کرتے تھے اس کی فیاضیاں صرف مدح پسندی کے لئے نہیں تھیں کچھ علم و ادب اور تاریخ کی ترقی کا خیال تھا اور کچھ "غریب پروری" ملحوظ تھی۔

علاوہ ازیں اکبر کے عہد حکومت میں ایران سے کم و بیش ساٹھ شاعر ہندوستان میں آئے جن میں غزالی۔ عرفی۔ نظیری۔ فیضی۔ حکیم سنائی غیرتی۔ قاسم۔ جعفر۔ ظہوری اور صائب وغیرہ مشہور نام ہیں۔ یہ سب قصیدہ گوئی کے صلے پاتے تھے اور جیتے تھے۔

فردوسی جیسا وقائع نگار شاعر ایک عرصے تک بالطبائی کر کے پیٹ پالتا رہا۔ بیچارے نے پندرہ سال خون جگر پیا اور شاہنامہ کی تکمیل کی لیکن کچھ حاصل نہ کر سکا۔ جب محمود غزنوی نے اس کے لئے انعام بھیجا تو لوگ اس کا جنازہ لئے جا رہے تھے۔

انوری ایران میں صنف قصیدہ کا پیغمبر مانا جاتا ہے۔ ہجو میں بھی کمال رکھتا تھا۔ ذرا سی بات پر بگڑ جاتا تھا۔ طبیعت کا وضعی تھا زبان قابو میں نہیں تھی۔ اس وجہ سے جگہ جگہ ذلتیں اٹھاتا تھا۔ مدت العمر تک مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک قصیدے میں کسی امیر کو مدح کے بعد لکھتا ہے۔ "میرے بدن پر مدت کے پھٹے پرانے کپڑے ہیں۔ چادر ابوطالب کی دی ہوئی ہے اور پیراہن ابوالحسن عراقی کا عطا کیا ہوا ہے۔" اس وقت ابوالحسن کو مرے ہوئے پندرہ سال گزر چکے تھے وہ اپنی قسمت پر ہمیشہ نالاں رہا چنانچہ کہتا ہے ؎

ہر بلائے کز آسماں آید
خانۂ انوری تلاش کند

سعدی۔ یہ فرزانۂ روزگار بھی اپنے دیگر ہمعصروں کی طرح بنوائے ؏

سعدی از دستِ خویشتن فریاد

اپنی قسمت کا شاکی رہا۔ وہ شاعر بھی تھا اور سیاح بھی۔ اس سلسلے میں اس کی دعوت شیراز مشہور ہے شاعری میں قصیدے کو ہاتھ تک نہیں لگایا اس لئے بغیر اس صنف کے قدر ناممکن تھی۔ ایک دفعہ پاؤں میں جوتا نہیں تھا دل میں بہت گھبرایا اور تنگدستی کے چند کلمات بھی بیساختہ مُنہ سے نکل گئے۔ نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ مسجد میں گیا تو ایک ایسے شخص پر نگاہ پڑی جس کے پاؤں نہیں تھے وہیں سجدے میں جھک گیا اور مالک کا شکر ادا کیا "مارے بھی پاؤں تو ہیں بلا سے اگر جوتا نہیں نہ ہوا" ۔۔۔ یہی وہ شاعر ہے جس نے عزت نفس کو برباد نہیں کیا۔

عمر خیام کی رباعیاں مشہور ہیں۔ بہت بلند پایہ حکیم اور فلسفی شاعر تھا۔ باپ کے ساتھ خیمہ دوزی کا کام کرتا تھا۔ زمانہ کے ہاتھوں ہمیشہ نالاں رہا۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

گویند مرد را ہنری باید
یا نسبتِ عالی پدری باید
امروز چنان شدہ است در نوبت ما
کینہا ہمہ ہیچ است زری باید

حافظ یکتائے روزگار اور بے بدل شاعر تھا ریاکاری اور اظہار تقدس سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا دولتمند باپ کا بیٹا تھا۔ مگر ترکہ میں کچھ نہ پایا کیوں نہ ہو شاعر ہی تو تھا۔ جب فاقوں پر نوبت آئی تو خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا۔

کمال اصفہانی۔ صاعدیہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا لیکن درباروں میں چنداں قدر نہ ہوئی آخر دل برداشتہ ہو کر گوشہ نشین ہو گیا مگر ایک ترک کے ہاتھوں قتل ہوا۔

فغانی شیراز کا رہنے والا تھا اسے تمام اہل سخن مجدد سخن مانتے تھے۔ پہلے چاقو بنایا کرتا تھا۔ لاابالی اور رند مشرب تھا۔ جگہ جگہ پھرا کرتا تھا آخر بیورد کے حاکم نے شراب اور گوشت روزینہ مقرر کر دیا اسی پر اوقات بسر کی۔

عرفی نہایت مغرور شاعر تھا۔ امیر اور امیر زادہ تھا لیکن چونکہ شاعر تھا غریبی کا جھونکا اس پر سے بھی گزر گیا۔ جب ایران سے ہندوستان آیا تو راستہ ہی میں ڈاکہ پڑا اور سب کچھ لُٹ گیا۔ آخر جھکنا پڑا اور حکیم ابوالفتح کا مدحیہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔

نظیری شاعر بھی تھا اور زرگر بھی۔ پہلے خانخاناں کے دربار میں رہا پھر مراد سے تعارف پیدا کیا۔ جب اکبر نے وفات پائی تو جہانگیر نے دربار میں بلایا۔ اس نے متواتر تین مہینے خاک چھانی اور شاہی فرمان کو قرآن سے تشبیہ دی۔

طالب وہ باکمال شاعر تھا جس نے ۲۰ سال کی عمر میں ملک الشعرائی کا خطاب حاصل کیا نہایت دوست پرور، وفاشعار اور خوش اخلاق تھا مگر زمانہ کی ضرورتوں نے اس سے در در کی خاک چھنوائی یہاں تک کہ تنگ آ کے لکھا ؎

شب و روز مخنہ و مناطالبا
پئے جیفہ دنیوی در تک است
مگر قول پیغمبرش یاد نیست
کہ دنیاست مردار طالب سگ است

ابن یمین امیر آدمی تھا لیکن خود ہی فقر و قناعت اختیار کی چنانچہ کہتا ہے۔

دو قرص نان اگر از گندم است یا از جو
دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بچار گوشۂ دیوار خود بخاطر جمع
کہ کس نگوید ازینجا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزون تر بنزد ابن یمین
ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

---

ہندوستان کی شاعری اور ایرانی شاعری میں کوئی فرق نہیں اور اگر فرق ہے تو صرف زبان کا اور وہ بھی کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ اردو شاعری فارسی شاعری کی رہین منت ہے اور اسی جہت سے فارسی کے نقش قدم پر چلتی ہے لیکن اس کی ابتدا بجائے قصیدے کے غزل سے ہوئی تاہم قصیدے میں ایرانی شاعری کے پہلو بہ پہلو رہی۔ اور بہت سے شعرا، نوابوں اور امیروں سے تعلق رکھتے تھے۔ قصیدے کہتے تھے انعام پاتے تھے اور اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ہندوستان میں بھی سعدی جیسے عزت نفس کے پاسبان تھے ان کی خودداری اس پر مستزاد تھی۔ تلسی داس نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

نظیر اکبر آبادی جسے اورنگ آباد کے پروفیسر شہاب نے شیکسپیر آف انڈیا کا خطاب دیا ہے آزاد منش شاعر تھا۔ روپیہ پیسے کے متعلق بالکل "درکس" تھا کہتا ہے ؎

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

سودا جیسے اپنی علمی استعداد کے لئے مشہور تھا ویسے ہی اپنی وضعداری کے لئے بھی۔ قصیدہ میں ہندوستان کا انوری تھا اور ہجو میں ید طولیٰ رکھتا تھا جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ بلا بھیجا تو معذرت چاہی مگر جب دہلی سے فرخ آباد ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا تو نواب کی ملازمت اختیار کر لی ایک دن دوران گفتگو میں نواب نے اس کی معذرت کا ذکر کیا تو سودا بھر بگڑا اور نواب کی زندگی میں پھر کبھی دربار میں نہ گیا۔

میر تقی متقدمین میں مسلم الثبوت استاد مانا جاتا ہے اس کی یہ حالت تھی کہ اکثر فاقہ کشی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ اس پر بھی اس نے نواب سعادت علی خاں کا فرستادہ خلعت اور ہزار روپیہ یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ "مسجد میں بھجوا دیجئے یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں۔" گورنر جنرل تک سے ملنا معیوب اور کسر شان سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ جو کوئی مجھ سے ملتا ہے یا تو میرے کلام کے باعث یا مجھے انعام دینے کے لئے۔

جرأت جب لکھنؤ پہنچا تو مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کی۔ ایک تنخواہ کو دیر ہو گئی حسن طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا ؎

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
کہ خدا دیوے نہ جبتک تو سلیماں کب تک

سید انشا نہایت ہی ظریف طبع، شگفتہ مزاج اور فصیح شاعر تھا۔ نواب سعادت علی خاں کا ملازم تھا۔ نواب کا حکم تھا کہ ہمارے سوا کسی اور کے پاس نہ جایا کرو۔ اس قید بے زنجیر اور جوان بیٹے کی اچانک موت نے اس کے حواس مختل کر دیئے۔ یہاں تک کہ ایک دن نواب کو سر راہ بے نقط سنائیں۔

سعادت یار خاں کہ سید کا ایک دوست تھا لکھتا ہے کہ انشا کے لکھنؤ میں وہ رنگ دیکھے ہیں کہ جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار ہو جاتا ہے۔

ایک تو وہ عروج کا زمانہ تھا کہ سید انشا نواب کی موچھ کا بال تھا اور دروازے پر پالکی نالکی، ہاتھی گھوڑوں کا شمار نہ ہوتا تھا۔

دوسرا وہ وقت تھا کہ انشا خود کہتا ہے کہ ظالم (یعنی نواب) کی قید میں ہوں سوائے دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں۔

تیسرا وہ دور تھا کہ ایک دفعہ لکھنؤ میں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ انشا پھٹے پرانے چیتھڑوں میں آیا چلم پر سلفہ جمایا ایک دو کش لگائے اور قبل مشاعرہ ایک لے میں غزل پڑھ کر چلا گیا۔

چوتھی یہ حالت تھی کہ جب میں (سعادت یار خاں) لکھنؤ گیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ جہاں ہاتھی جھومتے تھے وہاں کتے بھونکتے ہیں دروازے پر پہنچا دستک دی تو اندر سے ایک بڑھیا جو انشا کی بیوی تھی باہر آئی۔ جب میں گھر میں گیا تو انشا کو دیکھا کہ تن برہنہ ہے۔ دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے۔ سامنے راکھ کا ڈھیر اور ایک ٹوٹا ہوا حقہ پاس رکھا ہے۔ یا تو وہ شان و شوکت کے جمگھٹے دیکھے تھے یا یہ حالت دیکھی بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا کیا۔ جب ذرا سنبھلا تو "سید انشا، سید انشا" کہہ کر پکارا۔ سر اٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کیا کروں۔ آنکھ میں آنسو نہیں۔ میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "شکر ہے" اور اسی طرح گھٹنوں پر سر رکھ لیا کہ پھر نہ اٹھایا۔

شیخ مصحفی مطلب کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے قلمبند کرتا ہے۔ اس کا کلام تمام اسقام سے منزہ ہوتا تھا مگر باوجود ان خوبیوں کے اس بزرگوار کی مالی حالت یہ تھی کہ عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے تھے اور دس دس بارہ بارہ آنے دیکر نو نو اور گیارہ گیارہ اشعار کی غزلیں لکھوا کر لے جایا کرتے تھے۔

ایک دن مشاعرے میں جب اسے داد نہ ملی تو اس نے تنگ آ کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا "روئے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہنچی ہے کہ اب کوئی سنتا بھی نہیں ہے۔"

آتش رندانہ طبع اور آزادانہ وضع رکھتا تھا۔ اس کا کلام تمام عیوب و اغلاط سے پاک ہوتا تھا۔ قصیدہ گوئی اور مدح خوانی سے احتراز کرتا تھا۔ ہمیشہ بوریئے پر صبر و قناعت سے لُنگ باندھے بیٹھا رہتا تھا۔ انتقال کے بعد اس کی تکفین و تدفین ایک دوست میر دوست علی خلیق نے کی کیونکہ فقیر کا ترکہ اس کا بھی کفیل نہ ہو سکا۔

غالب۔ ہندوستان کی شاعری کا سہرا مرزا نوشہ غالب کے سر ہے۔ مضمون آفرینی میں اس کا دماغ فلک الافلاک تک پہنچتا تھا۔ مگر قسمت کا یہ بھی دھنی تھا۔ تمام عمر میں شاید ہی کوئی دن فارغ البالی اور خوشحالی سے گذرا ہو۔ کہتا ہے ؎

زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایک دفعہ مرزا کا ایک قرضدار لڑکا پیسہ مانگنے آیا پیسہ پاس نہیں تھا جواب دیا ؎

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

مرزا کی عمر کا آخری حصہ سید انشا کی طرح کٹا۔ چنانچہ ایک دوست کو خط لکھا جس میں اپنی شومئی قسمت کا ذکر کرتے ہوئے متعدد مثالیں دیکر یہ ظاہر کیا ہے کہ میں اس قدر بدقسمت ہوں کہ جو سرکاری عہدہ دار یا والی ریاست مہربان ہوتا ہے یا تو اپنے عہدے سے معزول ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔

پھر ایک دوست کو اپنے گھر کا حال یوں لکھا ہے کہ مکان اس قدر بوسیدہ ہو گیا ہے کہ چھت چھلنی ہو گئی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ یہ شعر شاعر کی زندگی کا مرقع ہے ؎

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

سرور جہان آبادی نہایت اچھا لکھنے والا شاعر تھا زمانہ نے اسے بھی چار چار آنے پر غزلیں فروخت کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔

ناسخ۔ نصیر اور مومن ان حضرات کی زندگی اچھی کٹی۔ شاید تقسیم مقدر کے وقت یہ سب شعراء کے زمرے میں شمار نہیں کئے گئے کیونکہ ناسخ پہلوان تھا۔ نصیر ملا اور مومن حکیم۔ یا ممکن ہے کہ یہ خود ہی الگ تھلگ رہے ہوں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ باقی شاعروں کی بدقسمتی کا حصہ تناسب کے لحاظ سے ان کو نہ پہنچتا۔

شاعری اور غریبی لازم و ملزوم چیزیں ہیں کسی ثبوت کی چنداں ضرورت نہیں۔ متعدد مثالیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہر کلیہ کا مستثنیٰ ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کے کچھ شاعر اس زمانے کے حادثات سے بچ رہے ہوں تو پھر بھی شاعری اور غریبی کے کلیہ کی ہمہ گیری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

باقی بر صفحہ ۸۰

[illegible] کا آئینۂ ذوق

# اشکِ وفا

از حضرت [illegible] صہبائی [illegible]

تمہارے شوق میں جب عالمِ مستی میں گاتا ہوں
جہاں کی رُوح کے خوابیدہ نغموں کو جگاتا ہوں
فضائیں غرق ہو جاتی ہیں رنگ و نور مستی میں
بپا ہوتا ہے رقصِ شادمانی بزمِ ہستی میں

مرا ہر نغمہ گویا اک گلستانِ محبت ہے!

تمہارے ہجر میں جب نالہ و فریاد کرتا ہوں
جہانِ رنگ و بُو کو درد سے آباد کرتا ہوں
گلستانوں پہ چھا جاتی ہے پژمردگی میری
فضاؤں میں سما جاتی ہے گویا بیدلی میری

مری آہوں میں اک دُنیائے درد و یاس حسرت ہے!

ہجومِ غم میں تسکیں جب کبھی آنسو بہاتا ہوں
میں اپنی رُوح کو سرچشمۂ انوار پاتا ہوں
غبارِ رنج و غم قلب و جگر سے دُور ہوتا ہے
مری ہستی کا ہر ذرّہ ریاضِ طور ہوتا ہے

مرے اشکِ وفا میں لذتِ بارانِ رحمت ہے!

# مکتوب الیہ کا پتہ نہیں؟

از جناب ابو محمد امام الدین صاحب رامنگری

قارئین خیام کی دلچسپی کے لئے امریکی افسانے کا ماحصل پیش کیا جارہا ہے، اس کے مصنف کا نام مسٹر کریسمان ٹیلر ہے، اس افسانے پر جس قدر نقد و تبصرہ ہوا ہے بہت کم فسانوں پر ہوا ہوگا، کہتے ہیں کہ امریکہ کے جس پرچے میں یہ فسانہ شائع ہوا تھا اس کی تمام کاپیاں صرف دس روز کے اندر ختم ہو گئیں۔

(۱)

سان فرانسسکو (کیلی فورنیا)

۱۲ر نومبر ۱۹۳۲ء

ڈیئر مارٹن!

تم جرمنی واپس چلے گئے۔ بڑے نصیب ور ہو۔ میں بچپن ہی سے جرمنی سے باہر ہوں لیکن وہاں کے اسکول کی تعلیم کے ایام ہنوز فراموش نہیں ہوئے ہیں۔ وہ مباحثے، وہ گانے، وہ بیباکانہ بحثیں، وہ سپاہیانہ غنڈاپن، غرض اس وقت کی ایک بات بھی بھولتی نہیں۔ اب تو تم جمہوریت پسند جرمنی میں ہو۔

اچھا ہوا کہ تم واپس چلے گئے۔ تم کبھی پورے امریکن تو بنے بھی نہیں۔ اب کاروبار بھی اچھی طرح چل رہا ہے۔ بہت بہتر ہے۔ تمہارے بچوں کی تعلیم بھی آبائی وطن میں ہو جائے گی۔

بہن گریسلی کا خط آیا ہے۔ وہ ویانا میں اپنے نئے ڈرامے کے پارٹ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اس نے تمہارے متعلق بھی دریافت کیا ہے وہ تمہیں بھولی نہیں۔ اس نے تمام پرانے قصے اور قصے فراموش کر دیئے ہیں۔ ابھی میں نے اسے لکھا نہیں ہے کہ تم یورپ پہنچ گئے ہو۔ وہ کسقدر خوش ہوگی۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ تم بھی اس کے قریب آگئے ہو۔ بھابھی ایلسا اور بچوں کو پیار

تمہارا ——

میکس

(۲)

شاس راجینبرگ میونخ (جرمنی)

۱۰ر دسمبر ۱۹۳۲ء

پیارے دوست میکس!

چیک اور حساب ملا شکریہ۔ میرا یہاں کا مکان بہت شاندار ہے۔ امریکہ کی بہ نسبت یہاں اس قدر کم یافت ہوتے ہوئے بھی لوگ مجھے قسمتی خیال کرتے ہیں۔ اب جرمنی بہت مفلس و نادار ہو گیا ہے ہر چیز کی قیمت میں زیادتی ہو گئی ہے۔ ہیڈنبرگ کی حکومت ہونے کے باوجود یہاں امن و سکون نہیں ہے۔

تم نے گریسلی کے بارے میں لکھا ہے مجھے اب بھی اس سے محبت ہے۔ لیکن اس کے باوجود کسب زر کے لئے اس کا اس طرح کام کرنا مجھے پسند نہیں۔ جس وقت ہم دونوں میں جھگڑا ہوا، تم خاموش تھے۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ اس سے دونوں کو کتنا صدمہ ہوا۔ گریسلی کی شادی ہو جانے کے باوجود میرے دل میں اس کیلئے وہی جذبۂ محبت باقی ہے۔ اسے ہم لوگوں سے ملنے کے لئے لکھدو ایلسا خوشدلی اور محبت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کریگی۔

تمہارا ——

مارٹن

(۳)

سان فرانسسکو

۲۱ر جنوری ۱۹۳۳ء

پیارے مارٹن!

میں نے گریسلی کو تمہارا پتہ لکھ دیا ہے۔ جس وقت وہ تم سے ملے گی تم دونوں کو کتنی فرحت و خوشی ہوگی۔ اس مسرت انگیں وقت میں میری روح بھی تم دونوں کے پاس ہوگی۔

اچھا، یہ ایڈولف ہٹلر کون ہے؟ آجکل اس کا بہت تذکرہ ہے۔ میں اس کے متعلق اخباروں میں جو باتیں پڑھتا ہوں۔ مجھے ان سے تو وہ اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔

تمہارا ——

میکس

(۴)

میونخ

۲۵ر مارچ ۱۹۳۳ء

پیارے میکس!

تم نے جرمنی کے نئے حالات پڑھے ہونگے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف اسباب و وجوہ کی بنا پر موجودہ جرمنی کو ہٹلر کی شدید ضرورت ہے۔ تاہم مجھے کبھی کبھی اس کی جانب سے شک ہو جاتا ہے۔ اس شخص نے بجلی کی طرح جرمنی کو بیدار کر دیا ہے۔ اس کے بھوری قمیص والے سپاہیوں نے ایک طرح یہودیوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا ہے۔ لیکن یہ چنداں اہم بات نہیں۔ اس کے علاوہ ایک زبردست تحریک اندر ہی اندر زور پکڑ رہی ہے۔ لوگوں میں ایک عجیب جوش و ولولہ پیدا ہو گیا ہے مایوسی و نامیدی کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا۔ ہمیں ایک اولوالعزم قائد مل گیا ہے۔ میں کبھی کبھی اپنے دل سے سوال کرتا ہوں کہ ہاں قائد تو مل گیا ہے لیکن وہ لے کہاں جائے گا؟

میں اپنے شک و شبہ کو علی الاعلان ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میں اس جدید حکومت کے ایک عہدے پر فائز ہو گیا ہوں۔ مجھے تو "جدید جرمنی زندہ باد" کے نعرے لگانے پڑتے ہیں۔ ہم سب خوش و خرم ہیں۔ تم سمندر پار ہو پھر بھی تمہاری یاد بار بار آتی رہتی ہے۔

تمہارا —— مارٹن

(۵)

سان فرانسسکو ۱۸ر مئی ۱۹۳۳ء

ڈیئر مارٹن!

وطن کی خبریں پڑھ پڑھ کر میں متوحش اور پریشان ہو رہا ہوں۔ میں صرف اس توقع کے ساتھ تمہیں خط لکھ رہا ہوں کہ تم سچے حالات و واقعات سے مطلع کروگے، جیسا کہ تم نے یہودیوں کے متعلق لکھا ہے۔ ممکن ہے وہ معمولی باتیں ہوں۔ لیکن کیا اس شیطانی رقص سے انقلاب عمل میں آئے گا۔ اور کیا اس تہذیب و شائستگی کے دور میں بھی ہم یہودیوں کو وہی قدیم قتل و غارت کا زمانہ دیکھنا پڑے گا؟ پیارے دوست! جب تک تم مجھے تمام حالات سچ سچ نہ لکھو گے میری پریشانی اور بے اطمینانی دور نہ ہوگی۔

گریسلی کا ویانا کا کام جون میں ختم ہو جائیگا اسے برلن سے دعوت آئی ہے لیکن میں نے اسے لکھدیا ہے کہ جب تک یہودی ایجی ٹیشن فرو نہ ہو جائے برلن جانے کا ارادہ ملتوی رکھو۔

میں اس تشویشناک خط کے لئے معافی خواہ ہوں لیکن جب تک تم مجھے تسلی نہ دوگے سکون و اطمینان میسر نہ آئے گا۔

تمہارا —— میکس

(۶)

جرمن بینک میونخ ۹ر جولائی ۱۹۳۳ء

پیارے میکس!

میں بینک کے کاغذ پر لکھ رہا ہوں۔ تم سے ایک بات عرض کرنی ہے۔ یہاں خطوط پر سخت سنسر قائم کر دیا گیا ہے۔ اسلئے مجھے یہ بات کہنی پڑ رہی ہے ہم لوگوں کو خط و کتابت بند کر دینی ہوگی۔ اگر ایسی ہی ضرورت پیش آجائے تو بینک کے خطوط کے ساتھ لکھ دیا کرنا۔ مکان کے پتے سے از راہ کرم کبھی خط نہ بھیجنا۔ جرمن کے متعلق تم نے جو حالات سنے ہیں پہلے وہ مجھے بھی ناپسند تھے۔ مگر اب دیکھتا ہوں کہ وہ ایک لازمی ضرورت پر مبنی ہیں۔ یہودی قوم ہمارے ملک کیلئے ایک بدنما داغ ہے۔ میں انفرادی طور پر کسی یہودی سے بغض و عناد نہیں رکھتا ایک تم ہی ہو جو میرے دوست ہو۔ تمہارے یہودی ہونے کے باوجود میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

لیکن یہ یہودی مسئلہ تو ایک معمولی مسئلہ ہے کوئی اس سے بھی اہم انقلاب رونما ہونیوالا ہے ہمارے نئے رہنما کی قیادت میں ایک جدید جرمنی کی تخلیق ہونے والی ہے۔ ہم اپنی شکست کی وجہ سے چودہ سال تک سرنگوں تھے۔ مگر اب ہم آزاد ہیں۔ ہم اپنے چہرے کے بدنما داغوں کو خون کی دھاروں سے دھو ڈالینگے۔ ہم اپنے پاؤں کے سہارے دوسری اقوام کے سامنے سر بلند کرکے کھڑے ہوں گے۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ تم جرمنی کی ان ضرورتوں کو کبھی سمجھ نہیں سکتے۔ بہرحال کروڑوں کی نجات و فلاح کیلئے ہمیں کچھ آدمیوں سے ہاتھ دھونا ہی پڑے گا۔ تم پہلے یہودی ہو اور بعد میں اور کچھ اسلئے تمہیں بے شک یہودیوں کے لئے ہمیشہ رونا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ تم لوگوں کو تو مقابلہ کرنا آتا نہیں صرف رونا آتا ہے۔

افسوس ہے کہ ہم لوگوں کو خط و کتابت بند کر دینی پڑے گی شاید ہم میں پھر کبھی ملاقات ہو۔

تمہارا —— مارٹن

(۷)

سان فرانسسکو ۵ر ستمبر ۱۹۳۳ء

پیارے مارٹن!

ایک ڈرافٹ اور مہینے کا حساب بھیج رہا ہوں۔ خط لکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ گریسلی برلن چلی گئی۔ وہ بہت ہمت ور ہے۔ وہ میرے خوف و ہراس کا مذاق اڑاتی ہے۔ کونک تھیٹر میں ہوگی وہ۔ تم سرکاری افسر ہو۔ تم سے استدعا ہے کہ اس کا خیال رکھنا۔ فورا برلن چلے جانا۔ دیکھنا اس کی جان کے لئے کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔

میں تمہاری تبدیلی پر بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن میری بات پر غور کرو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہودیوں کے خلاف صرف اس لئے کہ وہ یہودی ہیں تم ہتھیار نہ اُٹھاؤ۔ لیکن تم انصاف اور بے انصافی کا فرق سمجھتے ہو۔ اسلئے نہیں سمجھنا چاہئے کہ انصاف کیا ہے؟

گریسیلی کو میں تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ اس لڑکی کو نہیں معلوم کہ اس نے اپنے کو کس خطرے میں ڈالدیا ہے اب میں تمہیں بھی نہ لکھوں گا۔ آداب

تمہارا ——— میکس

## (۸)

سان فرانسسکو ۵ر نومبر ۱۹۳۳ء

مارٹن!

ضرورت نے مجھے پھر تمہیں لکھنے پہ مجبور کردیا ہے میری آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ میں نے گریسیلی کو ایک خط لکھا تھا اس کا جواب تو آیا۔ مگر دوسرا خط بھیجا تھا جو واپس آگیا۔ اس پہ تحریر ہے "مکتوب الیہ کا پتہ نہیں" اُف کتنا خوفناک فقرہ ہے۔ گریسیلی ضرور خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ میں نہیں جانتا کیا پیش آنے والا ہے۔

مارٹن! کیا تم اسے تلاش کروگے؟ مجھے خط نہ لکھنا میرا مقصد محض تمہیں اس امر سے آگاہ کرنا تھا کہ گریسیلی خطرے میں ہوگئی ہے۔ میں اسے تم پہ چھوڑتا ہوں تاکہ میں مجبور رہوں۔ میکس

## (۹)

سان فرانسسکو ۲۳ر نومبر ۱۹۳۳ء

مارٹن!

پاگل ہوکر میں تمہیں پھر خط لکھ رہا ہوں۔ دو مہینے سے گریسیلی کا کوئی خط نہیں آیا اور اب ہولناک افواہیں پھیلنے میں آرہی ہیں۔ برلن میں ایک ہفتہ تک اس نے تھیئٹر میں کام کیا۔ تماشائیوں نے یہودن کہہ کر اس کی ہتک کی۔ اور اس نادان لڑکی نے بھی تماشائیوں سے فخریہ انداز میں کہا کہ "ہاں ہاں میں یہودن ہوں"

کچھ تماشائیوں نے اس کا پیچھا کیا وہ بھاگ کر ایک یہودی خاندان میں پناہ گزیں ہوئی۔ کئی روز کے بعد وہ پیدل ہی ویانا کیلئے روانہ ہوگئی۔ ریل گاڑی سے جانے کی اسے ——— ہمت نہ ہوئی۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ میونخ پہونچکر میں محفوظ ہوجاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ وہ تمہارے پاس پہنچی ہوگی۔ اسلئے کہ وہ ویانا نہیں گئی۔ خدا کرے تم مجھے اس کی عافیت و سلامتی کی اطلاع دے سکو۔

میکس

## (۱۰)

جرمن بنک میونخ۔ ۸ر دسمبر ۱۹۳۳ء

پیارے میکس!

ہٹلر زندہ باد۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں ایک اندوہناک اطلاع دے رہا ہوں۔ تمہاری بہن دنیا میں موجود نہیں ہے۔

وہ واقعی نادان تھی۔ ایک ہفتہ بھی ابھی نہیں ہوا کہ وہ یہاں کئی اسٹارم ٹروپر (طوفانی سپاہی) اسکے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اتفاقاً میں نے دروازہ کھولا پہلے تو میں نے سمجھا کہ کوئی بوڑھی عورت ہے۔ بعد میں میں نے اس کی صورت دیکھی۔ اور اس کے ساتھ ہی اسٹارم ٹروپر سپاہیوں پر نظر پڑی۔ جو پھاٹک تک آگئے تھے۔ کیا میں اسے چھپا سکتا تھا؟ اور ایک یہودن کو پناہ دے کر اپنی جان و مال کو خطرہ میں ڈال سکتا تھا؟ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا "گریسیلی تم مجھے تباہی میں نہ ڈالو۔ واپس چلی جاؤ۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی، پھر کچھ سوچکر بولی۔

"میں تمہیں خطرے میں نہیں ڈالوں گی مارٹن!"

یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑی۔ وہ بہت تھک گئی تھی بھاگ نہ سکی۔ اسٹارم ٹروپروں نے اسے پکڑ لیا۔ میں مجبور تھا۔ میں مکان کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی چیخ بند ہوگئی۔ صبح میں نے اس کی لاش دفن کرنے کیلئے بھجوادی۔ اس نے جرمنی آکر بڑی نادانی کی۔ آہ بیچاری غریب گریسیلی؟

مجھے بہت قلق ہے لیکن تم سوچو کہ میں کس قدر مجبور تھا۔

یہاں ایک جدید جرمنی کی نشوونما ہورہی ہے ہم اپنے قائد کی قیادت میں جلد ہی دنیا کے سامنے ایک نیا منظر پیش کرنے والے ہیں۔ مارٹن

## (۱۱)

بحری تار

میونخ۔ ۲ر جنوری ۱۹۳۴ء

مارٹن!

نمائش کے لئے تمہاری شرح منظور ہے۔ ماسکو روانہ ہونے کی تیاری کرو۔ نئے پتے پر بازار کے مطابق ہدایت دی جارہی ہے۔ آئینسٹین

## (۱۲)

گھر کے پتے پر خط

سان فرانسسکو ۳ر جنوری ۱۹۳۴ء

پیارے مارٹن!

دادی کی سالگرہ کا دن نہ بھولو۔ وہ آٹھ تاریخ کو ۶۴ سال کی ہونگی۔ جرمن پینٹر لیگ کے لئے امریکہ والے ایک ہزار برش دینگے۔ سینڈیل برگ لیگ کے ساتھ تعاون کریگا۔ آئینسٹین

## (۱۳)

سان فرانسسکو۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۳۴ء

بھائی مارٹن!

خوشخبری۔ پلیشیمین نے دس ہزار ڈالر قرض دئے ہیں۔ موقع ہو تو لکھو۔ لوگ سوس نمونے کی چیزیں پسند کرتے ہیں۔ بازار پر نظر رکھو۔ اور یکم مئی سے جورج چلے جاؤ۔ میری خوشگوار آرزوئیں تمہاری جدید کوششوں کے ساتھ ہیں۔ تم کامیاب ہو۔

آئینسٹین

## (۱۴)

میونخ۔ ۱۲ر فروری ۱۹۳۴ء

دوست میکس!

تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ خط میں پوشیدہ طور پر ایک امریکن کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔ میں کس تشویش کی حالت میں عرض کر رہا ہوں۔ تمہارے خط اور تار کیلئے مجھ سے جواب طلب کیا گیا۔ اور پوچھا جا رہا ہے کہ ان کے اشارات کا مطلب کیا ہے؟ تمہاری بے دقوفی کا نتیجہ ہولناک صورت میں ظاہر ہوگا۔ مجھ سے صاف صاف کہدیا گیا ہے کہ میں استعفیٰ داخل کردوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم یہ سب کیوں کرتے ہو۔ مگر تمہیں معلوم نہیں کہ میں دل کا کمزور ہوں۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اپنے لئے نہیں ایلسا اور بچوں کے لئے۔ ذرا غور کرو اگر میں قید کردیا گیا تو ان کی کیا حالت ہوگی؟

تم نہیں جانتے نظربند چھاؤنی کے کیا معنی ہیں میکس! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے خط نہ بھیجو۔ تمہیں خدا کی قسم۔ میں نے تم سے بھائی کی طرح محبت کی ہے۔ کیا تم مجھ پر اتنا بھی احسان نہ کروگے؟ میں تم سے پھر دست بستہ التجا کرتا ہوں کہ ایک خط بھی نہ بھیجنا۔ قبل اس کے کہ میری آزادی سلب کرلی جائے۔ مجھے خط لکھنا بند کردو۔ میں پرانی محبت کا واسطہ دیکر تم سے صرف اتنی التجا کرتا ہوں۔ مارٹن

## (۱۵)

سان فرانسسکو ۳ر مارچ ۱۹۳۴ء

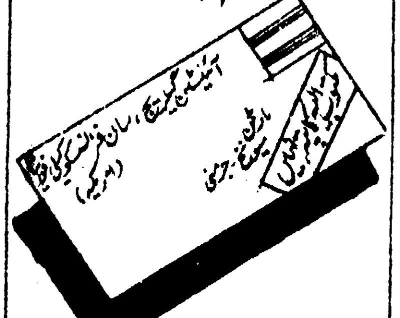
پیارے مارٹن!

اس ماہ کے آخر میں پندرہ ہزار برش برلن پہنچ جانے چاہئیں۔ نمائش کے پہلے اس کے ذریعہ تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ امریکن کامل امداد دینگے۔

البم جمعے کو نئے سامان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ ہیمبرگ اور لیپزگ میں مال دیکر تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ بعد کے کام کو تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اُمید ہے تم کامیاب ہوگے۔

آئینسٹین

## (۱۶)




رباعی

ہستی نہیں الزام سے [illegible] جاتا ہوں
[illegible] سے [illegible] جاتا ہوں
جب [illegible] حسن جاناں کا
[illegible] سے [illegible] جاتا ہوں

لطیف انور

# شاعر اور تنگدستی!

بقیہ صفحہ ۷۷

انیس و دبیر کی مالی حالت گو اچھی ہی کیوں نہ ہو لیکن انھوں نے اپنی جولانیٔ طبع کے لئے معرکۂ کربلا منتخب کیا اور تمام عمر اسی سیاحی میں گزار دی طبیعت میں قدرت نے سوز و گداز ودیعت کیا تھا اور موضوع بھی ان کے حسب حال تھا اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو اور کیا۔

آج کل شعراء کی ضروریات زندگی کا انحصار بڑے لوگوں پر نہیں۔ وہ سوائے پبلک کے دوسرا مربی نہیں رکھتے اور پبلک مجموعی حیثیت سے اچھا اور فیاض سرپرست خیال کی جاتی ہے۔ درحقیقت ہر ایک شخص سے داد کی اُمید رکھنے میں اکثر اوقات غلطی کی جاتی ہے گریہ غلط فہمی زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ اگر ایک تصنیف تھوڑے عرصے کے لئے شہرت پذیر ہو بھی جائے تو حقیقی لیاقت کے فقدان کی وجہ سے بازاری غزلوں کی طرح بہت جلد لوگوں کے ذہن سے اُتر جاتی ہے۔ وقت جو اصلی قابل قدر چیزوں کے لئے کسوٹی ہے بہت جلد صحیح کو پالیگا۔ اس لئے مصنف کو کسی کامیابی کا دعویٰ ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ جب تک اس کی تصانیف کم از کم دس سال کے لئے متواتر نہ پڑھی جائیں۔

موجودہ زمانے میں ایک شاعر یا ادیب جس کی تصانیف واقعی قابل قدر ہوں وہ ان کی قدر و منزلت سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور قوم کا ہر فرد اس کی تصنیف شدہ کتابیں خریدنے سے اس کی محنت کا معاوضہ اور اس کی قابلیت کی داد دیتا ہے اوّل تو کسب معاش شاعری کے علاوہ کچھ اور ہونا چاہئے ورنہ اشاعت ہی کو ذریعہ روزگار قرار دیا جائے جوں جوں کلام کو فروغ ہوگا شاعر کی تصنیفات کی اشاعت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس لئے اپنے گھر میں پڑے رہنے اور قسمت سے شکوہ و شکایت کرنے کا مضحکہ خیز رویہ شاید گذشتہ زمانہ میں پسند کیا جاتا ہو مگر اب اسے کوئی بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا کیونکہ جو لوگ کشمکش حیات میں حصہ لیتے ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی ناکام رہتا ہو۔ آج کل ایک اچھا ادیب یا شاعر نہایت آسانی سے امیر بن سکتا ہے بشرطیکہ اس کا دل صرف دولت کی دھن میں لگا ہو۔ لیکن وہ جو اچھا نہیں لکھ سکتا اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ گمنامی کی حدود سے باہر نہ نکلے۔ ایسا آدمی بدوں کسی مربی کی ناراضی کے اپنے گھر میں فاقہ کشی کر سکتا ہے وہ اپنے معمولی لباس میں ہر ایک سوسائٹی میں جا سکتا ہے اور آزادی کی دولت سے کافی طور پر بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

# مرزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل

لکھنؤ پر جب ادبار کا زمانہ آیا تو وہاں سے صاحب کمال حضرات بھی تلاش معاش میں ادھر ادھر نکلے انہی میں سے ایک شخص [illegible] کرتے تھے اور غالب کے شاگرد تھے [illegible] یہاں آ کے [illegible] صاحب وکیل [illegible] اچھے شعر [illegible] کافی آؤ بھگت کیا کرتے تھے اور یہاں [illegible] ان کی خدمت بھی کیا کرتے [illegible] غزل [illegible] لکھی ہوئی ہے [illegible]
[illegible] سید علی [illegible]

سینے میں سوز ہجراں پہنچا کہاں کہاں تک
جل بھن کے رہ گیا دل نکلا نہیں دھواں تک

تیغ نگہ نے اُن کی گھائل کئے یہاں تک
دیکھیں گلو بریدہ پانی میں مچھلیاں تک

او سنگدل ادھر آ اس وقت پردہ کیسا
پتھرا گئی ہیں اب تو آنکھوں کی پتلیاں تک

ہیں ہند میں سکے ہوں روم و عرب میں سکہ
شہرہ مرے سخن کا پہنچا کہاں کہاں تک

کیا لطف ہے جو باندھے کوئی کسی کا مضموں
اعجاز نظم ہے عیسیٰ ہی کی زباں تک

ساقی کو یاد مطلق ہیں بادہ کش نہ آیا
شیشے نے بزم میں لیں حسرت سے ہچکیاں تک

جل بھن کے نالہ بلبل کرتی جو ہے قفس میں
سیخ کباب کی ہو دیتی ہیں تیلیاں تک

تیغ زباں میں تیزی تیرے اسد ہے ایسی
ہے کند جس کے آگے شمشیر اصفہاں تک

# ہشت بہشت خیام

از حضرت مولانا شفق رضوی عماد پوری

## ۱

ساقیا صبحِ ازل پی کے ترے نام کا جام — چلے تا شامِ ابد دورِ مئے انجام کا جام
بیٹھے ہیں مستِ مئے عشق بادۂ گلفام کا جام — چھلکے لا پیرِ مغاں بس شبِ آشام کا جام
راز محبت ہے سدا رازی کا — ورد کرنے سے کہ ہو حافظ شیرازی کا

## ۲

ساقیا پھول کھلے روشِ گلزاروں میں — جان پڑ جائے نئی عیش کی بہاروں میں
پینے میں یاد لوگ کے گھٹے ہیں کہساروں میں — عمرِ خیام کی بھرپور ہے گلزاروں میں
چاہ دو گل لے ترے بستر پہ صدا آتی ہے — قل قل کی پھر قہقہ مینا سے صدا آتی ہے

## ۳

چمکتی بجلی ہے ستانے کو گھٹا چھائی ہوئی — کالی کلیوں کی لہرتی ہیں پل کھائی ہوئی
کھلکھلاتے ہیں ہو کے ہے گلزار کی ہوئی — جوش پہ چھپے ہے گی تیغ آئی ہوئی
بلبل کی مستی ترے لب میں یا دل ساقی — بھر کے لا تو مئے لب کی تو پل ساقی

## ۴

[illegible] جام ہے سرخوش مجھے — نہ ہو اندیشۂ فردا غمِ دوش مجھے
[illegible] ہوش مجھے — بیخودی ہو یہ خودی ہی فراموش مجھے
نیستی [illegible] ہستی ساقی — حق پرستی ہو مری بادہ پرستی ساقی

## ۵

دیجئے وہ جام کہ ہو جاؤں سراپا مخمور — دیجئے وہ جام کہ شیشۂ تقویٰ کو ہو چور
دیجئے وہ جام کہ ہو پستیٔ اعمال ہو دور — دیجئے وہ جام کہ عصیاں کی ہو ظلمت کافور
ورنہ پیاسا کسی جلد بڑھا پیمانہ — کہیں لبریز نہ ہو جائے مرا پیمانہ

## ۶

دورِ آخر ہے کہاں پھر تری محفل ساقی — کہہ دے اک جام میں طے آخری منزل ساقی
لوں بلائیں تری اے حور شمائل ساقی — عید ہو جائے بڑھا ہاتھ گلے مل ساقی
عیدِ وصل تو دیدار کی دولت ہے بہشت — کہہ گئے رند حیا و یہ نعمت ہے بہشت

## ۷

میرے مشرب میں ہے ہر غم سے فراغت جنت — دین دنیا کے بکھیڑوں سے ہے فرصت جنت
پاکبازوں کے لئے حوروں کی صحبت جنت — باصفا زاہدوں کے لئے مژدۂ رحمت جنت
اجرِ طاعت میں ملے مزدِ عبادت میں ملے — ایسی جنت کسی کی جنت ہے جو اجرت میں ملے

## ۸

شیخ و زاہد کو یہ سودا کہ ملیں حور و قصور — اُن کو طرہ یہ کہ سجدوں کا بھی ہے سر میں غرور
ہم کہ مے نوشوں کا خیال کریں وصفِ قصور — جام ہاتھوں میں لیے ہے شفق نامِ غفور
ناز ہے اُس کا کرم عام ہے شفقت اُسکی — بخشے رحمت نہ بخشے تو عنایت اُسکی

# افاداتِ گرامی

(حضرت مولانا گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غیر مطبوعہ غزل)

من از ذوقِ نظر بیگانہ بودم یا جنوں دارم
کہ ایں برگ و گیاہِ سوختہ را آشیاں گفتم

وفورِ حسن، رعبِ بے نیازی، شانِ رعنائی
مپرس از من کہ حالِ دل در آں مجلس چساں گفتم

نمیدانم چگونہ در دو عالم داستانے شد
ہماں رازے کہ با قلبِ پریشانم نہاں گفتم

مرا بے تابیٔ دل کرد وقفِ بادہ پیمائی
کہ ایں پستیٔ خود را تو حریفِ آسماں گفتم

نہ کس فہمید دردم را نہ کس چارہ ہمی سازد
بہ پیشِ بارگاہِ حسن گرچہ یک جہاں گفتم

تمنایم بحسرت شد مبدل! جانِ محبوبی!
دلے دارم کہ ایں جور و ستم را امتحاں گفتم

گرامی نغمۂ شادی ست یا افسانۂ ماتم
برائے گرمیٔ محفل کسے را داستاں گفتم

# تبرکات

## حضرت خیال مرحوم عظیم آبادی کا غیر مطبوعہ کلام

[illegible] نہیں رہا
وہ اُن کی آنکھ اور وہ میرا دل نہیں رہا

[illegible]
افسوس ہے کہیں تو رہا دل نہیں رہا

[illegible]
وہ ایک دم کے واسطے قاتل نہیں رہا

[illegible]
مجھ سے یہ بخت بد کبھی غافل نہیں رہا

[illegible]
وہ انتشار دوریٔ منزل نہیں رہا

[illegible]
کیا جانئے ہو کوئی مقابل نہیں رہا؟

[illegible]
اب وہ [illegible] کے قابل نہیں رہا

### دیگر

[illegible] سوال کیا
[illegible] پامال کیا

[illegible]
کہتے ہیں [illegible] وصال کیا؟

[illegible] آئینہ دیکھ کر
[illegible] مثال کیا

[illegible] حسن کی دولت لٹا ہے
کچھ کام [illegible] وہ مال کیا

[illegible]
پھر اس کے بعد [illegible] خیال کیا؟

## غزل

عالیجناب نواب [illegible] یار جنگ بہادر اختر [illegible] مدظلہ

[illegible] لطف کا ساماں ہو جائے
دام عنقائے جنوں تار گریباں ہو جائے

عشق ہی کیا ہے [illegible] ہو جائے
درد ہی کیا ہے جو منت کش درماں ہو جائے

[illegible] اس نے
ہر کلی پھول ہو اور پھول گلستاں ہو جائے

[illegible] ایام بہار
اب جنوں معتکف گوشۂ داماں ہو جائے

[illegible] جو دوبارہ نہ مرے
اس پہ جو قتل کرے اور پشیماں ہو جائے

[illegible]
جو نظر میں ہے وہ آنکھوں سے نہاں ہو جائے

[illegible] ممکن لیکن
شرط یہ ہے کہ غبار رہ جاناں ہو جائے

[illegible] ہیں
شرح افسانۂ طول شب ہجراں ہو جائے

اپنی صورت کا [illegible]
میری صورت جو کبھی دیکھ لے حیراں ہو جائے

[illegible] چارہ گری کا شوق ہے
اور اس پر وہی زخم جو خنداں ہو جائے

سر گریباں تصور سے نہ اٹھے اختر
دور جب تک نہ حجاب رخ جاناں ہو جائے

[illegible] کا ایک مزاحیہ

# موٹا پاجی

از جناب ایم آر خاں صاحب یوسفی

میرے اور اس کے درمیان مشکل سے چھ ساتھ گز کا فاصلہ ہوگا۔ وہ میری پیٹھ کے پیچھے ہی بیٹھتا ہے۔ لیکن میں اسے آسانی سے نگاہ پھیر کر دیکھ سکتا ہوں اور اگر اتفاق سے ہماری آنکھیں چار ہو جائیں — اور کمبخت ہو ہی جاتی ہیں — تو مجھے اس کی آنکھوں میں یاس و حسرت بیٹھی جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ مجھے ایک حسرت بھری ملتجیانہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔

ان ملتجیانہ نگاہوں میں دوستی نوازی تک شب کی لہریں بھی اٹھتی رہتی ہیں!

خدا کی مار اس نمک و قسمت پر اگر میں بھانڈا پھوڑنا چاہتا تو اب تک یہ حضرت کبھی کے رسوا ہو چکے ہوتے۔ لیکن بدنامی یہی ہے کہ میرا کہنے کو منہ ہی نہیں پڑتا۔ میں اس راز کو ابھی تک اپنے سینہ کی تنہائیوں میں چھپائے ہوئے ہوں پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیوں مرا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بالکل بے فکر، بے تکلف اور مخلص بالطبع ہو جائے میری یہ خواہش ایسی ہے گویا میں کسی فٹ بال یا غبارہ کو بالکل بے تکلف اور مخلص بالطبع دیکھنے کا متمنی ہوں لیکن — بالفرض میں پول کھول بھی دیتا تو میرا اعتبار کون کرتا!

خدا رحم کرے تجھ پر بدبخت پائی گرانٹ — گوشت پوست، لحم و استخواں کا ایک لحیم شحیم ریت کا تودہ — دس گز لندن کے کلبوں کا منحوس کو — دیو داد تھقہ! ہنسی کا کوں گیا!! خدا جانے کونسی چکی کا آٹا کھاتا ہے۔ پھیلتا ہی چلا جاتا ہے تمام دنیا کا موٹاپا اسی پر ختم ہو گیا ہے۔

وہ آتشدان کے پاس کھڑکی کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھا بیٹھا کچھ ٹھونس رہا ہے کیا ٹھونس رہا ہے؟ میں دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوں اچھا اب سمجھا! وہ ایک گرما گرم مہکتا کیک نکالتا ہے اور کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتا جاتا ہے۔ خدا کی مار ہو کمبخت تجھ پر اجب دیکھو ہاتھی کے سے دیدوں سے مجھے ہی مجھے تکتا رہتا ہے گویا نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے نگل جائیگا ~

نہ چھوڑے گی یہ تیرا مجھے چشم قاتل
یقیں پر یقیں بلکہ عین الیقین ہے

اچھا پائی گرانٹ تو اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی! تم تو میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتے ہو گویا میں آدمی نہ ہوا کوئی مچھر ہوا جسے اپنے معدہ زمم میں ڈالنے کا ارادہ ہے — کوئی مقتبہ چھوٹا یا اشتہا انگیز، تم تو میری طرف ایسی قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے جیسے میں نے تمہارا حلوہ کھا لیا۔ اچھا لیجے مزہ تو مجھ سے کر

کہ تمہیں بھی وہ سب لفظ سناؤں کہ عمر بھر یاد رکھو اور تمہارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دوں۔ مگر کیا کروں تمہاری بدنامی کا خیال آ جاتا ہے۔ خیر مگر خالی تو کیسے جانے دوں گا۔ میں بھی تیرے سامنے ہی تیرا کچا چٹھا لکھتا ہوں تمہاری محسن کش افسانہ ہے جس کی

میری اور پائی گرانٹ کی جان پہچان اسی تنہا کوہ نوشی کے کمرہ میں ہوئی تھی۔ میں حادثاتاً شر میلا واقع ہوا ہوں۔ نیا نیا ممبر تھا لہذا مجھ پر قدرتی طور پر جھینپ سوار تھی۔ وہ اس حجاب کو بھانپ گیا میں اکیلا بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی یہاں کے ممبروں

## جانِ تغزل

از حضرت خیر بہوروی صاحب

غیر ممکن ہے جفا و ظلم کا شکوا کریں
آج دنیائے محبت میں "نئی پوجا" کریں
میرے "احساس نظر" کو وہ تہ و بالا کریں
دل سے کچھ آہیں نکلنے کیلئے بیتاب ہیں
اب تصور میں بھی وہ رہتے ہیں جیسے دور دور
عشق کی بیتاب نظریں آج رکتے کی نہیں
ان کے "حسن بیوفا" کا آئینہ بنجائیں ہم

ہم کو "آئین وفا" کا پاس ہے ہم کیا کریں
اے "خیال حسن" کافر ہم، تجھے سجدا کریں
زندگی میں انقلاب زندگی پیدا کریں
پھر نہ "ضبط عاشقی" کو یہ کہیں رسوا کریں
کیا کریں اے آرزوئے حشر ساماں کیا کریں
حسن کی نیچی نگاہیں" لاکھ اب پردا کریں
اپنے "انداز وفا" میں وہ "ادا" پیدا کریں

آج اے "حسن نظر" اس مہ جبیں کی یاد میں
آنسوؤں سے ہم رواں اک "نور کا دریا" کریں

میں نے مدد کی، جس کے آٹے میں ڈھال بنا رہا۔ اور اے احسان فراموش تو نے مجھے یہ بدلہ دیا کہ میری کلب کی زندگی کو اجیرن کر دیا۔ اٹھنا بیٹھنا دو بھر کر دیا طوطا چشم انسان میں خوب واقف ہوں تیری ان چیلی زدہ بے غیرت آنکھوں سے جو ہر وقت زبان حال سے کہتی رہتی ہیں۔ بشد انشائے راز نہ کرنا تمہیں میرے سر کی قسم میرے راز کو مشت ازبام نہ کرنا اور وہاں! یہ ہر وقت، ہر لمحہ ڈبل کیک کھاتا کیوں رہتا ہے؟ کمبخت پیٹ دوزخ ہوا تنور ہوا جو ہر وقت "ھل من مزید۔ ھل من مزید" کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔

اچھا تو آپ کو ان حضرت کی رام کہانی سنا ہی دوں! — مسٹر نور میلتوں ولد . . . . قوم فرنگی ساکن لندن کہوں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اقرار کرتا ہوں کہ: —

سے پوری واقفیت ہوتی کہ یکایک وہ میری طرف فٹ بال کی طرح لڑھکتا اور حاملہ عورت کی طرح جھومتا جھامتا آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بس توند ہی توند ہے جسم کے دیگر اعضاء اس کے مدور شکم میں مدغم ہو گئے تھے۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا میرے نزدیک ہی ایک کرسی پر اچس دھڑ گرتا۔ سوں سوں کرتا ہوا بیٹھ۔ پھر دیا سلائی سے ایک سگریٹ جلائی اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ صحیح طور پر یاد نہیں کہ کیا کہا کیا نہ کہا۔ سب بھیان سے اتنگیا! البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ اس نے دیا سلائی کے زمانہ کے متعلق بھی کچھ کہا تھا۔ وہ ہر روائے کو جو شامت کا مارا ادھر سے گذرتا روک لیتا اور اپنی گرمی کی سی — موسیقار کی سی — باریک رسیلی آواز میں دیا سلائی کی بابت شکایت کرتا اور پھر چھوڑ دیتا۔ خیر کچھ ہی سہی بہر حال کچھ اسی طرح کے موضوع کو ہم نے پہلے پہل چھیڑ دی تھی۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کیس کود کے متعلق گوہر افشانی شروع کی اور میرا سنگ روپ اور چہرہ مہرہ دیکھ کر کہنے لگا چشم بد دور! آپ تو سچ مچ کرکٹ کے کھلاڑی معلوم ہوتے ہیں۔ میں ایک دبلا پتلا منحنی سا آدمی ہوں اتنا دھان پان کہ بعض تو مجھے مدقوق ہی خیال کرتے ہیں۔ اور میرا رنگ بھی کچھ سانولا سا ہے اور اب آپ سے کیا پردہ ہے — خدا غریق رحمت کرے میری پردادی کو جو ہندوستانی تھیں [illegible] اور من برفتہ انہیں سے وراثت میں ملا ہے وہ میری بزرگ ہیں۔ تو کیا لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ ہر کس و ناکس میری صورت دیکھکر میری پردادی تک کی خبر لے ایسے دور کی کوڑی لانے والوں سے مجھے سخت نفرت ہے یہی وجہ تھی کہ میں شروع سے ہی پائی گرانٹ سے بدک گیا۔

لیکن میرے متعلق گفتگو اس کے "ذاتیات" کی تمہید ہوتی تھی۔

اس نے کہا میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے زیادہ کسرت نونہ کرتے ہونگے اور کسی حالت میں مجھ سے کم کھاتے بھی نہ ہونگے بہت سے موٹے آدمیوں کی طرح اسے اپنی جانب سے یہ حسن ظن پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بہت کم کھاتا ہے — بالکل کم) پھر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کے بعد کہنے لگا "تاہم مجھ میں اور آپ میں زمین و آسمان کا فرق ہے کہاں آپ کہاں میں۔ چہ نسبت خاک را بعالم پاک۔

پھر وہ اپنے موٹاپے ہی موٹاپے، اور افزونی جسم و فراوانی شحم کے متعلق ایک بیحد دماغ پاش گفتگو کر کے میرا مغز چاٹتا رہا۔ شیب کا بند یہی تھا کہ میں نے تمام دنیا کے حکیم بیلنے مہنگے کر دیئے۔ لاکھ جتن کئے بیسیوں ٹونے ٹوٹکے کر ڈالے۔ دنیا بھر کی دوا دارو کر ڈالی الٹے گنڈوں میں روپیہ کھول کر پانی کی طرح بہایا تہ زیادہ میں روپیہ اڑایا۔ لیکن ہنوز روز اول ہے۔ عام طور پر لوگ اسی طرح استدلال کرتے ہیں "اس نے کہا "لاغری کمزوری کا مداوا مقوی و مرغن غذاؤں سے ہو سکتا ہے۔ اور ہاضم اور معدہ کی جملہ بیماریوں کا علاج حکیموں کے گروہ ندھوں سے۔ بڑی روکھی پھیکی اور خشک باتیں تھیں میں نرو ملی مالش کہنے لگا سنتے سنتے کان پک گئے۔ لیکن کبھی کبھی اپنی تعریف سنکر میرا سینہ جذبۂ تفاخر سے پھول جاتا تھا۔

اگر ایک دو دن کی بات ہوتی تو جوں توں کر کے اسے برداشت بھی کر لیتا کبھی کبھار زہر ہلاہل کو بھی امرت کا گھونٹ سمجھکر پی لیا جاتا ہے۔ لیکن وہاں تو ہر روز — ہلا ناغہ — اسی قند مکرر کا مزہ چکھا کرتی

پھپھوند زدہ مریض کا سا چہرہ بنا کر کھٹ پڑتا تھا۔ اس نے مجھے کچھ اس طرح داؤں کا شکار کر رکھا تھا کہ میں ذرا بھی ہل نہیں سکتا تھا۔ تمباکو نوشی کے کمرہ میں گھسا اور وہ سست ذہنی منیجر کے کیبن لڑھکنا لڑھکتا میرے پیچھے آیا۔ اور کنست جیسے کے گرد جو کے گتے کی طرح منڈلانے لگا۔ اگر جبر صبر طرح کرنے کو تیار تھا کہ آتا ہیں بھی کبھی تو اپنی آہنی گرفت کو ڈھیلا کرتے ہی ہونگے۔ مگر یہ میرا پیشہ ـــ میرا ہم زلف بلکہ ہمزاد ـــ اپنی دھن کا پکا میری گردن پہ بیری کی طرح سوار ہوا تھا۔ آدمی کیا تھا بٹا بنایا پلنگ تھا! جیسے پیچھے جان بیلر بھوت لے۔ اس کی ہر ادا اور جنبش سے یہی مترشح تھا کہ اسے کچھ ہو گئی خاص چیز مثلاً جیسی یاقوت کی ہائی بلڈ شان دلیری و دلربائی صحبت کی چھوٹی وارفتگی کا یہ عالم کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اوپر دل و جان سے فدا ہیں۔ ہر وقت پروانہ وار جیسے گرد طواف کرتے رہتے تھے ـــ یعنی عامیانہ زبان میں ـــ میں اُن کے کام کا آدمی تھا۔

اگر کوئی خدا کا بندہ مجھے اس "وظیفہ" سے نجات دلاتا تو منہ مانگے دام دوں اور ہر چہ دصد دسو کر پاؤں پیوں۔ کوئی میرے عشق کا علاج کر دے تو سب کچھ اس کے قدموں پر نچھاور کر دوں اور عمر بھر احسان ڈھیوں۔ نرگس عموماً کہا کرتا تھا برا ہو اس موٹاپے کا! پائی گرافٹ کے لئے تو یہ سوہانِ روح بن گیا تھا۔ اس نے لیک کے لئے پھر تیسری مرتبہ گھنٹی بجائی۔

آخرکار ایک دن حرفِ مطلب زبان پر آ ہی گیا کہنے لگا۔ اپنا مغربی فنِ طب بھی بالکل ناکارہ ہے میں نے سنا ہے کہ ہندوستان میں تو ـــ"

وہ رکا اور مجھے گھورنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کچلی بن کا کوئی ہاتھی دیکھ رہا ہے۔

اُس نے میری دکھتی رگ پکڑ لی۔ مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ ناک بھوں چڑھا کر پوچھا "کیوں جی! میری پردادی کے نسخوں کا تذکرہ تم سے کس پاجی نے کر دیا؟"

"میں تو یونہی کہہ رہا تھا" کلرک نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"یونہی کیسے کہہ رہا تھا؟ میں ضبط کر رہا ہوں جھنک کر رہا ہوں اور تم سر پر ہی چڑھے جا رہے ہو۔ متواتر ایک ہفتہ سے دیکھ رہا ہوں کہ جب میرا ملتا ہوں تم بہر صورت اس راز کی طرف ضرور اشارہ کرتے ہو۔ اور چہرہ کو لٹکاتے ہو۔ یہ لچھن اچھے نہیں ہیں تمہاری حرکتیں، ورنہ تمہی پوری باتیں ایک دن سنگ ناگہانی اور ضرور رنگ لائینگی۔ آخر تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟"

میں نے پھٹکارا۔

"اچھا! اب سمجھ گئے آپ! شکر ہے کہ غصہ تھوک دیجئے" اُس نے کہا "اس کا مجھے اعتراف ہے کہ میں حقیقت میں تمہاری پردادی کے مجربات کی طرف ہی کنایہ کرتا تھا۔ یہ بات سمجھے ـــ"

"پیشین سے معلوم ہوا؟" میں نے مقرر کیا۔

"ہاں! لیکن براہِ راست نہیں" اس نے جواب دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ "بزہ لاستی" کا دم چھلا مجاور ہے۔ میں نے کہا "پہلے تم نے وعدہ کیا تھا کہ نسخہ مجھ سے زبردستی چھین لیا تھا"۔

وہ ہونٹ سکیڑ کر چھینکا۔

"میری پردادی کے نسخے میں اچھا خاصہ چوں چوں کا مربہ ہیں ترکیب استعمال اور پرہیز استعمال وغیرہ کر کے تو یہ بھی بھلا اور اسی وجہ سے والد صاحب مرحوم مجھ سے عہد لینا چاہتے تھے کہ ـــ"

"پھر تم نے نہیں لیا؟" دیانی گھوشے نے سوال کیا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ لیکن انہوں نے مجھے تاکید کے ساتھ متنبہ کر دیا تھا۔ انہوں نے خود بھی ایک نسخہ استعمال کیا تھا۔"

"آہ! لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ ـــ وہ فرض کرو ـــ بالفرض ـــ ایک ـــ" "جی صاحب! کیا پوچھتے ہو۔ بس یہ نسخے بھی آفت کی پڑیا ہیں۔ میں تو ان کے سایہ تک سے بچتا ہوں۔ ان کی تو ہی ـــ نہیں نہیں!"

لیکن اتنا تسلیم کر لینے کے بعد بھلا پائی گرافٹ اپنا شکار چھوڑنے والا تھا کیا! ابھی تو یہ باتیں سے قرائن سے اندازہ لگا لیا کہ اگر اس کے صبر کی تھوڑی بہت آزمائش ہوئی تو مجھے یا تو شفاخانہ کا منہ دیکھنا پڑیگا یا کمر پر پٹی کر کے ہلدی اور گڑ کی پلٹس باندھنا پڑیگی اور میری بساط ہی کیا! ایک دبلا پتلا چھیلی سا آدمی ـــ بالکل مرزا پھویا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا لیکن کمزور کا غصہ خود پر ہی اُترتا ہے۔ نوبت باینجا رسید کہ عاجز آ کر میں نے بھی کہہ ہی دیا "بھئی! جب ایسا ہی شوق چرایا ہے تو پھر دل پکا کر لو اور آزمانے لگے تو تیر بہدف نکلا تو اپنا اور اپنے باپ کا!" پیشین والا نسخہ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں بالکل جداگانہ چیز تھی جس کا تعلق زیرِ بحث نسخہ سے بالکل نہ تھا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح یہ یقین ہو چلا تھا کہ کم از کم یہ نسخہ از حد مجرب اور زود اثر ہے۔ باقی ماندہ کا مجھے علم نہیں کہ کہاں تک کہاں نہیں۔ آیا مجرب بھی تھے یا نہیں!

لیکن بالغرض ـــ نہ ہر نے پائی گرافٹ کا کام تمام کر دیا تو جانتے بوجھتے پائی گرافٹ کو زہر دیتے ہوئے میرا دل دھڑکنے کی پوری "گردان" کرنے لگتا تھا۔

شام کو میں نے اس پُر اسرار صندل کے بکس کو اپنی تجوری میں سے نکالا۔ اور "پارچہ جات" کو اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس شخص نے ان کاغذوں پر یہ مجرب نسخے لکھے تھے پختہ خط نہ تھا۔ خط میں کچھ اور کچا پن پایا جاتا تھا یا شاید وہ مختلف قسم کی کاغذوں پر پختگی کے ساتھ یکساں طور پر نہیں لکھ سکتا تھا۔ سیاہی کا نہایت کفایت شعارانہ استعمال کیا گیا تھا بعض جگہ تو ہاتھ کے لرزہ اور رعشہ نے وہ کمال دکھایا تھا کہ میری سمجھ میں ایک حرف بھی نہیں آیا یعنی شکل تھی کہ گیلا پڑھا جائے نہ آپ سے اور سوکھا پڑھا جائے نہ مجھ! یہ سہی کہ میری پرورش ہندوستانی ماحول میں ہوئی سہی۔ لیکن الفاظ کے پیچ و تاب اور صد گونہ پیچیدگی کے سامنے میرا ہندوستانی زبان کا

سورتی علم ہیچ تھا۔ آخر غیر ملکی زبان کا چھپا منہ کا لفظ تھا ہو نہیں۔ لیکن شکر ہے کہ مطلوبہ نسخہ پڑھنے میں مجھے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نسخہ لے کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بہت دیر تک اس میں غرق رہا۔

"یہ دیکھو! تمہارا مسیحا!" میں نے دوسرے دن پائی گرافٹ کو دیتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے یہ وزن کم کرنے کا نسخہ ہے پائی گرافٹ نے آؤ سرد بھری۔ یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ موٹاپا بھی کم کر دے گا یا نہیں لیکن ہاں میرا خیال ہے کہ یہ ہے وہی مطلوبہ نسخہ۔ مگر بھائی! میرا کہا مانو اور میرے مشورہ پر عمل کرو۔ تو میں تو یہی رائے دوں گا کہ اس نگوڑیا کو ہی گولی مار دو۔ تم پر بھی عجیب سنک سوار ہوئی ہے۔ اسے بھول کر بھی دل میں خیال نہ لا۔ خدا جانے اوشکس کروٹ بیٹھے۔ تمہارے ہی خاطر میرا منہ مفت میں کالا نہ ہو۔ اور پول الگ کھلے۔ بات یہ ہے کہ میرے بزرگوں نے بھی بڑی رنگین اور تیلی طبیعت پائی تھی۔ اسی لئے میری طبیعت کچھ اس طرف نہیں جھکتی۔ کسی کا کیا بھروسہ! ان کا تو مذاق ہو جائے اور یہاں جان پر بن جائے کل کو خدانخواستہ تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو جائے تو ـــ سمجھے!"

"مرد خدا ایک مرتبہ آزمائش تو کرنے دو۔ ایسے بھی کیا بزدل ہو گئے؟" پائی گرافٹ نے اشتیاق سے مجبور ہو کر کہا۔ میں نے کرسی کا سہارا لیا اور خیالات میں غلطاں و پیچاں ہو گیا۔ "خدا کے لئے پائی گرافٹ ذرا یہ تو بتاؤ کہ دبلے ہو کر تم کو کیسے ـــ بالکل چرخ؟" میں نے سوال کیا۔

مگر وہ تو عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھر رہا تھا بھلا کس کی سنتا۔ کانوں میں تیل ڈال رکھا تھا آخر تنگ آ کر میں نے اُس سے وعدہ کرایا کہ آئندہ ـــ خواہ سیاہ ہو یا سپید ـــ دھرے یا جلے میری بلا سے ـــ مگر وہ مجھ سے ہرگز ہرگز اپنے مکروہ موٹاپے کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہیگا۔ پھر میں نے نسخہ اُس کے حوالہ کر دیا۔

"بڑے غلیظ مرکبات ہیں اس نسخہ میں" میں نے ناک چڑھا کر کہا۔

"اوہ! اس کی تو مجھے بالکل پروا نہیں۔ ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم" کہکر نسخہ رکھ لیا۔ اُس نے اپنے گول گول چربی سے ڈھکے پلکوں سے متواتر دیدے اس پر گھمائے اور ایک دم اُچھل کر بولا "مگر ـــ مگر یہ تو ـــ" یہ اسے ابھی ہی معلوم ہوا تھا کہ نسخہ انگریزی زبان میں نہیں ہے۔

"میں اپنے بساط کے موافق ـــ جیسا کچھ مجھ سے بن پڑے گا۔ اس کا ترجمہ کر دو نگا" میں نے اس کا تذبذب دیکھ کر کہا۔

میں نے ترجمہ کر دیا۔ اسکے ایک ہفتہ بعد تک ہم "منہ" سے بالکل نہیں بولے۔ البتہ اس کی چتونیں اپنا کام کر جاتی تھیں۔ تیور کے بل طوارے زیادہ قاتل تھے جب کبھی وہ میرے پاس کھسکتا

کھسکا آتا ہیں پھیرے ہوئے غیر کی طرح بھڑک اُٹھتا۔ اور یہ معاہدہ کا خیال کر کے اپنا سا منہ لے کے چلا جاتا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پندرہ روز تک اس کے وزن میں کمی ہوتا کہ مٹاپے میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ ـــ وزن بڑھتا گیا جب دیکھی آخر مجبور ہو کر ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔

"اب بغیر پوچھے کام چلنا دشوار ہے۔ دیکھو تم نے فوراً ترجمہ میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ کی ہے یا تو تم نے ضرور اس میں تحریف کی ہے۔ تم اپنی پردادی سے ہٹ دھرمی کر رہے ہو ـــ ظلم کر رہے ہو ظلم!"

"لاؤ کہاں ہے وہ نسخہ؟"

بڑی احتیاط سے اُس نے نسخہ اپنی پاکٹ بک سے نکالا۔

نسخہ کے اجزا کو سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا "کیا گندہ تھا؟"

"نہیں تو کیا گندا ہونا چاہئے تھا؟"

"لو اور سنو!" میں نے کہا "واہ بچو! جبھی تم نے خوب نہال کیا۔ ارے یہ تو میری پردادی کا بالا متیاز خصوصیت ہے۔ نسخے کو بھی سوجھتا ہے کہ جب تحفہ میں وزن، مقدار، اور قسم یا نوع مذکور نہیں ہو تو بدترین قسم کی چیز ڈالنی چاہئے۔ مجھے میری پردادی کے نسخے از حد مجرب اور زود اثر ہوتے ہیں۔ ہاں! اور اس میں دو چار اجزا ایسے ہیں جن میں کچھ سقم ہو سکتا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ کیا تم نے سانپ ڈالا تھا جس کے چلنے میں سرسراہٹ کے بجائے کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آتی ہے!"

"ارے یہ لو! کھڑکھڑاہٹ کو تو میں نے کان لگا کر سنا نہیں۔ البتہ جبر آج سے ایک سانپ منگوایا تھا۔ جس کی قیمت ـــ جس کی قیمت ـــ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

خیر یہ تمہارا کام ہے۔ مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔ اور یہ آخری خبر ـــ"

"میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جو ـــ" "یہی کی بیچنے کے بوجھ اور فلک کے دل کے غبار نکالنے ہاں! کیوں وہی نہ وہی ـــ اچھا میں تمام مشکوک اور ذو معنی الفاظ اور مبہم اجزا کی فہرست تیار کر دوں گا کیا کیا جائے اس نسخہ میں املا کی غلطیوں کا خاص طور پر التزام رکھا گیا ہے۔ مثلاً گُفتہ سے مراد معمولی چھکبر کنا ہوا۔"

اس کے ایک صیدہ بعد تک میں پائی گرافٹ کو برابر کلب میں بوریشیں کتا دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی فربہی اور آماس اور فکر و تردد میں ابھی تک اسی جوش و خروش کا مظاہرہ تھا۔ اور اس کی کمر پہ اُسی جوبن پر تھا۔ اُس نے معاہدہ کا حتی الوسع نبھایا لیکن کبھی کبھی دل کا غبار منہ کی راہ نکل پڑتا اور وہ سر ہلا ہلا کر کہتا "ارے یار! تمہاری پردادی" "وہ خبردار جو مجھے متعلق ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔ یاد رکھنا اس قینچی سی چلنے والی زبان ہی کو گدی سے کھینچ لوں گا۔ میں اسے ڈرا دھمکا کر چپ کرا دیتا۔

میں نے سوچا تھا کہ اب تو وہ لُت چلی گئی ہوگی۔ لیکن ایک دن میں نے اُسے اسی گرمجوشی، اسی زندانی ہیجان، اسی چرب زبانی کے ساتھ تیوہنیے ہمسروں سے اپنے "وزن" کے متعلق متفکرانہ انداز میں گفتگو کرتے سُنا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دواؤں سے ابھی تک پیٹ نہیں بھرا ہے۔ کسی نئے نسخہ کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اسی فکر میں گھل گھل کے آدھا ہو رہا ہے۔ میرا تو یہی استدلال تھا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اچانک ـــــ بالکل غیر متوقع طور پہ مجھے اس کا تار ملا:

"مسٹر فوربسیلین" ہوا سے میرے سر پہ آگرنے لگا۔ میں نے تار لے لیا۔ اور کھول کر پڑھنے لگا:

"خدا کے اور اس کے حبیب کے واسطے میری خبر لو ـــــ پائی کرافٹ"۔

"ہوں" میں نے شیطانی تبسم کے بعد کہا۔ یہ نوید جانفزا پڑھ کر میں دل ہی دل میں گھل رہا تھا اپنی پیدائش کی عظمتِ رفتہ اور بربادی قصہ تقدس کو لوٹتا ہوا دیکھ کر میری باچھیں کھل گئیں۔ خوب خوب شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔

ہوٹل کے منتظم سے پائی کرافٹ کا پتہ معلوم کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بلومسبری میں ایک مکان کی بالائی نصف منزل پر عشرت گزیں ہیں۔ سگرٹ کا کون انتظار کرتا۔ میں تو شراب اور قہوہ پیتے ہی چل کھڑا ہوا۔

"مسٹر پائی کرافٹ" میں نے سامنے والے دروازہ پہ منہ لگا کر آواز دی۔ دو دن سے اس نے کمرے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ اس لئے گھر والوں کا خیال تھا کہ وہ علیل ہے۔ انہوں نے مجھے بتلایا تھا اور انتظار کر رہے ہونگے۔ میں نے انہیں مطمئن کیا اور انہوں نے مجھے اوپر بھیج دیا۔ دروازے کے کٹہرے پہ پہونچ کر میں نے گھنٹی بجائی۔

"اس نے یہ دوا کھائی ہی نہیں ہوگی" میں نے اپنے دل میں کہا۔ "او بیٹا! بکری کی طرح کھا گئے تو تو ند بھی منصۂ شہود پہ ضرور جلوہ گر ہوگی۔ اس میں کیا شک ہے"۔

ایک خوش لباس عورت آئی۔ سر پہ ٹوپی بڑی لاپرواہی سے رکھی ہوئی۔ چہرہ پہ فکر کی شکنیں بل کھاتی ہوئیں۔ آتے ہی نظروں ہی نظروں میں میرا جائزہ لینے لگی۔

"افوہ!" میں نے زینہ طے کر کے پائی کرافٹ کی رہائش گاہ پہ پہونچ کر استعجاب سے کہا۔ "انہوں نے آپ کو اندر آنے کی اجازت دیدی تھی" عورت نے راستہ بتائے بغیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "جناب! انہوں نے خود کو مقفل کر رکھا ہے"

"ہائیں! مقفل!"

"جی ہاں! کل صبح سے خود کو بند کر رکھا ہے۔ کسی کو بھی اندر نہیں آنے دیتے۔ وہ دو ملازمتیں بک رہے ہیں کہ ملکانوں کے کپڑے چھوڑ جائیں۔ اے اللہ! اب ہم کیا کریں!"

میں نے دروازہ کی طرف دیکھا اور اس نے آنکھوں کے اشارہ سے اثبات میں جواب دیا۔

"یہیں ہیں؟" میں نے مستفسرانہ انداز سے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟"

اُس نے حسرت آمیز انداز سے اپنا سر ہلایا۔ "کیا بتاؤں صاحب! بس کل سے کھانے ہی کھانے کی رٹ لگ رہی ہے۔ وہ کھانا ـــ کھانا۔ مگر پیٹ نہ ہوا تنور ہوا۔ میاں! آدمی تو بہت دیکھے ہیں مگر ایسا حریص آج تک نہیں گذرا۔ کبھی پلاؤ منگاتے ہیں۔ کبھی قورمہ، کبھی قلیہ، کبھی فیرنی، کبھی زردہ، کبھی متنجن۔ فلنجن! کچھ عجیب سنک سوار ہوئی ہے۔ کل سے گھر میں قیامت بپا کر رکھی ہے۔ زبان کے چٹخارہ نے ہمارا تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ٹہل کرتے کرتے نگوڑے پاؤں بھی ٹوٹ گئے۔ کل سے ناچ نچا رکھا ہے۔ ہر گھڑی لاؤ کھانا لاؤ کھانا! ـــ اچھا ٹھیریئے! مرضی ہو تو باہر رہیئے۔ میں ابھی جا کر دیکھتی ہوں ـــ ابھی صاحب! وہ تو کھا رہے ہیں ـــ کوئی خوفناک چیز"

کمرے کے اندر سے ایک کوئل کی سی آواز آئی "کون! فوربسیلین؟"

"ہاں! پائی کرافٹ!" میں نے کہا اور کواڑ کو دھکا دیا۔

"پہلے اس چھنال سے کہدو کہ چلی جائے"

نادر شاہی حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ دروازہ پہ ایک عجیب و غریب کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص تاریکی میں گنڈی کھولنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ پھر پائی کرافٹ کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

"اماں! کھولو بھی! وہ تو گئی" میں نے بسلسلۂ رفع تشویش کہا۔

لیکن دروازہ بہت دیر تک نہیں کھلا۔ کنجی کے گھومنے کی آواز آئی اور پائی کرافٹ کی لوچدار آواز سنائی دی "اندر آجاؤ نا"۔ میں نے دستہ گھما کر دروازہ کھولا۔ قدرتی طور پہ مجھے امید تھی کہ پائی کرافٹ وہاں ہوگا۔

مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا! مجھے بڑا اچنبھا ہوا بس مبہوت کھڑا رہ گیا۔ تصویر حیرت بنا کمرہ کے بیچ میں کھڑا تھا۔ ملاقاتی کمرہ میں تمام چیزیں بدنظمی سے بکھری پڑی تھیں۔ رکابیاں اور طشتریاں کتابوں سے راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ دیگچیں اور طباق کاغذوں پہ ڈنڈ پیل رہے تھے۔ چھُری کانٹے قلمدان میں پڑے پنجے تیز کر رہے تھے۔ کرسیاں چمگادڑ کی طرح اُلٹی پڑی تھیں۔ سب سہی! مگر پائی کرافٹ کہاں مر گیا؟

"اماں! سب ٹھیک ہے۔ دروازہ بند بھی کر دو!" اس نے کہا اور میں نے اس کا سراغ لگا لیا۔

اخاہ! آپ کمرے میں چھت سے لٹک رہے تھے۔ گویا کسی نے سریش لگا کر چھت سے وصل کر دیا ہو۔ عالم برزخ میں رونق پذیر تھے۔ چہرہ پہ غم و غصہ کی لکیریں قوس قزح کا لطف دے رہی تھیں۔ آگ بگولا ہو رہا تھا۔ فرطِ غضب سے ہانپ ہانپ کر کانپ رہا تھا۔

"دروازہ بند کر دو" اس نے مجھے حکم دیا۔ "اگر اس نقطامہ نے مجھے دیکھا تو..." میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور حفظ ماتقدم کے طور پہ دور سے کھڑے رہ کر ٹکٹکی باندھ کر اس کی ہیئت کو دیکھنے لگا۔

"غضب خدا کا! اماں یہ بھی کچھ حرکت ہے! خدا نخواستہ ـــ اے حضرت! اگر تمہاری گرفت ڈھیلی ہو جائے یا کوئی چیز کھسک جائے تو نانی جی یاد آجائیں۔ پھر تو ٹوٹے ہاڈی پسلی، بچہ کی ٹھیال تک نہ ملیں۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔ موت ہی تو نہیں آتی" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "شرم تو نہیں آتی مگر اس ستم ظریفی پہ! بندۂ خدا! اس بڑھاپے میں یہ لونڈوں کی سی حرکتیں! یہ لسنداں پن! ایسی چھچھوری چھچھی! قبلہ یہ جمناسٹک زکہ بچوں کے لئے ہی بہت خوب ہے۔ کیوں بڑھاپے میں تمہاری عقل سٹھیائی ہے۔ بدتمیز! آخر وہاں کیوں چپکے پڑے ہو۔ ہاتھی کے نیچے نیچے آتے ہو یا لاؤں مولا بخش ـــ" میں نے کہا۔

"اوں ہوں! کیسے آؤں؟" اس نے مغموم ہو کر کہا۔

"میں تمہیں سب باتیں کہونگا" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور طرح طرح کی شکلیں بنانے لگا۔

"واللہ! لنگور بن لنگور! یہ تو فرمائیے آپ وہاں کس طرح ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

لیکن دوسرے لمحہ ہی مجھ پہ یہ آشکارا ہوگیا کہ وہ ساکن و صامت نہیں ہے۔ بلکہ ہوا میں کسی پھکنے یا غبارے کی طرح تیر رہا ہے!

اُس نے چھت سے نیچے آنے کی کوشش کی۔ "یہ اسی بیہودہ نسخہ کی کرامت ہے" اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تمہاری پروا ـــ"

اُس نے ایک تصویر کے چوکھٹے کو لاپرواہی سے پکڑ رکھا تھا۔ لیکن دوران تقریر میں وہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور یہ حضرت پھدک کر رنٹ کی طرح چھت سے جا لگے۔ تصویر ٹوٹ کر چکنا چور ہوگئی اور صوفہ پہ کٹی پتنگ کی طرح گر پڑی۔ اور وہ خود چھت پہ دھپ سے جا لگا۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ اس کے جسم پہ جا بجا قلعی اور سجا کیوں لگ رہے تھے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ نیچے اُترنے کی سعی بلیغ کی اور آتشدان کے ذریعہ سے نازل ہو کر قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا۔

بڑا دلچسپ نظارہ تھا کہ وہ اوپر نیچے تھرک رہا تھا۔ وہ آیا، وہ گیا، وہ اترا، وہ چڑھا۔ نیچے آتا تھا اور پھر گیند سے اوپر چلا جاتا تھا۔ ذرا ڈھیل ملی اور ... ہوتے ہی میں نے کہا "وہ مارا!" کہتے ہی ... آواز نکالی "وہ کاٹا"۔

"یہ نسخہ" مرغ زیرک نے کہا "بہت کامیاب رہا"۔

## آہ و فغاں

جناب منشی ممتاز علی صاحب آہ مرحوم

شاگرد حضرت امیر مینائی رح

کچھ خضر ہی نہیں رہِ الفت میں تھک گیا | سایہ بھی شب کو آنکھ بچا کر کھسک گیا

پیری میں جھریاں یہ نہیں جا بجا پڑیں | بوسیدہ ہو کے پیرہنِ تن مسک گیا

عاشق کا دل عجیب جگہ ہے نمود کی | دم بھر کو اس میں درد بھی آکر چمک گیا

گر پڑ کے مری خاک جو پہنچی وہاں تلک | جھونکا ہوا کا دوڑ کے دامن جھٹک گیا

چمکی ہوا میں برق تو چلا اٹھا یہ رعد | مستو وہ دخت رز کا ستارہ چمک گیا

بس ہے کہ لو ابھی سی ہے حوروں کی تاک جھانک | آنکھوں میں آکے دم جو ہمارا اٹک گیا

پہلو تہی کا یار سے شکوہ ہو آہ کیا

پہلو سے مرے دل ہی جو میرا کھسک گیا

"وزن" میں کمی — نقصان" مینڈک نے کہا "وہ کیسے"؟

اب معاملہ باون تولہ پاؤ رتی سمجھ میں آگیا۔ پائی کرافٹ تم ہے اس وعدہ لا شریک کی جس نے تمہیں موٹا پا دیا۔ منکا سی تو مردی التی کا ساڑھی ڈول دیا۔ کوئی حقیقت تم اپنے موٹاپے کا علاج کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کہتے یہ پھرتے تھے کہ میرا وزن کم کر دو۔ میرا وزن گھٹا دو کیوں نا؟ بھول گئے کیا تم نے ہی تو کہا تھا کہ کوئی خدا کا بندہ مجھے اس "وزن" سے نجات دلا دے تو — سو تمہیں مل گئی۔ مبارک ہو گھی کے چراغ جلاؤ کہ خدا خدا کر کے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ اسے ظالم ؎

"نہ ہو خوش فربہی تن سے غافل
سبک کرتی ہے مردہ کو گرانی"

بہرحال مجھے از حد مسرت تھی اور کیوں نہ ہو۔ نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ۔ بے بسی کی حالت میں پائی کرافٹ بڑا بھلا معلوم دیتا تھا — بڑا پیارا۔ دل چاہتا تھا کہ جا کر جھٹ سے منہ چوم لوں۔ اس کا غصہ اور بے بسی دیکھ کر مجھے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ؎

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

"لاؤ میں مدد کروں؟" میں نے اس سے کہا اور ہاتھ پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ وہ عجیب ہیئت کذائی سے قلابازیاں کھاتا۔ لاتیں پھینکتا، اور ہاتھ پاؤں مارتا ہوا آتا یا۔ لیکن پاؤں ٹکنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ رگ رگ پھڑک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی جھنڈا طوفانی ہوا کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر تڑپ تڑپ کر ہوا کی زد سے بچ رہا ہے۔

وہ بولا "میرے بھیا! دیکھو وہ میز خالی ہو گئی کی ہے۔ بڑی بھاری اور ٹھوس ہے۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ اگر تم کسی طرح مجھے اس کے نیچے دبا کر بٹھا دو تو اللہ قسم کام بن جائے۔ اور —"

میں نے حکم کی تعمیل کی، اور کچھ دیر بعد وہ اس کے نیچے کسی قدر — "یا قسمت و غایہ" کیسے مستانہ اداؤں سے لڑھکنے اور لڑکھڑانے لگا۔ اللہ اللہ! وہ مستانہ لغزشیں! جب خیال آتا ہے دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ میں فرش پر کھڑا کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور مزے لے لے کر باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔

میں نے ایک سگریٹ جلایا اور فرمائش کی "اچھا تو اب سنائیے اپنا افسانۂ درد!"

اس نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا "میں نے وہ دوا کھائی۔"

"ذائقہ میں کیسی تھی؟"

"اُف کچھ نہ پوچھو! از حد تلخ!" مرغ نے کہا۔

"میرا اپنا بھی خیال ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو گا میری پھلاوی کے نسخوں کے اجزاء اور ترکیبات کم از کم مجھے از حد تلخ اور بدمزہ نظر آتے ہیں۔ اور میں تو —"

"میں نے ایک گھونٹ لی"

"اچھا!"

"لیکن! ابھی گھنٹہ بھر بھی نہ ہوا ہو گا کہ دوا نے اپنے حیرت انگیز اثرات دکھلانے شروع کئے۔ میں ہمہ تن نہال ہو گیا۔ طبیعت کچھ تازگی پلٹی 'وزن' بھی کچھ ہلکا معلوم ہونے لگا۔ میں مگن ہو گیا۔ بلا میں نے دار و کے تلچھٹ کے تمام قدح نوآنکہ پینکر پی جانے کا فیصلہ کر لیا۔"

"خدا کی سنوار!" میں نے کہا۔

"ہوں ناک پکڑ کر تمام دوا ایک سانس میں غٹ غٹ پی گیا" اس نے ذرا وضاحت سے بیان کیا "اور پھر ہلکا پھلکا ہوتا چلا گیا — اسفنج کی کیفیت طاری ہوتی چلی گئی — بالکل بے بس — تم تو خوب واقف ہو۔"

یکایک ایک غصہ کا دورہ پڑا۔ چہرہ پر سکرات موت کے سے آثار رونما ہونے لگے۔ رونی صورت بنا کر رقت آمیز لہجہ میں کہنے لگا۔ "ہائے اللہ! اب کیا کروں؟"

میں نے جواب دیا "کرنا دھرنا تو میں جانتا نہیں یہ کسی ڈاکٹر سے پوچھو۔ مگر اسے تو پتھر کی لکیر سمجھ لو کہ جہاں تم نے گھر سے باہر قدم رکھا اور تم سیدھے آسمان پر جا لگے۔ پھر تو تمہاری خبر تک نہیں ملے گی۔ تم چلے جاؤ گے۔ چلے جاؤ گے بے پناہ بلندیوں پر — اوپر" میں نے ذرا ٹھا کر سمجھاتے ہوئے کہا "پھر نہیں نیچے لانے کو کسی ہوا باز کو بھیجنا پڑے گا۔ تاکید جانو۔"

"ہائے ہائے! گھس گھس کر، گُھٹ گُھٹ کر، گل گل کے مر کر فنا ہو جاؤں گا۔ ہائے ہائے میں تو کھلی چھاچھ سے بھی گیا!" وہ منہ بنا کر رونے لگا۔

احساسات کے التہاب اور جذبات کی آگ نے اس کے خرمن صبر کو پھر جلا کر خاک کر ڈالا۔ اور وہ کرسیوں سے فٹ بال کھیلنے لگا۔ لیکن مجھے اس اہانت آمیز رویہ پر بھی ذرا تعجب نہ ہوا۔ مجھے تو پہلے ہی اس کی امید تھی۔ غرضکہ صورت حالات قابو سے باہر تھی۔ لیکن میں چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا تھا ؎

جو چاہو تم سنا کو لو چپ چاپ پڑے ہم ایسے
گویا زباں نہیں ہے اپنے دہن کے اندر

وہ میرے اور میری پردادی کے متعلق از حد ناشائستہ گفتگو کرنے لگا۔ ایک اچھا خاصہ قصیدہ پڑھ دیا۔ جس میں دنیا بھر کے فصیح و بلیغ مدحیہ الفاظ میری اور میری پردادی (خدا انہیں جنت نصیب کرے) کی شان میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر استعمال کئے۔ عریاں تشبیہات، برہنہ استعارے، ہیجان آفریں کنایات اور جگر پاش تلمیحات سے دل کھول کر کام لیا۔ مضمون کو لال چنبھا بنا دیا۔ اتنا بانس پہ چڑھایا کہ زمین کو آسمان بنا دیا۔ مقطع تو کجا تشبیب ہی ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔

"دیکھو صاحب! ذرا سنبھال کر بولو اپنے کلام گمراہ نہ ہو۔ کس ہاجی نے کہا تھا کہ دوا استعمال کرو" میں نے گالیوں کا جواب دیا۔ ہاسی کڑھی میں ابال آ گیا۔

آ گیا۔

پے در پے بے حد قابل اور ہتک آمیز حملوں کے باوجود میں نہایت صبر و اطمینان سے سنجیدہ اور متین صورت بنائے اس سے دوستانہ بلکہ محبوبانہ انداز میں گفتگو کرتا رہا۔ گویا مجھے اس کی ہرزہ سرائیوں اور دشنام طرازیوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ اس کان سنی اور اس کان نکال دی۔ اپنا تو یہی وطیرہ رہا ہے۔ ؎

جب مجھے رنج دلانا ہی نہ ہو
بے وفا پھر حاصل بے داد کیا

میں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو بھئی یہ بلا تو تم نے خود اپنے گلے آپ مول لی ہے۔ میں کسی کا قصور بھی کیا ہے۔ جو تم مجھ غریب پر لال پیلے ہو رہے ہو۔ یہ تو قدرت کا انصاف ہے کھاتے بھی تو ہیں پھر نئے۔ اب انہی کی سزا بھگت رہے ہو۔ چنانچہ اسی قسم کی پیروی کے متعلق ایک شائستہ شستہ گفتگو کی۔ اسے ایک آنکھ نہ بھائی بگڑ گیا تو بھلے کو وہ سب ہوئی۔

وہ تو تلا بیٹھا تھا۔ کھاؤں پھاڑوں کرنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب کاٹا اب کاٹا۔ منہ سے تھوک اچھلنے لگا۔ ناک سکیڑ کر پیشانی سے جاگی منہ سے خیف خیف آوازیں نکلنے لگیں۔ میں نے سوچا کہ یہ تو چلتے راستے یہ بلا اور گلے پڑی پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ ؎

اس جنس پر تو ذوق بسنر کا یہ حال ہے
کیا جانئے کیا کرے جو خدا اختیار دے

مصلحت وقت سمجھ کر میں نے اس موضوع سے اجتناب کیا۔ اور کترا کر کہنے لگا "ایمان کی تو تم میں شروع سے ہی عادت ہے۔ تم وزن کی کمی کے خواہاں تھے۔ نہ کہ موٹاپے کے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ قصور تمہارا ہے یا میرا۔ میرا قصور نکلے تو میرا جوتا اور تمہارا سر۔

کار بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر

واہ صاحب! واہ! ایک تو میں نے بھلائی کی اور اس کا یہ ثمرہ دیا۔ سچ ہے میاں اب بھلائی کے دن نہیں رہے۔ نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال وزن کی کمی چاہتے تھے۔ سو وہ نفی کے برابر ہو گیا اب کیا اپنی ماں کا کلیجہ چاہتے ہو۔ واہ میاں لاؤ بس دیکھ لیا!"

اس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "ہائے بابا معاف کر! میرے چچا معاف کر! انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ بس ہو گئی غلطی۔ ہمیں بھی معلوم ہے۔ اب گھڑی گھڑی اُسے یاد دلا کر میرے زخموں کو کیوں کریدتے ہو۔ اللہ قسم! حواس مختل ہوئے جا رہے ہیں۔ خدا کے لئے اب تو یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں۔" ؎

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و فغاں سے
اسیر و کرو کچھ رہائی کی باتیں

میں نے کہا "کرتے کیا وہی کرو جو سب کرتے چلے آئے ہیں۔ اپنے حالات سے موافقت اور مطابقت پیدا کر لو اور موج اُڑاؤ۔"

غرضیکہ بہ ہزار دقت نجات پا کر ہم ہوا سے ہلکی سی باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ چھت پر ہاتھوں کے بل چلنا آسان تھا۔ کام نہیں سو ضرورت اور مشق سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

ہائے تم نے اگر ضروریات سے کیسا فارغ ہو لو گے۔ اور سو ڈن کو کھاں جو — تمہارے سر پر تو ایک وہم پڑی اٹھا۔

لیکن یہ کوئی اتنا مشکل کام نہ تھا۔ بھلا اس میں کیا رکھا تھا۔ جب وہ ٹھوکر کھڑی کھڑی ہشیار زور شور سے بول و براز سے فارغ ہو جاتا۔ تیار کر دیا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ایک چارپائی کو الٹا کر کے اس کے پایوں کے گرد جال کا کھونٹا گاڑ کر اور اسے گدیلے تکیے۔ چادر، رضائی وغیرہ سے لیس کر کے اوپر چڑھا دیں گے اور بس۔ اور کیا چاہیے نوکر تمام کام کر دیا کرے گا۔ اوّل اوّل تو اس نے یہ بات سنکر بڑے نخرے دکھلائے۔ وہی ناک، وہی نزاکت وہی نخرے، وہی عشوے، مگر بات بنی کھری آخر اتنا پڑی پیسی کو ایسا شیشہ میں اتارا کہ بس کیا کہوں۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔ جس حسن و خوبی سے اس عورت نے اس تخت سلیمانی کا انتظام کیا وہ واقعی قابل تھا۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ بھائی شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن خدا سنگ دے تو وہ بھی سہنے پڑتے ہیں۔ جب وصل گنجے میں پڑ گیا تو پھر بھاتا ہی پڑے گا۔ ایک چھوٹا سا کاٹھ کا زینہ نہایت خوش سلیقگی سے لگا دیا گیا۔ اور کھانا من و سلویٰ کی طرح وہیں پہنچا دیا جاتا تھا دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس دلچسپ داستان کے ایک ایک واقعہ کے تار و پود دکھا کے رکھ دوں مگر کیا کروں وقت بہت قلیل ہے۔ خیر اجمالاً ہی عرض کرتا ہوں ایک بچاؤ یہ کی گئی کہ برٹش انسائیکلوپیڈیا (دسواں ایڈیشن) الماری کے اوپر رکھ دی گئی۔ اور جب کبھی اس بھینس کے انڈے کو نیچے اترنا ہوتا تو وہ چار جلدیں اٹھا کر ان کے دباؤ سے نیچے اکڑ جاتا۔ ہم نے یہ بدعت اور کی کہ الماری کے کٹہرے پر ایک تالا بھی لگا دیا تاکہ وہ آسانی سے زینہ ساج پر شرف صعود لا سکیں۔

مجھے اس معاملہ میں بڑی دلچسپی بلکہ کیف و سرور محسوس ہوتا تھا۔ یہ خاکسار ہی کے دم کا طفیل تھا کہ خادم کو آقائے ولی نعمت، سلیمان تخت ثریا تخت۔ خفاش طینت۔ گردوں نشیں۔ جناب پائی کرافٹ کی زبوں حالی اور شکستہ پری کا علم ہو گیا۔ ورنہ بیٹھا بیٹھے بیٹھے ہی مر جاتے اور کوئی پرسان حال تک نہ ہوتا۔ یہ اسی بندہ ہی کا دم تھا کہ یہ تخت سلیمانی بچھایا گیا۔ ورنہ حضرت کی زندگی دوبھر ہو جانے میں کونسی کسر باقی تھی۔ اے حضرت! وہ احسان فراموش نکل جائے تو احسانات سے ورنہ اس کا رواں رواں مجھے دعائیں دے رہا ہے مجھے یہ تمام انتظامات کرنے پڑے۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ تب کہیں وہ دن میرے انتظامات مکمل ہوئے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں تو ایک بے تکلف دوست ہوں — آدمی ہوں

باقی صفحہ ۹۰

# صہبائے مغرب ہندی میناؤں میں

انگلستان جرمنی ہالینڈ یونان اور فرانس کے رنگین و کیف آفریں شاہپارے

## اظہارِ الفت

از جناب قادر نیازی ناگوری

ـــ ۱ ـــ

آ . . . . . . . .

اور اپنے آتشیں رُخسار میرے رُخسار سے

ملا دے . . . . .

تاکہ ــ تیرے آنسو . . میرے آنسوؤں

سے مل جائیں ــ

تاکہ ــ دو شعلے ایک ہی ہو کر جلیں ـ

---

جب ہمارے آنسوؤں کا طوفان . . .

اس قہرمان آتش سے دوچار ہوتا ہے ـ

میں تجھے مضبوط پکڑ لیتا ہوں ــ

کیونکہ ــ

محبت کے بے پناہ اظہار سے مجھ پر

غشی طاری ہو جاتی ہے ــ

ـــ ۲ ـــ

مئی کے خوشگوار مہینے میں ــ

جبکہ تمام کلیاں کھل رہی تھیں ــ

میں نے محبت کی ــ

اور مجھ کا پیاسا رہنے لگا ــ

---

مئی کے خوشگوار مہینے میں ــ

جبکہ تمام پرندے نغمے گا رہے تھے ـ

میں نے اپنے محبوب سے کہا ـ

"میں نے پہلے پہل اس طرح تیری جانب

ہاتھ دراز کئے تھے . . . . ."

( جرمن شاعر ہائینے )

---

## رات

از جناب "شمس" مظفر پوری

آفتاب مغرب کی عمیق وادیوں میں

آہستہ آہستہ اتر رہا ہے ــ

شام کا ستارہ بلندی پر چمک رہا ہے

طیور اپنے آشیانوں میں آ چکے ہیں ـ

مجھے بھی اپنا خیال کرنا چاہیے ــ

---

پھول کی مانند ماہتاب

آسمان کے بلند دائروں میں

خاموش مسرتوں کے ساتھ

رات کو مسکراتا ہے ــ

---

الوداع ! اے سبزہ زار باغ ــ

اور خوبصورت جھاڑیو ــ

لوگ اپنے گھروں میں

اطمینان و مسرت کی انگڑائیاں

لے رہے ہیں ــ

مویشیوں نے اپنی جائے پناہ میں

سکوت قائم کر رکھا ہے ـ

فرشتوں کے ہلکے اور نورانی

قدم متحرک نظر آ رہے ہیں ـ

---

وہ چھپ چھپ کر رحمتوں کی بارش

کرتے ہیں ــ

اور رات کی خاموش فضا میں

مسرت کی لہریں بکھیرتے ہیں ـ

تمام پھولوں اور کلیوں پر

اور تمام خوابیدہ سینوں پر

---

فلک بوس ڈالیوں پر

وہ گھونسلوں میں جھانکتے ہیں ـ

جہاں طیور گائے پڑے ہوتے ہیں

وہ درندوں کے غاروں کی

سیر کرتے ہیں ـ

تمام تکالیف سے اُن کو محفوظ

رکھنے کے لئے

اگر وہ کسی کی آنکھوں میں آنسو

دیکھتے ہیں ـ

حالانکہ انہیں میٹھی نیند کے مزے

لینے تھے ـ

تو اُس کی آنکھوں میں خواب کا

نشہ انڈیلتے ہیں ـ

اور اُس کے بستر کے قریب بیٹھ

جاتے ہیں ــ ( انگریزی سے )

---

## محبت

از جناب قمر فاروقی

محبت ایک نور ہے جو آسمان سے اترا

محبت ایک لرزتا ہوا شعلہ ہے جو

کبھی نہیں بجھ سکتا ـ

محبت خدا کی طرف لے جاتی ہے

محبت آسمان کا وہ سربستہ راز ہے

جو دنیا میں فاش کر دیا گیا ـ

محبت وہ ازلی تجلی ہے جو خدا کی آنکھ سے نکلی

محبت ایک بے لوث ارادہ ہے ـ

محبت خدا کا تحفہ ہے ــ

محبت پاک روحوں کے ارد گرد چکر لگاتی ہے

( ٹن کاتس )

## نغمہ

از جناب قیصر عثمانی !

اس کے دلفریب نغموں میں خون کی سی

گرمی تھی ــ

اور اس کا وہ محبت آفریں گیت ـ

ان لطیف جذبات کا حامل تھا ــ

جنہیں الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا ـ

ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر

ایک دوسرے کے دل کی باتیں سمجھ

رہے تھے ــ

ہمیں سمجھنے کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں

اس کا بیخود و سرمست بنا دینے والا

نغمہ ــ

خود اُن روحانی کیفیات کا ترجمان تھا ـ

کہ ہم دونوں میں آنکھوں ہی آنکھوں میں

کیا کیا باتیں ہو رہی تھیں ـ

( آرتھر سائمنس )

---

## نمودِ سحر

از جناب "شمس" مظفر پوری

سحر ہو گئی ـ

مگر اے میری محبوبہ ! ـ

تیری جلوہ گاہ کے دروازے اب

تک مسدود ہیں ـ

ایسا بھی کیا سونا ہے ـ

اس کثرتِ خواب کے کیا معنی ؟ ـ

ننھی کلیاں بھی آنکھیں میچ کر مسکرا رہی ہیں

آخر تو اپنے خوابِ بدمست سے کب

بیدار ہو گی ؟ ـ

اے وہ کہ جس نے مجھے شرابِ محبت

کے نشہ بار جرعات سے مست و مدہوش

کر رکھا ہے ـ

اپنے پرستار کی دل کی گہرائیوں

سے نکلی ہوئی آواز سن ! ـ

دیکھ ! ــ

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے

تھرک رہے ہیں ــ

---

کون ہے جو تیرے دروازے پر جھک

کر دستک نہیں دیتا ـ

زبانِ حال سے صبح گویا ہے ـ

"میں نور ہوں اور تیری منتظر کھڑی ہوں"

جبل کہتی ہے ـ

"میں نغمات و موسیقی کی ملکہ ہوں"

اور تیری بارگاہ میں بزمِ طرب منعقد

کرنے آئی ہوں"

میرا دل کہہ رہا ہے ـ

"میں مجسم عشق و محبت ہوں

اور تیرے قدموں پر نچھاور ہونے

آیا ہوں"

میں تیری پرستش کرنے آیا ہوں ـ

اسلئے کہ تو فطرت کی وہ حسین شاہکار ہے

جو پرستش کی مستحق ہے ـ

فطرت ــ جس نے

اپنی حسن کاری کا تمام کمال

تیری تخلیق پر ختم کر دیا ہے ـ

میری محبت تیرے لئے مخصوص کر دی ہے

اور مجھے آنکھیں اسلئے بخشیں کہ

تجھے دیکھا کروں ــ

سن ! ــ اے جوانی کے آغوش

میں میٹھی نیند سونے والی الڑھ محبوبہ ! ــ

اپنے پرستار کے دل کی گہرائیوں سے

نکلی ہوئی آواز سن ! ــ ( وکٹر ہیگو )

---

## ارواح

از جناب قمر فاروقی !

قوسِ قزح میں ـ

بادلوں کے پیچھے پیچھے ـ

ستاروں کی لرزشوں میں ـ

چاند کی روشنی میں ـ

سورج کی ابتدائی کرنوں میں ـ

بوسہ کی گرم لذت میں

گلاب کے پھولوں میں

انگور کے خوشے میں

اس نور میں جو افق سے جھانکتا ہے ـ

صبح کے کیف بار دھندلکوں میں ـ

پاک روحیں نظر آتی ہیں ــ

( ٹن کاتس )

---

باقی بر صفحہ ۲۷

زیور ــــ جیسے دوستوں کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں تیار۔ چنانچہ میں نے گھنٹیوں کے لمبے لمبے تار نگار اس کی جلوہ گاہ تک پہونچا دیئے۔ بہتیرے قصوں کے رخ کو بالکل الٹ کرنا پڑا۔ اور اسی طرح کی دیگر تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ مجھے یہ تمام معاملات بہت دلچسپ نظر آتا ہے۔ پالی گرافٹ کو عالم نزع میں مکڑی کی طرح بے بس اور معلق دیکھ کر جیسے دلی جو گد گدی اٹھتی تھی۔ اس کا اندازہ شاید آپ نہیں کر سکتے اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اب کوئی بھی مجھ کو پیاسی نگاہوں سے گھورنے والا بھی مشکل سے نہ لگ گیا تھا۔ خس کم جہاں پاک۔

اب آپ جانو میں ٹھیرا ایک ذہین فطین آدمی اچھے میری خدا داد ذہانت اور فطانت کے سامنے کہاں ٹھیر سکتے ہیں میں نے وہ ترکیب سوچی کہ آپ بھی عش عش کریں۔ قصہ یوں ہوا کہ ایک دن میں آتشدان کے پاس بیٹھا اسکی وسکی مزے سے گھونٹ لے کر پی رہا تھا مال مفت دل بے رحم وہ چھت کے کونے میں ایک تنہ کی قالین سیدھ سے لگائے حلوائی کی دکان اور دادا جی کی فاتحہ کا دیرینہ سوال پیسے کا منہ دیکھ رہا تھا کہ یکایک مجھے ایک مسعود خیال آیا اور میں چلا اٹھا " اللہ قسم! یہ تمام کرنٹ بالکل فضول ہے ــــ لغو ــــ بالکل لغو!"

قبل اس کے کہ میں اس ہلاکت خیز طریق کے بھیانک اثرات کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیتا میرے منہ سے ایک دم نکل ہی پڑا۔ " نیچے ســیســہ کے کپڑے پہن لو" یہ ہلاکت آفریں مشورہ سنکر پالی گرافٹ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر پی گیا " ہائے! پھر وہی!" اس نے سسکی بھر کر کہا میں نے اسے کچھ دم دلاسا دیا نشیب و فراز سمجھائے اور اس اسکیم کا ہر پہلو ذہن نشین کرایا۔ میں نے کہا " اجی! بس ایک سیسہ کی چادر خرید لو اور اسکے چھوٹے چھوٹے گول گول حسب پسند ٹکڑے کر ڈالو تاکہ ان کا وزن تمہاری سبکی پر غالب آجائے اور تمہیں عالم بالا کی طرف پرواز کرنے سے باز رکھے۔ پھر ان کو اپنے کپڑوں سے سی لو۔ جوتوں کے تلے بھی اسی کے بنوالو۔ ہیٹ پر بھی وہی مڑھوا لو۔ ہینڈ بیگ بھی خالص سیسہ کا استعمال کرو۔ اور پھر پانچوں گھی میں! مزے سے آنند کرو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ گھر کی چار دیواری میں مقید چھت سے لپٹے لٹک رہے ہو۔ شوق سے دنیا بھر کے سیر سپاٹے کرو۔ کیوں مانتے ہو کیسی سوجھائی!

ایک اور پر لطف خیال نے مجھے گدگدایا میں اس طرح گویا ہوا " اور ہاں بار بار دیکھو یہ تو سمجھا ہی گیا تھا کہ تمہیں جہاز کی غرقابی کے ڈر سے تو نجات ملی۔ جہاز ڈوبتے وقت تمہیں صرف اتنا کرنا پڑے گا کہ چند ضروری کپڑے پہن لو اور پھر ہوا میں سیر کرو۔ نہ ڈوبنے کا کھٹکا نہ غرقابی کا معرکہ۔ کیوں۔ ہے نا پتے کی بات؟" خوشگوار مستقبل کے دلآویز نظاروں

میں وہ کچھ ایسا محو ہوا کہ تھوڑا اشتہ سے چھوٹ گیا میرا سوال بال بچا ہوا سیدھا عدم آباد جا کر ٹھیرتا لیکن وہ بہت خوش تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں " اللہ قسم! تمہیں میرے سر کی قسم ہے سچ کہنا اب میں پھر کلب آنے کے قابل ہو جاؤں گا؟"

کلب میں رونق افروز ہونے کا مجاز سمانا مزاج سنکر میری روح خشک ہوگئی اور خوفناک خیالات کا تصور نگیں ہوا میں جھولنے لگا۔ کی کراہی مفت جا رہی تھی۔ نہایت ضعیف آواز ہیں۔ میں نے جواب دیا " ہاں ہاں! تم آ سکو گے آ سکو گے! بیشک! پھر آ سکو گے! بیشک ــــ

چنانچہ وہ آیا اور اب بھی آتا ہے۔ وہ دیکھئے میرے پیچھے ہی بیٹھا نکل رہا ہے کیکیں پہ پہ تیسرا حملہ ہے۔ سوائے میرے اور خادم کے کسی کو مطلق علم نہیں ہے کہ آنجناب صرف کھانے کی پوٹ ہیں۔ روٹیوں کا تنور ــــ بادوں کی طرح کھوکھلا ــــ روئی کے گالے کی طرح ہلکا پھلکا ــــ بے حقیقت انسان جس کا کچھ وجود نہیں ــــ وہ بیٹھا بیٹھا انتظار کر رہا ہے کہ کب میں اس مضمون کو ختم کروں اور کب وہ دھاوا بولے!

پھر وہ مجھ سے کہیگا کہ اس کے دل پر کیسی گذرتی ہے۔ طبیعت کیسی رہتی ہے " وزن کا کیا حال ہے۔ اور پھر اس طویل افسانہ میں کہیں نہ کہیں کہہ ہی بیٹھے گا " بھئی خدا نے لاج رکھ لی کہ ابھی تک راز فاش نہیں ہوا۔ اگر خدانخواستہ بھانڈا پھوٹ جائے تو میں تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہونگا۔ میری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ میری پت اور عصمت کی لاج تمہیں کو ہے۔ کبھی کبھی سوچو تو سہی کتنی رسوائی کی بات ہے ــــ چھت پہ چپکنا۔ لٹکنا اور چلنا"

اب مجھے پالی گرافٹ کی شعبدہ بازی دور سے نظر آ رہی ہے بچکر راہ فرار اختیار کرنا ہے۔ مگر کیسے؟ وہ تو میرے اور دروازہ کے درمیان دیوار بنا بیٹھا ہے۔ دیکھئے یہ مہم کیسے سر ہوتی ہے!!!

بادل وہ اٹھے جھوم کے آئی وہ گھٹا
ساقی بھی چلا آیا ہے پیمانہ بدست
عشرت کا سب سامان مہیا ہے اب
میں پی کے مئے ہوش ربا ہو جاؤں مست

عطا کاظمی

# شاہجہان آباد کی دو آتش نوا مطربائیں

## نازک بدن (اور) نور بائی

فرید دانش نام ایک کتاب فارسی زبان میں ہے جس کے مصنف مولوی غلام حضرت صاحب عباسی بر عہد واجد علی شاہ میں گزرے ہیں۔ مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اس کا سال تصنیف ۱۲۶۴ھ لکھا ہے جس کو آج ۱۳۵۸ھ میں چورانوے ۹۴ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۱ پر شاہجہان آباد (دہلی) کی ایک مطربہ کے گانے کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں صاحب مصنف لکھتے ہیں کہ شوکت الدولہ نواب محمد جان بہادر نصیر جنگ اور چند دیگر معززین نے بمقام بیت السلطنت لکھنؤ مجھ سے ذکر کیا کہ شاہجہان آباد میں ایک دفعہ ایک مجلس آراستہ تھی۔ اس مجلس میں نازک بدن نام ایک رقاصہ نے مرزا محمد فاخر مکین کی یہ غزل گائی ؎

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت
خود سوئے ما ندید و حیا را بہانہ ساخت

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں
کنجے گرفت و یاد خدا را بہانہ ساخت

رفتم بہ مسجد از پے نظارۂ رخش
بر رو کشید و دست دعا را بہانہ ساخت

ان تین شعروں کے بعد جب نوبت اس شعر پر پہنچی ؎

دستے بدوش غیر نہاد از سر کرم
مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت

تو صاحب مصنف لکھتے ہیں۔

"در زمزمۂ ایں شعر طرفہ دانیے بہ کار برد کہ چوں مصرعِ اولی می گفت دست خود برد دوش سازندہ بطرزے می گذاشت و چوں بہ لفظ لغزش می رسید مستانہ بسر مے غلطید"

پھر اس کا ترنم اور نغمۂ دلکش۔ پھر ان اشعار کی وجدانیت ان سب نے سامعین پر بیخودی سی طاری کر دی۔ اسی اثنا میں ایک جوان بے خودی کے عالم میں اس کی ادا کاری اور شعر کے سحر آفریں اثر سے مجذوب ہو کر۔

"دفعۃً برابر ایک نیزہ بالا جست و زیر پائے نازنین افتاد۔ مردم دویدند و سرش بر داشتند جنبش راہ بے حس و حرکت یافتند"

یہ حال دیکھ کر مجلس کا رنگ بدل گیا۔ اہل مجلس پر سکتہ و سکوت کا عالم طاری ہو گیا رقاصہ کی یہ حالت تھی کہ بے حس و حرکت ہو کر پشیمان و دلگیر نظر آ رہی تھی۔ رئیس محفل و دوسرے لوگ اس جوان کے زاد و بوم بلکہ نام و نشان تک سے واقف نہ تھے۔

حضار مجلس نے جب اس کے جسم کو بیجان اور اس کے قالب کو بے روح دیکھا تو اس کو غسل دے کر اور کفن پہنا کر قبرستان میں پہنچایا۔ شہر میں اس جوان کی موت کا عام چرچا ہو گیا تھا اس لئے جنازہ کے ہمراہ ایک جم غفیر موجود تھا۔ صاحب مصنف لکھتے ہیں۔

"نازک بدن ہم درون انبوہ بنظر انبوہ آہستہ آہستہ بہ اتفاق جمع خود قریب بہ مدفن رسید۔"

لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی اور نعش کو سپرد خاک کر کے فاتحہ پڑھی ابھی وہ واپس آنے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ نازک بدن نے جو قبر سے ذرا فاصلہ پر بیٹھی تھی اپنے ہمراہیوں سے کہا اگر تم اجازت دو تو میں بھی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ لوں اور داخل حسنات ہو جاؤں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا کیا حرج ہے آخر ہم سب کو اسی خاک میں جانا ہے۔ نازک بدن قبر کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ہاتھ قبر پر رکھ کر کچھ پڑھتی رہی تھوڑی دیر کے بعد اٹھی تو لوگوں نے دیکھا کہ قطرات اشک اس کی آنکھوں سے رواں تھے اسی عالم میں درد و کرب کے ساتھ اس نے یہ یہ شعر پڑھا ؎

بے تو غم تلخ شادمانی تلخ
مرگ ہم تلخ زندگانی تلخ

سننے والے بیتاب و بیخود ہو گئے۔ شعر پڑھنے کے ساتھ ہی اس کے بدن میں ایک لرزہ سا پیدا ہوا۔ وہ کانپتی ہوئی گر پڑی اور گرنے کے ساتھ ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آخر اس جوان کی قبر کے ساتھ ہی نازک بدن کی قبر تیار کی گئی جہاں اس کو اس جوان بے نام و نشان کے پہلو میں دفن کر دیا گیا ؎

یوں دفن میرے ساتھ دل بیقرار ہو
چھوٹا سا اک مزار کے اندر مزار ہو

---

محمد شاہ کے زمانے میں نور بائی ایک گائن تھی جسے اپنے حسن و جمال۔ خوش آوازی حاضر جوابی۔ بذلہ سنجی اور مصاحبت کی عمدگیاں کے سبب بادشاہ کے تقرب کا درجہ حاصل تھا۔ تمام امرائے دربار اسے دل و جان سے چاہتے تھے ایک روز وہ نواب روشن الدولہ کے یہاں بیٹھی تھی۔ ہنسی کھیل کی باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں میران سید بھیک صاحب کی سواری ان پہنچی۔ سید صاحب سے نواب کو بیحد عقیدت تھی ان کی آمد کی اطلاع سنی تو نور بائی کو فوراً دوسرے کمرے میں بٹھا کر آگے سے چلمن چھوڑ دی۔ میران صاحب آئے اور اتفاق سے بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ نور بائی جو ایک بیچین اور چلبلی طبیعت کی عورت تھی تنہائی میں زیادہ دیر تک بیٹھنے کی تاب نہ لا کر بیباکانہ نکل آئی اور شیخ کے حضور میں جھک کر آداب بجا لائی اور عرض کی کہ لونڈی کو حکم ہو تو کچھ گائے۔ میران صاحب چونکہ سماع کے شائقین تھے خاموش رہے بائی نے ان کی خاموشی کو اجازت سمجھ کر عمر خیام کی یہ رباعی نہایت سوز و گداز کی لے میں گانی شروع کی ؎

شیخے بہ زن فاحشہ گفتا مستی
کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم
تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

شیخ بیخود ہو گئے۔ ان کی حالت اس بر محل رباعی اور نور بائی کے انداز نغمہ سرائی سے ایسی متغیر ہوئی کہ بائی کو اپنی جسارت پر سخت نادم ہونا پڑا۔ نور بائی کو خاموش کر دیا۔ شیخ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی۔ مگر ان کی شورش کسی طرح کم نہ ہوئی۔ وہ مرغ بسمل کی طرح زمین پر لوٹتے تھے اور در و دیواروں میں سر

# چینی عورت

فنون لطیفہ کے لحاظ سے چین مشرق کا ایک صحیح نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ آج سے ہزاروں برس پہلے جبکہ دنیا تہذیب و تمدن کی آرائش و زیبائش سے ناآشنا تھی۔ اور دنیا کے صرف چند خطے اپنے تمدنوں کی بلندی پر ناز کر سکتے تھے۔ سرزمین مشرق کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ تہذیب کا گہوارہ ہے۔ بابل، نینوا، ہندوستان اور چین مشرق کے چند مرکز تھے۔ جہاں تمدن جنم لیتے تھے۔ ان تمدنوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ فنون لطیفہ بہت عروج پر تھے اور انہی فنون لطیفہ کی وجہ سے سماجی زندگی اور سماجی زندگی کے پہلو بہ پہلو صنف نازک کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔

جس طرح سے کہ مشرق و مغرب کے تمدنوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اسی طرح سماج اور عورت کے تخیل میں بھی بعد المشرقین ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس اختلاف کے باوجود بھی مشرق میں کہیں بھی عورت کو ان ترقی یافتہ تمدنوں میں جانور یا بھار و سامان نہیں سمجھا گیا البتہ تاریک زمانہ میں نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی عورت کو مرد کا شریک نہیں مانا گیا لیکن ماحول اور ذہنیتوں کے اختلاف کی وجہ سے زندگی کی تگ و دو میں مرد اور عورت کی راہیں الگ الگ کر دی گئیں۔ یہ تفریق مشرق کے تمام تمدنوں میں ہمیں نمایاں ملتی ہے خواہ وہ نینوا و بابل یا ہندوستان میں ہو یا خواہ چین میں بہرحال عورت کو کشمکش حیات میں برسرِ پیکار ہونے کے لئے کہا گیا۔

چین میں آج بھی عورت کے متعلق جو کچھ روایتیں موجود ہیں اگر ان کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی بنیاد اس ہزاروں برس پہلے کے تمدن پر ہے جس کی اب بظاہر کوئی نشانی چین کی سرحد پر باقی نہیں رہی۔ چینی مرد اس بات کو دیکھ کر متعجب ہوتا ہے کہ نئی دنیا کے ... شہر نیویارک کے ساحل پر عورت کا مجسمہ اتنا نمایاں ہے کہ اس شہر میں آنے والا ہر شخص اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسے یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوتا ہے کہ وہاں عورت نسوانی پیکر سے زیادہ مجسمۂ آزادی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگتا ہے کہ عورت کو آزادی کا ترجمان کیوں سمجھا گیا۔ آخر آزادی اور عورت کا کیا تعلق ہے؟ اس کی حیرت یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ آگے چل کر وہ سیکھتا ہے کہ فتح، انصاف اور امن کی نمائندگی بھی عورت ہی کرتی ہے — نازک اندام عورت بھلا اپنے کندھوں پر اتنا بار کیونکر اٹھا سکتی ہے؟ کہیں مرد کی مہربانیاں ضرورت سے زیادہ ہو کر اس کے لئے وبال جان تو نہیں ہو گئیں" وہ سوچنے لگتا ہے۔ ناہید کے نقروئی ... شہر ہی قہقہے اس کے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔

چینی ... کے تخیل میں عورت ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے طور پر مکمل نہیں یعنی یہ کہ وہ خود اپنی زندگی کے لئے بھی دوسروں کی محتاج ہے اور جب تک مرد اس کو سہارا نہ دے وہ دنیا کی آزمائشوں میں پوری نہیں اتر سکتی۔ قدم قدم پر اسے ایسی مشکلیں پیش آتی ہیں جن پر مرد ہی قابو پا سکتا ہے۔ وہ ایک ایسی لطیف شے ہے جس کی فطرت ادھوری ہے اور بغیر مرد کے اس کی زندگی بے کیف ہے۔ اس تخیل میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چینی مرد اپنی برتری کا لوہا عورت سے منوانا چاہتا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس طرح کاغذ کی ناؤ دریا کو عبور نہیں کر سکتی اسی طرح کمزور عورت بھی زندگی کے طوفان میں تنکے کی طرح بہہ جائے گی۔

غرض یہ کہ چینی مرد اپنے اصلی خدوخال میں تو مرد سے زیادہ ہمدرد نظر آئے گا۔

جہاں چینی معاشرت میں عورت کے لئے یہ لازمی ہے کہ مرد کی اطاعت کرے — بچپن میں باپ کی، جوانی میں شوہر کی اور بڑھاپے میں لڑکے کی — وہاں چینی مرد پر اپنی ماں کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اور جو لڑکے اپنی ماں کا کہا نہیں سنتے وہ بدچلن سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چینی عورت پر حکومت کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی عزت کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہر طرح اس کی نگرانی کو فرض سمجھتے ہیں۔

چینی مصوری جو ابتدائی مصوری کی طرح مشرقی تہذیب کا ایک بے نظیر ترکہ ہے، عورت کو اسی احترام کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اگر آپ پرانی تصویروں کو دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے جذبات میں عریانی سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ان کا اقرار کیا گیا ہے۔ مغربی مصوری میں عورت کے جسم سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور اعضا کے تناسب، قد و قامت کی موزونیت اور چہرہ کی دلکشی ہی پر مصور اپنا سارا زور قلم صرف کر دیتا ہے اور حتی الامکان ان ساری چیزوں کی مدد سے عورت کی جسمانی لطافتوں کو عریاں کرتا ہے۔ برخلاف اس کے چینی مصور کا قلم بڑا ہی محتاط ہوتا ہے۔ وہ جسم کی عریانی کو ابتذال سمجھتا ہے اور عورت کی روح کو ٹٹولتا ہے۔ جذبات اور کیفیات جو اس نازک اندام کے سینہ میں مچلتے ہیں ان کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ ظاہر بین نظروں کو دعوت ابتذال نہیں دیتا۔ اور نہ وہ مرد کے مشتعل ہونے والے جذبات کو اکساتا ہے۔ بلکہ عورت کی ساری لطافتوں اور رعنائیوں کو پورے احترام کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جسم کو وہ ایک مادی شے سمجھتا ہے جس کیلئے مصوری نہیں بلکہ عکاسی کافی ہے۔ مصوری تخلیق کا جزو اور صحیح ترجمانی مصوری کی اضافہ ہے۔ اسلئے عورت کے جذبات کو جو بنفسہ پاک ہوتے ہیں، کچھ اس طرح نمایاں کرتا ہے کہ عورت اپنے صحیح خدوخال میں نظر آنے لگتی ہے۔ مغربی مصور اگر لباس کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو نیم برہنگی کی طرف راغب نظر آتا یا زیادہ سے زیادہ ایسا لباس پہناتا ہے جس میں عورت کے جسم کی نمائش رک نہ سکتی ہو بلکہ بعض دفعہ لباس کو جسم سے اتنا مربوط کر دیتا ہے کہ لباس اور جسم میں حد فاصل باقی نہیں رہتی۔ اس کے برخلاف چینی مصور لباس کو ماحول کا آئینہ دار بناتا ہے۔ اور صحیح جذبات کی ترجمانی میں اس سے مدد لیتا ہے اور بس۔ اس کے آگے لباس کی اس کے نزدیک کوئی اور اہمیت نہیں ہے۔

اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چینی مرد عورت کو مادی نقطۂ نظر سے اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی کہ روحانی نقطۂ نظر سے اوصاف ثابت ہوتا بلکہ وہ عورت کی لطافت و صحت کرتا ہے نہ کہ اس کی تذلیل۔ لیکن مغرب میں جہاں تمدن و تہذیب کا معیار ہی بدل چکا ہے اور انسانی ذہنیت و رجحان ابھی کافی سے زیادہ ملتفت ہو چکا ہے، ہر چیز کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا ہے اور اس کسوٹی پر پرکھ کر اس کی افادیت اور ضرورت کا اعلان کیا جانے لگا ہے۔ نہ صرف مرد کی ذہنیتوں میں انقلاب ہو گیا بلکہ اس کے اثرات سے خود عورتوں کی طبیعت بدل گئی۔ اور اب وہ خود اس بات کی خواہاں ہو گئیں کہ انہیں زندگی سے نبٹنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جائے لیکن مشرق ابھی مشرق ہی ہے اور اس کا ڈانڈا ابھی مغرب کے ڈانڈے سے نہیں ملا ہے خصوصاً چین جس کے متعلق ابھی تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نیند سے چونکا بھی ہے کہ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم کو چین میں وہ تمام رسوم نظر آتے ہیں جو ہزاروں سال پہلے رائج تھے۔ خصوصاً شادی بیاہ کے معاملات میں قدیم پابندیاں نئے زمانہ میں بھی موجود ہیں۔ یہ رسوم بعض لوگوں کو دلچسپ نظر آتی ہیں اور بعض کو تکلیف دہ۔ بہرحال اس اختلاف کو نظرانداز کرنے کے بعد بھی یہ ظاہر ہے کہ لڑکی کو اپنا شوہر تلاش کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ تلاش کرنا تو کجا اس کو مرد کے دامن سے باندھنے سے پہلے پوچھا بھی نہیں جاتا کہ وہ کسی کی شریک زندگی بننے یا کسی کو اپنی زندگی کا شریک بنانے کے لئے راضی بھی ہے یا نہیں۔ ماں باپ عموماً یہ مراحل خود ہی طے کرتے ہیں اور ہندوستانی لڑکی کی طرح وہ پہلی مرتبہ ماں باپ کا گھر چھوڑتی ہے تو بالکل ہی اجنبی ماحول میں پہنچ جاتی ہے۔ یہاں اس کو اپنی زندگی کا نیا ورق الٹنا پڑتا ہے۔ اور نئے سرے سے زندگی کی راہ نکالنی پڑتی ہے۔ عورت کے ذمہ گھر کے فرائض بہت زیادہ ہیں اور بسا اوقات وہ اس بوجھ سے اتنی دب جاتی ہے کہ گھر کے باہر کی زندگی میں اپنی دلچسپی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ پھر بھی ہندوستانی عورت کی طرح محصور نہیں ہوتی۔ اگلے وقتوں کی عورتیں بھی کھلے بندوں گھر کے باہر زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتی تھیں لیکن ایک مقررہ حد کے اندر۔ عورتیں ہر بات کا ایک خاص لحاظ کیا کرتی تھیں اور اپنے اوپر سخت پابندیاں خود ہی عائد کر لیتی تھیں۔ بیرونی زندگی میں وہ بے تکلف نہ ہوتی تھیں اور ہر کام ضرورت کے موافق اور موقع کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ لیکن اب نئی روشنی کی لڑکیاں اپنی بیرونی زندگی کو بھی ایک طرح سے منظم اور مربوط کر رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے ہمسایہ کی لڑکیاں جاپان میں کافی ترقی کر چکی ہیں اور وہاں عورت کے متعلق مردوں

چینی مرد کے تخیل میں عورت ... جب تک مرد اسے سہارا نہ دے ... [illegible]

**از جناب سید بادشاہ حسین صاحب (حیدرآبادی)**

باقی برصفحہ [illegible]

# محبت مختلف آئینوں میں

از جناب
مرزا عاشق علی بیگ صاحب
خیال مرادآبادی

میں نے محبت کے موضوع پر عربی، فارسی، بھاشا، اردو اور انگریزی کے چوٹی کے شعرا [illegible] کا کلام جمع کیا ہے۔ محبت کے متعلق ان تمام شعرا کے خیالات کی یکسانیت حیرت انگیز چیز ہے۔ محبت ہر جگہ [illegible]۔ محبت کا راز کہیں بھی چھپائے سے نہیں چھپتا اور محبت ہر ایک کے نزدیک تباہی اور موت ہے! امید ہے [illegible] پسند کریں گے (خیال مرادآبادی)

## محبت عربی آئینہ میں

○ لیمنا سرالبطل الکمی بنظرۃ — ویحول بین فوادہ وعزالہ

ترجمہ: محبت بہادر اور مسلح انسان کو ایک نظر ہی میں پچھاڑ دیتی ہے۔ اور صبر کو دل سے بیگانہ کر دیتی ہے۔

○ اسفی علی اسفی اللذی دلھتنی — عن علمہ فیہ علی خفاء

ترجمہ: آلام فراق کا مجھے شکوہ نہیں۔ بلکہ ان ظالموں نے تو میرے عقل و حواس کو پراگندہ کرکے آج درد عشق کی لذتوں سے بھی مجھے محروم کر دیا ہے جس کا مجھے بڑا قلق ہے۔

○ شیب راسی وذلتی ونحولی — ودموعی علی ہواک شہودی

ترجمہ: میرے سر کے بالوں کی سفیدی، میری بدحالی و نقاہت اور پیہم اشکباری اے محبوب! تیری محبت کے گواہ ہیں۔ مجھ سے تیرا راز محبت چھپائے نہیں چھپتا۔

○ ولکن حبا خامر القلب فی الصبا — یزید علی مر الزمان ویشتد

ترجمہ: محبت جس نے بچپن سے ہی دل میں گھر کر لیا ہو، وہ ہمیشگی عمر کے ساتھ ترقی کرتی اور سخت تر ہوتی جاتی ہے۔

○ ضنی فی الھوی کالسم فی الشہد کامنا — لذذت بہ جہلا وفی اللذۃ الحتف

ترجمہ: محبت میں جسمانی صحت کی تباہی یعنی بیماری اس طرح ہے، جیسے شہد میں زہر ملا دیا گیا ہو۔ بے سمجھے بوجھے میں نے محبت کا مزا چکھا اور اس مزے میں ہی جان دیدی۔

○ فلیت ہوی الاحبۃ کان عدلا — فحمل کل قلب ما اطاقا

ترجمہ: کاش محبوبوں کے دل میں انصاف ہوتا اور وہ عشاق کے دل پر اسقدر ہی بوجھ ڈالا کرتے جو قابل برداشت ہوتا۔

○ وھزئت اہل العشق حتی ذقتہ — فعجبت کیف یموت من لا یعشق

ترجمہ: میں عشاق کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ لیکن خود مبتلائے عشق ہو کر گوناگوں حقائق کا انکشاف ہوا۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ جو شخص سوزِ عشق سے محروم ہے اس کو موت کیونکر آتی ہے؟ کیونکہ انسان جیسی قوی ہستی کو عشق کے سوا کوئی چیز ہلاک ہی نہیں کر سکتی۔

○ عمیز لاسی من داوہ للحدق النجل — عیاۂ مات المحبون من قبل

ترجمہ: جو شخص کسی آہو چشم کی آنکھوں کا بیمار ہے۔ اس کے علاج کی تمنا بے سود ہے۔ یہ تو لا علاج مرض ہے کہ سینکڑوں عاشق اس میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکے ہیں۔

○ ومن شاء فلینظر الی فمنظری — نذیر الی من ظن ان الھوی سہل

ترجمہ: جو لوگ محبت کو کھیل سمجھتے ہیں وہ میری قابل عبرت تباہ حالت کو دیکھیں کیونکہ سہل انگاران محبت کے سلسلہ میں سراپا آئینہ عبرت ہوں۔

○ جری حبہا مجری دمی فی مفاصلی — فاصبح لی من کل شغل بہا شغل

ترجمہ: محبوبہ کی محبت میرے جسم کے ہر رگ و پے میں خون بن کر دوڑ چکی ہے۔ اور اب اس نے مجھ کو ہر مشغلہ حیات سے بے خبر اور مدہوش کر دیا ہے۔

(متنبی)

## محبت شیرازی آئینہ میں

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ترجمہ: محبت جس انسان کے دل کو زندگی بخشتی ہے۔ صحیفہ کائنات کی پیشانی پر اس کا نام بقا کے نورانی حروف سے لکھ دیا جاتا ہے۔

اشکِ حافظ خرد و صبر بدریا انداخت — چہ کند سوزِ غمِ عشق نیارست نہفت

ترجمہ: حافظ کی اشکباریوں نے عقل اور صبر کو دریا برد کر دیا۔ کیا کیا جائے محبت کا غم چھپایا نہ جا سکا۔

سینہ ام ز آتش دل در غمِ جانانہ بسوخت — آتشے بود درین خانہ کہ کاشانہ بسوخت

ترجمہ: دل کے بھڑکتے ہوئے شعلے سے سینہ جل گیا۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

نیست آتش نہفتہ کہ در سینۂ من است — خورشید شعلہ ایست کہ در آسمان گرفت

ترجمہ: میرے سینہ کے اندر جو آتش محبت دبی ہوئی ہے۔ یہ سورج اسی کا ایک آسمان گیر شعلہ ہے۔

درد عشق ارچہ دل از خلق نہان می دارد — حافظ این دیدۂ گریاں تو بے چیزے نیست

ترجمہ: محبت کے درد کو چھپانے کے لئے اگرچہ دل زار بہت کوشش کرتا ہے۔ لیکن حافظ! ان آنکھوں کی اشکباریاں غمازی کئے بغیر نہیں رہتیں!!

سر سودائے تو در سینہ بماندے پنہاں — چشم تر دامن اگر فاش نکردے رازم

ترجمہ: محبت کا راز گنجینۂ دل میں محفوظ رہ تو سکتا تھا۔ لیکن ان کم بخت آنکھوں نے رو رو کر راز افشا کر دیا۔

(حافظ شیرازی)

## محبت ہندی آئینہ میں

پریت بہارے بہے نہ سوچو — وہی پنتھ بہل ہوئے کہ موچو

ترجمہ: محبت کا بوجھ اٹھا کے پس و پیش میں نہ پڑو۔ اب تو یہی بہتر ہے کہ موت اس زندگی کا خاتمہ کر دے!

پریت پہاڑ جو کاندھا — تب کت چھوٹ نہ ہے جیو باندھا

ترجمہ: محبت کا پہاڑ جس نے کاندھے پر رکھا ہے۔ وہ اس سے کس طرح سبکدوش ہو سکتا ہے؟ کیونکہ محبت تو دم کے ساتھ ساتھ ہے!

پیم پھاند جو پڑا نہ چھوٹا — جیو دینہ وہ پھاند نہ ٹوٹا

ترجمہ: جس کی گردن میں محبت کا طوق پڑا اسے رہائی نصیب نہ ہوئی۔ جان دیکر بھی یہ پھندا نہیں ٹوٹ سکتا۔

دکھ بہتر سو پیم مار راکھا — کنچن مران چھی سو چاکھا

ترجمہ: محبت میں دکھ بہت ہوتے ہیں۔ جو شخص مرگ کو گوارا کرتا ہے وہی محبت کا مزا چکھتا ہے۔

پیم گھاؤ دکھ جان نہ کوئی — جنہ لاگے جانے پے سوئی

ترجمہ: زخم محبت کی ٹیس کو کوئی نہیں جان سکتا۔ کسی زخمیِ محبت سے ہی اس کی کیفیت پوچھنا چاہئے!

کٹھن مرن تیں پیم بوستھا — نہ جیئے نہ جاسے اوستھا

ترجمہ: محبت کا درد موت سے زیادہ سخت ہے۔ آدمی نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے بلکہ ادھر میں لٹکتا ہے۔

او جہین پیم جنہ آئے — پہ لوبہت ہوا دکھ سوائے

ترجمہ: جس شخص کے دل میں درد محبت پیدا ہو جاتا ہے۔ نصیحت اور ملامت سے یہ درد اور بڑھتا ہے۔

اوجیس بڑ سد کھاوا — اونہوا کبھی کنٹھ پی لاوا

ترجمہ: مہادیو بڑے کامل مشہور تھے۔ لیکن زہر محبت کا پیالہ انہوں نے بھی نوش کیا تھا۔

جہر کے نیں پیم رنگ جاماں — کا تہ نیند۔ بھونکھ بسراماں

ترجمہ: جس کے دل میں محبت سما جاتی ہے۔ خواب و خور، راحت و آرام سے اسے کیا کام!

پیم سمندر الیس اوگاہا — جہاں نہ وار نہ پار نہ تھاہا

ترجمہ: محبت کا سمندر اس قدر عمیق ہے جس کا اور چھور، اور کوئی تھاہ نہیں ہے۔

جو وہ سمندر کا منہ پیرے — جو اوگاہ ہنس ہوئے پیرے

ترجمہ: لیکن جو سمندر ناپیدا کنار میں قدم رکھ دیتا ہے باوجودیکہ اسکی گہرائی کے وہ ہنس کی طرح تیر کر پار ہو جاتا ہے۔

ملت سے آئے سکھ بھرا — وہ دکھ نین نیر ہوئے ڈھرا

ترجمہ: جب عاشق مہجور کو محبوب مل جاتا ہے تو غم سے بھرے ظرف دل میں خوشی سمانے لگتی ہے۔ اور درد فراق آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ پڑتا ہے کیونکہ دل میں ایک ہی چیز رہ سکتی ہے۔

مدت کے بچھڑے محب اجب اتفاقات زمانہ سے مل جاتے ہیں اور پھر جدائی کی گھڑی آتی ہے تو وہ لمحہ حیات بہت ہی زہرہ گداز ہوتا ہے۔ عاشق جب وہ عورت ہو، محبوب کو رخصت کرتے وقت وفور اندوہ مفارقت سے بے قابو ہو جاتی ہے اور آواز گلوگیر سے اگر کچھ کہہ سکتی ہے تو یہی کہہ سکتی ہے کہ "اچھا آئے ہی کیوں تھے جو اسقدر جلدی چلے؟" ہندی شاعر کی زبان سے سنئے۔

نی کے بچھڑ، من کی آناں — کت آیہ جو ملیہ نیاناں

ترجمہ:۔ مدت کے بعد ملنا، پھر جلدی جدا ہو جانا عاشق کو مارے ڈالتا ہے۔ اسلئے تم آئے ہی کیوں تھے جو اسقدر جلد جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ (ملک محمد جائسی)

# محبت انگریزی آئینہ میں

*Know that Love is a careless child,*
*And forgets promise past:*
*He is blind, he is deaf when he list,*
*And in faith never fast.*

ترجمہ:۔ دیکھو! محبت کا دیوتا (کیوپڈ) بے پروا بچہ ہے!
وہ پچھلے وعدوں کو بھول جاتا ہے!
وہ اندھا ہے اور جب چاہتا ہے تو بہرا بھی بن جاتا ہے!
وہ وفاداری میں کبھی بھی استوار نہیں ہے!

*But true Love is a durable fire,*
*In the mind ever burning,*
*Never sick, never dead, never cold,*
*From itself never turning.*

ترجمہ:۔ سچی محبت مسلسل بھڑکتی آگ ہے!
جو دل کے اندر ہمیشہ شعلہ زن رہتی ہے!
یہ آتش محبت نہ کم ہوتی ہے، نہ بجھتی ہے اور نہ ٹھنڈی پڑتی ہے!
اپنی فطرت میں لازوال اور ابدیت رکھتی ہے! (نامعلوم)

*What is love? 'tis not hereafter,*
*Present mirth hath present laughter.*

ترجمہ:۔ محبت کیا ہے؟ عیش نقد، مسرت اور قہقہوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ (شیکسپیئر)

*I did but look and love a while,*
*'Twas but for one half-hour,*
*Then to resist I had no will,*
*And now I have no power.*

ترجمہ:۔ میں نے اپنی محبوبہ کو ذرا سی دیر کے لئے پیار کی نظر سے دیکھا تھا۔
یہ صرف آدھ گھنٹے سے زیادہ کی نظارہ بازی نہ تھی۔
اسوقت محبت کی دلستانی کو روکنے کے لئے دل نہیں چاہتا تھا۔
اور اب مجھ میں اس کی برداشت کی طاقت بھی نہیں!

*To sigh and wish is all my ease;*
*Sighs which do heat impart*
*Enough to melt the coldest ice,*
*Yet cannot warm your heart.*

ترجمہ:۔ آہیں بھرنا اور تمنا کرنا اب یہی میرے لئے سرمایۂ سکون ہے!
میری آہیں کچھ اسقدر آتشیں ہیں
کہ وہ سخت ترین تودہ برف کو پگھلا سکتی ہیں۔
لیکن اے محبوبہ! وہ تیرے سرد مہر دل میں محبت کی ذرا سی گرمی بھی پیدا نہیں کر سکتی ہیں۔

*O would your pity give my heart*
*One corner of your breast,*
*I would learn of yours the winning art,*
*And quickly steal the rest.*

ترجمہ:۔ اے محبوبہ! کاش تو مہربان ہو کر میرے دل کو اپنے سینہ کا ایک گوشہ دے دیتی۔ تاکہ میرا دل تیری دلستانی کی ادا کو سیکھ لیتا۔ اور پھر بسرعت تمام تیرے دل پر قبضہ کر سکتا۔

(تھامس اوٹ وے)

*When Delia on the plain appears,*
*Awed by a thousand tender fears,*
*I would approach, but dare not move:*
*Tell me, my heart, if this be love?*

ترجمہ:۔ جب محبوبہ سبزہ زار میں جلوہ گر ہوتی ہے۔
میں ہزاروں ناقابل بیان لطیف جذبات و شبہات سے مغلوب ہو جاتا ہوں۔
میں اس کے قریب ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن قدم نہیں اٹھا سکتا۔
اے میرے دل! مجھے بتا کیا یہ بھی کوئی افسون محبت ہے؟

*Whene'er she speaks, my ravished ear*
*No other voice than hers can hear,*
*No other wit but hers approve:*
*Tell me, my heart, if this be love.*

ترجمہ:۔ جب محبوبہ سرگرم تکلم ہوتی ہے۔ میری نشاط آگیں سماعت
بجز اس کی آواز کے دنیا کی کوئی آواز نہیں سن سکتی۔
میں اپنی خودی گم کر کے اس کی شخصیت میں گویا جذب ہو جاتا ہوں
اے میرے دل! مجھے بتا کیا یہ بھی کوئی کرشمۂ محبت ہے؟ (جارج لٹلٹن)

# محبت اردو آئینہ میں

سہ یاد اس کی خوب نہیں میر باز آ
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے!
لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھا
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
آنے میں اس کے حال ہوا جائے ہے تغیر
سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
منع گریہ نہ کر تو اے واعظ!
مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں؟

نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا؟
مذہب عشق اختیار کیا
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

(میر تقی میر)

# چینی عورت

بقیہ صفحہ ۹۲

کا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ اس زندگی میں بھی ایک بات جو خاص طور پر جاذب نظر ہے وہ ان کی محنت و جانفشانی ہے۔ عورت کو کمزور سمجھا جاتا ہے لیکن چین کی عورتیں جو محنت کرتی ہیں اگر اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مغربی عورتوں کی طرح محض نمائش و زیبائش میں محو نہیں رہتیں بلکہ ملک و قوم کی خدمت اپنی بساط سے زیادہ کرتی ہیں۔

گھر میں عورت جس طرح پرانے زمانہ میں میزبان کے فرائض انجام دیتی تھی اسی طرح آج بھی تواضع کا کام ان کے سپرد ہے۔ گو کہ تواضع کے طریقے الگ الگ ہیں لیکن عام طور پر مہمان کی ممکن خاطرداری کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اور اگر سوئے اتفاق سے اس میں کوئی کسر باقی رہ جائے تو اس کا سارا الزام گھر والی کے سر تھوپا جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے چین میں عورتوں کی تعلیم و تربیت میں یہ بھی اچھی طرح سکھلایا جاتا ہے کہ مہمانوں کو کس طرح خوش رکھا جائے اور ان کی خاطر تواضع کس طرح کی جائے۔ چینی افلاس ضرب المثل ہے اسلئے یہ ظاہر ہے کہ خاطر تواضع میں دولت کو پانی کی طرح بہانا ناممکن ہے۔ لیکن پھر بھی چونکہ مہمان کو بہرحال خوش رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے میزبان کی سلیقہ مندی کا امتحان بڑا ہی کٹھن ہوتا ہے

مختلف وجوہ سے چین کو ہمسایہ ممالک اور اس کے سوا دور دراز کے ممالک بھی اپنے زیر اثر رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف سے روس گھسا آتا ہے تو دوسری طرف سے جاپان دھاوا بولتا ہے۔ خیر یہ تو ہمسایہ ہی ہے لیکن دور دراز والوں کی بھی نظریں جمی ہوئی ہیں اور جہاں موقع ملا امریکی اثرات اور برطانوی اثرات پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ دراصل انہی وجوہ کی بنا پر چین ایک عجیب کشمکش کے عالم میں ہے اور اس کے سماج کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ سماج کے ساتھ ہی کمزور عورت کمزور تر ہو گئی ہے۔ حالیہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں میں مردوں کے دوش بدوش بلکہ بعض چشم دید سیاحوں کے بیان کے موافق مردوں سے زیادہ عورتوں میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ مستقبل قریب چینی عورت ایک مستقل درجہ حاصل کرے گی۔

# لطائف التفاؤل

## دیوان حافظ کی معجز نمائی کے متعلق ذاتی تجربات

(طاؤت کے قلم سے)

قبل ازیں لطائف التفاول کے عنوان سے حافظ کے تاریخی فال بیان کئے گئے تھے گو وہ سب جگ بیتی تھی - وقتاً فوقتاً راقم بھی حافظ سے استفادہ کرتا رہا ہے آپ بیتی ہے سے بھی اڈیٹر "خیام" کے اصرار پر چند نمونہ از خروار حاضر ہے ۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

۱- جب میں نے حافظ کے تفاولی لطائف کتابوں میں پڑھے تو مجھے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی میں نے دیوان حافظ اٹھایا اور دل میں خیال کیا کہ اگر واقعی ان لطائف میں کچھ شائبۂ واقعیت ہے تو خود فال لینے کے متعلق ارشاد ہو۔ کھولا تو یہ شعر سامنے تھا ؎

بنا امیدی ازیں در مرو بزن فالے

بود کہ قرعۂ دولت بنام ما افتد

میں محو حیرت گیا اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً تقریباً ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر دیوان حافظ سے استفادہ میرا معمول ہو گیا۔ اور اکثر صحیح جواب عنایت ہوا۔

۲- ایک دوست بیمار تھے میں اُن کی عیادت کے لئے گیا۔ بہت سے ڈاکٹر بلائے ہوئے تھے۔ مگر کسی نے مرض کی تشخیص نہ کی۔ مجھے خیال گذرا کہ کہیں یہ مرض عشق میں تو مبتلا نہیں - میں نے خود صاحب مرض سے اسکا تذکرہ کر دیا۔ وہ کچھ جھینپے تو سہی۔ مگر اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ دیوان حافظ کے وہ بھی رسیا تھے۔ میں نے کہا حافظ کی گواہی ہو جائے تو مانو گے - انہوں نے کہا۔ البتہ - میں نے حافظ سے استفسار کیا تو یہ شعر جواب میں نکلا ؎

دردِ عشقی کشیدہ ام کہ مپرس

زہر ہجری چشیدہ ام کہ مپرس

مداسے تو دوا سے لست حافظ

لب نوشش۔ لب نوشش۔ لب نوشش

وہ حیرت کی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگے۔ مجھے یہ امید نہ تھی کہ حافظ صاحب اسقدر صاف گوئی سے کام لیں گے۔

۳- ایک دفعہ بحث چھڑ گئی کہ حافظ کے اشعار میں کیا خوبی ہے کہ وہ اس قدر شیریں اور لطیف معلوم ہوتے ہیں جیسے منہ اتنی باتیں۔ اس مجلس میں راقم الحروف بھی موجود تھا۔ میں نے کہا خود حافظ ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیا جاتا۔ سب نے اتفاق کیا۔ دیوان کھولا تو یہ شعر سامنے تھا ؎

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ

بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

۴- ایک صوفی صاحب سے حافظ کی مے نوشی کا تذکرہ آیا تو وہ فرمانے لگے کہ یہ اتہام ہے حافظ نے کبھی بھی شراب نہیں پی - اور اُن کے کلام میں جہاں کہیں بھی شراب کا تذکرہ آیا ہے وہاں شراب حقیقت مراد ہے اور چونکہ مشاہدۂ حق گوئی کی گفتگو میں بھی ؎

نمی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس لئے وہ مے و مینا کے الفاظ استعمال کرتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس کا ذکر کبھی بھی منہ نہیں لگایا۔ میں نے تاریخی حقائق پیش کئے۔ مگر صوفی صاحب نے ایک نہ مانی آخر اتفاق کر میں نے کہا۔ آپ خود حافظ صاحب کی بات مانیں گے - انہوں نے کہا کیوں نہیں - میں نے دیوان حافظ اُن کے ہاتھ میں دیا اور کہا۔ اسے کہیں سے کھولئے - صوفی صاحب نے دیوان کھولا تو سب سے پہلے یہ شعر نکلا ؎

محتسب داند کہ حافظ مے خورد

واصف ملک سلیماں نیز ہم

صوفی صاحب دنگ رہ گئے - اور لطف بالائے لطف یہ کہ صوفی صاحب ایک زمیندار سلیمان نامی کے ہاں نوکر تھے۔

۵- میرے ایک دوست ایک بار ایک پیر کے پھندے میں پھنس گئے - اور اس سے بڑھ کر پھنسے کہ ان کا بچنا مشکل ہو گیا۔ پیر صاحب کو جفر وغیرہ میں خاصا دخل تھا اس لئے بعض باتیں وہ بن پوچھے بتلا دیا کرتے۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا کہ یہ سب دوکان داری ہے۔ مگر وہ اسے کشف و کرامات پر محمول کرتے تھے۔ بہت کچھ نقصان بھی اٹھایا مگر اُن کی عقیدت میں تنزلزل نہ آیا - ایک دن دیوان حافظ سے فال نکالے جا رہے تھے کہ وہ بھی تشریف لے آئے۔ ایک دو باتیں جب صحیح ثابت ہوئیں تو انہوں نے فرمایا۔ بھائی ان فقیر صاحب کے متعلق بھی حافظ صاحب سے پوچھیئے - میں نے کہا آپ حافظ کی بات مان لیں گے - انہوں نے کہا بیشک میں نے دیوان حافظ کھولا تو یہ شعر نکلا ؎

اے کہ در دلق ملمع طلبی ذوق حضور

چشم سیری عجب از بے بصران داری

میرے دوست شرما گئے اور حافظ صاحب کی ایک ہی ضرب کاری سے اُن کی عقیدت کا پہاڑ پاش پاش ہو کر ہباءً منثورا ہو گیا۔

۶- ایک صاحب تازہ تازہ ملازمت سے ریٹائر ہو کر آئے تھے۔ ذوق سخن کچھ یونہی سا تھا۔ کہنے لگے۔ ہماری بابت حافظ سے پوچھیئے کہ اب ہم کون سا کام کریں۔ دیوان کھولا تو یہ شعر سامنے تھا ؎

پس از ملازمت عیش و عشق مہر ویاں

ز کارہا کہ کنی شعر حافظ از بر کن

یہ عقیدت کا کرشمہ تھا یا کچھ اور کہ باوجود تجارت شروع کرنے کی مکمل تیاری کے انہوں نے کام شروع نہ کیا۔ اور اب دیوان حافظ کے تقریباً حافظ اور اچھے خاصے باذوق انسان ہیں -

۷- عید کے دن احباب جمع تھے۔ کہنے لگے بولو کیا کھلاتے ہو۔ میں نے کہا جو کچھ حافظ صاحب فرمائیں - ایک صاحب نے دیوان اٹھا کر کھولا تو یہ شعر نکلا ؎

روز عید است و من امروز در آں تدبیرم

کہ دہم حاصل سی روزہ و ساغر گیرم

میں نے چائے کے دور سے ساغر گیری کی شرط پوری کرائی اور احباب یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے ؎

بہار آئی ہے اور ہم کو نصیحت ...

پیالہ چائے کا جام شراب ہو ... کا

باقی برصفحہ ۹۶

## ملکہ زرینہ کی داستان محبت

### بقیہ صفحہ ۹۷

نہ لیے نکلی تو رڈلف اچانک اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور اپنی آواز میں مصنوعی مسکراہٹ کی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"تمہاری طلسمی نگاہ غلط انداز کا شکار تمہارا ملازم ہے۔ فریب کے تمام پردے اب چاک ہوگئے ہیں اور مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم الیکس شہزادی ہو — الیکس شہزادی —"

شہزادی کے چہرے کا شہابی رنگ شل کا نور اڑ گیا اور تاسف کے باعث اس کی صندلی انگلیاں آپس میں پیوست ہو کر رہ گئیں۔

"یہ کون ہے؟ — یہ کون ہے؟" بوڑھی معلمہ چلائی۔

لیکن اس کی آواز کی منتشر لہریں رڈلف کے بلند قہقہوں میں گم ہوگئیں۔ شہزادی کے سر پر یاندھ حریری قبا کو زور سے حرکت پیدا کرتے ہوئے آسمان کی طرف اٹھے اور اس کی ترحم آمیز نگاہیں رڈلف کے متبسم چہرے پر مرتکز ہوگئیں۔ مگر وہ یہ کہتا ہوا کہ — "الوداع شہزادی! الوداع! اچھا ہوا کہ یہ کھیل جلدی ختم ہو رہا ہے — الوداع" جلدی سے ایک سمت کو روانہ ہوگیا اور آہستہ آہستہ اس کے طعنہ آمیز قہقہے فضا میں ڈوب کر رہ گئے۔

"یہ کون تھا —؟" ہر ٹوفیلڈ نے نفرت انگیز نگاہوں سے جدھر وہ گیا تھا دیکھتے ہوئے زور دار آواز میں پوچھا۔

شہزادی نسیم کے ایک ساکن جھونکے کی طرح ساکت و جامد کھڑی رڈلف کے ہوتے ہوئے مدھم ہوتے ہوئے قہقہے کو سن رہی تھی اس نے فضا میں حسرت ناموسیقی کی لہریں پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی پاگل! — دیوانہ"

تمام دلی جذبات شہزادی کے چہرے پر منقش ہوگئے اور بوڑھی معلمہ وہ راز پاگئی جو رڈلف اور الیکس کے دلوں پر مسان کے چہروں اور آنکھوں میں نمایاں ہوگیا تھا۔

رڈلف لندن چلا گیا — جہاں اس بجر روح نیت کی لاش ایک ہوٹل میں پائی گئی۔ اس نے اس لئے خودکشی کی کہ شہزادی سے ایک معمولی نوجوان کا شادی کرنے کا خیال یقیناً احمقانہ تھا لیکن اس کی وفات کا جو وحشت زا اثر شہزادی پر پڑا اس کا حال ناقابل بیان ہے۔ اس نے درد و کرب سے بے چین ہو کر اپنے چہرے کو کافوری ہاتھوں سے ڈھانپ لیا گویا وہ اپنی گذشتہ زندگی کے ان واقعات کو جنہوں نے اس کی تمام مسرتیں چھین لی تھیں چھپا لینا چاہتی تھی۔

دراصل شہزادی ایک مجسمہ غم و اندوہ بن کر رہ گئی تھی لیکن واقعات نے مد و جزر کی طرح عجیب و غریب پلٹے کھائے۔ اور الیکس زار روس کے ہلاکت بار آغوش میں شہزادی گئی اور الیگزنڈرا کے مشہور عالم نام سے موسوم ہو کر ایک ہولناک مست ہوا شعلہ بن گئی — جس نے روس کو آگ اور خون کے سمندر میں دھکیل دیا۔

## لطائف التفاؤل بقیہ صفحہ ۹۵

۸ — ابھی سر فضل حسین مرحوم زندہ تھے اور دگر ایں وزارت فلی کے معاملہ میں ان کے اور سر سکندر حیات کے مقابلہ کی ہم سے گرماں ہو رہی تھیں ایک دوست نے کہا۔ ذرا حافظ سے تو پوچھو کہ ان دونوں میں کون زیادہ مستحق ہے۔ میں نے دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا ؎

سکندر را نمے بخشند آبے
بزور و زر میسر نیست ایں کار

اور جہاں تک مجھے یاد ہے اسی دن یہ خبر آئی تھی کہ سر سکندر حیات ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر ہو کر جا رہے ہیں۔

۹ — سر فضل حسین کی وفات کے دن دیوان حافظ کھولا تو سب سے پہلے اس شعر پر نظر پڑی ؎

راستی خاتم فیروزہ بو اسحاقی
خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

۱۰ — سر فضل حسین کے بعد پنجاب کے لیڈر عارضی طور پر سر چھوٹو رام ہو گئے۔ احباب نے اصرار کیا کہ ان کی بابت حافظ سے دریافت کیا جائے میں نے دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا ؎

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

۱۱ — الیکشن کے زمانہ میں ڈاکٹر عالم کی حمایت کے سلسلہ میں مرد ناظر حسین شاہ بڑے جلال پور جلالاں میں پٹ گئے تھے۔ نگران کی منتقل مزاجی اور صبر کا یہ عالم تھا کہ پٹتے پٹتے بھی تقریر کر آئے۔ اس جلسہ کے بعد حافظ سے استفسار ہوا کہ کامیابی کس کی ہوگی تو یہ شعر نکلا ؎

صبر و ظفر ہر دو دوستان قدیم اند
بر اثر صبر نوبت ظفر آید

ہم سمجھ گئے کہ سید حبیب کی کامیابی ناممکن ہے اور آخر نتیجہ نکلا تو ہمارا خیال صحیح ثابت ہوا۔

۱۲ — جس دن یہ خبر آئی کہ گاندھی نے ملکوٹ کے معاملہ میں انگریز جج کی ثالثی منظور کر لی ہے اس دن یاروں میں سارا دن بحث رہی۔ اور بحث کا موضوع گاندھی کی نیک نیتی تھی۔ کافی رد و کد کے بعد حافظ کی طرف رجوع کیا گیا۔ تو انہوں نے گاندھی جی کی نیک نیتی کا بھانڈا یوں فرما کے بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا ؎

ایں تصرف عجب شنو از بخت واژگوں
مارا بکشت یار بانفاس عیسوی

# زارینہ ملکۂ روس کی داستانِ محبت

## تاریخِ روس کا ایک لذت آفریں رومانی باب

از عبدالرحیم شبلی، بی کام

آسٹریا کی سیاحت کے بعد جرمن شہزادی "ایلکس" جس کا تبسم حُسن چاند کی طلعت ریزیوں سے بھی کیف بخش تھا اور جس کے طُرۂ طلائی نے کئی شہزادوں کو اپنا اسیرِ دام بنا رکھا تھا اُن دنوں اٹالیہ کی خوش مذاق ملکہ کے ہاں مہمان تھی اور اب روم کی سیر و تفریح سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔

"روم" ــــ وہ عشقِ ازلی کے دیوتاؤں کا معبدِ اعظم، جہاں حسن کی دیویاں اپنی حشر در بغل انگڑائیوں سے لوگوں کو مسحور و متکیف کر دیا کرتی تھیں اور دوشیزائیں حلقہ در حلقہ ــــ عنبر سے زیادہ سیاہ زلفوں کو اپنے مرمریں شانوں پر بکھیرے سورج کی اولیں شعاعوں کا استقبال کیا کرتی تھیں ــــ یہ سمجھ کر کہ دیوتائے عشق کی مقدس آنکھوں کا نور آہستہ آہستہ ضیا افگن ہو رہا ہے اور وہ ہمارے نازک اور گداز جسموں میں حلول کر جائے گا۔

ــــ تاریخِ عالم میں ایک رومان آفریں باب کا اضافہ کرنے والا تھا۔

کیف آور چاندنی میں لپٹی ہوئی رات صبح کے لطیف دھندلکوں میں تبدیل ہو گئی اور روم کی مست شباب حسینانِ زہرہ جبین اپنے سحر طراز سینوں کے اُبھار کو نمایاں اور گھنگھریالے گیسوؤں کو اپنے نقرئی کندھوں پر منتشر کئے بازاروں میں گھومنے لگیں۔ شہزادی ایلکس نے جب قصرِ شاہی کی ایک کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو اس کی سحر کار آنکھوں کے سامنے فرحت و کیف سے مملو نظارے ابھر آئے۔

"کیا روم کی ہر صبح ایسی ہی دلفریب ہوتی ہے؟" اس نے خادمہ کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا اور خود اس حسین تصور میں مست موسیقی کی طرح جھومنے لگی ــــ

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وادیٔ نیل کے سبزہ زاروں پر رقص کرنے والی پریاں اپنا جشنِ سالگرہ منا رہی ہیں۔"

"آج ایک مشہور میلہ ہے۔ اس جشن میں روم کی عورتیں خاص بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ دراصل اس روز بہادر رومیوں نے اپنے دشمنوں پر ایک شاندار فتح پائی تھی۔ یہ میلہ اسی فتح کی یادگار ہے۔"

میلہ کا نام سن کر کمسن شہزادی جو ابھی اٹھارہ برس کی ایک نوخیز حسینہ تھی یہاں کے فردوس صفت مناظر کی سیر کے لئے بیتاب ہو گئی اور پھر وہ سوداگر لڑکیوں کا بھیس بدل کر موسم بہار کے تیز شعلوں کی مانند ــــ اپنی کافوری انگلیوں کو عود و عنبر سے مسرور زلفوں کے ایک حلقہ میں اُلجھاتے ہوئے سیرگاہ کی طرف روانہ ہو گئی ــــ جرمن کی نوخیز و حسین کنواریوں کی طرح مست خرامِ ناز ہو کر ــــ

وہاں منظر نہایت ہی فرحت آمیز تھا، نیلے پانی کے ایک تالاب پر سورج کی سنہری کرنوں کا انعکاس ہو رہا تھا۔ فضا یکسر معمورِ حسن و جمال تھی۔ رومی دوشیزائیں اپنے طرح طرح کے رنگیلے اور ریشمی لباس سے وہاں قوسِ قزح کا سا رنگین نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ نوجوانوں کے شباب کی تلطف زا کیفیتوں سے ہم آہنگ نغمے تماشائیوں کے شور و غل میں اس طرح گم ہو رہے تھے جس طرح غروبِ آفتاب کے وقت روشنی کی آخری کرنیں سیاہیوں کے جنگل میں تڑپ کر رہ جاتی ہیں۔

شہزادی نے اپنی کہربائی آنکھوں سے ان حیات افروز مناظر کو دیکھا اور اپنے خیالات کو روم کی فراتی دلفریبیوں میں گم کر دیا۔ اچانک تماشائیوں کے ایک زبردست ریلے سے شہزادی لڑکھڑا گئی۔ اس ہجوم میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ سینے میں ایک عجیب بھاگڑ سی پڑ گئی تھی۔ اس کا سر گھومنے لگا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ دو نوجوانوں نے اسے اٹھا کر آدمیوں کے بے پناہ ہجوم سے باہر نکالا اور ایک ہوٹل میں پہنچا کر اسے ہوش میں لائے۔

اس نے اپنی نقرئی کلائیوں کو ایک محبوبانہ انداز سے حرکت دیتے ہوئے اپنے مہربانوں کا شکریہ ادا کیا۔ جرمنی نوجوان "رڈلف ڈینڈ راف" جو اپنے اطالوی ساتھی "مکار ریو لونی" سے نسبتاً بہت نذیذ خوبصورت تھا شہزادی کی ان طلسم زائیوں سے بالکل مسحور ہوا جا رہا تھا جو اس کی بادامی آنکھوں میں رقص کر رہی تھیں وہ ان سے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کرتی ہوئی محل میں واپس آ گئی۔

دوسری ملاقات میں شہزادی نے خود کو ایک سوداگر کی لڑکی ظاہر کیا۔ دراصل وہ "رڈلف" کی والدہ خیدا ہو چکی تھی اور اس کے بعد اس نے "پیٹر ٹبور ریا ہوٹل" میں پوشیدہ ملاقاتیں جاری رکھیں۔ لیکن افسوس سرور انگیز لمحات بہت جلد گذر جایا کرتے ہیں۔ شہزادی کے والد کا تار آ گیا کہ واپس آ جاؤ۔ وہ ایک مجروح ہرنی کی مانند تڑپی۔ محبت کے لطیف در رنگین احساسات جدائی کی تلخیوں میں ڈوب کر رہ گئے۔ جب وہ اپنے محبوب سے رخصت ہو رہی تھی تو اس کے زمرد کی شعاعوں کی طرح دمکنے والے عارض پر غم و اندوہ کی ایک سفیدی مائل لہر دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں سے شبنم کی مانند آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

ایلکس کا حُسن جو کسی چشمے کے پانی کی طرح مصفا تھا جرمنی میں واپس آ کر روز بروز فراقِ محبوب سے درد و کرب کے طغیان بحر میں ڈوبنا شروع ہو گیا اس کے خیالات سحابِ منتشر کی طرح آوارہ رہنے جب وہ زیادہ غمگین و ملول ہوتی اور یادِ محبوب میں آہ و بکا کرتی تو اس کی آنکھوں میں محبت کا ایک مقدس نور جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ــــ میڈم جعیند جو کاؤنٹ کیمز کی حسین و جمیل سہیلی تھی اور جس نے شہزادی کے ساتھ ہی تعلیم پائی اور سیر و سیاحت میں بھی اس کی رفاقت کی شہزادی کی واحد رازدار تھی۔ وہ ہر ممکن طریق سے شہزادی کو بشاش و خندہ ریز رکھنے کی کوشش کرتی۔ اس کے آلامِ فراق میں طرب و نشاط کی دلفریبیاں پیدا کرنا چاہی لیکن آہ، وہ عیش و تنعم کے زعفران زاروں میں اپنے لئے مسرت کی ایک ہلکی سی جنبش بھی نہ پاتی۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے گلاب کو شرما دینے والا رنگ ان ہلکے نیلے مائل طیور کی مانند ہونا شروع ہو گیا جو موسمِ برشگال میں پال کشا ہوتے ہیں۔

جب کبھی "رڈلف" کا خط آتا، شہزادی خوش ہوتی اور مسرت میں بہار کے رنگین پھول کی طرح جھوم جاتی ــــ "رڈلف" بھی اس کی ہرنی کی سی آنکھوں کا بری طرح شکار ہو چکا تھا۔ جب وہ سرزمینِ روم میں شہزادی کے بغیر رہتا رہتا اکتا گیا اور اس کے ایامِ فرقت ــــ ضبط و صبر کی ناقابلِ برداشت حدود سے باہر ہو گئے تو وہ اپنی محبوبہ شہزادی کے دیدارِ حسن کے لئے جس کو وہ ایک خوش نصیب سوداگر کی لڑکی سمجھتا تھا جرمنی آ پہنچا ــــ!

ایلکس اس کی آمد پر بیحد مسرور ہوئی اور اس نے پہلے کی طرح اپنا بھید اب بھی آشکار نہ ہونے دیا۔ وہ جرمن کی عام کنواریوں کے بھیس میں اسے ایک ہوٹل میں ملتی رہی اور عاشقانِ باوفا کی ان ملاقاتوں کے دوران میں شہزادی کی رازدان رفیقہ ہر طرح انہیں مدد دیتی رہی حتیٰ کہ جب ایلکس کی غیر حاضری کی خبر اس کے والد گرانڈ ڈیوک کو پہنچی تو میڈم جیند نے ایک نہایت مکارانہ کھیل کھیل کر شہزادی کے راز کو ظاہر ہونے سے بچا لیا۔

شہزادی ایلکس نے اپنے محبوب کی گردن میں اپنے نگاریں بازو حمائل کر دیئے اور اس کے عارضِ دلفریب پر حسن و جمال کی رنگینیاں ایسا منظر دکھانے لگیں کہ معلوم ہوتا تھا نسیمِ صبح گاہی سے بھی بڑھ کر معطر جھونکے ــــ مہتاب سے بھی زیادہ طلعت زا نور اور مئے ارغوانی سے بھی کہیں زیادہ شوخ رنگینی کسی آسمانی موسیقی کی جنبش ہائے موج سے متاثر ہو کر باہم منجمد ہو گئی ہیں اس کے حسن کیف بخش سے تمام ارضی اثرات عنقا کی طرح غائب ہو گئے اور وہ مجسم نورِ سماوی بن کر رہ گئی ہے۔

رڈلف نے الکس کی بادہ ریز گردن میں جو مینائے مرمریں کا سا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ جب اپنے مرتعش ہاتھ حمائل کر کے اُسے بتایا کہ وہ انگلستان کے عظیم الشان شہر لندن میں جا رہا ہے تو عین جس طرح شعاعِ آفتاب کے اثر سے بنفشہ کے پھول سرجھا جاتے ہیں۔ یہ خبر سُن کر شہزادی کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اور اس کی نرگسی آنکھوں میں صبح کے ستارے کے مثل دو آنسو لرزنے لگے۔ اور اس کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر ایک آہِ جگر پاش کے ساتھ رخصت ہوئے۔

دوسرے روز شہزادی جب بہت زیادہ غمگین تھی تو وہ اپنی رازدان رفیقہ اور اپنی بوڑھی مکار معلمہ "ہر تو نیلڈ" کے ساتھ جس کی موٹی موٹی آنکھوں میں عیارانہ بدکاری کی چمک کسی آسیب کی طرح ناچتی رہتی تھی اپنے شاہی لباس میں سیر

باقی برصفحہ ۹۶

# محبت کے آنسو

از حضرت فطرت واسطی

**حبسِ غم**

اس قدر حبس ہے سینے میں کہ روتا ہے ضرور | آج آلام کو اشکوں سے ڈبونا ہے ضرور
جتنے منہ اتنی زبانیں یہ تغیر ہے لیکن | غم کے ہاتھوں جو نہ ہونا تھا وہ ہونا ہے ضرور

**حدیثِ غم**

غرقِ تخئیل ہوں اور عیش و خوشی سے آزاد | بے خوشی ہوش مرا اور خوشی فریاد
جب ستاتا ہے بہت مجھ کو غمِ ایشیا | آنسوؤں سے تمہیں تنہائی میں کرتا ہوں یاد

**مجھے نہ سمجھائیے**

میں ہوں غم کی نوازشوں کا امیں | عاشقی کی خلش مٹی ہے کہیں
چھوڑیئے میرے حال پر مجھ کو | میں نہ روؤں یہ مجھ میں تاب نہیں

**نالۂ غم**

قلب میں گرمیٔ انفاس نہیں ہے امروز | روح میں زیست کا احساس نہیں ہے امروز
منزلِ عشق تھی اے وائے مری ناکامی | میری شیپا ماہی مرے پاس نہیں ہے امروز

**احساسِ شکست**

مجھ سے مرے احباب بھی منہ موڑ رہے ہیں | بے یار و مددگار مجھے چھوڑ رہے ہیں
وابستہ ہے ہستی مری جن لوگوں سے فطرت | افسوس کہ وہ بھی مرا دل توڑ رہے ہیں

# آبشار

از جناب خواجہ رونق لطیفی صاحب کانپوری

ہے رواں اشعار کی مانند نغمے کی مثال
وادیوں میں یا کسی آہو کا "بے پروا خرام"
چاند کی "سیال چاندی" یا "ستاروں کی زمیں"
یا کسی بھولے ہوئے افسانۂ ماضی کی یاد
چاند تاروں کا محافظ ہر کرن کا پاسباں

بانسری کی لے ہے، یا دوشیزہ کی مستانہ چال
ساقیٔ نوخیز کے یا ہاتھ میں گلرنگ "جام"
تابشِ انوار ہیں یا ایک "دنیائے حسیں"
زندگی کے واسطے یا کوئی پیغامِ جہاد
نور کا اک قصرِ رنگیں "حسنِ فطرت کا جہاں"

(۲)

ہے کسی جانب رواں انگڑائیاں لیتا ہوا
سینچتا ہے جنکو تو اے دامنِ ابرِ بہار
عظمتِ دیرینہ کے پوشیدہ ہیں تجھ میں نشاں
کر چکا ہے یا کسی دیوی سے تو بھی گفتگو

حسن کے دریا میں کشتی نور کی کھیتا ہوا
ہیں مرے محبوب کو مرغوب انہیں پھولوں کے ہار
کس قدر پاکیزہ تر ہے تیری رنگیں "داستاں"
میری صورت کیا تجھے بھی ہے کسی کی جستجو

زندہ باد اے میری دیرینہ محبت کی بہار
لے سلامِ آخری اب مجھ سے تو اے "آبشار"

# افکارِ آزاد

از جناب ڈاکٹر آزاد لکھنوی

حکومت تو ہے کامرانی نہیں ہے
جوانی تو ہے شادمانی نہیں ہے

جوانی جوانی۔ جوانی نہیں ہے
جوانی اگر جاودانی نہیں ہے

بیاں کیا جو جادو بیانی نہیں ہے
وہ تلوار کیا جس میں پانی نہیں ہے

میری آپ بیتی ہے سنکر تو دیکھو
فسانہ نہیں ہے کہانی نہیں ہے

غمِ دوست سے زندگی زندگی ہے
یہ جس دن نہ ہو زندگانی نہیں ہے

جہاں سے جہاں میرا بالکل جدا ہے
وہاں ہوں جہاں شادمانی نہیں ہے

بری ہے تکلف سے ہر حسنِ ذاتی
اگر حسن ہے حسن فانی نہیں ہے

ازل سے ہوں میں کشتۂ یاس و حرماں
بلا یہ کوئی ناگہانی نہیں ہے

یہ جلوے۔ یہ نقشے۔ یہ عشوے۔ یہ غمزے
خدا کی قسم کوئی ثانی نہیں ہے

ہمارے لئے غم ہے غم کے لئے ہم
ہماری جوانی جوانی نہیں ہے

یہ ساغر میں میرے جو رقصاں ہے ساقی
پری ہے مئے ارغوانی نہیں ہے

# چاکلیٹ

## عشق و محبت کی سچی دلاویز کہانی

(از جناب شفیق الرحمٰن صاحب متعلم میڈیکل کالج لاہور)

آپ نے چاکلیٹ ضرور کھایا ہوگا، یا دیکھا ہوگا۔ اگر نہیں تو کبھی کبھار سنا ہی ہوگا۔ اگر اب بھی آپ "نہیں" کہیں تو مجھے آپ کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے اور میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ پہلی فرصت میں کسی چاکلیٹ والے کی دکان پر جا کر چاکلیٹ کھائیے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک بار سونگھ ہی لیجئے۔ چاکلیٹ ایک سنہری سے رنگ کی مٹھائی کا نام ہے۔ جسے بڑے اہتمام سے طرح طرح کے رنگ برنگے کاغذوں میں لپیٹا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات تو پیکنگ میں سے تصویریں بھی نکلتی ہیں۔ چاکلیٹ کو ایک تو بچے بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور دوسرے "صاحب لوگ" خواہ وہ سفید رنگ کے ہوں یا چاکلیٹ رنگ کے۔

میں بچپن سے چاکلیٹ کا عاشق تھا۔ مگر ایک مرتبہ ایک چاکلیٹ نے میری کافی مدت کی محنت کو برباد کر ڈالا، وہ دن اور آج کا دن — میں نے پھر کبھی چاکلیٹ نہیں چکھا۔

### ۱ — فلسفۂ عشق

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں نے پیتھالوجی پڑھنی شروع کی۔ دنیا بھر کی بیماریوں کے بارے میں طرح طرح کی تھیوریاں! عجیب عجیب نظریئے پڑھے یکایک مجھے خیال آیا کہ محبت سے بھی انسان کے نظام میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ حالت جو کسی نظام کو الٹ پلٹ کرے یا کرنے کی کوشش کرے بیماری ہوتی ہے۔

بس یکلخت ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں دوڑ گیا — کیا محبت بھی ایک بیماری ہے؟

"ہے! — اور واقعی ہے!"

میرے دل نے کہا۔ مگر پیشتر اس کے کہ اس تھیوری کو طبی دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اس کے لئے ثبوت درکار تھے۔ لہٰذا میں نے مختلف نظریئے بنائے۔ اوّل تو یہ کہ محبت کے وجوہ کیا ہیں؟ کس قسم کے انسانوں، کیسی آب و ہوا اور کیسے ماحول اور موسم میں یہ بیماری پھیلتی ہے۔ بعد ازیں اس بیماری کے جراثیم دریافت کرنے تھے۔ اور آخر میں علاج غالباً کوئی ویکسین (VACCINE) ٹیکے کے لئے۔ یہ ایک بہت بڑی ریسرچ تھی۔ چنانچہ میں نے آہستہ آہستہ کام شروع کیا۔

پہلے پہل تو میں نے محبت کا لٹریچر پڑھنا شروع کیا مگر مجھے معلوم ہوا کہ حالات میرے خلاف تھے۔ افسانوں میں ہیرو نہایت حسین ہوتا تھا۔ لمبا تڑنگا، خوبصورت ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں، گلابی رنگ، غرضیکہ حسن مردانہ کا مکمل ترین نمونہ، اور بعد کھلاڑی، بہترین تیراک، جو ہیروئن کو دریا میں سے نکال لائے! شاعر، مضمون نگار، بہترین دماغی قابلیت کا مالک، اور سب سے بڑی بات یہ کہ کسی بہت بڑے امیر کا لڑکا۔ مجھے بڑی تشویش ہوئی کہ اس قسم کا انسان تلاش کرنا چاہیئے۔ کوئی مہینہ بھر سائیکل لے کر لاہور کی تمام سڑکیں چھان ماریں۔ سینما، باغ، بازار، گلیاں غرضیکہ مجھے ہر جگہ اپنے آدمی کی تلاش رہتی تھی۔ مگر مجھے اس حلیہ کا کوئی آدمی نہ ملا۔ سارے دن کی آوارہ گردی کے بعد بمشکل پانچ چھ آدمی کام کے نظر آتے تھے مگر جو لمبے تڑنگے تھے ان کا رنگ سیاہ تھا۔ اور جو خوبصورت تھے وہ کل پانچ فٹ کے تھے۔ جو کھلاڑی تھے وہ بدصورت تھے۔ جو شاعر تھے وہ تپ دق کے مریض معلوم ہوتے تھے۔ اور جو بہت بڑے امیر زادے معلوم ہوتے تھے وہ یا تو ایسے تھے کہ پھونک مار دینے سے اڑ جائیں۔ اور یا ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بلا رکھا ہے۔ ان میں زیادہ تعداد بیلتو حضرات کی تھی۔ بسم اللہ ہی غلط نکلی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ اس قسم کا آدمی دنیا میں ملنا محال ہے اس لئے محبت سرے ہی سے غلط ہے۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ریسرچ میں کامیابی کافی ناکامیاں کے بعد میسر ہوتی ہے۔

اب ہیروئن کی تلاش ہوئی کہ بوٹا سا قد، منہ سرے ہی سے غائب۔ کمر اتنی کہ مٹھی میں آ جائے۔ آنکھوں سے ہر وقت لپکتے ہوئے شعلے نکلیں۔ مسکراہٹ ایسی کہ دھڑا دھڑ بجلیاں گریں۔

قصہ مختصر کہ ایسی لڑکی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

اب اسے چھوڑ کر نمبر دو ریسرچ شروع کی۔ وہ یہ کہ محبت کیا ہے؟ کسی نے کہا کہ ایک آسمانی عطیہ ہے کوئی کہنے لگا کہ خدا کا دوسرا نام ہے۔ کسی نے کہا کہ محض غلط فہمی ہے۔ ایک صاحب بولے۔ محض بکواس ہے۔ چنانچہ یہ بھی گڑبڑ ہو کر رہ گئی۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ محبت کس طرح کی جاتی ہے افسانوں میں پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں آنکھیں لڑیں تو یکلخت محبت ہو گئی اور دونو خودکشی پر آمادہ ہو گئے لڑکے نے ایک لمبا سا خط لکھا اور ادھر لڑکی بھی محبت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ ملے تو سہی۔ اگر وہیں محبت نہ کر ڈالی تو نام نہیں۔ یا تو دوسرے ہی مہینے شادی ہو گئی۔ ورنہ کسی تالاب میں شہیدانِ محبت کی لاشیں تیرتی ہوئی پائی گئیں۔ کسی کا باندی میں ملبہ گر پڑا۔ ایک نوجوان نے اٹھا کر دے دیا — بھڑام سے محبت ہو گئی۔ بازار میں کیچڑ تھا۔ ایک لڑکی کا پاؤں پھسلا اور پیشتر اس کے کہ وہ ایک نفیس سی قلابازی کھائے ایک نوجوان نے اسے تھام لیا۔ محبت ہو گئی۔ سینما میں محبت ہو گئی۔ کالج میں محبت ہو گئی۔ سڑک پر محبت ہو گئی۔ کوتوالی میں محبت ہو گئی۔ غرضیکہ جہاں بھی ایک نوجوان لڑکی اور ایک لڑکا آپس میں ملے محبت کا امکان ہو گیا۔

اب جو میں نے آپ بیتیاں سننی شروع کی ہیں تو معلوم ہوا کہ ہر بچہ عشق میں مبتلا ہے یا ایک آدھ مرتبہ عشق کر چکا ہے۔ بچے سے بوڑھے تک کیوپڈ کا شکار بن چکے ہیں۔ کبھی تانگے میں بیٹھے ہوئے کسی تانگے والے سے دو چار باتیں کیں اور پھر مسکرا کر پوچھا۔

"کیوں بھئی کبھی کسی سے آنکھ بھی لڑی؟"

اب خواہ سارے شہر کی سیر کر لی جائے خواہ دیسے ایک پیسہ بھی نہ دیا جائے۔ مگر وہ اپنی داستانِ محبت ضرور بالضرور سنائے گا اور سنا کر بیٹھے گا۔ ٹھنڈی آہیں بھرے گا۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہے گا۔

"جناب کئی مرتبہ جی میں آیا کہ اپنے ہاتھوں خودکشی کر لوں۔ مگر پھر دو چار بھوکوں کا خیال آ جاتا ہے مجبوراً تانگہ چلا رہا ہوں۔ ویسے دنیا تو یہ سمجھتی ہے کہ میں مزے میں ہوں۔ جب میں گھوڑے کو گالیاں دیتا ہوں تو میرا دل کسی کی زلف میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔" پھر وہ ایک آدھ شعر عشقیہ پڑھے گا۔

اگر اسٹیشن پر آپ کو رات بھر ٹھہرنا ہے تو ایک قلی کو ایک آدھ سگرٹ پلا دیجئے پھر انگڑائی لے کر کہیئے۔

"آہ کیسی سیاہ اور بھیانک رات ہے (خیال رکھیئے کہ کہیں چاند تو نہیں نکلا ہوا) خدا جانے عاشقوں کی رات کیسے کٹے گی؟"

بس پھر صبح تک آپ ہیں اور اس قلی کی داستانِ محبت! — ساری رات سنیئے اور خوب داد دیجئے علی الصبح وہ داستان لکھ کر کسی رسالے میں چھپوا دیجئے چاروں طرف سے واہ واہ ہو گی۔

عشاق حضرات کا سب سے زیادہ ہجوم کالج میں ملا۔ کالج میں کسی لڑکے سے علیک سلیک ہوئی اور اس نے اسی وقت اپنی محبت کے بارے میں ریویو کر ڈالا۔ کوئی خوبصورت سا لڑکا اگر یہ بات سنائے تو کچھ بات بھی ہوئی۔ اس سے کہہ دیں کہ "ہاں بھئی تو مزہ دو سنا۔" مجھے یہ باتیں سچی ہیں ضرور ایسا ہوا ہوگا۔ مگر میں نے ایسے ایسے کالے بھجنگ اور عجیب الخلقت لوگوں کو عشق کرتے دیکھا ہے کہ بس حیران سا رہ گیا۔

اور پھر یہ نہیں کہ محبت صرف ادھر ہی سے ہو اور یکطرفہ کارروائی عمل میں لائی گئی ہو۔ بلکہ لڑکی کی طرف سے بھی ضرور دارِ عشق جتلایا جاتا ہے۔ مثلاً جب میں چلنے لگا تو اس نے میرے کوٹ کا کالر پکڑ لیا اور کہا۔ "اب تمہارے سوا میرا کون ہے جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح چاند سا مکھڑا بھی دکھانا" (یہ حضرت کالے رنگ کے تھے)

وہ بولی:۔

"اگر دیوالی کی چھٹیوں پر گھر نہ آئے تو مجھے جیتا نہ پاؤ گے"

وہ کہنے لگی:۔

"خدا کے لئے میرے لئے تھوڑی سی افیم یا کوئی زہر لا دو کہ مجھے تمہارے ہجر سے نجات ملے" وغیرہ وغیرہ۔

خدا جانے ان قصوں میں سچ کتنے فیصدی ہوتا ہے۔ اور کتنے عاشق حضرات محض جاپانی تھے مگر سوال تو یہ تھا کہ نہ تو سارے کے سارے سچے ہی ہو سکتے ہیں اور نہ سارے جھوٹے ہی۔

اب میں نے ریسرچ ایک نئے طریقے سے شروع کی۔ وہ یہ کہ ایک چارٹ سا بنا لیا جس میں پہلے تو عنوان تھے اور آگے نتائج کے لئے خانے خالی چھوڑے ہوئے تھے۔ انہیں پُر کرنا تھا۔

#### مثال

| نمبر | عنوان | نتائج | کیفیت |
|---|---|---|---|
| ۱ | محبت اور دولت | دولتمند مفلس | (یہاں نتیجہ ہوگا) |
| ۲ | محبت اور تندرستی | ہٹا کٹا - مریل | |
| ۳ | محبت اور قد | لمبا تڑنگا - بونا | |
| ۴ | محبت اور مدت | پہلی نگاہ پر - دیر میں - وغیرہ | |

اسی طرح سب سے آخر میں آتا تھا "محبت اور شکل"۔

اب باقاعدہ ریسرچ شروع ہوئی۔ مگر مشکل تو یہ تھی کہ جہاں ایک ثبوت کسی بات کے حق میں ملتا تھا وہیں اس کے خلاف بھی کئی ثبوت ملتے تھے۔

مثلاً یہ دیکھا گیا کہ لڑکیاں امیر لڑکوں کو چاہتی ہیں۔ مگر ہزاروں مثالیں ایسی تھیں کہ انہوں نے بھک منگوں تک کو پسند کر ڈالا تھا۔ اسی طرح اچھی بھلی لڑکیوں نے مریل لڑکوں کو پسند کر لیا تھا پھر سوال یہ تھا کہ محبت یکلخت پیدا ہوتی ہے یا مدت میں۔ کئی جگہ تو یہ معلوم ہوا کہ آدھ گھنٹے سے پہلے پہلے محبت ہو چکی تھی۔ اور کئی جگہ پانچ پانچ سال تک لگ گئے تھے۔

میں بالکل ناامید سا ہو گیا۔ آخر کار میں نے آخر والے عنوان یعنی "محبت اور شکل" کو حاصل ریسرچ سمجھا اور فیصلہ کر لیا کہ جو بھی نتیجہ نکلا۔ بس وہ آخری ہوگا۔

### ۲ — ماسٹر صاحب

آخر چھٹیاں ہو گئیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی

کہ اب اچھی طرح سے ریسرچ ہو سکتی۔ مگر بیچو رہے۔ پہلے میں نے اپنے پرانے کمرے پر قبضہ جمایا۔ چند سال پہلے یہ کمرہ میرے قبضے سے نکل گیا تھا۔ وہ یوں کہ ہمارے پڑوس میں ایک پولیس انسپکٹر آ گئے تھے۔ جن کے ہاں پہرا اس قدر سخت تھا کہ چرند پرند۔ مزفیشکر کوئی جاندار کمرہ پاس نہیں بھٹک سکتا تھا۔ انہوں نے آتے ہی مکان کی موجودگی کی اور اچھی طرح سے معائنہ کیا کہ کہیں سے کوئی کچھ دیکھ تو نہیں سکتا۔ میرے کمرے کی ایک کھڑکی ان کی چھت پر کھلتی تھی۔ اور ویسے بھی میں کالج کا لڑکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کہلا بھیجا کہ کھڑکی بند کر دی جائے اور اس میں تالا لگوا کر چابی انہیں دے دی جائے۔ مجھے کمرے سے نکال دیا گیا۔ پھر تو یہ ہوا تھا اور انداز کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی تھی وہ یہ کہ جلد ہی یا مہینے اندر اندر ان کا بیٹا ان کی بھاگی کر یا لڑکا ان کا بھائی ان کی بیٹی کو لے کر بھاگ گیا۔ بڑے اطمینان سے ریل میں بیٹھ کر گیا ہوگا۔ کچھ ہفتوں کے بعد انہوں نے مکان چھوڑ دیا اور ان دوسرے کرایہ دار آ گئے۔

ایک دن میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ مجھے کہیں باہر جانا تھا۔ یکایک چھت سے [illegible] آئی اور میرا ہیٹ قلابازیاں کھاتا ہوا میرے قدموں میں آ پڑا۔ میں نے اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔

"[illegible]" میں نے دل میں کہا۔

[illegible] سے آواز آئی۔ اور ہیٹ کا وہی حشر ہوا۔ میں حیران سا رہ گیا۔ تیسری دفعہ پھر یہی ہوا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے ایک بچہ ہوائی بندوق لئے میری طرف نشانہ باندھے کھڑا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک بڑی خوبصورت لڑکی کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ ننھے میاں نے میری ہیٹ کی نشست لی ہوئی تھی۔ غالباً انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ ہیٹ ایک سر پر رکھا ہوا ہے اور اس سر کا تعلق ایک انسانی جسم کے ساتھ ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنس پڑا اور کمال رحم دلی سے میری جان بخشی کرتے ہوئے بندوق پرے رکھ دی۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا اور گھبرا سی گئی۔

"معاف کیجئے! میں یہ سمجھی کہ کہیں خالی ہیٹ رکھا ہے۔"

وہ بچے کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر گئی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ اور پھر کبھی ایسا حادثہ نہ ہوا۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

انہی دنوں میری واقفیت ایک ماسٹر صاحب سے ہو گئی تھی اور چند ہی دنوں میں ہم بے تکلف ہو گئے۔ یہ مقامی اسکول میں انگلش ٹیچر تھے۔ بھدے جسم کے بھونڈے سے آدمی تھے۔ مجھے ان میں کوئی جاذبیت دکھائی نہ دی۔ سوائے اس کے کہ باتیں بڑے دلچسپ تھے۔

ایک روز یونہی میں نے اس ہیٹ والے قصے کا ذکر چھیڑ دیا تو ماسٹر صاحب یکایک چونک پڑے۔ اور پوچھا کرو رہے تھے۔

"تو آپ نے اس لڑکی کو دیکھا ہے گویا"

"جی ہاں! پڑوس ہی میں تو رہتی ہے کیوں؟"

اب ماسٹر صاحب اپنی بے چینی چھپا رہے تھے مگر میں نے انہیں نہیں چھوڑا۔ اور بڑی لمبی بحث کے بعد بیچارہ سارا قصہ بتا دینے پر راضی ہو گیا۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ ایسے بھدے سے آدمی کو بھی عشق ہو سکتا ہے۔ اور پھر ایسی خوبصورت لڑکی سے۔

ماسٹر صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے۔

"دو سال کا ذکر ہے۔ میں کالج میں پڑھا کرتا تھا جب میں سائیکل پر جایا کرتا تو یہ لڑکی مجھے تانگے میں ملا کرتی۔ نہ جانوں بات یہیں تک محدود رہی۔ اس کے چہرے پر نقاب ہوا کرتا تھا مگر میں تانگے کے برابر ہو کر۔ یا آگے پیچھے ہو کر کسی نہ کسی زاویئے سے اسے روز ہی دیکھ لیا کرتا۔ میں نے ایک لڑکے سے مل کر سازش کی وہ یہ کہ اس سڑک پر جہاں آدمی نہ ہوں وہاں جھوٹ موٹ کی سائیکلوں کی ٹکر کی جائے۔ میں بے ہوش ہو جاؤں۔ وہ ضرور تانگہ ٹھہرا کر نیچے اترے گی۔ مگر یہ تجربہ دو مرتبہ فیل ہو گیا۔ عین ٹکر کے وقت کبھی وہ جھجک جاتا کبھی میں۔ آخر ایک روز اللہ کا نام لے کر آنکھیں میچ کر دونوں نے ٹکر کر ہی ڈالی۔ وہ بیچارہ سائیکل سے گر کر دور جا پڑا۔ میں لیٹا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ پورے [illegible] منٹ گزر گئے کوئی نہ آیا۔ میں نے چپکے سے آنکھ چھپا کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ تانگہ جا چکا تھا۔

جب اسطرح [illegible] پر بھی [illegible] نہ ہوئی تو میں نے تانگے والے سے بات چیت کی۔ اور تھوڑے تامل کے بعد وہ راضی ہو گیا۔ [illegible] پروگرام بنایا وہ یہ کہ تانگہ پوری رفتار سے جاتا ہو ایک دم وہ روک دیگا۔ چونکہ میں تانگے کے بالکل پیچھے ہونگا اس لئے خوب تصادم ٹکر لگے گی اور میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں [illegible] غلطی کی کہ بریک لگانی بھول گیا۔ ایسی ٹکر لگی کہ میں سچ مچ بے ہوش ہو گیا۔ اس دفعہ تانگہ ٹھہر گیا۔

"ارے دیکھتے نہیں" وہ غصہ میں تانگے والے سے بولی۔

"انہیں اٹھاؤ"

"نہیں مس صاحب جی۔ اگر میں تانگے سے نیچے اترا۔ تو یہ کمبخت گھوڑا فوراً ہی بھاگ جائے گا"

ایک مختصر سی بحث کے بعد وہ نیچے آ گئی اور مجھ پر جھک گئی۔ اس نے پہلے میری نبض دیکھی پھر میری ناک پکڑ کر چہرا سیدھا کیا۔ دفعتاً ایک بھینی بھینی خوشبو نے میرا دماغ معطر کر دیا۔ اس کا چہرا مجھ سے بہت نزدیک ہو گیا۔ میں نے یکلخت آنکھیں کھول دیں اور اسے اچھی طرح سے دیکھ

لیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور تانگے میں بیٹھ گئی۔

اس حادثے کے بعد مجھے دیکھ کر وہ نقاب اُلٹ دیا کرتی تھی۔ پھر میرا ایم۔ اے کا امتحان ہُوا۔ اور میں بہت ہی اچھے نمبروں پر پاس ہوا۔ اس کے والد کو ایک ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ جو اسے انگلش پڑھائے۔ بڑی کوششوں کے بعد میں اس کا ٹیوٹر بن گیا۔ اب محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ آہستہ آہستہ دن گذرتے جا رہے تھے۔ آخر ایک دن میں نے ٹھان لی کہ محبت کا اظہار صاف صاف کر دیا جائے۔ چنانچہ کافی دیر سوچ کر میں نے اُسے ایک عبارت ترجمے کے لئے لکھائی جس میں اپنے جذبات کو ظاہر کیا تھا۔ اب ایک آدھ فقرہ آپ کو بھی بتلائے دیتا ہوں :۔

"اے زمین پر اُترے ہوئے چاند۔ تُو نے مجھے بے خود بنا رکھا ہے پہلے میں خوش تھا۔ آزاد تھا۔ اور اب میں رنجیدہ ہوں، گرفتار ہوں"

ساری عبارت تو میں بھول گیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے اچھی طرح سے اظہارِ محبت کر دیا۔ اس نے قلم ایک طرف رکھ دی اور مسکرانے لگی۔

میں بولا۔

"کیجئے نا ترجمہ"

"یہ عبارت ذرا مشکل سی ہے۔ ایک مرتبہ اور غور کر لیجئے"

"نہیں نہیں اسی کا ترجمہ کیجئے۔ اسی طرح تو آپ سیکھیں گی"

"بہت اچھا۔ اگر آپ مُصر ہیں تو یہ لیجئے گا"

اس نے کچھ لکھ کر کاپی میرے سامنے کر دی۔

میں نے پڑھا۔ لکھا تھا۔

"براہ مہربانی۔ آپ مجھے کل سے پڑھانے نہ آیا کیجئے"

اپنی محبت کا یوں خون ہوتے دیکھ کر میں تلملا اٹھا۔ اُس دن سے میں اُن کے ہاں کبھی نہیں گیا۔ اور نہ ہی انہوں نے مجھے بلایا۔ بس یہ ہے ساری داستان"

ماسٹر صاحب کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ اور آخر کچھ دیر بعد وہ چلے گئے۔

## ۳۔ چاکلیٹ

ماسٹر صاحب کی داستان سے یہ معمہ تو حل ہو گیا تھا کہ بدصورت آدمی کبھی عشق نہیں کر سکتا۔ بس ایک تھیوری اور باقی رہ گئی تھی۔ اور وہ یہ کہ عشق خوبصورت آدمی ہی کر سکتا ہے۔ بس اگر یہ ثابت ہوجائے تو میری ریسرچ سو فیصدی کامیاب تھی چنانچہ میں شب و روز اسی تلاش میں سرگرداں رہتا کہ کوئی صاحب ایسے ملیں جو اسے ثابت کر دیں۔

رات کا وقت تھا۔ میں ارشد کے ہاں بیٹھا تھا۔ یہ میرا بچپن کا ساتھی تھا۔ میں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"اے بڑا چھیلا بنا پھرتا ہے۔ کالج میں کچھ ہاتھ واتھ مار لیا ہے یا نہیں؟"

"رہتے بھی دو سے۔ سب کو اپنی طرح سمجھا ہے ہمیں کوئی پسند بھی کرتا ہے؟"

یہ اس کی کسر نفسی تھی۔ حالانکہ اچھا بھلا خوبصورت تھا۔

"ارے اگر زندگی کا لطف اٹھانا ہے تو لگے ہاتھ کہیں عشق کر ڈال۔ ایمان سے بتا کبھی کسی سے عشق بھی کیا ہے؟"

"کیا تھا! اور اتنا لطف آیا کہ طبیعت صاف ہوگئی"۔ وہ بولا۔

بس اب میدان مار لیا تھا۔ میں نے جھٹ سے نئی سگریٹ سلگائی اور متوجہ ہو کر بیٹھ گیا۔

"ایک لڑکی تھی ہمارے کالج میں۔ کچھ ایسی خوبصورت بھی نہ تھی۔ البتہ ایک خاص جاذب نگاہ اُس کی زلفیں تھیں جو صبح صبح تو نہایت سنوری ہوئی ہوتیں مگر جُوں جُوں دن گذرتا جاتا بکھرتی جاتیں۔ حتیٰ کہ شام تک بالکل بکھر جاتیں۔ کسی نے اس کا نام "ناگن" رکھا۔ کسی نے "زلفِ پریشاں" مگر میں نے اس کا نام "چاکلیٹ" رکھا۔ کیونکہ میں نے اسے ایک روز شام کو چاکلیٹ مزید لیتے ہوئے دیکھا۔ اس روز وہ مجھے بڑی اچھی لگی اور میرا دل چاہا کہ ان پتلے پتلے ہونٹوں کو ہلتے ہوئے بھی دیکھوں۔

خیر کوئی دو تین ماہ کے بعد بڑی اس کی واقفیت ہوگئی۔ بسم اللہ اس کی طرف سے ہوئی۔ اب رہا یہ کہ واقفیت کیونکر ہوئی۔ سو عرض ہے کہ نہ میں نے اُسے کسی حادثہ سے بچایا۔ اور نہ ہی میری اسکی کہیں ٹکر ہوئی۔ بس اتنا ہوا کہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ مگر اس سلسلہ میں اس کے قدم میری نسبت زیادہ تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ اُسے مجھ سے محبت ہے۔

اب میں اُسے ستانے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر منہ بنا لیتا۔ جہاں وہ آتی دکھائی دیتی راہ کترا کر نکل جاتا۔ مگر وہ بُلا لیتی۔ خوب باتیں ہوتیں۔ بات بات پر وہ مسکرا دیتی"۔

"اور وہ تم سے باتیں کیا کرتی تھی؟"

"کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ عموماً میری تعریفیں کیا کرتی تھی"

"اور تم کیا کہا کرتے تھے؟"

"میں بھی جواباً اس کی تعریفیں کیا کرتا۔ "آپ کی باتیں بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ آپ کو چاکلیٹ رنگ کے کپڑے بہت اچھے لگتے ہیں وغیرہ وغیرہ"

"اچھا۔ پھر؟"

"ایک دن وہ چاکلیٹ رنگ کے کپڑے پہنکر آئی۔ اور میں نے بھی اُس دن تمام چیزیں چاکلیٹ رنگ کی لے لیں۔ ہیٹ۔ سوٹ۔ جوتے۔ ٹائی۔ رومال وغیرہ۔ غرضیکہ ہر ایک چیز چاکلیٹ رنگ کی۔"

سبحان اللہ ایسا عشق تو آج ہی سنا ہے! میری خوشی اور بھی بڑھ رہی تھی۔ آخر میں نے فلسفۂ عشق کو سمجھ ہی لیا۔

"ایک رات کا ذکر ہے کہ ہمارا باکسنگ ٹورنامنٹ تھا۔ مجھے ایک چاکلیٹ رنگ کے بھدے آدمی سے لڑنا تھا۔ سارا کالج جمع تھا۔ وہ بھی میرے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ آخر لڑائی شروع ہوئی۔ وہ مجھ سے دوگنا تھا۔ اس نے پہلے دو راؤنڈ میں تو میری وہ مرمت کی کہ مجھے عرش بریں تک کے تمام چھوٹے بڑے تارے نظر آگئے۔ آخر وہ کہاں تک لڑتا۔ آخر کو وہ تھک گیا۔ اب میری باری آئی۔ میں نے اس کو مار مار کر بُھرتا بنا دیا اور پانچویں راؤنڈ ہی میں لٹا دیا۔ اُس روز میری خوب تعریف ہوئی۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ لڑکوں نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملائے۔ مگر میری نگاہیں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں جب یہ شور و غوغا ختم ہوا تو میں اُسے ڈھونڈنے لگا۔ آخر میں نے اُسے ایک دروازے پر کھڑے ہوئے پالیا۔ وہ فوراً میری طرف بڑھی اور بولی:۔

"آج آپ بہت اچھے لڑے"

"شکریہ! مگر سوکھی ہی تعریف؟" میں نے مکاری سے پوچھا۔

"تو پھر آپ کو انعام دوں گویا" وہ بولی۔

"آپ انعام دیں گی مجھے؟ بتائیے کیا دیں گی؟" میں نے پوچھا۔

"بھلا میرے پاس ہے ہی کیا جو پیش کر سکوں۔ بھلا آپ مانگئے تو سہی؟" وہ بولی

"یہ انگوٹھی ——!"

"اور اس کے بدلے میں آپ مجھے کیا دیں گے؟"

"ایک دوسری انگوٹھی اسی انگلی کے لئے" میں نے کہا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"ارے آپ کی ناک سے خون نکل رہا ہے آپ نے منہ بھی تو نہیں دھویا اچھی طرح سے" وہ بات ٹال گئی۔

"نکلنے دیجئے۔ اس کا کیا ہے۔ وہ بات تو آپ نے بتائی ہی نہیں۔ بتائیے نا۔ آپ کو ناگوار گذرا یا میں اس قابل نہیں ہوں" میں نے پوچھا۔

"مجھے پتہ نہیں" یہ کہہ کر وہ جلدی میں بھونچکا سا رہ گیا۔ مجھ پر گویا بجلی گر پڑی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کھچی کھچی سی رہنے لگی۔

"یہ بھی ایک انداز تھا" میں نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں انداز ہی تھا۔ میں نے بڑی غلطی کی جو اپنے آپ کو اتنا نیچے گرا دیا۔ میں اُسے سمجھ نہ سکا۔ میں اس کی طرف دیکھا کرتا۔ مگر اس کی نگاہیں نیچی رہنے لگی۔ مجھے دیکھ کر وہ راہ کترا جاتی۔ آخر ایک روز میں نے اُسے ٹھہرا ہی لیا۔ وہ بولی ضرور مگر روکھے پن سے۔ جیسے اُسے بہت بُرا لگتا ہو۔

"لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں آخر نیک نامی بھی تو کوئی چیز ہے" اُس نے کہا۔

میرے جی میں آیا کہہ دوں کہ پورے ڈیڑھ سال تک تو لوگوں کے کہنے کی ذرا پروا نہیں کی اور اب ایک دم اتنی احتیاط برتنی شروع کردی۔

"تو گویا میں آپ کو نہ بُلایا کروں۔ میرا آپ سے باتیں کرنا لوگوں کو ناگوار گذرا ہے۔ کیوں یہی ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ دیکھ لیجئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں اور اگر کوئی کام ہو تو باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" وہ بولی

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ مجھے اب کام سوچنے پڑا کریں گے"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ اگر واقعی کام ہو تو ——!"

"معاف کیجئے۔ میں اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ آپ نے مجھ سے یہی بات پہلے کیوں نہ کہدی؟" میں نے ذرا غصہ میں کہا۔

اس نے عجیب نفرت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا گویا کہ کہہ رہی ہے کہ اب بھی وقت نہیں گیا غلط فہمی دفع ہوسکتی ہے۔

میں نے ذرا نرمی سے پوچھا:۔

"تو گویا اب آپ کبھی نہیں ملیں گی"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ "تم نے مجھے بالکل غلط سمجھا ہے۔ تم بیوقوف ہو"۔ اس کے بعد میں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا اور وہاں سے چلا آیا۔

"چلا آیا؟ ——" میں نے چیخ کر کہا۔

"ارے کمبخت یہ کیا کیا!"

"اس کے بعد آج تک ہم نے کبھی بات نہیں کی وہ مجھے جہاں دیکھتی ہے نفرت سے منہ موڑ لیتی ہے۔ واقعی میں اُسے سمجھ نہ سکا اور غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ اور غلط فہمی بھی پورے دو سال کی —— لاحول ولا قوۃ! بعض اوقات انسان کتنا بے وقوف ہو جاتا ہے۔ پورے دو سال تک اس نے میرے دماغ کو اُلٹ پلٹ کئے رکھا۔ پڑھتے وقت اس کے لفظ میرے کانوں میں گونجا کرتے۔ میں سوچتا رہتا کہ ان کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے مجھے یہی وہم ہو گیا تھا۔ میں پہلے سے ہی باتیں سوچ کر رکھتا کہ اب یہ کہوں گا۔ مگر اسے میرا جتنا خیال تھا؟ وہ اتنے روز بے وقوف بنے رہنے کے بعد معلوم ہُوا"

"اس کے بعد کیا ہُوا" میں نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا۔

اس کے بعد؟ —— اس کے بعد مجھ میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی ہے۔ پہلے چلتے وقت میرا سر جھکا ہوا ہوتا تھا۔ اور اب میں اکڑ کر چلتا ہوں۔ ایک مسکراہٹ میرے لبوں پر ہوتی

ہے۔ لوگوں سے جان بوجھ کر ٹکراتا ہوں۔ اگر کوئی بولے تو ناک توڑ ڈالوں۔ پہلے میں لڑکیوں کو دیکھ کر کچھ شرمایا سا جاتا تھا۔ اور اُن سے باتیں کرتے وقت نگاہیں نیچے ہوتی تھیں۔ مگر اب میں ہر آنے جانے والی لڑکی کو گھورتا ہوں۔ میری نگاہیں ہمیشہ کسی حسین چہرے کی تلاش میں رہتی ہیں۔ اور جب کسی لڑکی سے بات کرتا ہوں تو اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں گاڑ دیتا ہوں اور میرے ہاتھ پتلون یا کوٹ کی جیب میں ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو حسین کہہ دیتا ہوں۔ تعریفیں کرتا ہوں۔ پہلے محبت کے بارے میں میرے دل میں نہایت اچھے خیالات تھے میں ترسا کرتا تھا کہ کوئی مجھے چاہے اور میں اسی کا ہو رہوں۔ اب مجھے محبت کے نام پر ہنسی آتی ہے۔ میرا دل اب اس قدر سخت ہو گیا ہے کہ اب اس میں محبت جیسی نازک چیز یا کسی قسم کا احساس یا کسی کا درد کچھ بھی نہیں سما سکتا۔ اگر میرا واسطہ کسی لڑکی سے پڑا تو اُسے ایسا بے وقوف بناؤں گا کہ ساری عمر یاد کرے۔ مجھے اب کسی کی پروا نہیں۔ بہر حال کئی سے میرے دل پہ ایک عجیب سا سوداسا طاری رہتا ہے ——

وہ کچھ جانتا تھا۔ میں سامنے بیٹھا تھا۔ خدا جانے اس نے کیا کچھ کہا۔ آخر کو میری آخری تھیوری بھی فیل ہو گئی تھی —— ساری ریسرچ ہی ناکامیاب رہی۔

"اچھا بھیا۔ ایک کام اور کر۔ ذرا اس لڑکی کی تصویر تو دکھا دے"

میں نے کہا۔

"کیا کرو گے دیکھ کر؟ کہہ جو رہا ہوں کہ خوبصورت نہیں ہے"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور تصویر لا کر میرے ہاتھ میں دے دی۔

ایک دُبلی سی لڑکی تھی بے رونق آنکھیں پچکے ہوئے گال۔ اور چاکلیٹ رنگ۔

"لاحول ولا قوۃ! ارے کیا سچ مچ یہ اسی کی تصویر ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے اثبات کے طور پر سر ہلا دیا۔

پھر گھر آ کر بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ارشد جیسا خوبصورت لڑکا اور ایسی چاکلیٹ رنگ کی لڑکی۔ آخر یہ ہو کیسے گیا۔ سوچ سوچ کر میں نے ایک اور تھیوری بنائی اور وہ یہ کہ چونکہ ماسٹر اور ارشد دونوں نے اپنے آپ کو گرا دیا تھا اس لئے ان دونوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بس یہی نتیجہ نکلا کہ محبت میں اکڑے رہو۔ اور کبھی اپنے آپ کو نہ گراؤ۔

ایک روز رات کے وقت میں کمرے میں بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا۔ چاروں طرف بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ریڈیو پر بچوں کا پروگرام شروع ہوا۔ یکایک ایک دو مرتبہ گھرر ر گھرر اور چاخ چاخ ہوئی اور ریڈیو بند ہو گیا۔ سب کے سب مجھے لپٹ گئے۔ "ریڈیو ٹھیک کر دو" انہوں نے پُر زور مطالبہ کیا۔

میں نے ریڈیو کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ بظاہر تو کوئی خرابی معلوم نہیں ہوئی۔ یکایک ایک چھوٹی بچی بولی۔

"بھیا کہیں ایریل میں خرابی نہ ہو"

اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے چھت پر چڑھنا پڑے گا۔ میں نے بہتیرا پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر بچے نہ مانے۔ آخر کار مجبوراً مجھے اوپر چڑھنا پڑا۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ میں نے منڈیر پر جھک کر سب تھو والے مکان کو دیکھا —— جو کچھ دیکھا۔ بس آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چھت پر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ پرندوں کا نہیں —— آدمیوں کا! —— ماسٹر صاحب اور وہی لڑکی دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ لڑکی کے ہاتھ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں تھے۔ ماسٹر بے ایمان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ باتیں تو بنانی آتی ہی ہیں۔ لیکچر دے رہا ہوگا۔ مکار کہیں کا۔ گویا لڑکی نے ماسٹر صاحب کو پھر سے بُلا لیا تھا کہ —— "آ بیل مجھے مار"

ماسٹر کو محبت ہی ہوگی اُسے بھی جو اس طرح بُلا لیا۔ اب یہ آخری تھیوری بھی گڑبڑ ہو کر رہ گئی۔ آخر یہ معاملہ کیا تھا۔ ایک نہایت خوبصورت لڑکی ماسٹر جیسے بدصورت انسان پر عاشق تھی۔ اور ارشد جیسے اچھی شکل کے لڑکے کو چاکلیٹ نے ٹھکرا دیا۔ یہ بھی غلط۔ وہ بھی غلط —— میرے سب نظریے غلط تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محبت بیماری نہیں۔

خیر جو کچھ بھی ہو۔ مجھے سب سے زیادہ غصہ چاکلیٹ پر آ رہا تھا۔ اس نے محض قصور ہی نہیں کیا تھا بلکہ گناہ کیا تھا۔ جس جگہ سے میں نے ریسرچ شروع کی تھی گھوم گھام کر پھر وہیں پہنچ گیا۔ سامنے سرو کے درختوں کی آڑ سے چاند مسکرا رہا تھا۔ غالباً مجھ پر ہی ہنس رہا ہوگا —— میری بے وقوفی پر —— میں بھی بغیر مسکرائے نہ رہ سکا!!

# الفانسو کا خواب

## سرزمین سپین کا ایک تاریخی افسانہ

از جناب علی احمد صاحب علی

گیارہویں صدی کے اواخر کا ذکر ہے کہ شاہ الفانسو اسپین میں قشتالیہ پر حکمران تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عرب شمالی افریقہ سے سیلاب کی طرح اُمڈ کر اسپین کے شمالی اور وسطی حصوں میں پھیل گئے تھے۔ انگریزوں کی یہ حکومت عرب موروں کے خلاف نبرد آزمائی کر رہی تھی۔ شاہ الفانسو اس وقت طلیطلہ کے محاصرہ میں مصروف تھا جب اُسے موروں کی پیش قدمی کی خبر ملی تو وہ فوراً تولیڈو آگیا۔ اور موروں کی ٹڈی دل فوج کیساتھ مقابلہ کی تیاری کرنے لگا جسے اسپین کی بعض اسلامی حکومتوں کی مدد حاصل تھی۔ تولیڈو کو چھوڑنے سے پہلے اس نے دو خوفناک خواب دیکھے جو تاریخ کی رو سے اس قوم کے زوال کا باعث ہوئے۔ اُسنے دیکھا کہ وہ ایک ہاتھی پر سوار ہے اور اسکے قریب ایک بڑے جانور کی پشت پر عربوں کا محبوب ترین ساز دف رکھا ہے اور وہ خود اُسے بجا رہا ہے۔ دف سے پیدا ہونیوالی صدا اتنی تیز اور ہیبتناک تھی کہ الفانسو گھبرا کر اُٹھ بیٹھا پہلے تو اُس نے خواب کو صرف ایک ڈراؤنا توہم سمجھ کر ٹالدینا چاہا لیکن جب تولیڈو کے قیام کی ہر رات یہی خواب اُسے دوبارہ نظر آتے رہے تو وہ متفکر ہوا اُسنے محسوس کیا کہ ضرور کسی آنیوالی بلا کا پیش خیمہ ہے ہر رات وہ خوفزدہ ہو کر چونکتا، اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا اور کان مشرقی ساز کے نغموں سے گونجتے رہتے۔ آخر پریشان ہو کر اُسنے اپنے تمام مدبروں اور درباریوں کو طلب کیا۔ پادری مذہبی پیشوا بھی بلائے گئے۔ یہودیوں کے ربی بھی موجود تھے جب سب جمع ہوگئے۔ تو شاہ الفانسو نے اپنا خواب تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہا سب سے عجیب بات جو مجھے معلوم ہوتی ہے وہ ہاتھی کی سواری ہے اور یہ جانور ہمارے ملک میں ہوتا ہی نہیں اسی طرح عربی ساز بھی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ آپ لوگوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے یہ عجیب چیزیں کیا مطلب رکھتی ہیں؟"

چونکہ مدبران ریاست آپس میں اس خواب کی تعبیر کے متعلق مشورہ کرتے رہے اور پھر دربار شاہی میں حاضر ہوئے۔ شاہ الفانسو انہوں نے کہا ہماری رائے میں اس خواب کی تعبیر یہ ہے۔ کہ جہاں پناہ کو اس جنگ پر فتح حاصل ہوگی۔ جو مسلمان ہمارے خلاف لا رہے ہیں۔ انکا سارا لشکر قبضہ میں آجائیگا اور آپ مال غنیمت لیکر کامیابی کے ترانے گاتے ہوئے لوٹیں گے علاوہ بریں ہمیں یقین ہے کہ آپ کی فتح کی شہرت سے مشرق کا چپہ چپہ گونج اٹھیگا۔ کیونکہ ہاتھیوں کا نظر آنا مسلمانوں کے حوصلہ افزا ابن تقفین کے اور حیوانی ہو سکتا جو افریقہ کے ایک بڑے شہر کا حکمران ہے اور عربی دف جو آپ بجا رہے تھے اس سے مراد یہ ہے کہ آپکی فتح کی شہرت تمام دنیا میں پھیل جائیگی"

الفانسو اپنے خواب کی تعبیر کو بڑے غور سے سنتا رہا پھر بولا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ میرے خواب کی اصل تعبیر سے بہت دور ہوگئے ہیں۔ اسلئے کہ میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ یہ خواب کسی آنیوالی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہے"

یہ کہکر الفانسو نے ان عرب سرداروں کی طرف نظر اُٹھائی جو اسکے دربار کے سرداروں میں سے تھے۔ اور دریافت کیا کہ کیا انکی قوم میں کوئی ایسا حکیم اور دانا شخص موجود ہے جو میرے اس خواب کی صحیح تعبیر بتا سکے اُنہوں نے کہا کہ وہ ایک درویش سے واقف ہیں۔ جو تولیڈو کی ایک مسجد میں رہتا ہے وہ بادشاہ کے خواب کی صحیح تعبیر بتا سکے گا۔ الفانسو نے حکم دیا کہ اس درویش کو فوراً حاضر کیا جائے۔ عرب سردار اس درویش کو جسکا نام فقیہ محمد ابن عیسیٰ تھا لے کر جلد لوٹے۔ درویش کو جب یہ معلوم ہوا کہ اُسے ایک کافر بادشاہ کے خواب کی تعبیر پوچھنے کیلئے بلایا گیا ہے تو وہ بہت برہم ہوا اور بادشاہ کے محل میں جانے سے انکار کر دیا۔ عرب سرداروں نے یہ دیکھا تو گھبرائے اور بادشاہ سے عرض کیا کہ فقیہ کا تقویٰ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایک انگریزی دربار میں حاضر ہو۔ بادشاہ جو اسلامی احکام سے واقف تھا۔ اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ خواب بتا کر وہیں تعبیر حاصل کیجائے۔ عرب سرداروں کے اصرار کرنے پر فقیہ نے کہنا شروع کیا۔ جاؤ الفانسو سے کہو کہ خواب کی تعبیر بہت صاف ہے یعنی اُسے شکست ہوگی اور دولت کیساتھ اسکی فوج کا خون بہایا جائے گا۔ آخرکار اپنے سرداروں کو لیکر وہ میدان جنگ سے فرار ہو جائیگا۔ اور فتح محمدؐ کے پیروؤں کو نصیب ہوگی اُس نے یہ بھی کہدیا کہ یہ تعبیر قرآنی آیات کے لحاظ سے نکالی گئی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے خدا نے اُسکے ہاتھیوں کا کیا حشر کیا۔ کیا اُسکی تمام قوتیں بیکار نہیں ہوگئی تھیں اور اُسکے ناجائز منصوبے کیا نامکمل نہیں رہ گئے تھے؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اُسکی ٹڈی دل فوج کے لئے ہم نے ابابیلوں کی ایک ٹکڑی بھیجی تھی۔ فقیہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا یہ آیتیں یمن کے بادشاہ ابرہہ کے زوال کی پیش گوئی کیلئے نازل ہوئی تھیں۔ اصحاب فیل نے چاہا تھا کہ کعبہ کو ڈھا دیں۔ ابرہہ نے کئی سو ہاتھی لیکر کعبہ پر چڑھائی کی لیکن خدا کی قدرت سے ابابیلوں کی ایک ٹکڑی نے انہیں کنکریاں پھینک پھینک کے ہلاک کر ڈالا تھا۔ اور عربی ساز جو بادشاہ نے دیکھا تھا وہ اسبات کی دلیل ہے کہ اسکی تباہی کے دن قریب آگئے ہیں مور سرداروں نے جو صرف پیامبر کی حیثیت رکھتے تھے شاہ الفانسو سے فقیہ کے الفاظ بیان کئے۔ بادشاہ یہ سنکر زرد ہو گیا اور پھر بولا فقیہ سے کہدو کہ اگر اُس کی پیشگوئی غلط ثابت ہوئی تو اس جھوٹ کی کافی سزا ملیگی۔

کچھ دنوں بعد شاہ الفانسو کثیر تعداد پیدلوں اور ۸۰ ہزار سواروں کیساتھ بڑھا۔ شاہ تقفین اپنی فوج لیکر ابوس تک آچکا تھا جو شہر سے صرف بارہ میل دور تھا۔ ایک دریا درمیان میں حائل تھا۔ فوجیں دونوں کناروں پر اتر گئیں۔ تقفین نے الفانسو کے پاس اپنا حکمنامہ فرمان بھیجا کہ یا تو وہ اسکی اطاعت قبول کرے یا لڑنے کیلئے تیار ہو جائے۔ الفانسو غصہ میں کانپنے لگا۔ اور کہا جاؤ تقفین سے کہو ہمارے مقابلہ کیلئے اپنی فوجیں لائے ہم ایکدوسرے کو سمجھ لیں گے۔

جنگ شروع ہوگئی لڑائی سے پہلے ہی یہ طے پاگیا تھا کہ جمعہ اور اتوار کے مقدس دنوں کے روز جنگ بند رہیگی۔ خود الفانسو نے اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی جسے عربوں نے منظور کر لیا تھا لیکن الفانسو نے جمعہ کی صبح ہی کو حملہ کرنیکی ٹھان لی۔ اور اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آگے بڑھا۔ سیویلی کے مور شش بادشاہ نے اپنے منجموں کو حکم دیا کہ وہ اس دن کی جنگ کے متعلق معلوم کریں انہوں نے اپنے علم سے بتایا یہ دن مسلمانوں کیلئے نامبارک ہے اس پیشگوئی سے انکا جوش و خروش کچھ کم ہو گیا تھا لیکن الفانسو کے پہلے حملہ کی کامیاب مدافعت کیبعد شاہی منجموں نے پھر زائچے کھینچے اس دفعہ تمام نتائج عربوں کی فتح کے حامی تھے سیویلی کے بادشاہ کا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا اور اُس نے فوراً اپنے خیمے سے تقفین کو پیغام بھیجا۔

ہمارا کامیابی کا قصہ عیسائیوں کی طرف ہے

اسکا قہر انہیں تباہ کر دے گا۔

اور موافق ستارے ہماری رہبری کر رہے ہیں۔

فتح مسلمانوں کی ہوگی

تقفین کو اچانک حملہ کی مدافعت میں بڑی دقت پیش آئی عیسائیوں نے اندلوسہ کے عربوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا لیکن سیویلی کے بادشاہ کی فوجیں برابر لڑتی رہیں تقفین سب سے آگے تھا اور سیدھا الفانسو کے خیمے کی طرف جھپٹ پڑا۔ یہ دیکھ کر ساری فوج ٹڈی دل کی طرح عیسائیوں پر حملہ کر دیا۔ حملہ اسقدر سخت تھا کہ انکے پیر اکھڑنے لگے الفانسو نے جب دیکھا کہ فوج منتشر ہو رہی ہے تو پانچسو ہاتھیوں کو لیکر فرار ہوا۔ جب وہ جنگ تولیڈو پہنچا۔ اسوقت اسکے ساتھ صرف چند سو سوار تھے اس دن کے بعد سے الفانسو کا دل بجھ گیا کچھ دن کے بعد اس نے اپنے بیٹے کے مرنے کی خبر سنی پھر فوج کی مکمل شکست کا حال معلوم ہوا۔ پھر وہ بیمار ہوا اور مر گیا۔

## دُعا

از جناب چوہدری عبدالرشید صاحب تبسم بی اے

الہٰی! پھر تماشائے ریاضِ طور ہو جائے
شب تاریک میں نکلا ہوا اپنا کارواں ہو کر
میری بادہ پرستی میں نہ حائل ہو سکے واعظ
پلانا ہے مجھے مے ہمسفر صحرا نوردوں کو
بس اے حسنِ ازل! حد ہو چکی بے التفاتی کی
قیامت ہے، کہ شمعِ دیر سے محفل چراغاں ہو
کہاں کا انگبیں اب نیش تک باقی نہیں اسمیں
میرا دل ٹوٹ کر سینے میں اک آواز دیتا ہے
ہے کچھ اور صدمے ہجر کے طاقت نہیں اسمیں

مکرر شعلۂ آتش سراسر نور ہو جائے
میری آہ شرر افشاں سے ظلمت دور ہو جائے
وہ اس انداز سے محوِ خیالِ حور ہو جائے
میرے پاؤں کا چھالا خوشۂ انگور ہو جائے
کہیں مسلم نہ ترکِ مہر پہ مجبور ہو جائے
مگر یارب چراغِ انجمن بے نور ہو جائے
الہٰی! جلد ویراں خانۂ زنبور ہو جائے
اسی آواز سے کہدے صدائے صور ہو جائے
دلِ فرقت زدہ اب وصل سے مسرور ہو جائے

نظر دیتی رہی ہے راہ میں ہر گام پر دھوکا
یہ منزل بھی نہ یارب آنکھ سے مستور ہو جائے

# عمر خیام

از جناب عطا کلیانوی

۱

افسونگرِ مشتاق کلامِ خیام
زندہ ہے ابھی دہر میں نامِ خیام
میخانے کا دَور اُٹھ گیا ہے لیکن
پیتا ہے جو مطلوب ہے جامِ خیام

۲

خیام ترا رنگ [illegible] والا آزاد
تھی تیری ہستی سے [illegible] آباد
دنیا کا اسرار [illegible] زندہ باد
رشتہ دنیا اور ابھی [illegible]

۳

مستی ہے ترے جامِ سفالِ ذوق میں
آرائشِ تصویرِ خیالِ خیام میں
کیفیت ہے حرف حرف میں مستی ہے
[illegible] پیمانۂ [illegible] میں

۴

رازِ ہستی دماغ سے جز و راز اٹھا تو
کیا وصف کہ مستی میں بھی ہشیار اٹھا تو
مجموعۂ کلام ہیں تیرے مستی تو
میخانۂ فطرت کا قدح خوار اٹھا تو

۵

صہبائے ازل عمر کی ہر جام میں ہے
عرفانِ حقیقت ترے پیغام میں ہے
پڑھ پڑھ کے میں ان کو مست ہو جاتا ہوں
کیا کیف رباعیاتِ خیام میں ہے

۶

[illegible] عظمت تیری
تھی [illegible] تسلیم [illegible] عمر خیام
میخوار [illegible] تجھ کو
[illegible] خلوت تیری

اے ساقی و جامِ مُل کے شیدا خیام
بدمست کوئی تجھ سا نہ ہوگا خیام
اب تک بھی تری یاد میں مے پیتے ہیں
ہاں تجھ کو نہ بھولے گا زمانہ خیام

# چنگیز خان

منگولیا جسے بعض مورخ "دنیا کی جنم بھومی" بھی کہتے ہیں سخت گرم اور سخت سرد و خشک آب و ہوا کی وجہ سے اب تک بالکل بنجر اور ویران پڑا ہے۔ پیداوار کی کمی اور بڑھتی ہوئی آبادی کی کمیت کے لئے بیسیوں صدی پیشتر ایک کارواں جنوب کی جانب چلا۔ بعض نے ایران، ہندوستان اور افغانستان کا رُخ کیا۔ اور یہیں آباد ہوئے اور بعض یورپ کی طرف روانہ ہوئے اور موجودہ مہذب اور متمدن مغربی اقوام نے آباؤ اجداد ہونے کا فخر حاصل کیا۔

اسی علاقہ میں ایک سردار حکمران تھا۔ اُس کی اچانک وفات کی وجہ سے اس کا تیرہ سالہ لڑکا گدی نشین ہوا جو تاریخ میں چنگیز خاں کے نام سے مشہور ہے۔

عام بچوں کی طرح اُس کی تعلیم منگولیا کے ایک سکول میں ہوئی۔ اسی نوجوان حکمران نے اپنی ذاتی قابلیت، فہم و فراست، خداداد مہارت اور فوجی ذہانت کی وجہ سے بحیرۂ اسود سے لیکر چین کی آخری حد پیکن تک اور منگولیا، ترکستان، ایران، بلخ، بخارا، تاشقند، سمرقند، کاشغر، افغانستان، کشمیر اور پنجاب تک کو فتح کیا۔ اور اس کا واحد مالک، حاکم اور آمر بنا۔ آج دنیا ہٹلر کا لوہا مانتی ہے۔ یورپ کی طاقتیں اس کے نام سے کانپتی ہیں۔ ہمسایہ ریاستیں اس سے لرزاں ہیں۔ مگر تیرھویں صدی کے منگولی آمر کے مقابلہ میں اُس کی کچھ بھی حیثیت نہیں ہے۔ اس وقت کے حالات، ماحول، ذرائع آمد و رفت اور دشوار گزار علاقہ کا اندازہ لگاتے ہوئے چنگیز خاں کو بلاشبہ بڑے بڑے فاتحین میں شامل کرنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے جابر حاکموں کو اُس نے نیچا دکھایا۔ عظیم الشان سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیئے۔ خاقانِ چین اور ایران کے عظیم المرتبہ بادشاہوں کو سرنگوں کیا۔ وہ کسی طرح نپولین اور سکندر اعظم سے کم نہ تھا۔

والد کی وفات پر دشمنوں نے حملہ شروع کر دیئے۔ باجگزار ریاستوں نے بغاوت کھڑی کر دی۔ مگر اس نے کمال تدبر سے بغاوت فرو کی۔ دشمنوں کو مغلوب کیا اور اپنی طاقت بڑھاتا چلا گیا۔ اس کا لمبا قد، پیلا رنگ، کشادہ اور فراخ پیشانی، روشن اور نیلگوں آنکھیں اور سنہری بال جو کندھوں تک بکھرے رہتے تھے۔ اس کی شخصیت کو جاذب اور نفاطیسی بنائے ہوئے تھے۔ اور باوجود جبر اور تعصب کے اپنے ذاتی محاسن کی بنا پر دشمنوں تک کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھا۔

شروع ہی سے اُس میں ایک لیڈر، ایک جرنیل، ایک حاکم اور ایک آمر بننے کے اوصاف موجود تھے۔ اُسے فوج میں یقین، قربانی اور استقلال کا جذبہ پیدا کرنے کا ملکہ آتا تھا۔ اسی لئے وہ ایک بہترین منتظم اور سالار تھا۔

پہلی دفعہ ہی اُس نے تیرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ ہمسایہ حکومت کی تین ہزار فوج کو شکست فاش دیکر اپنی طاقت کی دھاک بٹھا دی۔ اس کے چچا نے جسے خاقانِ چین نے "شاہِ شاہان" کا خطاب دے رکھا تھا چین کے بادشاہ کی شہ پر اُس کے خلاف بغاوت کھڑی کر دی۔ اُس کی افواج کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے پہلے تو کچھ عافیت دیکھ کر صلح کر لی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اپنی فوج منظم کرکے بجلی کی طرح اُس پر جھپٹا اور آن واحد میں لاکھوں کی فوج کو بھگا دیا۔ اور چچا کے علاقہ کو فتح کرکے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

اس فتح نے اُس کے حوصلے بہت بلند کر دیئے۔ سکندر، نپولین اور قیصر جرمنی کی طرح اس نے بھی ایشیا اور یورپ کو اپنے قبضہ میں کر لینے کا تہیہ کیا۔ تاتار اور صحرائی علاقوں کی فتوحات سے فراغت کے بعد اُس نے مہذب علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اُس وقت کی ایجادات اور مختلف ممالک کے عجائبات سے خوب فائدہ اٹھایا۔

پینتالیس سال کی عمر میں منگول سرداروں نے اُسے اپنا شہنشاہ تسلیم کیا اور "چنگیز خاں" (کسی سے نہ دبنے والا) کے لقب سے ملقب کیا۔

اب ذاتی قابلیت کے علاوہ وہ ایک پختہ کار حاکم ہو چکا تھا۔ موسوی دس احکام کی طرح اس نے بھی فوج کے لئے دس احکام جاری کئے۔

(۱) سب آدمی خدا کو واحد مانیں جو حکم العالمین پروردگار اور قادرِ مطلق ہے۔

(۲) حاکم کا حکم خدائی پروانہ ہے۔ جس کی عدولی کی سزا موت سے کم نہیں۔ مگر لڑائی میں سالار کی طرف سے حکم مل جانے کے بعد حاکم اور محکوم سپاہی کا ایک ہی مرتبہ ہے۔

(۳) ایک دشمن ہمسایہ قوم سے صلح اپنے ملک سے غداری کے مترادف ہے۔ وغیرہ وغیرہ

وسطی ایشیا میں طاقت حاصل کرنے کے بعد اُس نے چین کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

آج جاپان باوجود اپنی بڑھتی ہوئی طاقت جنگی بیڑے، ہوائی بیاری، اعلیٰ فوجی تنظیم، اٹلی و جرمنی کی خفیہ امداد، سہل ذرائع آمد و رفت اور تین سال کی لگاتار محنت و کوشش کے نہتے اور غیر مسلح چین کا ایک تہائی علاقہ فتح نہ کر سکا۔ مگر چنگیز خاں نے پہلے دیوارِ چین کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ چین کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے جاسوس بھیجے اور پھر خود شمالی علاقہ پر حملہ کر دیا۔ شاہ چین کو جنوب کی طرف بھاگنا پڑا۔ اور یہ شیر دل وہاں سے بیش بہا دولت اور سامان اپنے ہمراہ لایا۔

اُس وقت ایران کا بادشاہ وسطی ایشیا کا حاکم اعلیٰ مانا جاتا تھا۔ دور دور تک اس کے دبدبے اور طاقت کی شہرت تھی۔ ایران تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اسلامی ممالک کا مرکز تھا۔ اس کے ساتھ چنگیز خاں کا تجارتی معاہدہ تھا مگر ایرانی سرداروں کی کج روی کی وجہ سے سخت سیخ پا ہو کر چین سے ہی جنگ کا اعلان کر دیا۔

ایک لاکھ پچاس ہزار فوج کے ہمراہ وسطی ایشیا کے ویران، بنجر اور سخت دشوار گزار پہاڑوں میں دو ہزار میل کی مسافت طے کرتا ہوا ایران پر حملہ آور ہوا۔ ماہرین جنگ اُس کی اس ہمت اور شجاعت کی داد دیتے ہیں۔

آج کل آمد و رفت کی سہولت کے باوجود یہ مہم ناممکن نظر آتی ہے۔ مگر چنگیز خاں کے سامنے کچھ ناممکن نہ تھا۔ ایران سے زبردست مقابلہ ہوا۔ عرصہ تک جنگ جاری رہی مگر آخر تاب کے منگول فوج نے پتھر اور گندھک کے گولوں تک کا استعمال کیا اور ایران کو ناک چنے چبائے۔ ایران کو فتح کرکے چنگیز خاں پہاڑوں پر سے ہوتا ہوا بخارا پہنچا۔ اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا "تمہارے بادشاہ کے گناہ بے شمار ہیں۔ میں خدا کی طرف سے آگ اور غضب کی صورت میں انتقام کے لئے آیا ہوں۔ اگر کسی نے مزاحمت کی تو اس کا بھی یہی حشر ہوگا"۔ شہر کو خوب لوٹا اور جلا کر واپس آ گیا۔ اس کے بعد سمرقند کا رُخ کیا۔ جہاں شہر کے گرد دوہری فصیل تھی۔ ایک لاکھ فوج اور بیس ہاتھیوں کے ہمراہ وہاں شاہانہ طریقہ سے داخل ہوا۔ اور شہر کو فتح کیا بادشاہ کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ یہاں سے چنگیزی فوجیں سرحدوں پر لوٹ کھسوٹ کرتی ہوئی مشرقی یورپ اور ایشیائے کوچک تک پہنچ گئیں۔ اور روس کے کچھ علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ تھی طاقت اور یہ تھی قوت چنگیز خاں کی جو آج کل کے مدبروں کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈالے

## غزل

از جناب مسیح الحسن صاحب بقا نقوی سیکرٹری انجمن تعمیر ادب

نظر میں اُن کی وفاؤں کا انتخاب نہ تھا
سرشتِ حسن تھی حسنِ خیال سے محروم
ازل کی بزم میں آغازِ حسن کے باوصف
پتھر اکوئی ساحل سے کس طرح پاتا
تمہیں جلانے مرے دل سے اب کیوں نفرت
تمہاری بزم میں سنتے ہیں تابہ جام و شراب
کمال کیا ہے جو رحمت ہے بے حساب تری

دیارِ حسن میں انصاف کامیاب نہ تھا
کتابِ عشق میں صبر و سکوں کا باب نہ تھا
وہ لاجواب تھے ان کا کوئی جواب نہ تھا
جہاں میں ڈوب گیا تھا وہاں حباب نہ تھا
تمہارا تھا یہ مرا اپنا انتخاب نہ تھا
وہ کون تھا کہ جو مصروفِ اضطراب نہ تھا
مرے گناہوں کا دنیا میں کچھ حساب نہ تھا

ہم اس کو خواب سمجھتے تھے اے بقا لیکن
یہ بزمِ دہر حقیقت تھی کوئی خواب نہ تھا

بغیر نہیں رہ سکتی۔

اس کی سپاہ میں بوجہ مسلمان عیسائی اور یہودی سب شامل تھے۔ جنگ میں سپاہیوں کے علاوہ ہر مذہب کے راہب اور پنڈت بھی شامل ہوتے تھے۔ سب دوش بدوش لڑتے تھے اور شاید یہی اس کی کامیابی کی کلید تھی۔

ان فتوحات سے بھی چنگیز خاں کو تشفی نہ ہوئی تو اس نے جاپان کو مغلوب کرنے کی ٹھانی۔ مگر یہ مہم راس نہ آئی۔ اور شکست مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلئے وہ واپس آگیا۔

ان فتوحات کے ذریعے سے ایشیا اور یورپ کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک دوسرے کے قریب ہوئے چنگیز خاں نے وسطی ایشیا سے یورپ تک عمدہ فوجی سڑکیں تعمیر کیں جو عمدہ تجارتی اور سیاسی کاموں میں مفید ثابت ہوئیں۔ یہ سڑکیں بالکل محفوظ تھیں۔ یورپ کے سفیر مثلاً کارپن اور مارکو پولو وغیرہ انہی راستوں سے پانچ ہزار میل چل کر ادھر آئے اور ان سڑکوں کی عمدگی کی تعریف کی۔

آخری عمر میں چنگیز خاں نے پھر چین کے باقی ماندہ علاقہ کو بھی مملکت میں شامل کرنا چاہا۔ وہاں پہنچا مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اس کی قبر کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض کا خیال ہے کہ قراقرم میں واقع ہے اور بعض اسے صحرائے گوبی میں بتلاتے ہیں۔

چنگیز خاں دنیا کی تاریخ میں ایک بے نظیر ہستی تھی۔ اس میں مذہبی رواداری بھی بہت تھی اور تمام مذاہب کو یکجا دیکھنا چاہتا تھا۔

اس کا قول تھا کہ۔

"مسلمان رسول کریم کی تعظیم کرتے ہیں چینی بہاتما بدھ کو مانتے ہیں۔ یہودی موسیٰ کو پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ عیسائی مسیح ناصری کی پوجا کرتے ہیں۔ یقیناً یہ بانیان مذاہب سچے تھے۔ اسلئے میں سب کو مانتا ہوں۔"

## لطائف التفاول
### بقیہ صفحہ ۹۶

۳۔ ہمارے ایک کٹر کانگرسی دوست ایک دن کانگرسی حکومتوں کے سلسلہ میں بندش شراب کا ذکر فرما رہے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک مسلم لیگ کے حامی بھی وہاں موجود تھے۔ پھر کیا تھا دونوں میں ٹھن گئی۔ جب بحث بحثی میں کافی وقت گزر گیا تو میں نے کہا کہ تم دونوں کو حافظ کا فیصلہ قبول کر لینا چاہیئے۔ دونوں آمادہ ہو گئے۔ میں نے پنجاب کے متعلق دیوان کھولا تو یہ نکلا ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ دورِ شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

کانگرسی حکومتوں کے متعلق کھولا تو یہ شعر سامنے تھا ؎

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام
زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

اسپر کانگرسی دوست بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ تم نے پہلے ہی سے نشان لگا رکھے تھے۔ وہی جگہ کھول دی۔ یہ ہم نہیں مانتے۔ میں نے دیوان اُن کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

مجھ پر اعتبار نہیں تو خود دیکھ لیجئے۔

انہوں نے دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا ؎

در میخانہ ببستند خدایا مپسند
کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند

یہ شعر پڑھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئے اور ایسے گئے کہ آج تک شکل نہیں دکھائی۔

۴۔ ایک دن بحث چھڑ گئی کہ حافظ و خواجو میں سے کس کے اشعار اچھے ہیں۔ ایک صاحب کو اصرار تھا کہ خواجو چونکہ السابقون الاولون میں سے ہے لہذا اس کی برتری میں شبہ نہیں۔ خود حافظ صاحب سے جب استفسار ہوا تو یہ شعر نکلا ؎

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلمان است
کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

**عالمگیر بکڈپو سے کتابیں خریدیئے**

## فاتح کی سیاست

"فاتح مفتوح سے پابندی حکم چاہنے کیلئے ان کو آزار پہنچاتا اور بدسلوکی کرتا ہے وہ سب سے مضبوط سب سے بہادر اور غیر مغلوب تک کو بھی پھانسی پر چڑھاتا اور اس کے مقابلہ میں زیادہ کمزور زیادہ بزدل اور زیادہ فرمانبردار کو رہنے دیتا ہے کیونکہ یہ دوسروں کے علاوہ ایسی اولاد پیدا کرتے ہیں جن کے اندر غلامی اور کمینے پن کے خیالات تمام قوم میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔"

(ولبرٹ)

# تیرہ سال بعد

جذبات انگیز افسانہ

از جناب محمد اسحاق میرؔ

تیرہ سال کا عرصہ ہوا کہ میں اسی شہر میں کس مپرسی کی حالت میں آوارہ گردی کیا کرتا تھا۔ اُس وقت یہاں کی عالی شان عمارتیں مجھے ایک معنی خیز سکوت اور نفرت انگیز نظروں سے دیکھتی تھیں۔ مگر آج میں فاتحانہ انداز میں ہانگ کانگ کے بازاروں میں سے گذر رہا تھا۔ دفعتہً چلتے چلتے میں ایک عالیشان عمارت کے سامنے رُک گیا۔ کیا نسیمہ اب بھی ویسی ہی خوبصورت ہے جیسے وہ تیرہ برس پہلے تھی؟ منصور کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے ہیں؟ شاید اب وہ مجھے بھول چکی ہوگی ..................

• زیادہ عرصے کی بات نہیں ——— کوئی تیرہ ہی سال کی مدت گذری ہوگی ——— کہ میں ہانگ کانگ میں بیکاری و بے روزگاری کے عالم میں پریشان و سراسان در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ میں ایک معمولی سے معمولی کام اور ذلیل سے ذلیل ذریعۂ معاش کو بھی حاصل کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا اور منت و سماجت اور ہر ممکن ذریعے اور وسیلے کو کام میں لانے کی کوشش کرتا تھا لیکن نتیجہ کیا ہوتا ؟ ——— یاس و ناکامی اور نامرادی چنانچہ میں نے کئی مرتبہ مصمم ارادہ کیا کہ اس نابکار دنیا اور بے ہمدرد دنیا والوں سے تمام تعلقات منقطع کر لوں۔ رشتہ دار دل کو جو میری پے در پے ناکامیوں کو دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہو رہے تھے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دوں۔ بھائیوں بہنوں اور اپنی بیوہ والدہ سے جو ہزاروں میل دور مجھ سے بڑی بڑی امیدیں باندھے بیٹھی ہے، ہمیشہ کیلئے منہ موڑ کر روپوش ہو جاؤں۔

یہ پراگندہ اور گمراہ کن خیالات ان تاریک اور یاس انگیز ایام میں میرے دماغ میں ہر وقت متحرک رہتے تھے اور میں اپنی پریشانیوں کے باعث ایک عجیب مخمصے میں پھنسا ہوا تھا۔ اس وقت میری حالت اگرچہ حالات کی اہمیت کی وجہ سے نہایت خطرناک اور پر مصائب تھی۔ تاہم مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی بھی آفتاب امید کے طلوع ہونے کے انتظار میں اپنی آنکھوں کو بند کیا ہو۔ بیشک مجھے ایک انسان اور خطا و سہو کا پتلا ہونے کی حیثیت سے اپنی فطری کمزوری اور کم ہمتی کا پورا پورا اعتراف ہے اور میں جانتا ہوں کہ مجھ پر کئی مرتبہ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اگر وہ زیادہ عرصے تک میرے دل و دماغ پر مسلط رہتی تو میری زندگی کی تمام سنہری امیدوں کا عالیشان محل میری ایک لغزش کے ڈائنامیٹ سے اُڑ کر سطح زمین کے برابر ہو جاتا۔ لیکن مجھے ابھی تک خوب اچھی طرح یاد ہے کہ میرے دل میں اُمید کی ایک ایسی شعاع اور یقین کا ایک ایسا درخشاں شعلہ تھا جو میری تمام مایوسیوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی کو چیر کر میرے خانۂ دل کو منور کر دیتا تھا۔

انہی خیالات میں مستغرق ——— اپنی گذشتہ اور موجودہ زندگی کے تاریک اور روشن پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے ——— میں ہانگ کانگ کے مشہور و معروف اور پُر رونق بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ تیرہ سال کا عرصہ ہوا کہ میں اس شہر میں کس مپرسی کی حالت میں آوارہ گردی کیا کرتا تھا۔ اس وقت یہاں کی عالیشان عمارتیں مجھے ایک معنی خیز سکوت اور نفرت انگیز نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اس شہر کی زمین میرے لئے تنگ ہو چکی تھی اور آسمان کو میری اس شہر میں موجودگی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ بالآخر حالات سے تنگ آکر میں اس پونجی کو لے کر جو میں نے وطن میں رہی سہی جائیداد کو اونے پونے داموں پر فروخت کر کے حاصل کی تھی۔ جاپان کا رُخ کیا۔ وہاں اگرچہ میری کسی قسم کی شناسائی نہ تھی۔ لیکن جب حالات سُدھرنے پر آتے ہیں۔ تو اس میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ میں نے اپنی سرگرمیوں کو پوری قوت کے ساتھ عمل میں لانے کیلئے کوبے شہر کو منتخب کیا۔ لیکن اس مرتبہ مجھے زیادہ زحمت کشی کا موقعہ نہ ملا۔ اور میں دوسرے ہی دن ایک ہندوستانی فرم میں جو جاپان سے ربڑ کا مال درآمد کیا کرتی تھی، ملازم ہو گیا۔ اور پھر میں نے آہستہ آہستہ ترقی کرنا شروع کی۔ دن رات کو ایک کیا مشکلات کا مردانگی سے مقابلہ کیا۔ دکھ درد کی حالت میں صبر و استقلال کا دامن نہ چھوڑا اور بالآخر میں اس مرتبہ پر پہونچا کہ میں ایک بہت بڑے تجارتی ادارے کا واحد مالک ہوں اور ہر سال لاکھوں روپیہ منافع کی صورت میں حاصل کر رہا ہوں ——— آہ! میرے لئے یہ دن کتنے مسرت کا دن تھا کہ میں آج فاتحانہ انداز میں ہانگ کانگ کے بازاروں میں سے گذر رہا تھا۔

دفعتہً چلتے چلتے میں ایک بہت عالیشان عمارت کے سامنے رُک گیا۔ اور اس عمارت پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ ہاں! مجھے یاد ہے اور خوب اچھی طرح یاد ہے کہ یہ عمارت جس کی بالائی منزل آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ میرے ایک قدیم اور مخلص دوست منصور کی خوبصورت بیوی کی ذاتی ملکیت ہے۔ کئی سال گزر چکے ہیں۔ کہ میری اس سے خط و کتابت بند ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے ہانگ کانگ سے جا کر اُسے کبھی خط لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

منصور کی خوبصورت اور سلیقہ شعار بیوی نسیمہ ایک ایسی عورت تھی کہ اس میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے، جو ایک سلیقہ شعار عورت کیلئے لازم ہو سکتے ہیں۔ اس کے سیب کی طرح سُرخ گال۔ اس کے گھنگریالے گیسو۔ اس کی سیاہ اور مست آنکھیں۔ اس کی چنبیلی کی طرح چمکتی ہوئی پیشانی۔ اس کے موتیوں کی طرح درخشاں اور خوبصورت دانت۔ اس کے حنائی لب۔ اس کی دلوں پر بجلیاں گرانے والی مسکراہٹ اور اس کا جادو بھرا دل میں اُتر جانے والا طرز کلام ایسی چیزیں نہ تھیں جو ایک دیکھنے اور ملنے والے کو اس کا غلام بے دام نہ بنا لیں۔ مجھے اس سے یقیناً محبت تھی۔ میں اپنی مصیبت کے ایام میں جب اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ تو مجھے کسی لمحہ میں بھی اپنی مصیبت اور پریشانی کا خیال نہ گزرتا۔ میں گھنٹوں گفتگو میں صرف کر دیتا۔ مگر پھر بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ شاید میں ابھی ابھی یہاں آیا ہوں۔ مجھے اسکی تواضع، دلجوئی اور بے لوث ہمدردی ابھی تک نہیں بھولی۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر اس وقت اس شہر میں میری مصیبت پر سب سے زیادہ کسی دل کو کوفت تھی تو وہ نسیمہ کا دل ہی تھا جو میری پریشانیوں کو دیکھ کر اندر ہی اندر کُڑھتا تھا ——— اور شاید میں اسی بے لوث محبت اور خالص ہمدردی کو دیکھ دیکھ کر اپنے دل ہی دل میں سوال کیا کرتا تھا کہ کیا واقعی نسیمہ مجھ سے محبت کرتی ہے؟

میں منصور کو خوش قسمت ترین انسان تصور کرتا تھا۔ اور مجھے اس پر رشک بھی تھا کہ خدا نے اسے ایسی حسین و جمیل اور سلیقہ شعار بیوی عطا کی ہے۔ لیکن کیا منصور بھی اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا تھا؟ ——— نہیں! بالکل نہیں۔ کیونکہ وہ نسیمہ کا حقیقی قدردان نہ تھا۔ بیشک اس کے دل میں نسیمہ کے غیر معمولی حسن اور سلیقے کا ضرورت سے زیادہ احساس تھا۔ لیکن وہ اس کی کماحقہ قدر نہ کر سکتا تھا۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس میں ایسی صفات نہ تھیں جو نسیمہ جیسی خوبصورت اور عقلمند بیوی کے شوہر میں ہونا ضروری ہیں۔ شادی سے پہلے وہ اگرچہ نہایت نیک سیرت تھا لیکن بعد میں کبھی کبھی مے نوشی کر لینے کو برا نہ سمجھتا تھا۔ وہ اب فضول خرچ بھی ہو چکا تھا۔ اور کبھی کبھی اپنی شیطانی خواہشات کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بازاری عورتوں کی مصنوعی محبت کے پانی سے بھی ٹھنڈا کر لیا کرتا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ نسیمہ اب اس سے کلیتہً دل برداشتہ ہو چکی تھی۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ جب وہ اس کی موجودہ سرد مہری اور بے توجہی کو دیکھتی اور پھر ان قربانیوں اور مصیبتوں کا جائزہ لیتی جن کی پل صراط پر سے گزر کر وہ اس اندر کی جنت میں پہونچی تھی۔ تو وہ اکثر گہری سوچ میں پڑ جایا کرتی اور ... مجھے بار بار اُسے ادھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر ... ان تفکرات ... کی انجمن سے نجات دلانا پڑتی تھی۔ اسی کش مکش کے دوران میں ایک دن اس نے مجھ سے نہایت رقت آمیز اور درد بھرے لہجے میں کہا: ———

"نسیم تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک متمول اور خوشحال خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ میرے والدین کی خواہش تھی کہ میری شادی شنگھائی کے ایک بہت بڑے تاجر کے لڑکے سے کر دی جائے۔ تاکہ میں بچپن سے ناز و نعم میں پلی پوسی اپنی جوانی اور زندگی کے تمام بقیہ ایام بھی مسرتوں اور راحتوں کی دلفریب وادی میں بسر کر دوں۔ لیکن مجھے منصور سے محبت تھی کیونکہ وہ مجھ سے بے انتہا محبت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور اسی محبت کی مقناطیسی قوت مجھے منصور کی جانب اپنی پوری قوت کے ساتھ کھینچ رہی تھی۔ پھر میں نے کن افسوسناک حالات میں اپنے خاندان کی عزت و عظمت کو ٹھکرایا۔ اور کس طرح میں نے اپنے بوڑھے والدین اور قرابت داروں کی آتش غضب کو اپنے لئے بھڑکایا۔ اور کس طرح میرے والدین نے میری اس مذموم روش کا دو ٹوک جواب دیتے ہوئے اور اپنے ناموس کی چادر پر سے میری شرمناک حرکت کے سیاہ داغ کو ہمیشہ کیلئے مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے، اپنی ساری جائیداد سوائے اس مکان کے میرے چچازاد بے وقوف اور ناکارہ بھائی کے نام لکھ دی۔ اور مجھ سے تمام تعلقات منقطع کر کے مجھے عمداً ایسا فراموش کیا کہ گویا میں ان کی اولاد ہی نہیں تھی ........

........ لیکن افسوس کہ مجھے اتنی قربانیوں کے بعد بھی ایسا رفیق حیات میسر ہوا جو میری قدر کرنا تو درکنار خود اپنی قابلیتوں سے ہی فیضیاب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور مجھے سب سے زیادہ اس کی اس کمزوری سے زبردست اختلاف ہے کہ وہ مصائب کا مقابلہ کرنے کی بالکل جرأت نہیں رکھتا۔ وہ اگرچہ تاجر ہے اور تاجر استقلال کی جیتی جاگتی تصویر اور مجسم مثال ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ذرا سی پریشانی لاحق ہو جانے سے ہی اپنی ہمت ہار دیتا ہے اور ایسی کیفیت میں وہ دُنیا کی ہر ایک شے حتیٰ کہ اپنی محبوب رفیقۂ حیات کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اتنا دلاور ہوں کہ میں نے شکار کھیلتے وقت اکثر زخمی شیر کو میدان پر سے کود کر اپنی گولی کا نشانہ بنایا ہے۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ میں آپ کو بہت دلاور تسلیم کر لوں ... آپ ... معمولی سی مصیبت کو بھی برداشت کرنے کی تاب نہیں لا سکتے۔ میں نے اکثر کی زبان سے سنا ہے ... دنیا کی ... نعمتوں میں سے صرف تم ہی ایک ... محبوب ...

لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ کیونکہ جب مصائب و آلام کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ تو وہ مجھے بالکل ہی فراموش کر دیتا ہے ......... اور اس خود فراموشی اور بے خودی کا باعث صرف وہ بزدلی ہے جس کی موجودگی میں سفینۂ حیات کو استقلال کے چپوؤں سے کھیتے ہوئے دریائے حوادث کے پار لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ بزدلی وہ شے ہے کہ اس کی موجودگی میں حقیقی محبت۔ امید۔ اور کامیابی کی مسرت بخش لہریں دل کے اندر جاگزیں نہیں ہو سکتیں ......!"

آہ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے۔ نسیمہ اس کے بعد کچھ دیر تک بالکل خاموش ہو گئی۔ اور جب آنسو اس کی آنکھوں سے گزر کر اس کے شفتالو کی طرح سرخ رخساروں پر گرنے لگے تو مجھے ان پر آبدار موتیوں کا شبہ گزرتا تھا۔ اس نے جب اپنا نیلگوں رومال لے کر اپنی آنکھوں پر رکھا اور آنسوؤں کو پونچھنے کی کوشش کی۔ تو یوں محسوس ہوا کہ کوئی گل نیلوفر فرط محبت میں کسی گلاب کے پھول سے ہمکنار ہو رہا ہو۔ اس وقت میں حیرت زدہ ہو کر ایک بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اور میری گفتگو کرنے کی قوت بالکل سلب ہو چکی تھی۔ لیکن کچھ توقف کے بعد نسیمہ نے خود بخود میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور ایک اطمینان بخش گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن نسیم میں بہت خوش ہوں کہ مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ہمت نہ ہارنے کی قوت تم میں مکمل طور پر پائی جاتی ہے ........"

یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گئی۔ معلوم نہیں وہ کن خیالات میں مستغرق تھی۔ چنانچہ جب میں نے اس بے لطف مجلس کو برخاست کرنے کی غرض سے جانا چاہا تو وہ چونک کر بولی ——

"آپ ابھی سے واپس جا رہے ہیں؟"

میں نے ایک ہلکی سی مصنوعی مسکراہٹ کے سوا اور کوئی جواب نہ دیا اور وہاں سے واپس چلا آیا۔

~~~~~~~~

وہ دن اور یہ دن —— ایسے دو دن کہ ان میں تیرہ سال کی طول و طویل مدت حائل ہے —— پھر میں کبھی بھی نسیمہ کے مکان پر نہ گیا۔ اس نے اگرچہ منصور کی بزدلی پر واضح الفاظ میں تنقید کی تھی۔ اور میرے استقلال و صبر کو کھلے الفاظ میں سراہا تھا۔ لیکن میرے دل میں اس گفتگو اور غیر معمولی حادثہ کے بعد ایک شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ اور میرے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو میں کبھی کبھی یاس انگیز اور مایوسی کی حالت میں اپنی مصیبتوں کے متعلق نسیمہ سے کہہ چکا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد نوبت بانیجا رسید کہ میں نے اپنی اولین فرصت میں ہی اس شہر سے روپوشی اختیار کرنے کی ٹھان لی اور بالآخر اس شہر کو بصد حسرت و یاس خیرباد کہہ کر ہی دم لیا۔

تیرہ سال کا عرصہ! آہ ...... کتنا طویل و دراز اور صبر شکن وقفہ تھا! معلوم نہیں اب نسیمہ بوڑھی ہو چکی ہوگی۔ یا ابھی ویسے ہی دلفریب و خوبصورت ہے۔ معلوم نہیں منصور کے اب اس سے تعلقات کیسے ہیں۔ شاید وہ مجھے اب بھول چکی ہوگی۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنا عرصہ سڑک کے ایک کنارے پر نسیمہ کی مملوکہ عمارت کے عین سامنے یہ باتیں سوچتا رہا۔ ٹرام اب بھی ویسی گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ اور بسیں اور لاریاں اسی زور و شور کے ساتھ چل رہی تھیں۔ انسان اسی انہماک اور تیزی کے ساتھ سڑک پر ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ میں نے ایک غیر معمولی وقفے کے بعد ہمت کی اور سڑک کو پار کر کے سیدھا اس عمارت کے قریب پہونچا اور لفٹ کے ذریعے سے سب سے بالائی عمارت پر پہونچ گیا۔ قرائن سے معلوم ہوا کہ نسیمہ اب بھی اسی جگہ رہتی ہے۔ کیونکہ برآمدے میں وہ تصویریں اسی قرینے کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں جسے میں کئی سال پہلے دیکھ چکا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر قدرے مطمئن ہو گیا۔ اور چند لمحوں کے اندر ہی درمیانی کمرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب میرے اور نسیمہ کے ڈرائنگ روم کے درمیان صرف ایک ہلکا سا نیلگوں مخملی پردہ تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے پردے کو اٹھایا۔ اور دزدیدہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ اپنی دلکش اور دلفریب سجاوٹ کے لحاظ سے نگارخانۂ چین بنا ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچ کر ملازمہ کو بلانے کے لئے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا اور ایک معمولی سے وقفے کے بعد ایک ادھیڑ عمر عورت دروازے پر آئی اور میری شکل و صورت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"اپنے قدیم دوست مسٹر منصور سے۔ کیا وہ اس وقت اندر ہی تشریف رکھتے ہیں؟"

ملازمہ ماتھے پر بل چڑھا کر "آپ منصور صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟ آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟"

"ہاں! میرا نام نسیم ہے"

"اچھا، آپ اندر تشریف لائیے۔ میں بیگم صاحبہ کو خبر کرتی ہوں"

اس معمولی سی گفتگو کے بعد ملازمہ اندر چلی گئی اور میں نسیمہ کے آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں ایک سپرنگ دار کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ اور سامنے دیوار پر ایک تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ جس میں ایک افریقہ کا سیاہ فام وحشی انسان نیزے سے شیر کا مقابلہ کر رہا تھا۔ تصویر کو دیکھ کر میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ واقعی نسیمہ کا ذوق انتخاب ہی صاف طور پر یہ بتا رہا ہے کہ وہ جوانمردی اور جفاکشی کی حقیقی قدردان ہے۔ اور دلیر انسان کو نہایت عزت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے ..........

میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ دائیں جانب کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور نسیمہ مسکراتی ہوئی سرو خراماں کی طرح کمرہ میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ وہ آج بھی مجھے ویسی ہی دلفریب حسین اور دلکش نظر آ رہی تھی جیسا کہ مجھے آج سے تیرہ سال پہلے دکھلائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے سے اگرچہ اب شوخی کی بجائے سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ لیکن اس کی سرشار آنکھوں میں اب بھی وہی شوخی، کشش اور جادو بھرا ہوا تھا۔ جب وہ میرے قریب آئی تو مجھے پہچانتے ہی وہ دم بخود سی ہو گئی۔ عالم حیرت میں بے خود ہو کر چلتے چلتے رک گئی۔ اور چند لمحوں کے بعد بے اختیار ہو کر فرط مسرت میں مسکرانا شروع کر دیا۔ میں تعظیماً کاؤچ سے اٹھ بیٹھا۔

"نسیم تم واقعی آ گئے ہو؟"

یہ کہہ کر وہ غیر معمولی طور پر نہایت بے تکلفی کے ساتھ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اور میرے چہرے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میرے دل میں گذشتہ طویل جدائی کی یاد تازہ ہو گئی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ اور مجھے اس کے سوال کا جواب دینا بالکل یاد ہی نہ رہا۔

"تیرہ سال تک آپ لاپتہ رہے۔ اور معمولی سے معمولی اطلاع دینے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی" نسیمہ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس فروگذاشت کا احساس ہے"

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"الحمد للہ! کہ آپ کی ملاقات اتنے طویل انتظار کے بعد نصیب ہوئی ہے۔ لیکن نسیم مجھے اس خاموشی اور روپوشی کی وجہ بتاؤ"

"یقیناً بتاؤں گا۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ منصور بھائی اس وقت کہاں ہیں؟"

"بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم اپنی سرگذشت بیان کرو" اس نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔

طوعاً و کرہاً میں نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنی عجیب و غریب سرگذشت سنائی جس کا اختتام غالباً اس جملے پر ہوا تھا۔

"........ اور آج میں اپنی ان تھک کوششوں اور صبر و استقلال اور خدا کی رحمت کے باعث لاکھوں روپے کی جائداد اور کاروبار کا مالک ہوں"

نسیمہ میری سرگذشت کو نہایت انہماک اور توجہ سے سنتی رہی۔ اور جب میں نے اپنے سلسلۂ کلام کو ختم کیا اور اس کے روشن اور حسین چہرے کا جائزہ لینا شروع کیا تو مجھے اس پر محبت اور مسرت کے آثار نمایاں طور پر نظر آئے۔ وہ کچھ دیر تک بالکل خاموش رہی لیکن میں نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"نسیمہ! اب بتاؤ۔ منصور بھائی اسوقت کہاں ہیں اور کب واپس تشریف لائیں گے؟"

"منصور اس وقت کہاں ہیں اور کب واپس تشریف لائیں گے؟ یہ سوال اب مہمل سا معلوم ہوتا ہے" اس نے دل [illegible] ہو کر کہا۔

"کیوں؟" میں نے متعجب ہو کر کہا "آج یہ سوال مہمل کیوں بن گیا۔ جبکہ تیرہ سال پہلے یہ بالکل بامعنی سمجھا جاتا تھا"

"افسوس!" اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "منصور اپنی بزدلی کی وجہ سے اب ایسی جگہ پہونچ چکا ہے کہ میرے اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔ اور اب مجھے یقین ہو گیا

## محبت کی مجبوریاں

از حضرت کوکب شاہجہانپوری

وہ نوبہار ... اور ... پریشاں مرے لئے
گلزار کائنات ہے ویراں مرے لئے

ناز آفرینیاں ... نہ ... کرشمہ طرازیاں
وہ عشوہ ساز ... بے سر و ساماں مرے لئے

جس کی ادائے لطف ... مداوائے ہر الم
وہ محو فکر چارہ و درماں مرے لئے

وہ زلف ... جس کی یاد ... رفیق خیال و خواب
انداز بے دلی سے پریشاں مرے لئے

وہ مست انکھڑیاں ... وہ طرب گلابیاں
جوش ملال سے گہر افشاں مرے لئے

ہر کیف اثر نگاہ ... قرار و نشاط روح
وہ مبتلائے گردش دوراں مرے لئے

جس کا جمال ... وجہ سرور دل و نگاہ
اس رخ پہ رنگ حسرت حرماں مرے لئے

ایما پہ جس کے ... میری اک اک آرزو نثار
اس دل میں سوز آتش ارماں مرے لئے

جس دل کا انبساط ... مرا منتہائے شوق
وہ دردمند، شعلہ بداماں مرے لئے

باقی برصفحہ ۱۱۰
~~~~~~~~

# فقیر ایپی

## آزاد سرحد کے پُراسرار مردِ مجاہد کے دلچسپ حالاتِ زندگی

از رفیق خان حبیب الرحمان خان کابلی

حاجی میرزا علی خاں عرف فقیر ایپی سرحد آزاد و یاغستان کے غیور اور بہادر باشندوں کے محبوب ترین قائد ہیں۔ جلال آباد شریف کی سرہندی خانقاہ کی طرف سے آپ یاغستان میں خلیفہ مقرر ہیں۔ گویا اس لحاظ سے آپ آزاد پٹھانوں کے نہ صرف سیاسی قائد ہیں بلکہ ان کے مذہبی پیشوا بھی ہیں۔ آپ کی پیدائش برطانوی سرحد کے ایک چھوٹے سے گاؤں موضع ایپی میں ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔ اور ہوش سنبھالنے کے بعد ہندوستان کی سیاحت کے لئے گھر سے نکلے۔ تین چار سال تک اجمیر، سرہند، کلیر شریف اور دیگر اولیا کرام اور بزرگان دین کی زیارت گاہوں میں مقیم رہے اور روحانی فیوض حاصل کرتے رہے۔ ان بزرگان دین کی زیارت گاہوں کے علاوہ کئی مرتبہ درویشی کے لباس میں بیت اللہ شریف کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ حج بیت اللہ کے کئی سال بعد آپ افغانستان گئے اور وہاں حضرت مجدد الف ثانی کے خلفا کی بیعت میں شامل ہوئے۔ جہاں سے آپ یاغستان میں خلیفہ مقرر ہو کر آئے۔

## فقیر ایپی کا اخلاق

پٹھانستان کے تمام مجاہد اور سرفروش قبائل فقیر صاحب ایپی کے حلقہ عقیدت میں منسلک ہیں۔ اور آپ کے ہر ارشاد پر جان و مال کو قربان کرنا اپنے لئے سعادت دارین سمجھتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آزاد پٹھان جو فقیر صاحب کے عقیدت مند ہیں آزادی کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت تصور کرتے ہیں۔ اور جہاد کو اپنا مذہبی، وطنی، اور قومی فرض سمجھتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پٹھان و افغان اپنی آزادی کا سب سے بڑا دشمن برطانیہ کو سمجھتا ہے۔ فقیر صاحب ایپی بلند اخلاق ہیں اور اصول کے سختی کے ساتھ پابند ہیں۔ وہ اپنے تمام رفیقوں کو خوش اخلاق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کا ثبوت ذیل کے واقعہ سے ملتا ہے۔

فقیر صاحب ایپی جب گوشۂ گمنامی سے نکل کر آسمان شہرت پر چمک چکے تھے تو ایک مرتبہ وزیرستان کا ایک قافلہ تون چھاؤنی سے بنوں کی طرف جا رہا تھا جس میں فقیر صاحب خود بھی شامل تھے۔ اور اس قافلہ میں ایک ہندو افغانی لباس میں ملبوس بندوق گلے میں ڈالے سفر کر رہا تھا۔ یہ قافلہ جب افغانی کی حدود سے پٹھانستان میں داخل ہوا تو قافلے والوں میں سے چند اشخاص نے اس ہندو کو جو "سیین خارا" میں دو جو گرتز اور سپیدگی کے درمیان ایک نہایت سنسان جگہ ہے، لوٹنا چاہا۔ مگر جب فقیر صاحب کو معلوم ہوا تو آپ نے قافلہ کے سردار کو بلا کر کہا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رفیق سفر کو لوٹنا اور اس کو کسی قسم کا گزند پہنچانا اسلامی قانون اور افغانی رواداری کے خلاف ہے۔ سالار قافلہ نے جواب میں کہا کہ جس شخص کو ہم لوٹنا چاہتے ہیں وہ ایک ہندو کافر ہے۔ ایسے شخص کو گزند پہنچانا اور لوٹنا ثواب میں داخل ہے۔

فقیر ایپی نے نہایت غضب ناک ہو کر کہا کہ یہ فرنگی کا جاسوس نہیں بلکہ یہ افغانستان کا ہندو ہے اور بنوں کے ہندوؤں سے اس کے برادرانہ تعلقات ہیں۔ ہندو ہونے کی وجہ سے کسی کو گزند پہنچانا ثواب نہیں بلکہ پرلے درجہ کی کمینگی ہے۔ اس کے علاوہ کسی ہمسفر کو لوٹنا اور تکلیف پہنچانا افغانی شرف و وقار کے بھی سخت خلاف ہے۔

## آزاد پٹھانوں کی تنظیم

۱۹۳۶ء میں حکومت نے جب سڑکوں کی تعمیر کے نام پر آزاد سرحد پر مسلط ہونے کی کوشش کی تو پٹھان جو اپنی آزادی کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ فقیر ایپی کی قیادت میں تحفظِ آزادی کے لئے میدان مقابلہ میں سر سے کفن باندھ کر اتر آیا اور اپنے مجاہدانہ جوش و خروش سے ثابت کر دیا کہ جوش حریت کی آگ خون کے چھینٹوں سے بھی بجھ نہیں سکتی۔

آزاد سرحد کے بہادر اور غیور پٹھان اپنی آزادی کے نام پر حضرت فقیر صاحب ایپی کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ اور اس راہ میں اپنی جان کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے ان کو یقین ہے کہ موت برحق ہے۔ اور ضرور آئے گی۔ آزادی خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور اس نعمت کو کسی قلیل یا کثیر قیمت پر فروخت کرنا اسلام اور وطن کے خلاف کھلی غداری ہے آزادی کے اس بلند مقصد کے حصول کے لئے فقیر صاحب نے آزاد سرحد کے پٹھانوں کی تنظیم کی مہم شروع کر دی ہے۔ اور مختلف علاقوں میں اپنے سفیر روانہ کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں غازی سید علی بادشاہ کو مرکزی قبائل کی تنظیم کے لئے بھیجا گیا ہے۔

غازی سید علی بادشاہ پہلے برطانوی علاقہ میں سپاہی تھے۔ جب فقیر ایپی صاحب کی خدمت میں پہنچے تو فقیر صاحب نے ان کے خلوص کو دیکھ کر اسے علاقہ تیراہ اور مرکزی قبائل میں اپنا معتمد بنا کر بھیجا۔ چنانچہ اس وقت وہ الغازی محمد سعید خلف الرشید حضرت ملاں محمود اخوند رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ پٹھانوں کی تنظیم میں مصروف ہیں اور ہزاروں پٹھانوں کو منظم کر چکے ہیں۔ اور انہیں بندوقوں اور سامان جنگ سے آراستہ و پیراستہ کر رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں سرحد قوم سے جب تبرا ایجی ٹیشن میں شمولیت کے لئے جتھے بازی شروع ہو گئی تھی تو فقیر صاحب ایپی کے حکم سے جرنیل سید علی بادشاہ اور غازی محمد سعید کے حریت پسند سرفروشوں نے بزور اس جتھہ بازی کو بند کر دیا۔ غازی سید علی بادشاہ افریدیوں کو بھی منظم کرنے اور ان کو فقیر ایپی صاحب کی جانب سے آزادی کا پیغام پہنچانے آئے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کو سب سے بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ آفریدیوں کے ایک مشہور سردار غازی خوشحال خاں کو انہوں نے اپنا رفیق بنا لیا۔ غازی خوشحال خاں نے سید علی بادشاہ کو یہ یقین دلایا ہے کہ آفریدستان کے باشندوں کو قوم و وطن کی آزادی کے تحفظ کے لئے تیار کیا جائے گا۔ اور فقیر صاحب کے ہر ارشاد پر لبیک کہنے میں ہم آفریدی خوشی اور مسرت محسوس کرتے ہیں۔

آفریدستان میں حضرت فقیر ایپی صاحب کے ارشاد اور آپ کے سفیر کے مشورہ سے غازی خوشحال خاں نے لا الٰہ الا اللہ پارٹی قائم کی ہے جس کے جھنڈے تلے ہزاروں آفریدی منظم ہو رہے ہیں۔ اس جماعت کے امیر بھی غازی خوشحال خاں ہیں۔ سرحد کے پولیٹیکل حکام نے ان سے اس سلسلہ میں چھیڑ چھاڑ بھی شروع کی تھی۔ غازی موصوف نے اس کے متعلق چند طویل مراسلے خان عبدالغفار خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر خاں صاحب وزیر اعظم سرحد کے نام روانہ کئے ہیں۔ جن میں پولیٹیکل حکام کے رویہ کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے۔

## فقیر ایپی کی کرامتیں

فقیر صاحب نے اپنی بہادری اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے علاوہ کشف و کرامات سے بھی لوگوں کے دلوں میں اپنی عقیدت اور محبت جما رکھی ہے

ایک مرتبہ لوہ سار یعنی کالا پہاڑ جہاں ماچا وزوں کی آبادی ہے۔ کے ایک درے میں اپنے رفیقوں کے ساتھ بیٹھے جنگی پروگرام کی تیاری میں مصروف تھے۔ کہ ایک دم آپ کھڑے ہو گئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہاں سے چلو۔ سرکاری فوج ہمارے تعاقب میں ہے

### غزل

از جناب لطیف فاروقی مدیر سعادت لائلپور

ترے جلوے بے نقاب ہو کر جو نہاں ہوتے جاتے ہیں
مرے آئینہ دل سے نمایاں ہوتے جاتے ہیں
میری ناکامیاں و پریشانیاں سب بادباں ہیں تو
بغیر ان کے منازل سب بیاباں ہوتے جاتے ہیں
جسے تھا مجھ سے گلہ میری امید وار ان ہوتے جاتے ہیں
تصور میں بھی وہ جب آنکھوں سے گراں سمجھا
جنہیں عشق دو عالم سے ارزاں ہوتے جاتے ہیں
وہی اشک محبت واہ کیا کہنا
لطیف خستہ کا جذب محبت
سراپا داغ الفت تاباں ہوتے جاتے ہیں

گذشتہ ہیں۔ یہاں آنے والی ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کے بعد سرکاری فوجیں وہاں پہنچیں اور جب فقیر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو وہاں نہ پایا تو ان کو سخت حیرت ہوئی۔ کیونکہ ایک گھنٹہ قبل مخبر نے فقیر صاحب کی یہاں پر موجودگی کی خبر دی تھی۔ غرض سب سرکاری فوج فقیر صاحب کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تو واپس لوٹ گئی۔ اس واقعہ سے آپ کے رفیقوں پر آپ کی بزرگی کا زبردست سکہ بیٹھ گیا۔

پٹھانستان میں سرحد خوست پر ایک وادی شوال کوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جگہ خشک پہاڑوں میں واقع ہے۔ جو شاہ زمان خاں اور امیر شیر علی۔ اور قوم کی قدیم خونریز جنگوں کی وجہ سے بے حد مشہور ہے۔ اس وادی میں محسود قوم کے چند جھونپڑے ہیں۔ فقیر صاحب ایک دن تین سو مجاہدوں کے ساتھ وارد ہوئے یہ لوگ چھاؤنی میں مزدوری کے لئے گئے تھے چند عورتیں جو وہاں پر موجود تھیں۔ ان سے فقیر صاحب نے کہا کہ میرے رفیق مسلسل کئی دنوں سے سفر کر رہے ہیں اور ان کو شدت کی بھوک لگی ہوئی ہے ان کے کھانے کا انتظام کیا جائے۔ عورتیں ایک گائے اور بیس سیر آٹا فقیر صاحب کی خدمت میں لیکر حاضر ہوئیں۔ فقیر صاحب کے مریدوں نے کہا کہ حضرت تین سو افراد کا اس سے کیا بنے گا۔ فقیر صاحب نے فرمایا کہ تم فکر مت کرو۔ دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ گائے کو ذبح کیا اور آٹے کو گوندھ کر عورتوں کے حوالہ کیا کہ اب اس کو پکاؤ۔ جب کھانا پک کر مجاہدین کے سامنے لاکر رکھا گیا۔ تو سب نے سیر ہو کر کھایا۔ بلکہ اس قدر کھانا بچ بھی گیا کہ اس کو تین سو آدمی اور بھی کھا کر سیر ہو جائیں

بنوں کی ایک عورت مخبری کی غرض سے فقیر ایپی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی تو مجاہدین نے اس کو زدوکوب کرنا چاہا لیکن فقیر صاحب نے انہیں روکا اور کہا کہ یہ عورت ہے اس پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے۔ اس کو میرے پاس آنے دو۔ یہ عورت جب فقیر صاحب کے پاس آئی تو کوئی بات نہ کر سکی۔ معلوم ہوا کہ اس کی زبان اس کے منہ میں اس قدر پھیل گئی تھی کہ وہ بات کرنے کے قابل بھی نہ رہی اور چند ساعت کے بعد اس کی زبان ایک گز لمبی ہو کر اس کے منہ سے باہر نکل آئی۔ اس پر فقیر صاحب ایپی نے حکم دیا کہ اس کو رات ہی رات انگریزی علاقہ میں پہنچا دیا جائے۔ الغرض اس قسم کی ہزاروں کرامتیں اور کشوف آپ کی طرف منسوب ہیں۔

## فقیر ایپی کے جرنیل

فقیر ایپی کے مشہور جرنیلوں میں ملنگ عالم مہر گل۔ گل نواز۔ سید داور۔ شیر زمان۔ اور سید علی بادشاہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جرنیل ملنگ عالم بنوں کے ایک گاؤں میں ایک سازش کا شکار ہو کر قتل ہو گیا تو فقیر ایپی صاحب کے جرنیل گل نواز نے مجاہدین کی قیادت میں اس گاؤں کو جلا کر راکھ سیاہ کر دیا اور اس سازشی شخص کی بیوی اور لڑکیوں کو وزیرستان لایا گیا۔

## قزاقوں کی حقیقت!

سرحد پر جو لوگ ڈاکے ڈال کر پر امن شہریوں کو تنگ کرتے ہیں ان کا فقیر ایپی صاحب کے ساتھیوں اور فقیر ایپی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ لوگ انگریزی حدود سے متعلق ہیں۔ اور خاص اغراض کے ماتحت یہ لوگ سرحد میں کسی پر اسرار اشارہ سے یہ قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت کا اظہار گل امام اور دیگر مقامات کے ڈاکوؤں سے ظاہر ہوتا ہے۔

فقیر ایپی صاحب گو اپنے پیروں کو یہاں تک ہدایت و تلقین کرتے ہیں کہ وہ کسی ہندو اور سکھ کو ہرگز ہرگز ضرر نہ پہنچائیں۔ کیونکہ اس سے ہماری آزادی کے مقصد کو فائدہ پہنچنے کی بجائے شدید نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں فقیر ایپی نے ایک رفیق کو قتل بھی کر دیا کیونکہ اس کا قصور یہ تھا کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کا دشمن تصور کرتا تھا۔ اور ان کو تنگ کرنا اور اذیت پہنچانا کار ثواب سمجھتا تھا لیکن اس کے برعکس فقیر ایپی صاحب کا نظریہ تھا کہ جو شخص ہندو کو اپنا دشمن سمجھتا ہے وہ بالکل پاگل ہے اور وہ ہم میں سے نہیں ہے

## یاغستان کے صحیح حالات

یہ وہ حالات ہیں جو سرحد آزاد کے بعض افراد سے پشاور میں مل کر معلوم ہوئے ہیں۔ اور کچھ میری ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں۔ ورنہ آزاد سرحد اور حضرت فقیر ایپی صاحب کے صحیح حالات معلوم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ حالات کیسے معلوم ہوں۔ جب نہ وہاں کوئی جا سکتا ہے اور نہ وہاں سے کوئی یہاں آ سکتا ہے گزشتہ چند دنوں کی بات ہے کہ سرحد کے بعض قوم پرستوں نے فقیر ایپی صاحب کے پاس جانے کی کوشش کی تھی تاکہ صحیح حالات معلوم ہو سکیں۔ لیکن ان کو فقیر صاحب سے ملنے کی اجازت نہ مل سکی۔ اگر ان لوگوں کو وہاں جانے کی اجازت مل جاتی تو یہ بات یقینی تھی کہ بعض ایسے اہم انکشافات ہوتے جن کو اہل ہند سے مصلحتاً چھپایا جاتا ہے

---

## تیرہ سال بعد بقیہ صفحہ ۱۰۸

تیرہ سال بعد بقیہ صفحہ ۱۰۸

ہے کہ اسے بھی مجھ سے کوئی محبت نہ تھی!"

"بزدلی" یا "تعلقات کا انقطاع" میں دونوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

"ایسی بزدلی جو انسانیت کے ساتھ کلنک کا ٹیکہ ہے" نسیمہ نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جو انسانوں کیلئے جہنم کی بشارت اور اس بدنصیب انسان کے عزیزوں، رشتہ داروں اور متعلقین کے لئے جیتے جی پیغام موت ہے وہ ایسی بزدلی ہے جو ایک مرد کیلئے ابد تک شرمندگی، ندامت و شرمندگی کا باعث ہے۔۔۔۔۔۔ اور یہی بزدلی منصور کے لئے پیام اجل بن کر آئی۔" نسیمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میرے رگ و ریشے میں غم و رنج اور حزن و ملال کی برقی لہریں دوڑ گئیں۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اور خاموشی کے عالم میں اس فوری صدمہ کے باعث مجسم بت بن گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت میرے اوسان درست تھے یا نہیں۔ نیم بیہوشی کے عالم میں تھا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ میں نے ایک لمبے عرصے کے بعد بڑی کوشش اور ہمت کر کے اپنی خشک زبان کو جنبش دے کر رکتے رکتے کہا۔

"وہ بزدلی کیا تھی جو منصور کیلئے پیالہ اجل ثابت ہوئی؟"

نسیمہ کی آنکھوں سے پھر ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے شروع ہو گئے۔ اور اس نے میری کلائی کو اظہار شفقت کے طور پر ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔

"آپ کے جانے کے سات سال کے بعد منصور کو تجارت میں پے در پے کئی نقصانات ہوئے اور ایک بنک کے فیل ہو جانے سے اس کے دل پر ایسا گہرا صدمہ ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو ایک عارضی رنج سے نجات کے لئے دائمی موت سے ہمکنار ہونا منظور کر لیا۔ اور وطن میں اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو محض اپنی ایک معمولی سی روحانی کوفت کی بھینٹ چڑھا کر انہیں ہمیشہ کیلئے دائمی مشکلات اور مصائب کے غار میں دھکیل کر خود راہ فرار اختیار کی۔ ایک معمولی سے رنج سے سبکدوش ہونے کے لئے خود غرضی اور عزیزوں سے کامل غیر ہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔۔۔۔۔۔۔ اور میں ایسی معیوب حرکت کو انسان کی انتہائی بزدلی۔ خود غرضی اور سنگدلی سمجھتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ بتاؤ نسیم کیا حقیقتاً ایسا نہیں؟"

میں چند لمحوں کے لئے صدمہ کی تاب نہ لا کر پھر دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ معلوم نہیں اس کے بعد نسیمہ نے اور کیا کیا کہا اور وہ کتنا عرصہ گفتگو کرتی رہی۔ لیکن جب میں اس عارضی غشی سے بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ نسیمہ میرے سینے سے لپٹی ہوئی ملتجیانہ اور با اصرار انداز میں کہہ رہی ہے۔

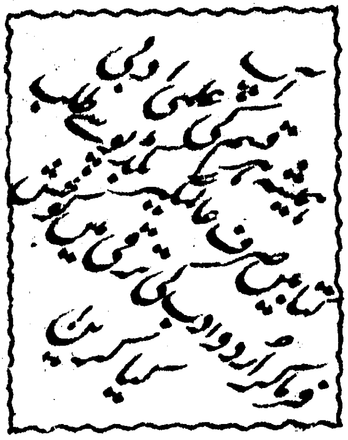
"نسیم! نسیم!! خدارا بتاؤ کیا یہ انتہائی بزدلی اور سنگین انسانی جرم نہیں؟"

میں نے بے خودی کے عالم میں ہی نسیمہ کو اپنے دونوں بازوؤں کی گرفت میں لے لیا اور اس کی طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی اس بزدلی سے بڑھ کر کوئی بزدلی نہیں اور یہ درحقیقت بزدل انسان کی صرف خالی خود غرضی اور ہمدردوں کی محبت اور جذبات کو کمال بے پروائی سے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے۔ لیکن پیاری نسیمہ! اب تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ میری خوش قسمتی سے تم اب منصور جیسے بزدل انسان کی آغوش میں نہیں۔"

نسیمہ کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے شرمائی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اور اس کے سرخ ہونٹ اب اپنی پوری خوبصورتی اور دلفریبی سے چمک رہے تھے۔ میں نے بھی حالات کو خوش قسمتی سے خوشگوار دیکھتے ہوئے ان پر اپنے ابدی پیمان محبت کو باندھنے کے لئے ایک روحانی مسرتوں سے لبریز مہر ثبت کر دی۔۔۔۔۔۔۔

اور اب نسیمہ میری بیوی بن چکی تھی۔



ایک ایکٹ کا ڈراما

# پھول اور کانٹے

از جناب پاشا جالندھری

## افراد

نبر ——— ایک مشہور سائنسدان

زیاس ——— نبر کا بے تکلف دوست

گیری ——— نبر کا نوکر۔ مریض وغیرہ

منظر:۔ [نبر کا معمل۔ میز پر شیشے کے بھبکے اور نالیاں وغیرہ پڑے ہیں۔ نبر اور زیاس میز کے قریب بیٹھے محوِ گفتگو ہیں]

زیاس۔ "کیا بہکی بہکی باتیں کرتے ہو نبر۔ تم لوگ تو عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہو لٹھ ......"

نبر۔ "یہ بھی ایک ہی کہی۔ تم وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ خدا موجود ہے"

زیاس۔ "اور کیا تم اس بات کو پایۂ ثبوت تک لے جانے کیلئے تیار ہو کہ نظامِ عالم پر ایک ذرے کی حکومت ہے"

نبر۔ "میں کیا۔ ہر ایک سائنسدان ......"

زیاس۔ (الفاظ کاٹ کر) "سب باؤلے ہوتے ہیں (آپ ہی آپ) نہ جانے ان لوگوں کی عقل کھو گئی ہے کیا"

نبر۔ "زیاس! تم نے موجودہ ایجادات کو ٹک ٹکی آنکھ نہیں دیکھا ورنہ تم پر بہت جلد یہ راز منکشف ہو جاتا ......"

زیاس۔ "انہاں میں ایسی ویسی لغویات کے عالم میں جان بوجھ کر پھنسنا دانشمندی نہیں سمجھتا"

نبر۔ "ارے واہ! تم سائنس اور فلسفے کو لغو بتاتے ہو۔ حالانکہ ان دونوں کی کرشمہ سازیاں اور فسوں کاریاں سب پر عیاں ہیں ...... آج ہم کیا کچھ نہیں کر سکتے ....."

زیاس۔ "کیا پدی اور پدی کا شوربا۔ تم کیا کر سکتے ہو۔ یہ تو سب قدرت کے جوہر پاروں کی نقل ہے نقل ......"

نبر۔ "ہے تو سہی۔ مگر نقل را عقل باید۔ یہ بھی تو سائنس کی برکات ہیں"

زیاس۔ "مگر نبر تم جو کہتے ہو کہ سائنس کی دنیا پر حکمرانی ہے۔ تمہارے یہ خیالات کہاں تک درست ہیں۔ کوئی ذی شعور ان پر کان دھر سکتا ہے؟"

نبر۔ "آنکھ رکھتے ہوئے جان بوجھ کر اندھے ہو جاؤ تو کوئی کیا کرے۔ اتنی دماغ سوزی پر بھی خاک نہ سمجھے۔ اور ہاں آج کل ہم روح پر قبضہ جمانے کی سعی کر رہے ہیں ......"

زیاس۔ "یہ جد و جہد اور سعی و تجاہد لاحاصل ہے۔ نبر تم نے کیا ہی کیا ہے"

نبر۔ "جانے جناب کو علم ہی نہیں۔ بڑے بڑے بنے پھرتے ہیں۔ ارے بھئی یہ ریل گاڑیاں۔ ہوائی جہاز۔ گولے بارود اور جانے کیا لٹریچر۔ یہ بھی تو سائنس کی خدمات کا ایک نادر نمونہ ہے اور اب تمہارے سامنے روح کو اپنے آہنی شکنجے میں دبا لونگا (مستقبل کے خیالات سے قدرے مسرور ہو کر) پھر دنیا میں ہر سویرے نام کا ڈنکا بجے گا۔ مردے زندہ ہو جائیں گے۔ ہاہا ... کیوں دوست ہے نا ..."

زیاس۔ "محض خیال آرائیاں ... ایسے ارادوں سے باز آؤ نبر ....."

نبر۔ "بھئی واہ خوب رہی ــ تم سمجھتے ہو کہ میرا گلہائے مراد سے آراستہ پیراستہ محل دم بھر میں مسمار کر دیا جائیگا .. ہوں؟ ....."

زیاس۔ "اور نہیں تو کیا ....."

نبر۔ "میری میز پر ایک نظر ڈالو۔ طرح طرح کی ایجادیں ہیں۔ جو جنگ میں نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ پیلے سے پانی کی نلکی دیکھیا۔ بخدا اتنی تیز ہے کہ معاذ اللہ! اگر یہ ٹوٹ جائے تو جانو میرا معمل خاکستر کی ایک مٹھی بن جائے ...."

زیاس۔ "ہوں ... ہوں ...."

نبر۔ "نہیں مانتے نہ مانو ... تم جانو تمہارا کام۔ اچھا ٹھہرو تمہیں سب کچھ دکھلائے دیتا ہوں ..." (گیری کو آواز دیتا ہے) مریض کو کھاٹ پر لٹا کر ادھر آؤ۔

(گیری مریض کو لئے داخل ہوتا ہے۔ نبر تیزی سے بڑھتا ہے اور اسے اٹھا کر شیشے کی الماری میں بند کر دیتا ہے)

نبر۔ "یہ قریب المرگ ہے بالکل ... زیاس بغور مریض کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا مطالعہ کرو ... کوئی چھید نہیں ... کوئی سوراخ نہیں۔ فقط ایک ڈبیہ سی ہے۔ اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ کوئی چیز اس میں جا کر لوٹ نہیں سکتی .... ارے پھر جان نکل کر کہاں بھاگ جائے گی"

زیاس۔ "ہوں ... ہوں" (ایک مبہم سا جذبۂ خوف اس کے دل کی گہرائیوں میں اہمیت پکڑتا جا رہا ہے) "نبر جہاں پھول وہیں کانٹے ....."

(مریض اضطرارانہ پہلو بدلتا ہے)

نبر۔ (الفاظ کاٹ کر جوش سے) "زیاس وہ دیکھو۔ کچھ دھواں سا دکھائی دے رہا ہے۔ بس یہی جان ہے .... ہاہا ... ہی ہی ...."

زیاس۔ (گھبرا کر) "یہاں سے چل دینا از بس ضروری ہے۔ روح خدا کے پاس ہی جائیگی۔ وہ کہیں پل بھر نہیں اٹک سکتی .."

(مریض کے منہ سے دھواں سا نکلتا ہے وہ مردہ ہو کے رہ جاتا ہے)

نبر۔ "ذرا ٹھہرو .. بس اب میدان مار لیا ... مار لیا" (دھواں محدود فضا میں ادھر ادھر بھٹک کر پھر مریض کے منہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ... کا بے حس و حرکت جسم متحرک ہو جاتا ہے ..)

زیاس۔ (طنزاً) "لو مار لیا میدان ... ہونہہ .."

(دھواں پھر مریض کے منہ سے نکلتا ہے کوئی راہ فرار نظر نہیں آتی ..)

نبر۔ "وہ ڈبیہ میں جانے کو تھے ... ہائے ... اوں .. اوں .."

باقی بر صفحہ ۱۲۳

# کہیں نہ کہیں

از جناب سید محمد علی صاحب بہار

نکلے یہ آہِ آتشیں نہ کہیں
آگ لگ جائیگی کہیں نہ کہیں

جس کو سمجھے ہیں راز داں اپنا
نکلے وہ مارِ آستیں نہ کہیں

لاکھ پردے میں تم رہو چھپ کر
دیکھ ہی لینگے ہم کہیں نہ کہیں

کہیں ایسا نہ ہو بگڑ بیٹھیں
شکوہ کرنا دلِ حزیں نہ کہیں

اُن کے اقرار کے عوض ڈر ہے
وہ زباں سے کہیں نہیں نہ کہیں

سرخ آنکھیں بتائے دیتی ہیں
رات جاگے ہو تم کہیں نہ کہیں

دُور آنکھوں سے ہیں بہار مگر
نکلیں وہ دل ہی کے قریں نہ کہیں

# غزل

از جناب صائب عاصمی

میں کیا کہوں وہ کس لئے آئے کدھر گئے
ہاں آج مسکرا کے ادھر سے گزر گئے

میں ڈھونڈتا ہوں جن کو شبِ ماہتاب میں
اب وہ حسین لمحے الٰہی کدھر گئے؟

وہ یاد آ رہے ہیں مجھے پھر بہار میں
بچھڑے ہوئے جنہیں کئی موسم گزر گئے

مدت ہوئی چلے گئے مجھکو بھلا دیا
لاہور سے گئے نہ وہ دل سے مگر گئے

ہر سنگِ راہ بن گیا پھر آستانِ یار
پھر جستجوئے یار میں جلدے گزر گئے

اب کے بھی میرے سر سے قیامت گزر گئی
"اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے"

اب میرے دل میں حسرتِ پرواز بھی نہیں
اُڑنے کے دن تو سارے قفس میں گزر گئے

مجھکو مسرتوں سے زمانے کی کیا غرض
صائب وہ کیا گئے مرے شام و سحر گئے

## سگار کے پھٹنے سے شوہر کی ہلاکت

فرانس میں ایک عورت نے ایک سرکاری سگار بنانے والی فرم سے ۱۰۰۰ پونڈ کا تاوان اس بنا پر بذریعہ عدالت حاصل کیا ہے۔ کہ چار سال پیشتر جبکہ اس کا شوہر اس فرم کا تیار کردہ سگار پی رہا تھا دفعتاً ایک دھماکہ کے ساتھ وہ سگار پھٹ پڑا۔ جس کے صدمے کی تاب نہ لا کر اس کا شوہر راہی ملک عدم ہو گیا تھا۔

## آج تک کوئی طلاق نہیں دی

کینیڈا کے قریب ایک جزیرہ پرنس ایڈورڈ نامی ہے۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف اسی جزیرے میں ہی طلاق حاصل کرنے کی ایک ایسی عدالت ہے کہ جس نے طلاق کی خواہشمند ہزار ہا عورتوں کے مقدمات سنے ہیں۔ لیکن آج تک کسی ایک عورت کو بھی طلاق حاصل کرنے کا قانونی طور پر اجازت نہیں دی۔

## ۴۴ انچ لمبا پاؤں

کولوراڈو میں ایک کوئلے کی کان میں ۴۴ انچ لمبے پاؤں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جس جانور کے یہ پاؤں ہیں۔ وہ تقریباً ۳۵ فٹ اونچا تھا۔ اسکے ایک قدم کا طول ۱۵ فٹ تھا۔ اور تقریباً دس لاکھ برس پیشتر شمالی امریکہ میں پایا جاتا تھا۔

# دلچسپ خبریں

از جناب محمد اسحٰق صاحب میرٹھ

## کرایہ داروں کو ڈائنامیٹ اڑانے کی کوشش

چیکوسلاواکیہ میں ایک مالک مکان نے کرایہ داروں کے کرایہ نہ دینے سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے بم کرایہ داروں کو معہ ان کی رہائش گاہوں کے ڈائنامیٹ سے اڑا دے۔ چنانچہ اس نے خفیہ طور پر برقی انتظام کی امداد سے بذریعہ سرنگ ان کی رہائش گاہوں کے نیچے بم۔ بارود اور ڈائنامیٹ وغیرہ نہایت احتیاط اور پوشیدگی سے رکھ کر انکی مکمل تباہی و بربادی کا پورا پورا انتظام کر لیا تھا۔ لیکن سوء اتفاق سے عین وقت پر کرایہ داروں کو مالک کے اس بہیمانہ انتظام کی خبر مل گئی۔

## مٹھائی کی پلیٹیں!

نیویارک کی ایک مٹھائی بنانے والے کارخانے کے ایک مالک نے مٹھائی کی پلیٹیں ایجاد کی ہیں جن میں کھانا ڈالکر نہایت آسانی اور مزے سے کھایا جا سکتا ہے۔ بالفعل یہ بھی کہ ناکہ ان کے بیشتر ٹکڑوں کو بھی ہضم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح برتنوں کو بار بار صاف کرنے اور دھونے کی زحمت برداشت نہیں کرنا پڑتی۔

## مکوڑے ۴۰۰ پونڈ کی بیر پی گئے

آسٹریلیا کے شہر ٹورانو میں بیر کے چند بڑے بڑے کنستر جن کی کل قیمت ۴۰۰ پونڈ کے قریب تھی۔ ۱۸ انچ اونچی بیت پر رکھے گئے تھے۔ رات کی تاریکی میں مکوڑوں نے موقعہ پا کر ان کنستروں پر دھاوا بول دیا۔ اور تمام رات کی لوٹ مار کے بعد اس ۴۰۰ پونڈ قیمتی سامان میں سے جو کچھ باقی بچا تھا وہ سوا بیر کی بھینی بھینی خوشبو کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ البتہ ایک قسم کا سفوف جو شاید ٹین کو کاٹتے وقت زمین پر گرتا تھا کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ایک گذشتہ موقع پر انہی مکوڑوں کو یہ شرارت سوجھی تو بلیرڈ کھیلنے کی تمام گیندوں کو کاٹ کر کھا گئے۔

## بالوں سے رومال کا کام لینے والی لڑکی

ٹورانٹو میں ایک ایسی لڑکی ہے جو چھ فیٹ لمبے بال رکھتی ہے اور بالوں سے رومال کا کام لیتی ہے جو دیکھنے والوں کے لئے تفریح کا باعث ہے۔

## ۹۰ سالہ دقیانوسی بڑھیا

انگلستان کے ایک گاؤں میں ایک ایسا دقیانوسی بڑھیا کو دیکھا جاتا ہے جس نے ۹۰ سال عمر میں کبھی بھی لندن کا شہر دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی اور نہ کبھی اپنی آنکھوں سے سمندر دیکھا اور نہ اُسے سینما دیکھنے کا ہی موقعہ میسر ہوا ہے۔

## گرجا چوری ہو گیا

نارتھ کیرولینا میں ایک گرجے کے متولیوں نے تجویز پاس کی کہ گرجے کی از سر نو مرمت کرنی چاہیئے لیکن جب وہ سب مع اور مزدوروں کے گرجے کی مرمت کیلئے اس جگہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ گرجا چوری ہو گیا ہے کیونکہ وہاں گرجے کا نام و نشان تک بھی نہ تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ پولیس نے اس گرجے کی چوری کے سلسلے میں ایک مشتبہ انسان کو گرفتار بھی کیا ہے۔

## ایک متمول گداگر

بلغراد میں حال ہی میں ایک گداگر نے غریب طلبہ کے ایک مدرسے کیلئے تقریباً ایک ملین پونڈ کی جائداد چھوڑ کر وفات پائی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جائداد کے علاوہ گداگر کے قریباً دو عالیشان مکانات بھی ہیں۔

# برمی دوشیزاؤں کا جذبۂ محبت

از [illegible]

## تجارت پیشہ لڑکیاں

برمی عورتوں کی جملہ معیشی، اقتصادی و تجارتی ترقیاں ان کی آزادی کی رہین منت ہیں۔ سیاحوں کیلئے سب سے زیادہ دلکش اور رنگین شے برمی عورتوں کا حسن اخلاق، حسین چال اور اختلاط ہے جسے وہ سیاحوں کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ جب کوئی سیاح برما کے کسی ریسٹورنٹ یا دکان میں جاتا ہے تو برمی عورتیں کچھ ایسی معشوقانہ ادا سے مسکراتی ہوئی ان کا خیر مقدم کرتی ہیں کہ وہ مرعوب کر دیا جاتا ہے۔

دُنیا کے کسی قطعۂ ارض پر ایسی آزادی عورتوں کو نصیب نہیں ہے جیسی کہ اس چھوٹے سے ملک برما میں انھیں حاصل ہے ———— وہ اپنے اعمال و افعال کی مختار کل ہوتی ہیں۔ صنعت و حرفت کے ترقی کے راز سے بھی برمی عورتیں اچھی طرح واقف ہیں۔ دوکان، اسٹال اور ریسٹورنٹ سب میں عورتیں ہی کام کرتی ہیں۔ وہ تجارت میں بہت زیادہ ماہر ہو گئی ہیں اور نہایت ہوشیاری و دانائی سے اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔ بڑے بڑے امیر گھرانوں کی کتخدا لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں بازار میں دوکانوں اور اسٹالوں پر بیٹھتی ہیں اور یہ کوئی ان کے یہاں ننگ و ناموس کے خلاف بات نہیں۔ دوکانوں اور اسٹالوں پر بیٹھنے والی زیادہ تر جوان لڑکیاں ہوتی ہیں جن کا حسین اور تبسم ریز چہرہ نہایت ہی ہوشربا ہوتا ہے۔ وہ اپنے گاہکوں اور خریداروں سے ایسے اخلاق سے پیش آتی ہیں کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی دوکانیں نہایت صاف اور ستھری ہوتی ہیں۔ چیزیں نہایت قرینے سے دھری ہوتی ہیں۔ وہ صرف فروخت اشیا ہی میں ماہر نہیں ہوتیں بلکہ مال کو جانچ پڑتال کر کے خریدنے میں بھی ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ قارئین متعجب ہونگے کہ برمی عورتیں ہر شعبۂ حیات میں مہارت تامہ رکھتی ہیں۔ اکثر اسٹیشنوں پر قلیوں کا کام صرف عورتیں ہی انجام دیتی ہیں۔ اسٹیشنوں پر اُن کا سُریلی آواز میں "قلی قلی" پکارنا نہایت دلکش اور شیریں ہوتا ہے۔ وہ قلیوں کی ایسی شرعت کیساتھ حسین لنگیوں میں ملبوس، رنگا رنگ خوشنما پھولوں سے سر کو سجائے، کمر میں پیتل کا پٹکا باندھے، اور بڑی بڑی گٹھریوں کو اپنے سیمیں شانوں پر اٹھائے ادھر اُدھر بھاگتی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے ہر کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں اور انہیں کسی پیشے سے عار نہیں ہوتا۔

تجارتی فرائض کے ساتھ ساتھ وہ عشق و محبت میں بھی پیش پیش ہوتی ہیں۔ ان کا دل ترحم و مروت کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے دلوں میں محبت کی موجیں مضطرب ہوتی ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی سیاح برمی عورتوں کے حسن جہاں سوز سے متاثر ہوئے بغیر رہے۔ اُن کا ملیح چہرہ، چاند سا مکھڑا، خوبصورت اور سڈول جسم دراصل عشق و محبت کے حسین جال ہیں جن میں سیاحوں کے قلوب پھنسکر رہ جاتے ہیں۔

## ذوقِ خوش پوشی

برمی عورتیں لباس کے معاملہ میں بہت محتاط واقع ہوئی ہیں۔ وہ اچھے اچھے اور خوبصورت لباس کی حد درجہ شائق ہوتی ہیں۔ خصوصاً دیدہ زیب لنگیاں اور سفید جیکٹ انھیں بہت پسند ہیں۔ انہیں پہن کر وہ کوہ قاف کی حسین پریوں سے کم خوبصورت معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ بالوں کو طرح طرح کے پھولوں سے آراستہ کر کے جب باہر نکلتی ہیں تو دیکھنے والے کی نظر چکا چوند ہو جاتی ہے۔ ان کے [illegible] سپید اور نازک [illegible] ہاتھوں میں ایک حسین چھتری بھی [illegible] ... [illegible] ہوتی ہے جو ان کے حسن کو دوبالا کرتی رہتی ہے۔



## جذبۂ محبت

برمی عورتیں جب دام عشق میں گرفتار ہوتی ہیں تو وہ اپنا سب کچھ اپنے محبوب کے قدموں پر ڈال دیتی ہیں۔ وہ وفا کیشی اور محبت نوازی کی زندہ تصویریں ہوتی ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کی طرح ان کے ارمانوں اور حسرتوں کا خون نہیں ہوتا۔ ان کی شادیاں بڑوں اور بزرگوں کی مرہون منت نہیں ہوتیں۔ بزرگوں کو اس باب میں دخل اندازی کا کوئی استحقاق نہیں۔ وہ آزاد ہیں اور ان کی شادیاں ان کی مرضی اور پسند کے مطابق ہوتی ہیں۔ ان کا معاشقہ ۹۹ فی صدی کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ جب کسی عورت کو کسی مرد سے محبت ہو جاتی ہے تو اپنے محبوب کے ساتھ وہ گھر سے چند دن کیلئے فرار ہو جاتی ہے اور جب واپس آتی ہے تو اس کے ساتھ گل مراد بھی ہوتا ہے۔ اس کے بعد عاشق و معشوق میاں بیوی تصور ہونے لگتے ہیں۔ پھر وہ دونوں محبت کی رنگین دُنیا میں کھو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی خوشی و مسرت سے لبریز ہوتی ہے ان کی راتیں بہت انبساط کی راتیں ہوتی ہیں اور ان کا دن عید سے بڑھ کر نشاط آگیں ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ ایام زندگی ہنسی خوشی گزار دیتی ہیں۔ ایسی محبت و الفت کی مثال کسی دوسری جگہ بہت نایاب ہے۔ زن و شوہر کے تعلقات نہایت شیریں اور بہجت افزا ہوتے ہیں۔ حقیقتاً ان کی زندگی قابل رشک ہوتی ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کی ملکیت اسی کے قبضہ میں رہتی ہے وہ اپنے مال و متاع سے محروم نہیں کی جاتی۔ برما میں دراصل لڑکیاں ہی لڑکوں سے شادی کرتی ہیں کیونکہ شادی کے بعد لڑکے لڑکیوں کے گھر چلے جاتے ہیں اور وہیں بیوی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔

## دوشیزاؤں کا رقص و سرود

برمی عورتیں رقص و سرود کی حد درجہ شائق ہوتی ہیں۔ باوجود کثرت کار کے وہ موسیقی اور رقص میں بہت زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔ بچپن ہی سے انہیں موسیقی اور رقص کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بہترین رقص کرنا جانتی ہیں۔ بعض اوقات رات رات بھر [illegible] جوان اور بوڑھی عورتیں اور [illegible] ناچ اور گانے [illegible] ... [illegible] محظوظ ہوتی رہتی ہیں اور اُن میں سے کسی ایک کی پل بھر کیلئے بھی آنکھ نہیں جھپکتی۔ وہ اسی طرح ساکت و صامت شام سے صبح تک تماشہ دیکھنے میں محو رہتی ہیں۔

وہاں عورتوں کی کوئی علیحدہ نشستگاہ نہیں ہوتی بلکہ عورت اور مرد ایک ہی ساتھ بغل در بغل بیٹھے تماشہ دیکھا کرتے ہیں۔ گاڑیوں، ٹراموں اور ریلوں میں بھی عورتوں کیلئے کوئی علیحدہ نشست مخصوص نہیں ہوتی اور سب ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔

## محشرستانِ حسن و جمال

برما میں دو تہوار بہت ہی جوش و خروش سے منائے جاتے ہیں۔ ایک تو "پانی کا تہوار" کے نام سے موسوم ہے۔ "ہولی" کی طرح یہ تہوار بھی برما میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جوان جوان لڑکیاں پیکر رعنائی و دلفریبی سفید ریشمی لنگیوں میں ملبوس، ہاتھوں میں پچکاریاں لئے اپنے ہم جنس لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف ہوتی ہیں۔ وہ نظارہ بھی دیدنی ہوتا ہے۔ جب ہر کوئی اپنے ساتھی پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا تہوار "روشنی کا تہوار" کے نام سے موسوم ہے۔ "دیوالی" کی طرح تمام شہر بستی قمقموں قندیلوں اور رنگا رنگ روشنیوں سے بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ عورتیں اپنی اپنی حسین اور نظر فریب ملبوسات زیب بدن کئے بازاروں میں گشت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مرد بھی ان کے شانہ بشانہ مسرور و شاداں ان کی ہمنوائی کرتے ہوئے مصروف سیر ہوتے ہیں۔

## حوران ارضی

برما میں قریباً تمام مکانات لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ ہر گھر دوسرے سے علیحدہ ہوتا ہے۔ غریب سے غریب آدمی کے یہاں بھی ایک چھوٹا سا باغ مکان کے سامنے ضرور ہوتا ہے جس میں انواع اقسام کے پھل اور پھول لگے ہوتے ہیں۔ برمی اپنے گھروں کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے بہت شائق ہوتے ہیں۔ خاص کر مکان کے سامنے والے کمرہ کو خاص طور پر ہر قسم کے سامان آرائش سے سجاتے ہیں اور گھر کی تقریباً کل قیمتی اشیا اسی پر نمائش کے طور پر رکھ دیتے ہیں۔ ان کا مکان بہت ہی صاف اور ستھرا ہوتا ہے۔ ایسے مصفا ماحول میں ذرا اندازہ کیجئے کہ برمی دوشیزائیں جنت کی حوروں سے کیا کم معلوم ہوتی ہونگی۔

## پھول اور کانٹے بقیہ صفحہ ۱۱۱

بقیہ صفحہ ۱۱۱

زیاس۔ "ناممکن.. وہ باہر نکل گئی ہے تھا.."

نبر۔ (عالم گومگو میں) "ایں.. کانچ دانی توڑ کر کیا؟"

زیاس۔ "جی ہاں الماری کے پرزے اڑا کر"

نبر۔ "ارے باپ رے۔ وہ نلکی تو نیچے رکھدی ہوتی۔ اُسے ٹھیس لگی اور ہم سب مٹی میں مل جائینگے"

زیاس۔ "خیر کچھ بھی ہو.. تم روح پر قابض نہیں ہو سکتے۔ سائنس تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ پھول اور کانٹوں کا ساتھ ہے۔ پھول توڑتے وقت کانٹے چبھ ہی جاتے ہیں"

نبر۔ "ارے مگر وہ نلکی تو پرے کر دوں"

(نلکی اُٹھانے کو بڑھتا ہے۔ بڑے زور کا دھماکا ہوتا ہے۔ کانچ کی الماری چکنا چور ہو جاتی ہے ٹھیس لگنے سے زردی مائل پانی کی نلکی [illegible] سے ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک اور زور کا دھماکا۔ [illegible] کا محل خاکستر کی مٹھی بن جاتا ہے۔ زیاس اور اس کے رفیقوں کا کچھ پتہ نہیں)

# نکہت!

از حضرت امین حزیں سیالکوٹی

(۱)

جنوں ساماں نہ ہو جو آرزو وہ آرزو کیسی؟
نہ ہو روشن مثالِ مہر جو وہ مدعا کیسا؟
نہ ہو جو سعیِ پیہم سر بسر وہ جستجو کیسی؟
نہ ہو جو رشکِ صد آئینہ وہ صدق و صفا کیسا؟

(۲)

جو منزل کو نہ اُٹھے خود بخود ہی وہ قدم کیسا؟
جو اُٹھتے ہی نہ چھا ماحول پر جائے نظر کیسی؟
جبیں سا جسکے در پر ہو نہ کوئی وہ حرم کیسا؟
صدف تک ہی ہو محدود وہ آبِ گہر کیسی؟

(۳)

وہ کیا زخمہ جو سازِ دل کو چھوتے ہی نہ تڑپا دے؟
نہ ہو الہام جو وہ "بربطِ حق" کی نوا کیسی؟
وہ کیا نغمہ جو چھڑ کر ساری محفل کو نہ گرما دے؟
نہ ہو جو انتہا کا آئنہ وہ ابتدا کیسی؟

(۴)

مثالِ شعلۂ لالہ جو ہو "سوزِ بروں" کیسا؟
جو شاخِ تاک میں روپوش ہو وہ دخترِ رز کیسی؟
نہ ہو روشن جو مثلِ شمع وہ سوزِ دروں کیسا؟
امیں نخچیر کو جو بھاگ جانے دے وہ "ڈز" کیسی؟

# جلوۂ گریزاں

از جناب پروفیسر اختر اورینوی (ایم اے)

(۱) وہ کاکلِ پیچ پیچ بل کھول رہی تھی | یا قوتِ تسخیر کو وہ تول رہی تھی
محبوب اداؤں کے گہر رول رہی تھی

(۲) وہ زلفِ رسا تا بہ قدم آئی ہوئی سی | بکھری ہوئی مچلی ہوئی، لہرائی ہوئی سی
بدمست جوانی پہ گھٹا چھائی ہوئی سی

(۳) وہ فتنۂ گیسو کو بھی ہاتھوں سے سنبھالے | لیکن وہ مچل جاتے تھے سنوار کے پالے
پہرے پہ جوانی کے خزانے کے تھے کالے

(۴) تھا چشمِ فسوں ساز میں پھیلا ہوا کاجل | شانے پہ وہ ڈھلکا ہوا مسکا ہوا آنچل
جھکتی ہوئی گردن کا دمکتا ہوا صندل

(۵) ماتھے پہ تھا مٹتا ہوا گلنار ستارہ | کمھلایا ہوا رخ پہ یا صبح کا تارہ
بکھرے ہوئے چہرے پہ مچلتا ہوا عشوہ

(۶) آرائشِ گیسو سے کلائی میں لچک سی | گلریز جبیں پر تھی پسینے سے دمک سی
عارض پہ شبابِ گل و لالہ کی جھلک سی

(۷) ابروئے خمیدہ میں پلا فتنۂ دوراں | غنچے سے حسیں کان میں آویزہ لرزاں
سرتا بہ قدم لوٹتی تھی روحِ گلستاں

(۸) وہ نیم نگاہی سے مجھے لوٹ رہی تھی | پیراہنِ باریک سے پو پھوٹ رہی تھی
اور نبض زمانے کی ادھر چھوٹ رہی تھی

(۹) دروازہ پہ میں ساکت و خاموش کھڑا تھا | نظارہ میں کھویا ہوا بیہوش کھڑا تھا
میں جلوۂ عریاں سے ہم آغوش کھڑا تھا

(۱۰) دیکھا جو مجھے ناز سے اٹھلا کے وہ بھاگی | حیران نگاہوں میں مرے برق سی کوندی
ہے چشمِ تصور میں ابھی تک وہ تجلی

# مہابھارت کی اٹھارہ روزہ خونریز جنگ کے بعد

## بھیشم پتامہ کا اپدیش راجاؤں کے فرائض پر

از جناب منشی محمد الدین صاحب فوق

دہلی اور پانی پت کی درمیانی سرزمین نے جس کے ایک وسیع حصہ کا نام کورو کشیتر بھی ہے۔ آج سے پانچ ہزار برس پیشتر صرف اٹھارہ دن کے اندر وہ خونیں منظر دیکھا ہے کہ یورپ کی جنگ عظیم جس میں قریباً قریباً دنیا کی تمام بڑی بڑی سلطنتیں کسی نہ کسی فریق کے ساتھ شامل تھیں۔ اپنے تیسے جنگی آلات کی فراوانی اور سائنس کی تباہ کن ایجادات کی موجودگی کے باوجود چند سال کے عرصہ میں بھی وہ منظر پیش کرسکی۔ کورو اور پانڈو کا قصہ۔ ارجن اور بھیم کی عداوت اور بالآخر مہابھارت کی لڑائی کا حال کس کو معلوم نہیں؟ یہ مشہور واقعات ہیں۔ اس لئے ہم ان کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں سمجھتے۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب کورو کی تباہی و پامالی کے بعد پانڈو کامیاب ہوگئے۔ اور سری کرشن۔ بیاس جی اور دھرت راشٹر کے کہنے سے راجہ جدھشٹر نے جو پانڈوں کا سب سے بڑا بھائی تھا ہستناپور (دہلی) کا تخت و تاج قبول کرلیا تو سری کرشن جی نے بھیشم پتامہ سے جو زندگی کی آخری منزلیں طے کررہا تھا کہا کہ راجہ جدھشٹر تمہارا فرزند ہے وہ اس قدر لاتعداد انسانوں کے کشت و خون سے جو محض اسی کے سبب سے ہوا ہے۔ بہت پشیمان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے ایسی پاکیزہ نصائح سنے جو اس کی ذات کے لئے اور اس کی آئندہ نسلوں، جانشینوں اور تمام راجاؤں کیلئے فائدہ بخش اور کارآمد ہوں۔ تاکہ وہ ان پر عمل کرکے اپنی زندگی بھی امن و امان سے بسر کریں اور ان کی رعایا بھی خوشحال اور فارغ البال رہ سکے۔

بھیشم پتامہ نے جو قیمتی نصائح کیں۔ وہ مہابھارت کے آخری تین پربوں بالخصوص بارہویں پرب میں جس کا نام شانت پرب ہے بالتفصیل درج ہیں۔ ہم ان نصائح میں سے چند ایک یہاں پیش کرتے ہیں۔ کاش! ہندوستان کے والیان ریاست ان پر عمل کرسکیں۔

(۱) اگرچہ جھوٹ بولنا سب کے لئے بُرا ہے مگر راجاؤں کے لئے بہت ہی بُرا ہے۔ اس لئے کہ جھوٹ بولنے سے ان کا اعتبار جاتا رہتا ہے اور دوست دشمن سب بددل ہو جاتے ہیں۔ راجہ کے جھوٹ بولنے سے پرجا کو بھی جھوٹ بولنے کی عادت ہو جائے گی۔ اور ملک میں بہت سی خرابیاں پیدا ہونگی جن کا گناہ راجہ کی گردن پر ہوگا۔

(۲) راجے آب زلال کا چشمہ ہیں چشمے سے جتقدر پانی نکالا جائے گا چشمہ صاف اور شیریں ہوتا جائیگا اس لئے سخاوت اور فیاضی راجاؤں کیلئے لازمی ہے۔

(۳) راجاؤں کو چاہیئے کہ قہر و غضب اور نرمی و شفقت سے مساوی درجہ پر کام لیتے رہیں۔ اگر وہ ہر وقت غضبناک رہیں گے تو مارے خوف کے کسی کو ان سے عرض معروض کرنے کی جرأت نہ ہوگی اور انتظام مملکت میں ایسا الجھاؤ پیدا ہوگا کہ سلجھانا مشکل ہو جائے گا۔ اور اگر ہر وقت نرمی اختیار کرینگے تو ان کا رعب جاتا رہے گا۔ اور نوبت بایں جا پہنچیگی کہ تمام دنیا کا خون بہادینے پر بھی ان کا رعب قائم نہ ہوسکے گا۔

(۴) کارداروں کو ایسا سلوک کرنا چاہیئے کہ تمام رعایا ان کو اچھا جانے اور ان کیلئے دعا کرے۔

(۵) راجاؤں کو لازم ہے کہ رعایا پر سختی نہ کریں۔ ورنہ ایسے فتنے برپا ہونگے کہ کسی تدبیر سے ان کا تدارک نہ ہوسکے گا۔

(۶) راجاؤں کیلئے فرماں بردار۔ وفاشعار اور مضبوط فوج سے بڑھ کر کوئی چیز اچھی نہیں۔

(۷) راجاؤں کیلئے نہایت ضروری ہے کہ وہ شراب سے پرہیز کریں۔ کیونکہ پرمیشور نے انہیں اس لئے سردار بنایا ہے کہ وہ لوگوں کی حفاظت و نگہبانی کریں۔ اگر راجہ ہی مدہوش و بدمست ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ دوسروں کو اس کی نگہبانی کرنی پڑتی ہے تو وہ رعایا کی حفاظت کیا کریگا؟

(۸) راجاؤں کو مناسب ہے کہ وہ قمار بازی اور عورتوں کی صحبت اور مصاحبوں کے ساتھ ہنسی مذاق سے پرہیز کریں۔

(۹) راجاؤں کو اپنے ملازموں کی تقرری میں اتنی احتیاط رکھنی چاہیئے کہ وہ عزت داروں کو ذلیل و خوار نہ کرسکیں۔ اور رعایا کے جان و مال پر دست درازی نہ کرنے پائیں۔

(۱۰) راجاؤں کو لازم ہے کہ اپنی رعایا کے جان و مال کی ویسی ہی حفاظت کریں جیسی کہ حاملہ عورت اپنی اندر اپنے شکم کے بچہ کی حفاظت کرتی ہے کیونکہ رعایا راجاؤں کے لئے بمنزلہ فرزند کے ہے۔

(۱۱) راجاؤں کو لازم ہے کہ رعایا کے مال پر دست درازی نہ کریں۔ اور اسی قدر محصول وصول کریں جس کی انصاف و عدل اجازت دیتے ہوں۔

(۱۲) راجاؤں کو چاہیئے کہ رموز مملکت میں ہر کس و ناکس سے مشورہ نہ کریں۔ بلکہ صاحبان دوراندیش و تجربہ کار سے صلاح لیا کریں اور مشورہ سننے کے بعد غور و تامل کریں اور جو بات اچھی نظر آئے۔ اس پر عمل کریں۔

(۱۳) راجاؤں کو لازم ہے کہ ودیا دانوں اور پنڈتوں کی صحبت کیلئے ایک خاص وقت مقرر کریں۔ اور ان کی اچھی باتوں سے فائدہ اٹھائیں۔

(۱۴) راجاؤں کو لازم ہے کہ عفو جرائم کی عادت اختیار کریں۔

(۱۵) راجا کو لازم ہے کہ ظالموں کو رعایا پر مسلط نہ کرے ورنہ جس قدر جور و ظلم ان سے سرزد ہونگے وہ سب راجا کے نامۂ اعمال میں لکھے جائینگے۔

(۱۶) راجاؤں کو مصاحبت کیلئے راستباز۔ دیوان خاندانی رئیس اور بہادر و شجیع لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو اُن کو نیک کاموں کی رہنمائی کریں ملک کے صحیح صحیح حالات بتائیں۔ اور جن کی صحبت سے دونوں جہان کا فائدہ ہو۔

(۱۷) راجاؤں کے لئے مناسب ہے کہ وہ دیانتدار اور انصاف پرور حاکموں کے جاہ و منصب میں افزونی کریں اور ایسے لوگوں کو اچھی سزا دیں جو تھوڑے سے لالچ کے لئے رعایا کا خون چوس لیتے ہیں۔

(۱۸) راجہ رعیت و سپاہ کے سبب راجہ کہلاتا ہے اگر رعیت معمور و آباداں ہے تو سپاہ بھی آسودہ ہے اور جب سپاہ آسودہ ہے تو رعایا بھی خوشحال ہے۔

(۱۹) اگر پرچہ نویس اور مخبر جو خبریں راجاؤں کو دیتے رہتے ہیں وہ غرض سے خالی نہیں ہوتیں۔ راجاؤں کو مناسب ہے کہ عمل کرنے سے پیشتر ایسی خبروں کا حسن و قبح میزانِ دانش میں تول لیا کریں۔

(۲۰) راجہ کو لازم ہے کہ برہمن۔ کھتری۔ ویش اور شودر ہر فرقہ کے لوگوں کے نمائندے اپنے حضور میں رکھے۔ تاکہ ہر فرقہ کے حالات اسے معلوم ہوتے رہیں۔

(۲۱) راجہ کو لازم ہے کہ اپنی رعایا کو خویش و ندوں کے برابر سمجھے جو عمر میں بڑے ہوں ان کو اپنا بزرگ، ہم عمروں کو برابر اور چھوٹوں کو فرزندوں کے برابر تصور کرے۔

(۲۲) راجہ کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کی سپاہ اور رعیت دونوں آباد رہیں۔ تاکہ ضرورت کے وقت سپاہی جان دینے سے اور رعایا مال پیش کرنے سے دریغ نہ کرے۔

(۲۳) راجہ کو لازم ہے کہ جو برہمن نہ خود علم پڑھے اور نہ دوسرے کو پڑھائے۔ اس کو اپنی ولایت سے نکال دے۔

(۲۴) راجہ کو لازم ہے کہ کسی کاردار اور اہل کار کے دیانت دار اور صاحب اعتبار ہونے کے باوجود اس کے حال سے غافل نہ رہے۔ بلکہ اپنے پرچہ نویسوں کے ذریعے سے اس کے حالات کی تفتیش کرتا رہے اور ایسا عمل اختیار کرے کہ ہر ایک اہل کار کو یہی معلوم ہو کہ راجہ اس کے نیک و بد سے خبردار رہتا اور اس کے کاروبار کو خود ملاحظہ کرتا رہتا ہے۔

(۲۵) راجہ کو لازم ہے کہ جو قدیم عمارتیں اس کی مملکت میں خراب ہوگئی ہوں ان کو نئے سرے سے آباد اور ان کی تعمیر و مرمت کرے۔

(۲۶) راجہ کو لازم ہے کہ زراعت پیشہ لوگوں کا خاص خیال رکھے تاکہ وہ اپنے پیشہ کو حسب دلخواہ ترقی دے سکیں

(۲۷) راجہ کو لازم ہے کہ ہر ایک عامل اور کاردار کے دربار میں خفیہ نویس مقرر کرے جو ان کے کاروبار اور مشاغل سے اس کو آگاہ کرتے رہیں۔ راجہ کو یہ بھی لازم ہے کہ عاملوں کے حالات جو اس کو معلوم ہوا کریں کبھی کبھی ان پر بھی ظاہر کردیا کرے تاکہ وہ ہر وقت اس سے خائف رہیں۔ اور ظاہر و غائب اس کا رعب ان کے دلوں میں جما رہے۔

(۲۸) دشمن گو کیسا ہی ادنیٰ و کمتر ہو اس کو حقیر نہ سمجھے۔ سانپ اگرچہ بظاہر چھوٹا سا جانور ہے مگر اپنے زہر سے بڑے بڑے جانوروں کو ہلاک کردیتا ہے۔

(۲۹) راجاؤں کو کسی حالت میں مکر و فریب نہ کرنا چاہیئے۔ ہاں دشمنوں کے ساتھ فریب کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۳۰) راجہ کو لازم ہے کہ زراعت پیشہ لوگوں سے اپنا مقرر حصہ وصول کرے اگر پیداوار کم ہو تو اپنے حصہ میں بھی کمی کردے۔ اور ان پر کسی قسم کی زیادتی و تعدی نہ کرے۔

(۳۱) راجہ جن لوگوں کو شہروں کی حفاظت اور عدل و انصاف کا کام سپرد کرے۔ ان کے حالات کی پوشیدہ جستجو رکھا کرے۔ تاکہ اہل شہر پر زیادتی نہ ہونے پائے۔

(۳۲) کوئی راجہ حرام مال اپنے خزانہ میں جمع نہ کرے کہ یہ برکت کو زائل کردیتا ہے۔ کسی گنہگار پر جرمانہ کرنا ہو تو اس قدر نہ کرے کہ وہ نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہو جائے اور گدائی کرنے لگے۔

(۳۳) راجہ کو مناسب ہے کہ کمینہ اور بداصل لوگوں کی صحبت سے کنارہ کش رہے اور ... کوئی خدمت بھی ان کے سپرد نہ کرے

(۳۴) راجاؤں کو چاہئے کہ دوسروں کے گناہ سہواً معاف کریں۔ بشرطیکہ معاف کر دینے سے ملکی انتظام میں کوئی خلل نہ واقع ہوتا ہو۔

(۳۵) راجہ کو لازم ہے کہ ملک کے حالات اور اہلکاروں کے نیک و بد سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جاسوس مقرر کرے۔

(۳۶) راجہ اگر عادل ہو تو اس کو رکھیشروں اور پنڈتوں کے برابر نیکیوں کا پھل ملتا ہے۔ اس لئے برہمنوں اور رکھیشروں کا قول ہے کہ راجہ کو سلطنت ترک نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ جو پھل اس کو جنگل میں ہزار سال عبادت کرنے سے مل سکتا ہے۔ وہ سلطنت میں ایک روز عدل کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔

(۳۷) راجاؤں کا حکم یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات سے باخبر رہیں۔ نیکوں کی پرورش کریں۔ اور شریروں کو سزا دیں۔

(۳۸) جو راجہ بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھانا دیتا ہے۔ برہمنوں کو کپڑا پہناتا ہے۔ غریبوں کی دستگیری کرتا ہے جو درجۂ امارت سے گر گئے ہوں ان کی دلجوئی کرتا ہے وہ ظاہر میں تو راجا ہے مگر باطن میں دیوتا ہے۔

(۳۹) راجہ کو لازم ہے کہ اپنے نفس پر غالب رہے اور ہوا و ہوس کو ترک کرے۔ اور لوگوں کے زن و اطفال و فرزند کو اپنا عیال تصور کرے۔ جب وہ اپنے نفس پر جو اندرونی دشمن ہے غالب آجائے گا تو اس کی برکت سے بیرونی دشمن خود بخود مغلوب ہو جائیں گے۔

(۴۰) راجہ جو جاسوس اپنی راجدھانی اور دوسرے شہروں میں مقرر کرے۔ وہ ایسے ہونے چاہئیں جو بظاہر ابلہ و بیوقوف معلوم ہوں مگر باطن میں بلا کے زیرک، ہوشیار اور دیانتدار ہوں۔ لیکن ایک مرتبہ بھی اگر کوئی جاسوس جھوٹی خبر پہنچائے تو فی الفور اس کو معزول کر دے۔ نیز جاسوس ایسے جفاکش ہونے چاہئیں۔ جو بھوک پیاس اور سردی گرمی کی پروا نہ کریں۔ بلکہ پیدل چلنے اور سفر کرنے میں مضبوط ہوں۔ ہر اشارہ کو بس پر ایک جاسوس ہونا چاہئے۔ اور ایسا کہ وہ سب حالات سے واقف ہو مگر اس کی تقرری اور اس کے حالات سے کوئی واقف نہ ہو۔

(۴۱) جب ملک خوب سرسبز و آباد ہو تو اس وقت راجہ اگر محاصل میں کچھ اضافہ کر دے تو مضائقہ نہیں مگر یہ زیادتی صرف محاصل زمین پر ہونی چاہئے۔ اہل حرفہ و تجارت پر کوئی محصول لگانا موجب خرابی ہے۔

(۴۲) ہر ایک شخص کو اس کے رتبہ کے موافق سزا ملنی چاہئے۔ بعض لوگ ایسے ہیں۔ جن کو صرف چشم نمائی کافی ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شریف اور خاندانی ہیں۔ بعض ایسے ہیں۔ جن کو زبانی جھڑک دینا ہی ان کے لئے کافی سزا ہے۔ بعض ایسے ہیں جن کو دربار سے نکال دینا یا ان کے درجہ میں تنزل کر دینا ہی ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مگر کمینوں اور رذیلوں اور عادی مجرموں کی سزائیں ان لوگوں سے مختلف ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے ان کو سخت سزائیں

# تمباکو نوشی کی داستان



تمباکو نوشی کا رواج بہت قدیمی ہے۔ اس کا آغاز جزائر غرب الہند اور امریکہ میں ہوا۔ ۱۴۹۲ء میں جب کرسٹوفر کولمبس ان جزائر میں پہونچا تو کہو یا میں اس نے دیکھا کہ سرخ جلد کے انسان تمباکو کے پتے منہ میں لگائے دھوئیں کے بھبکے اڑا رہے ہیں۔ وہ اس چیز کو پی رہے تھے۔ اُسے موجودہ زمانہ میں سگار کہتے ہیں۔

انگلستان میں تمباکو سولھویں صدی کے اواخر میں پہونچا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگلستان میں سب سے پہلے تمباکو پینے کا سہرا سر جان ہاکنس کے سر ہے۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ نہیں پہلی بار سر والٹر ریلے نے ۱۵۸۶ء میں انگریزوں کو تمباکو سے روشناس کیا۔

فرانس و جرمنی کی سی سالہ جنگ نے اس کا رواج تمام یورپ میں عام کر دیا۔ اور نپولینی جنگوں کے دوران میں تو برطانی لوگ سگار بالعموم پیتے تھے۔ دوسری یورپی لڑائیوں نے سگرٹوں کے استعمال کو بالکل عام کر دیا۔

ایک اخبار کے قول کے مطابق سب سے زیادہ سگریٹ نوش ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہیں۔ وہاں ہر سال فی کس ۱۰۴۵ سگرٹوں کا اوسط ہے۔ دوسرے درجہ پر برطانیہ ہے۔ تیسرے درجہ پر میکسیکو چوتھے درجہ پر بلجیم اور پانچویں درجہ پر فرانس ہے۔

## ہندوستان میں تمباکو

ہندوستان بھی تمباکو نوشی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ یہاں خوشبودار سگار ساتویں صدی عیسوی میں پہونچ چکے تھے۔ نئی قسم کا تمباکو ہندوستان کے مغربی ساحل پر انگریزوں کی وجہ سے پہونچا۔ اور ۱۷۰۰ء تک ہندوستان میں تمباکو کا رواج عام ہو چکا تھا۔ اور آج یہاں ہر سال ۷۶ ارب سگریٹ سالانہ پئے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ سگریٹ پینے والا صوبہ سندھ ہے۔

سگرٹوں کے علاوہ یہاں بیڑی اور حقہ کا بھی رواج ہے۔ اگر بیڑیوں کا سالانہ خرچ تمام آبادی پر پھیلایا جائے تو فی کس ۱۹۷ بیڑیاں اوسطاً آتی ہیں۔ بیڑیوں اور سگرٹوں کے علاوہ زردہ اور قوام وغیرہ بھی ہندوستان میں کافی استعمال ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں دس کروڑ پونڈ تمباکو کی کھپت ہوتی ہے۔ باوجودیکہ ہندوستان میں تمباکو کی کاشت کافی ہوتی ہے۔ تاہم سگریٹ غیر ممالک سے بھی کافی درآمد کئے جاتے ہیں۔ بیڑیاں زیادہ تر سندھ۔ بڑودہ۔ میسور اور حیدرآباد میں استعمال کی جاتی ہیں۔

## دنیا کے مشہور تمباکو نوش

دنیا کے بعض مصنفین بہت زیادہ سگریٹ نوش ہیں۔ اور خاص طور پر لکھتے وقت اس کا استعمال کرتے ہیں۔ سر جیمز بیری لکھتے وقت اپنا پائپ سلگا لیتا تھا ایڈگر ویلس بھی بلا کا تمباکو نوش تھا ہمیشہ ایک لمبا ہولڈر اس کے منہ سے لگا ہی رہتا تھا۔ چارلس لیمب لکھنے سے قبل سگریٹ ضرور پیتا۔

موجودہ انگریزی مدبرین میں سے چرچل اور بالڈون کا سگار کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بالڈون تو اپنا پائپ ہر وقت منہ یا ہاتھ میں رکھتا ہے۔ نپولین دوم بھی تمباکو کا بہت عادی تھا۔ جب تک بیدار رہتا سگریٹ منہ میں رکھتا تھا۔ البانیہ کا بادشاہ احمد زوغو بھی بے پناہ سگریٹ پیتا ہے یعنی ایک گھنٹہ میں چھ سات سگریٹ ختم کر ڈالتا ہے۔ پریزیڈنٹ روزویلٹ بھی سگریٹ بکثرت پیتا ہے۔ اس کے لبوں سے سگریٹ ہر وقت چمٹا رہتا ہے۔ اسٹالین اکثر پائپ پیتا ہے۔ شاہ انگلستان اور اس کے تینوں بھائی پائپ استعمال کرتے ہیں۔

ہندوستان میں مسٹر محمد علی جناح اور سر تیج بہادر سپرو تمباکو نوشی کے بہت عادی ہیں۔ مسٹر جناح صرف سگریٹ پسند کرتے ہیں۔ لیکن سر سپرو تمباکو کی تمام قسمیں استعمال کرتے ہیں۔ آپ کو جب کبھی الہ آباد میں اقامت کرنے کا موقع ملتا ہے تو آپ تمباکو نوشی کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے پائپ، پھر سگار، اس کے بعد سگریٹ، اور پھر حقہ اور آخر میں پھر پائپ اٹھایا۔ درمیان میں بار بار زردے والے پان بھی کھاتے جاتے ہیں۔

اعلیٰحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ بھی سگریٹ استعمال فرماتے ہیں لیکن مصنوعات ملکی کی حوصلہ افزائی کے خیال سے ہمیشہ ملکی سگریٹ "چار مینار" یا "گولکنڈہ"



سر تیج بہادر سپرو



ایڈگر ویلس



ونسٹن چرچل



محمد علی جناح

استعمال فرماتے ہیں ۔ اعلیحضرت فرمانروائے بھوپال بھی تمباکو نوشی کے بہت عادی ہیں ۔ لیکن زیادہ تر حقہ استعمال فرماتے ہیں ۔

## تمباکو نوشی کا عمر پر اثر

یہ غلط فہمی عام پھیلی ہوئی ہے کہ تمباکو نوشی سے انسان کی عمر طبعی کم ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس نظریہ کی تکذیب کے لئے کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں تھامس ونشیرٹ ۱۴۴ سال کی عمر میں فوت ہوا حالانکہ وہ بچپن ہی سے تمباکو کا عادی تھا ۔ وینیزیلا کا رہنے والا جون ڈی لاامیسٹ بلاکا سگریٹ نوش تھا مگر ۱۳۰ برس کی عمر تک زندہ رہا ۔ ایک فرنچ باشندے کلیاس نے اپنی زندگی میں چالیس ٹن تمباکو استعمال کیا مگر اسی سال تک زندہ رہا ۔ اسی طرح بعض عورتوں کی مثالیں ملتی ہیں مسز کیتھرائن کونلی جو کیلی فارنیا میں رہتی تھی سو برس تک زندہ رہی ۔ اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی خاتون گریس کو پر نے ایک سو ایک برس کی عمر پائی حالانکہ وہ پائپ اور سگریٹ دونوں چیزیں استعمال کرتی تھی ۔ امریکہ کی لیڈی ڈاکٹر وردون مورنے ایک سو گیارہ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا درآنحالیکہ وہ ایک دن میں تین ڈبے سگریٹ کے ختم کر دیتی تھی ۔

## تمباکو سے متنفر

جارج برنارڈ شا تمباکو نہیں پیتا ۔ اسی طرح ہٹلر، فورڈ کو بھی اس سے سخت نفرت تھی ۔ اس کا قول ہے کہ " اگر انسان چائے یا کافی، تمباکو اور دیگر منشیات سے پرہیز کرے تو سوا سو برس تک زندہ رہ سکتا ہے " ۔ سائیبنور مسولینی اور ہر ہٹلر بھی کوئی نشہ آور چیز استعمال نہیں کرتے اور نہ تمباکو پیتے ہیں ۔ مسولینی کہتا ہے کہ میں الکحل کو انسانی صحت کے لئے بیحد مضر خیال کرتا ہوں ۔ میں کبھی شراب کے ذائقہ سے لذت اندوز نہیں ہوا اور جنگ عظیم کے بعد سے میں نے سگریٹ نوشی بھی ترک کر دی ہے " ۔

ہر اشیچر کا قول ہے کہ " تمباکو زہر ہماری قوم کے لئے بدترین زہر ہے ۔ یہودی چاہتے ہیں کہ جرمن تمباکو پینے لگیں تاکہ جرمن قوم کو تباہ کر کے پیسہ کمایا جائے " ۔

ہر کیف آجکل تمباکو نوشی کی عادت عالمگیر ہے ۔ بالخصوص نئی پود اس کی بہت عادی ہوتی چلی جا رہی ہے ۔

# ہندوستانی شاعری کے نادر نمونے

## سنبھل کر دل لگانا پیارے!

### (۱)

وہاں جاکر۔
پھر تو۔
واپس نہیں آسکے گا۔

وہاں۔
بے پروائی۔
حد سے زیادہ ہے۔

وہاں۔
شیریں بھی گھبرا جاتے ہیں۔
تو بھی۔
پھنس جائے گا۔
پیارے! سنبھل کر دل لگانا۔
پھر بعد میں پچھتائے گا۔

### (۲)

یوسف کو۔
اس نے۔
کنوئیں میں ڈالوا دیا۔

بازار میں۔
جاکر کھڑا کرا دیا۔
اس کی قیمت۔
ایک اٹی۔
دلوائی۔
تو
کوڑی کے دام پر۔
بک جائے گا۔
پیارے! سنبھل کر دل لگانا۔
پھر بعد میں پچھتائے گا۔

### (۳)

تم
زلیخا کے عشق کی طرف۔
دیکھو۔
وہاں
سینکڑوں ہی عاشق۔
تڑپ رہے ہیں۔
مجنوں بھی
ہائے ہائے کر رہا ہے۔
تو۔
وہاں سے۔
کیا لائے گا؟
پیارے! سنبھل کر دل لگانا۔
پھر بعد میں پچھتائے گا۔

### (۴)

کسی کی
کھال اتروا دی۔
کسی کو
آرے سے چروا دیا۔
کسی کو۔
پکڑ کر سولی چڑھا دیا۔
وہاں تو بھی
سر کٹائے گا۔
پیارے! سنبھل کر دل لگانا۔
پھر بعد میں پچھتائے گا۔

### (۵)

تیری قسمت میں۔
کلالوں کا گھر۔
لکھا ہے۔

وہاں
مست پیاسے آتے ہیں۔
بھر بھر کر۔
پیالے اور بڑے بڑے برتن
پیتے ہیں۔
دیکھ دیکھ
تیرا دل
للچائے گا۔
پیارے! سنبھل کر دل لگانا۔
پھر بعد میں پچھتائے گا۔

### (۶)

دل کے پیارے!
اب تم
کہاں چلے گئے۔
کل کی کیا خبر۔
کہ کیا ہوگا۔
تم مستوں کے پاس
جاکر کھڑے نہ ہونا۔
تم کو بھی
لوگ
مست کہیں گے۔
پیارے! سنبھل کر دل لگانا۔
پھر بعد میں پچھتائے گا۔

### (۷)

اے شیخ!
شریعت کے خلاف نہ چل۔
آرام کی نیند
پڑھ کے سورہ۔
منہ سے
انا الحق نہ کہہ
سولی پر چڑھ کر
ڈھولا گائے گا۔
پیارے! سنبھل کر دل لگانا۔
پھر بعد میں پچھتائے گا۔

## ارے میں اس پر قربان ہو چکی

### (۱)

درد اور جدائی کے صدمے
بہت برداشت کئے۔
اب یہ مصیبتیں
میری برداشت سے باہر ہیں۔
یہ مصائب کا پہاڑ
ہمارے سر پر رکھ دیا ہے۔
ڈولی بھی
بغچہ بھی
تو ابھی۔
اور کڑاہی بھی۔
اے میرے پیارے!
کیوں دیر کر دی۔
ارے!
میں اس پر قربان ہو چکی۔

### (۲)

میں بیداری ہی کے عالم میں
اپنے ہی گھر میں۔
لٹ گئی۔
میں کبھی
اِدھر اُدھر
نہیں گئی تھی۔
میں جس کی تھی
اس ہی نے مجھے
ذبح کر دیا۔
اب کیا ہے بے پروائی۔
اس نے کی۔
اے میرے پیارے!
کیوں دیر کر دی۔
ارے!
میں اس پر قربان ہو چکی۔

### (۳)

اے شیخ!
میں تم پر سے
قربان جاؤں۔
میں صدقے
میں لاکھ لاکھ بار
تصدق
تیری صورت
بہت پیاری ہے۔
میں بے چاری
تم پر سے صدقے
اے میرے پیارے!
کیوں دیر کر دی
میں اس پر قربان ہو چکی ہوں۔

# عجائباتِ عالم!

از جناب سید طفیل خاں صاحب امین آبادی

## بوڑھا بچہ

سٹیفورڈ شائر انگلستان میں ۱۴ مارچ ۱۸۲۹ء کو تندرست والدین سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ جو چار سال کی عمر میں بالغ ہو گیا اور اس کی ڈاڑھی مونچھ نکل آئی۔ تین سات برس کی عمر میں بوڑھا ہو کر مر گیا۔ چارلس اس کا نام تھا۔ اس کا قد بہت ہی چھوٹا تھا اور اس کی تھیلی اور جبڑے کی ہڈیاں نامکمل تھیں۔

سات سال کی عمر میں اس کے بال سفید ہو گئے چہرے پر جھریاں پڑ گئیں۔ آنکھوں پر گہیں ابھر آئیں اور مرض سے بیہوشی میں مر گیا۔

## سرکے کا دریا

کولمبیا میں ایک سرکے کا دریا پایا جاتا ہے یہ اصل میں کیوریکا دریا کا ایک حصہ ہے۔ جو ملک کے جنوبی حصے میں بہتا ہے اس کے تیزابی ہونے کی وجہ آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ اس کے ہر ہزار حصوں میں گیارہ حصے گندھک کے تیزاب کے اور نو حصے نمک کے تیزاب کے ہیں۔ اس قدر ترش ہے کہ کوئی جاندار اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

## ایک انسان کے ۱۴۸ خطرناک آپریشن

مسٹر ہنری سمتھ نے اپنی ۷۴ سال کی عمر میں ۱۴۸ دفعہ خطرناک آپریشن کرائے ہیں وہ ۴۷ سال درد میں مبتلا رہا اس نے آپریشن کی میز پر ۳۰۰ گھنٹوں سے زیادہ صرف کئے۔

وہ اپنی رفیق زندگی کے ساتھ خوشی سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ ماکر کھیلتا ہے سخت محنت کرتا ہے۔ اور تندرست آدمیوں کی خوراک کھاتا ہے۔ فرصت کے وقت میں اس کے مشاغل سواری اور تیرنا ہیں۔

## برچھیوں کا انسانی تکیہ

سنگاپور میں ایک ہندو سیاسی ہے جو اپنے جسم میں پچاس برچھیاں چبھو کر تقریباً دھوپ میں تین میل تک چل سکتا ہے۔

## ایک عورت کے ۲۸ بچے

یوگوسلاویہ کے ایک کسان متھیو پیار کی بیوی نے ۲۸ برس میں ہر سال ایک بچہ جنا جن میں سے ۱۲ مر گئے اور ۱۶ ابھی والدین کے زیر سایہ ہیں۔ یہ سب بچے خوب تندرست ہیں۔

## ۶۹ بچوں کی ماں

مسز برنارڈ شٹین برگ ۵۶ برس کی عمر میں فوت ہوئی اور اپنے پیچھے ۶۹ بچے چھوڑ گئی۔ یہ عورت آسٹریا میں رہتی تھی اور قریباً ۲۰ برس گزرے فوت ہو گئی ہے۔ مسز برنارڈ نے چار دفعہ چار چار بچے جنے سات دفعہ تین تین بچے اور سولہ دفعہ جوڑے پیدا کئے۔ مسٹر برنارڈ ابھی زندہ ہے اس نے دوبارہ شادی کی ہے اور دوسری بیوی سے اس کے ۱۸ بچے اور ہیں گویا وہ کل ۸۷ بچوں کا باپ ہے۔ جن میں سے ۶۷ زندہ ہیں اس کی عمر ۷۰ سال کی ہے اور تندرست ہے۔

## کفن میں پیدائش

گورگیاس باشندۂ ابیرس ایک کفن میں پیدا ہوا تھا۔ جس میں دو گھنٹے پیشتر اس کی ماں کو لٹایا گیا تھا۔

تہذیب

## رنگِ جدید

از جناب اندرجیت شرما اچھو

(١) پُوچھا صاحب کے جو منشی نے تو میں نے یہ کہا
ٹھیک ہے آپ کی تحریر یہ مسٹیک کے ساتھ
Mistake

زیست کا لُطف ہے دُنیا میں بدوں کے دم سے
ہاتھ کیا آئے گا اب رہ کے کسی نیک کے ساتھ

باسی ٹکڑا ابھی جو مل جائے غنیمت ہے وہی
چائے پینے کا تو آتا ہے مزہ کیک کے ساتھ
Cake

ایک سرکار ہی آئیں گے تو دیدیں گے ڈنر
Dinner
ہوں گے مجبور ہی آئیں گے اگر ایک کے ساتھ

کچھ نہ کچھ شغل تو ہو جاتا ہے تالاب بھی
لُطف تفریح کا آتا ہے مگر لیک کے ساتھ
Lake

(٢) زندگی کس کیلئے ہے موت ہے کس کیلئے
درد ہے اس کیلئے آرام ہے جس کے لئے

چلدیئے ایک ایک کر کے سب محبانِ وطن
ہم کریں کس کس کا ماتم روئیں کس کس کے لئے

کیا غرض مندر سے مسجد سے ہمیں کیا واسطہ
چھوڑ بیٹھے ہیں خدا کو ہی ہم اس مِس کے لئے
Miss

وصل کی شب بھی مصیبت تھی شبِ غم سے سوا
فوجداری رات بھر ہوتی رہی کِس کے لئے
Kiss

بچّوں کو اک فلسفہ ٹیچر نے سکھلایا عجیب
وقف ساری زندگی ہے ڈیڈ اور دیٹ کیلئے
This That

## خوش اخلاق لوگ

از حضرت مُلّا رموزی

گدھے ہیں جو ہلاکِ وعدۂ دیدار ہوتے ہیں
حسیں تو ہر جگہ کے آج کل مکار ہوتے ہیں

بچو اُن سے جو خوش اخلاق ہیں اور ہنس کے ملتے ہیں
یہ در پردہ بڑے غدار اور عیار ہوتے ہیں

یہ اُمیدوں ہی اُمیدوں میں تم کو مار ڈالیں گے
شقی القلب اور بے انتہا خونخوار ہوتے ہیں

بظاہر قوم کے ہمدرد بنتے ہیں مگر دل میں
یہ قومی آدمی تک سے بڑے بیزار ہوتے ہیں

اٹک جائے جو انکی آپ سے تو آپ ہی کے ہیں
نکل جائے جو انکی پھر کہاں یہ یار ہوتے ہیں

فقط تہوار پہ ملتے ہیں دس پندرہ غریبوں سے
نہیں تو انکے حق میں جیسے تھانیدار ہوتے ہیں

کہاں کا مذہب و ایماں کہاں کا وعدہ و پیماں
کسی کے ہو کے رہتے ہی نہیں یوں خوار ہوتے ہیں

یہ عاشق کے نہ یہ معشوق کے ہوئے کبھی دل سے
انہیں مرغوب دولت اور موٹر کار ہوتے ہیں

یہ انگریزی ہیں انگریزوں سے اُردو میں رموزی سے
جھجکتے ہیں تو ملتے وقت کم گفتار ہوتے ہیں

اُدھر "یس سر" اِدھر "جی ہاں" سے بڑھکر کہہ نہیں سکتے،
بس اتنی قابلیت تک کے برخوردار ہوتے ہیں

اکتشافات جدیدہ

# مغرب میں جرائم کے خلاف سائنس کی جنگ

از جناب [illegible] صدیقی

مغرب میں جرائم کے خلاف سائنس کی مدد سے ایک کامیاب جنگ لڑی جا رہی ہے۔ علی الخصوص ناخنوں کی میل۔ کپڑوں کی گرد اور سر کے بال جرائم کی تفتیش میں بہت ممد ثابت ہوئے ہیں۔ ذیل میں انہی حیرت انگیز باتوں کی تشریح کی گئی ہے:-

کسی جرم کی تفتیش میں آج کل بال بابت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک امریکن ماہر نے بالوں کی قریباً تیس ہزار اقسام دریافت کی ہیں۔ چنانچہ صرف ایک بال ہی کو لیبارٹری کے ماہرین کے سامنے پیش کر کے مجرم کی عمر، جنسیت اور صحت کے متعلق صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ابھی حال ہی میں سکاٹ لینڈ یارڈ پولیس نے بال تراشنے والی دو ایسی مشینیں تیار کروائی ہیں جن سے بال کا باریک ترین ریزہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ کسی قسم کے باریک سے باریک تر بال کا ایک انچ کا دس ہزارواں حصہ بھی بڑی آسانی کے ساتھ کاٹ سکتی ہیں۔

یہ بال کے ریزے جرائم کی تفتیش میں کس حد تک کامیاب ثابت ہو سکتے ہیں؟ اس کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ صرف ایک بال کے باریک ترین ریزے کی وجہ سے ایک قاتل کو پھانسی کے تختے پر لٹکا کر قتل کی سزا دی جا چکی ہو۔ اس مجرم نے اپنی بیوی کو قتل کر کے تیز چونے یا قلعی میں دفن کر دیا تھا۔ جب مقتولہ کی لاش برآمد کی گئی تو بدقسمتی سے اس کے جسم کی تمام کھال ضائع ہو چکی تھی مگر جلد میں سے ۲ مربع انچ کا ایک ٹکڑا ابھی تک صحیح و سالم تھا۔ اگر پولیس کا ایک نوآمد سائنس دان اسالسبری اس ٹکڑے ہی سے قتل کا ثبوت مہیا نہ کر سکتا تو قاتل شاید عدم ثبوت کی بنا پر بے گناہ سمجھ کر بالکل بری کر دیا جاتا۔

نیویارک کی پولیس لیبارٹری نے تمام دنیا کی پولیس کو صرف لکڑی کی شناخت ہی سے قاتل کا انکشاف کرنے کا ایک زریں سبق دیا تھا۔ اور یہ صرف ایک سیڑھی کی لکڑی کی شناخت ہی تھی۔ جو قاتل نے اپنے گھر کے تختوں کو کاٹ کر بنائی تھی۔ اور جس کے بڑے ٹکڑے اس نے ایک لکڑی کے ذخیرے سے خریدے تھے۔ اور جس نے لنڈبرگ کی بچی کو اغوا کرنے والے ملزم کی زندگی کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر ختم کر دیا تھا۔

انگلستان میں ایک ایسے شخص کے جرم کو جو جعلی سکے بنایا کرتا تھا محض اس ترکیب سے ثابت کیا گیا کہ اس کے تمام کپڑوں کو جھاڑ کی ایک زبردست لہر سے صاف کر کے اس سے میل اور گرد حاصل کی گئی۔ اور اسی گرد میں سے ایسی دھاتوں کے باریک ترین ریزے پائے گئے۔ جن کو آپس میں ملا کر وہ جعلی سکے بنایا کرتا تھا۔ اور وہ دھاتیں سیسہ۔ ٹن اور تانبہ تھیں۔

سب سے پہلے کانن ڈائل نے جرائم کے انکشاف میں "گرد" کی اہمیت اور قدر و قیمت کو واضح کیا تھا۔ لیکن اس کو عملی رنگ میں کارآمد ثابت کرنے کی سعادت ایک فرانسیسی ڈاکٹر ایڈمنڈ لوکارڈ کو حاصل ہوئی جو شرلک ہومز کے طریق تفتیش کا مثنی ہے۔ اور جس نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ صرف "گرد" ہی کسی مجرم کی سب سے بڑی دشمن ہو سکتی ہے۔ یہ خوردبین کے شیشے کے سامنے مجرم کو دھوکہ دے کر صاف صاف بتا سکتی ہے کہ وہ واردات کے وقت کہاں تھا۔ اور کیا کر رہا تھا۔ ایسے قاتل جو اپنے ہاتھوں سے خون کے دھبوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ صاف یا خون آلود کپڑوں کو نذر آتش اور اپنے اوزاروں کو احتیاط کے ساتھ محفوظ کر چکے تھے۔ محض گرد کے ان چند ریزوں کی بدولت جو ان کے کانوں۔ ان کے کانوں۔ نتھنوں۔ آنکھوں کے گوشوں اور ناخنوں کی میل سے برآمد ہوئے تھے۔ عدالتوں سے اپنے جرائم کی مناسب سزا پا چکے ہیں۔

فرانس میں حال ہی میں کسی شخص نے ایک دوسرے انسان کا گلا گھونٹ کر اسے قتل کر دیا تھا اور مقتول کو "ایکزیما" کی شکایت تھی۔ پولیس نے ایک مشتبہ انسان کو گرفتار کیا اور اس کے ہاتھوں کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ اس کے ناخنوں کو تراش کر ان کی میل کو محفوظ کر لیا گیا لیکن کوئی کارآمد ثبوت مہیا نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ لیبارٹری میں اس کے کوٹ کی جیب سے حاصل شدہ گرد کا معائنہ کیا گیا اور خوردبین سے بغور جانچ پڑتال کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسی گرد میں سے "ایکزیما" کے چند باریک ترین جرائم ہیں۔ اور بالآخر یہی جرائم اس کے لئے پیام موت ثابت ہو کر اسے پھانسی کے تختہ پر لٹکانے کا باعث ہوئے۔

واقعہ در اصل یوں تھا کہ قاتل نے واردات کے مابعد ہی اپنے ہاتھوں کو احتیاطاً اچھی طرح سے صاف کر لیا تھا۔ لیکن اسے بدقسمتی سے یہ یاد نہ رہا کہ قتل کے بعد جب وہ واپس اپنے گھر آ رہا تھا تو اس کے وہی ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب میں تھے۔

مسز برائنٹ ایک ۳۳ سالہ پانچ بچوں کی ماں نے اپنے سابق شوہر کو کوئی زہریلی شے پلا کر مار ڈالا تھا۔ اور وہ اپنی احتیاطوں کی موجودگی میں اپنے جرم کے نتائج سے بالکل مطمئن تھی لیکن اسے بھی "گرد" نے دھوکا دیا اور اس کی گرفتاری اور سزا یابی کا باعث ہوئی لیکن ایسے پُر اسرار قتل کا سراغ لگانا بھی کوئی خالہ جی کا گھر نہ تھا پہلے مقتول کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ اور ڈاکٹروں کو اس کے معدے سے سنکھیا کے آثار نظر آئے اور یہ ثابت ہو گیا کہ مقتول زہر خوردنی کی وجہ سے موت سے ہمکنار ہوا ہے۔ اسی زعم میں پولیس کے سراغ رساں مسز برائنٹ (قاتلہ) کی قیامگاہ تک پہنچے اور خانہ تلاشی اور ہر قسم کی جستجو کے بعد بھی انہیں وہاں سے سنکھیا دستیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر انھوں نے آتے وقت سیڑھیوں، چٹائیوں، کپڑوں، الماریوں، جوتوں اور صندوقوں پر سے گرد جھاڑ کر علیحدہ علیحدہ جمع کر لی۔ اور اسی طرح گرد کی قریباً ۱۵۶ اقسام کا ذخیرہ مہیا کر کے وہ واپس چلے آئے۔ اور لیبارٹری کے ماہرین کو تجزیہ کے لئے پیش کر دیں۔ معائنہ کے بعد ان ۱۵۶ اقسام میں سے ۴ قسم کی گرد میں سے سنکھیے کے ذرات دستیاب ہوئے۔ اور یہی ذرات عدالت میں قاتلہ کے خلاف بطور چشم دید گواہ پیش ہو کر اس کے لئے پھانسی کا فرمان ثابت ہوئے۔

امریکہ کے ایک دندان ساز نے اپنے باپ کی جائداد پر تصرف حاصل کرنے کے لئے اسے ہلاک کرنا چاہا۔ اور اس کے "کرم خوردہ" دانت کے خلا میں خاص دوا بھرنے کی بجائے ایک سخت زہریلا سفوف بھر دیا۔ جو چند دنوں کے بعد آہستہ آہستہ گھل کر اس کے معدے میں پہنچ کر اس کی ہلاکت کا موجب ہوا۔ اور دندان ساز اس عجیب و غریب سازش قتل میں نہایت آسانی سے کامیاب ہو گیا۔ لیکن جب پولیس نے مقتول کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا تو اسے نہ صرف اس زہر کے ذرات ہی مہیا ہو گئے۔ جن سے دندان ساز نے اپنے باپ کو پیالۂ اجل پلایا تھا۔ بلکہ معدے میں اس دوا کے ذرات بھی صحیح و سلامت برآمد ہو گئے۔ جن کو دانت بھرنے کے بعد دندان ساز دانتوں پر لگاتے ہیں۔ اور دندان ساز کو بحیثیت قاتل کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونا پڑا۔

## استعجاب

از جناب اثر صہبائی جلوالی بی اے

یہ کون آ رہا ہے مری بارگاہ میں؟

آنکھوں میں مستیوں کی حسین ضو لئے ہوئے
نازک لبوں پہ لیکے تمناؤں کا سہاگ
زلفوں میں لیکے ساغر بدمست کی کھنک
ہر عضو میں لئے ہوئے صہبا کی لغزشیں
باتوں میں نکہتوں کے خزانے لئے ہوئے
ہر ہر قدم پہ مے کے فسانے بکھیر کر

رخ پر بہشت نور کا پرتو لئے ہوئے
انگڑائیوں میں لیکے جوانی کے رنگ راگ
اور انکھڑیوں میں زہرہ و ناہید کی جھلک
موسیقیوں کی نرم و دلکش صباحتیں
کیفیت و جنوں کی شرابیں پیے ہوئے
انجام حسن و عشق جنوں زا سے بیخبر

یہ کون آ رہا ہے مری بارگاہ میں

# کیا آپ کو معلوم ہے؟

ازجناب چودھری امداد "شمع بلگر"

تمام دنیا میں جس قدر آہنی ریلوے لائن بچھی ہوئی ہے اس کی قیمت چونتیس ارب روپیہ ہے۔

---

دیا سلائی ۱۸۲۹ء میں ایجاد ہوئی۔ اس وقت اس کی قیمت دو روپیہ فی ڈبیا تھی۔

---

امریکہ میں ایک دو سو منزل کا مکان تیار ہو رہا ہے۔ اس میں ایک لاکھ آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہو گی۔

---

کارنس میں ایک گرجا ہے جس میں دس ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ وہ صرف کاغذ کا بنا ہوا ہے۔

---

دنیا میں سب سے بڑا قالین لندن کے ایک ہوٹل میں ہے۔ جو ستر آدمیوں کی مدد سے بچھایا جاتا ہے۔

---

اس کا وزن ۶۰ من ہے۔

---

بیجاپور میں بادشاہ محمد عادل کے مقبرہ کا گنبد دنیا کا سب سے بڑا گنبد ہے۔ اس کا قطرہ ۱۳۴ فٹ اور وسعت ۱۸۲۰۰ مربع فٹ ہے۔

---

گنجے آدمی نسبتاً ذہین ہوتے ہیں۔

---

دنیا میں سب سے گہرا کنواں فرانس میں ہے جس کی گہرائی ساڑھے تین ہزار فٹ ہے۔

---

لندن کی گلیوں کی مجموعی لمبائی ڈھائی ہزار میل ہے

---

ایک معمولی قمیص میں اکیس ہزار ٹانکے ہوتے ہیں۔

---

ازجناب اشرف نعمانی

دنیا میں اندھوں کی تعداد مندرجہ ذیل ہے۔

| | |
|---|---|
| ہندوستان | ۵۵۰۰۰۰ |
| جرمنی | ۱۲۵۰۰۰ |
| مصر | ۱۱۰۰۰۰ |
| جاپان | ۸۰۰۰۰ |
| جزائر برطانیہ | ۷۹۰۰۰ |
| فرانس | ۳۵۰۰۰ |
| اطالیہ | ۳۴۰۰۰ |
| ارجنٹائنا | ۷۵۰۰ |
| سویڈن | ۶۰۰۰ |
| کناڈا | ۶۰۰۰ |
| آسٹریلیا | ۴۰۰۰ |
| بلجیم | ۳۰۰۰ |
| ناروے | ۳۰۰۰ |
| فن لینڈ | ۲۸۰۰ |
| ڈنمارک | ۲۰۰۰ |
| نیوزی لینڈ | ۱۲۰۰ |
| ٹرینڈا | ۱۱۰۰ |

دنیا میں ڈاکخانوں کی تعداد مندرجہ ذیل ہے۔

| | |
|---|---|
| جزائر برطانیہ | ۲۳۸۵۲ |
| جرمنی | ۴۵۹۹۴ |
| فرانس | ۱۷۰۳۳ |
| اطالیہ | ۱۱۶۰۵ |

## امریکن شاعری (بقیہ صفحہ ۱۲۷)

بڑھ کر بلکہ لا ظہور شاعر والٹ وٹمن ہو گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے امریکن شاعری کو نئی چیز عطا کی۔ جدت طبع اور زور بیان سے دنیا کو بہترین چیز عطا کر دیا۔ چونکہ وہ ایک کسان کا بیٹا تھا اس لئے اس نے فطرت کی آغوش میں تربیت پائی تھی۔ لہذا اس کے موضوعات شاعری بھی فطری اور نیچرل ہوتے تھے۔ چنانچہ اس نے نیچرل اور سیدھی شاعری کو فروغ بخشا۔ اس کے موضوعات شاعری نہایت عام ہوتے تھے۔ مثلاً گھاس کی دھانی پتیاں "خاموشی اور صابر کڑی"، "میری ذات" "درات کو دریا کے کنارے" "جہازوں کا شہر نیویارک" وغیرہ۔ وٹمن کا کلام سادہ اور عام فہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اثر اور دلنشینی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ مسٹر عبدالحق فرماتے ہیں۔

"اثر ہمیشہ سادگی کے سایہ میں پایا جاتا ہے اور دلنشینی اس کا حسن ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ والٹ وٹمن Walt Whitman کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور وہ امریکہ کے دیگر شعرا سے بالا و برتر شمار کیا جاتا ہے۔ کسی امریکن نقاد نے خوب کہا ہے کہ

"وٹمن Whitman پر ابتدائی امریکن شاعری ختم ہو جاتی ہے اور شاعری کا ایک نیا



آئینہ آب

# ضروری اطلاع
## لاکھوں کا بھلا ہو گا — اس کے پڑھنے سے

**صاحبان!** میں اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی تھی جس کے نتیجہ بد سے میں بالکل بے خبر تھا۔ ایام ... سال کے بعد مجھے نامردی کا نامبارک مرض لاحق ہو گیا۔ سرعت۔ جریان۔ احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایتوں کے سبب میرا چہرہ ... بدن لاغر ... ہوتا جاتا تھا۔ دل ہر وقت دھڑکتا، سر چکراتا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا۔ گھبراہٹ، سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا مگر در پردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں ... اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی ادویات ... استعمال کرتا رہا لیکن مجھے بالکل خاک بھی فائدہ نہ ہوا بلکہ علاوہ خرچ کے کئی اور تکلیفوں کا سامنا کر کے بھی مایوس ہی رہنا پڑا۔ ... زندہ درگور ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے ایک سلسلہ میں پشاور رہنا پڑا ... وہاں ایک فقیر ... سے ... ملاقات ... پوچھنے لگے کہ تم اداس اور تمہاری صورت بیٹوں کی سی کیوں ہے؟ میرے ... دل نے ... خوبصورتی اور کامل فیاضی سے ... ہدایت کی۔ چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس فقیر صاحب کمال نے ... شفقت ... ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتایا۔ چنانچہ میں نے حسب ارشاد اس صاحب کمال کے ... جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر ہر دو جوہر کیمیا گر دیر اس صاحب کمال کے تیار کر کے استعمال کرنا شروع کیا! **ناظرین! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں** کہ ساتویں روز ہی میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ہو گئیں اور میں اپنے آپ کو قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہو گیا۔ اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال سے ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ مگر بموجب ارشاد اپنے محسن خوبصورت کامل سنیاسی کے **اکیس روز تک** پرہیز اور علاج جاری رکھنا پڑا۔ ... تین سیر ... تین سیر دودھ باآسانی ہضم کر لیتا تھا۔ میرا چہرہ بارونق۔ بدن مضبوط۔ بینائی طاقتور ہو گئی۔ اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ واپس آ کر ... دوائی کا نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت وغیرہ کے لئے اکسیر سے بڑھ کر پایا۔ پھر کئی ایک دور اندیش اصحاب کے اصرار ... عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس شرمناک اور قبیح عادت کے شکار ... انسانیت سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کر کے مایوس ہو چکے ہوں وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو استعمال کر کے صحت یاب ہو جائیں ... قیمت صرف لاگت ادویات اور خرچ اشتہار بمشکل اکتفا کرتی ہے۔ فائدہ بہت کم ملتا ہے۔

**قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ۱۲ روز کی ۲۴ خوراک موجود ہے صرف دو روپیہ عہ**

**قیمت روغن مالش طلا جو ۱۲ روز تک رگوں اور پٹھوں کیلئے کافی ہے فی شیشی دو روپے آٹھ آنے عہ** جریان کیلئے یہ گولیاں ازحد مفید ہیں ... نامردی کے سوائے خواہ کسی قسم کی نامردی کا مرض کیوں نہ ہو اکسیر ہے۔ روغن مالش طلا سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہو گا۔

اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ، جوان اور بوڑھا باآسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے اور نہ ... جعلی اشتہار شائع کر کے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے بلکہ ہر خاص و عام کا فائدہ مدنظر رکھ کر احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جا رہا ہے۔ تندرست اور شوقین اصحاب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے استعمال سے صحت اور ... طاقت ... اگر بڑھاپے میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہیں تو ان گولیوں اور روغن مالش طلا کا استعمال کریں کیونکہ اس کے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہوتا ہے۔ الغرض جب تمام جسم ڈھیلا ہو گیا ہو تو ان کا استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ مخفی دکھوں کا تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب علاج ہے۔

**نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے** جو عورتیں مردوں کی طرح جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیکوریا جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوں ان کے لئے مقوی گولیاں ازحد مفید ہیں۔ ضرورت مند اصحاب تجربہ کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہو گا۔ محصول ڈاک ... علاوہ۔ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

**خاص نوٹ** وہ اصحاب جو ہم سے دوائی منگا کر استعمال کریں اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ کیونکہ کئی اصحاب نے پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ہم سے دوائی منگا کر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ لہٰذا فقیر خوبصورت سنیاسی کے قول کے مطابق اس کی کمائی کھانا گناہ ہے۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹرڈ ہیں۔ آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

**غیر ممالک سے قیمت پیشگی۔**

### ضروری اطلاع

یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت، کمزوری اور لاغری اور جریان الرحم و لیکوریا کے لئے مخصوص ہے ... امراض خواہ کسی سبب سے ہوں ... کثرت مباشرت یا عادت بد کے ... پیدا ہوئی کمزوری کیلئے اس کا استعمال ... نامردی کے لئے میری دوائی اکسیر ہے۔

### شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ

... ایمان کی قسم ... دوائی ... استعمال ... فائدہ ... رکھنے والے ... حکیموں اور دیدوں کی رائے ہے ... مقوی گولیاں، روغن مالش طلا ...

**ملنے کا پتہ: منیجر دار الشفاء گولیاں رجسٹرڈ بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب**

ڈاکٹر بھگوان سنگھ از امرتسر: یہ دوائی احتلام و سرعت انزال کیلئے اکسیر ہے۔

ڈاکٹر حسین خان از سنگاپور: یہ دوائی جلق زدہ مریض کے لئے نہایت فائدہ دہ ہے۔

حکیم جہانگیر بیگ از چوبیس پرگنہ: یہ دوائی قابل تعریف ہے۔

**اخبار سروش** ...

ڈاکٹر شفاء خیرات ... : یہ دوائی گم شدہ قوت مردی کو از سر نو بحال کر دیتی ہے۔

مسٹر آر چندرا از امریکہ: اس دوائی کے استعمال سے میرا وزن بڑھ گیا ہے۔

جناب حکیم محمد عبدالرزاق صاحب ... : دار الشفاء گولیاں و روغن مالش طلا بہت ... مفید پایا۔

حکیم رام چندر از ...: یہ دوائی رگوں اور پٹھوں کیلئے بہت مفید ہے۔

حکیم چونی لال از لاہور: یہ دوائی ... پیدا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

مسٹر ... سرکاری ہسپتال گوالیار: یہ دوائی نامردی کے لئے ... استعمال کرائی گئی بہت مفید پائی گئی۔

**رسالہ کہکشاں** ...

ڈاکٹر ایچ ... از امریکہ: یہ دوائی نامرد کو مرد بنا دیتی ہے۔

والدہ یوسف ... از کلکتہ: یہ دوائی جریان الرحم ... کیلئے مفید ہے۔

... صاحب ... : یہ دوائی ... نامرد کو ... ہے۔

# امریکن شاعری؟

ابتدائی دور سے والٹ وٹمن تک پُر معارف تبصرہ

از جناب ا۔ ح پروانہ بریلوی

جس طرح عرب 'الیونان' 'رُوم' 'ایران' اور ہندوستان میں شاعری کا سنگِ بنیاد مذہب کے ہاتھوں رکھا گیا۔ بالکل اسی طرح امریکن شاعری کی پیدائش مذہبی عقائد اور مذہبی گیتوں سے ہوئی۔

انسان کو ہمیشہ اپنی کمزوریوں اور بندشوں کا احساس رہا۔ وہ ہمیشہ اپنے سے اعلیٰ اور برتر ہستی کے خوف سے مرعوب رہا اور ہر ممکن طریقے سے اُس کے قہر و غضب کو رحم و کرم میں بدلنے کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ اسی وجہ سے مذہباً قربانی کی رسم جاری ہوئی۔ اور برتر و بالا ہستی کی عبادت بالیوجا کے لئے رقص و سرود۔ چنگ و رباب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں لوگوں میں سے کچھ لوگ اُٹھے اور انھوں نے اپنے دلی جذبات اور قلبی کیفیات کو منظم خیالات اور مترنم عبارت میں پیش کیا۔ کچھ لوگوں نے اپنی آواز کی شیرینی اور لوچ کا خیال کرتے ہوئے اچھے ڈھنگ سے پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں نے مست و بیخود ہو کر الفاظ اور آواز کی حرکت کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر بھی چلانا شروع کر دیئے۔ جُوں جُوں زمانہ ترقی کے مختلف مدارج طے کرتا گیا یہ فن آہستہ آہستہ ترقی کرتے گئے۔ تا آنکہ شاعری رقص و نغمہ مستقل اور مکمل فن مان لئے گئے۔ اسی لئے کسی نقاد نے کہا ہے کہ :-

"تمام فنونِ لطیفہ کا منبع و مخرج مذہبی عقاید اور رسوم ہی ہیں"

شعر و شاعری کی تعریفیں اس قدر کی گئی ہیں کہ ان کا احصاد شوار ہو گیا ہے اور کثرتِ تعبیر سے خوابِ پریشاں ہو کر رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کے نزدیک "شعر منظوم انشا ہے۔ یہ ایسا فن ہے جو تعقل اور تخیل کی مدد سے انبساط کا صداقت کے ساتھ لگاتا ہے" [illegible] کی رائے میں :-

"شعر صداقت اور حسن کے ساتھ عشق کا اظہار ہے۔ اس کے ادراکات کی توضیح تخیل اور تصور کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اور اس کی زبان کا تو از ن یکسانیت میں اختلاف کے اصول کا تابع ہے"

ہیزلٹ کے نقطۂ نظر سے :-

"شعر کسی چیز یا کسی واقعہ کا فطری تاثر ہے جو اپنی صفائی کی بدولت جذبات اور تخیل میں ایک غیر ارادی تحریک برپا کر دیتا ہے اور اسی تحریک کی مطابقت سے اس کے اظہار کی آواز اور طرز میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتا ہے"

شیلے کے نزدیک "شعر تخیل کی زبان ہے" ورڈس ورتھ کے لئے "شعر انسان اور فطرت کا عکس اور شدید جذبات کا از خود چھلکنا ہے" میتھو آرنلڈ کی رائے میں "شاعری نقدِ حیات ہے۔ ان اصولوں کے ماتحت جو شاعرانہ صداقت اور حسن کے مقرر کردہ ہیں" اسی طرح ایک مشرقی ادیب اور نقاد کے نزدیک "شاعری ایسی صنعت ہے جس کی بدولت موہومات کی ترتیب سے چھوٹی چیز بڑی اور بڑی چیز چھوٹی کر کے دکھلائی جاتی ہے۔ اور اچھی چیز کو برا اور بری چیز کو خوشنما ثابت کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس سے انسان کے جذبات مشتعل ہوں اور طبیعت پر انبساط یا انقباض کی کیفیت طاری ہو۔ اور یہ دنیا میں عظیم الشان کارناموں کا سبب بنے"

بہرکیف شعر ایسی مخلوق ہے جس سے ہر فرد و بشر مانوس ہے۔ لیکن اس کے اسرار سے عالم تقریباً بڑی حد تک بیگانہ ہے۔ گو یا کسی نے شعر ہی کے متعلق کہا تھا کہ "نہ پوچھو میں سب کچھ جانتا ہوں اور اگر پوچھو تو میں کچھ بھی نہیں جانتا" شعر کے تاثرات ہر شخص کے دل پر نقوش ثبت کرتے ہیں۔ شعر کی حد بندی میں یہ ناکامی کچھ علما کے اپنے تصور کے سبب ہی نہیں بلکہ در اصل شعر کی نزاکت کسی تعریف کی متحمل ہوتی نظر نہیں آتی—

جس طرح شاعری کی مختلف اقسام ہیں اسی طرح مقاصد بھی گوناگوں ہیں۔ [illegible] شاعری دقیق خیالات کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرتی ہے۔ اخلاقی شاعری اخلاق کو [illegible] ہے۔ عشقیہ شاعری سے زندہ دلی اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ تاریخی اور مذہبی شاعری ہمیں ہمارے اسلاف اور مذہبی پیشواؤں سے روشناس کراتی ہے اور ہمارے دلوں میں ان کا احترام پیدا کرتی ہے۔ قومی شاعری ملکی رہنماؤں اور لیڈروں کے مشہور کارناموں کی تشہیر کرتی ہے۔ تخئیلی شاعری طبیعت میں اہتزاز اور انبساط کی روح پھونکتی ہے۔ لطیف الدین احمد کے نزدیک "جس طرح معرفتِ نفس کا ذریعہ مذہب ہے اسی طرح تہذیبِ نفس کا ذریعہ شعر ہے"

امریکن شاعری کے موضوعاتِ شاعری اور اصولِ شاعری بالکل پُرانی دنیا کے اصول اور موضوعات کے تابع ہیں۔ وہ کسی طرح انگریزی اور اسکاٹ اصولوں سے جدا نہیں مگر پھر بھی لب و لہجہ مختلف اور جداگانہ ہے۔ جُوں جُوں امریکہ کے باشندوں میں قومی جذبات نے ترقی کی شاعری اپنی پُرانی روش سے ہٹتی گئی۔ چنانچہ بہت جلد امریکن شاعری کے موضوعات اور اصولِ شاعری بدل گئے۔ خیالات اور احساسات میں فرق آگیا۔ انھوں نے اپنی قومی کہانیاں گھڑ لیں اور شاعری اُن کی تعریف اور مدائح کے ذریعہ سے وسیع اور متنوع بنائی جانے لگی۔ اسی وجہ سے سب سے پہلے قومی گیتوں اور گانوں کی ابتدا ہوئی جو عموماً مذہبی دیوتاؤں، ملکی رہنماؤں، حب وطن اور یادِ وطن کی تعریف، احترام، خلوص اور یاد میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اس لحاظ سے [illegible] شاعری اور اردو شاعری میں بڑا [illegible] فرق صرف اتنا ہے کہ امریکن شاعری میں ایک [illegible] یا جذبہ نظم کیا جاتا ہے۔ جو بالکل فطری ہے۔ مگر اُردو شاعری کی جان — غزل — میں متعدد قافیوں کے تحت ایک ہی وقت میں مختلف کیفیات نظم کی جاتی ہیں۔ [illegible] ہر شعر بجائے خود ایک مکمل نظم ہوتا ہے — موضوع کے لحاظ سے نکتہ [illegible] والوں کے یہاں شعریت کی جان سمجھا جاتا ہے —

عرصہ تک امریکن شاعری مذہبی عقاید و موضوعات کا کھلونا بنی رہی اور کوئی [illegible] کارنامہ ظہور میں نہیں آیا۔ [illegible] اور [illegible] [illegible] اُن کو حقیقی شاعری سے کوئی [illegible] [illegible] امریکہ کے باشندوں کے دلوں [illegible]

## ایک رومانی سفر!

از جناب اُمید رضوی بریلوی

کیا کہوں کیا میں نے دیکھا گھیپرو ں جاتے ہوئے
ہم سفر تھی ایک دوشیزہ باندازِ حجاب
شعریت کی جان، روحِ شاعری، حسنِ نشاط
مستیٔ خیام، حافظ کی غزل، جامی کی نظم
تاجدارِ رنگ و بُو، شہزادیٔ حسن و شباب
جلوہ ہائے دلنواز و حسنِ فردوس نظر
عارضِ گلرنگ پر فرخندگی چھائی ہوئی
نیم وا لب کی لطافت جیسے اک نورس کلی
ایک ہلکا سا ترنم دلنشیں آواز میں
حسن کے ساغر میں صہبائے شبابِ بے پناہ
گاہ وہ کافر نگاہوں سے پیامِ اضطراب
اور کبھی خاموشیوں کے ساتھ شیریں کلام

منہ کو آتا ہے کلیجہ اُس کو دُہراتے ہوئے
شاہکارِ حسن یا پیغمبرِ حسن و شباب
عرشِ اُلفت، مرکزِ جذبات، کیفِ انبساط
موجِ نغمہ، سازِ مطرب، برقِ میداں، شمعِ بزم
یا زمیں پر آگئی تھی کوئی "بنتِ ماہتاب"
سامنے تھی لکھنؤ کی شام کاشی کی سحر
جیسے ساون میں گلستاں پر بہار آئی ہوئی
دلنشیں شانِ تکلم پھول کی گویا ہنسی
یعنی اک طوفانِ نغمہ پردہ ہائے ساز میں
دیکھنے والی نظر کو دعوتِ ذوقِ گناہ
عشق کی مجبور نظروں سے کبھی وہ اجتناب
خود وہ کنکھیوں سے کبھی دینا محبت کا "پیام"

کاش پھر تقدیر بخشے فرصتِ نظّارگی
پھر نظر آئے وہ گلزارِ لطافت کی کلی

قوتیت اتنی اور آزادی کے جذبات ابھرنے لگے اور شاعری کے موضوعات بھی جذبات اور احساسات قرار پائے۔ اسی وقت سے ایک نئے دور (Colonial Period) کا آغاز ہوا۔ اور قدیمی شاعری نے اپنا رنگ بدل دیا۔

نوآبادیوں کی ابتدا میں امریکی شاعری کی ابتدا سترہویں صدی میں ہوئی۔ یہ لوگ انگلینڈ سے آکر بس رہے تھے۔ یا وجود یکہ فضا اور ماحول بدل چکے تھے پھر بھی امریکہ کے انگریز ہر طرح انگریز ہی رہے۔ اس نئی فضا اور اس کے تاثرات ایک نئی سوسائٹی بناتے نظر آرہے تھے۔ یہی زمانہ انگریزی شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ شیکسپیئر کا طوطی بول رہا تھا۔ ملٹن کو سرکس و ناکس سر آنکھوں پہ بٹھا رہا تھا۔ کرنشاہ اور مارول کے طنزیات و مضحکات زبان زد ہو رہے تھے۔ ہیرک اور ڈیلکی کا خوش اسلوبی اور جان ڈان John Donne کا جوش اور شدت جذبات ہر ایک کے دل میں طوفان اٹھا رہے تھے۔ امریکہ والوں نے سر ولیم ڈیوننٹ اور ڈرائیڈن کا اتباع کیا۔ یہی سبب ہے کہ ورجینیا Virginia کے بحری سفر پر کسی امریکن نے کوئی نظم نہیں لکھی اور اس کا لکھنے والا ایک لندن کا شاعر مائیکل ڈریٹن (Michael Drayton) تھا۔

"شاباش! اے جانباز سیاحو! تمہارے ملک اور قوم کا جاہ و اقبال ہمیشہ ترقی و شہرت کے گیتوں میں پرواز کرتا ہے۔ جاؤ! اور فتح کرو! جبکہ آوارہ پریاں اپنے وطنوں میں شرم سے چھپی ہوئی ہیں۔"

اگرچہ نظم کا اختتام کچھ اچھا اور شاندار نہیں مگر پھر بھی مائیکل ڈریٹن کو امریکن شاعری اور نئے ادب کا باوا آدم ماننا چاہئے۔ اس زمانے کے مشہور شاعر جان اسمتھ، ولیم اسٹریچی، ولیم ڈیشا اور جارج سینڈس ہیں۔ لیکن ڈریٹن کے نزدیک سوائے سینڈس اور اسمتھ کے باقی کے نامعلوم مصنفوں سے کوئی بھی شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ ان لوگوں کے کلام میں ادبی روح بالکل مفقود اور معدوم ہے اور شاعری کا یہ حال تھا کہ انیسویں صدی میں کوئی سچا اور حقیقی شاعر پیدا نہیں ہوا۔ نیو انگلینڈ کی نو آبادی کا ادب مضمون خیز اور بار آور ضرور تھا گو اس میں زندگی کی لطیف کیفیت اور نغمہ سرائی نہیں ہے۔ چونکہ یہ زمانہ پیوریٹن Puritanism کے عروج کا زمانہ تھا۔ لہٰذا تمام آرٹ مذہبی تھا اور بحث طلب مناظروں پر منحصر تھا۔ ادب، خصوصاً شاعری کا مذہب کی مقدس فضا اور ماحول میں ترقی کرنا امر محال ہے۔ مذہبی مضامین سے شاعری علمی منطق پر اتر آئی اور علمی منطق مسلسل پند تقریریں قرار پا گئیں۔

امریکن شاعری انگلستان کے متوسط درجے کے شاعروں کی نقالی تھی۔ ابھی تک جتنی بھی نظمیں لکھی گئی تھیں ان کی تاریخی اہمیت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو مگر وہ حقیقی آرٹ کے معیار سے بالکل گری ہوئی تھیں۔ گیت بیلڈ Ballad میں زیادہ تر شاعر ذاتی جذبات و احساسات کی بجائے عوام کے تاثرات و حسیات کا احترام کرتا تھا۔ اس لحاظ سے امریکن شاعری ایک طرح سے پرویگنڈے کا کام انجام دے رہی تھی۔ اور رفتہ رفتہ آزادی کا جذبہ ایک زبردست انقلاب کی صورت اختیار کر رہا تھا۔

## انقلابی دور

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے شاعری میں مذہبی عقائد اور موضوعات کے سوا جمہوریت پسندی اور عوام الناس کے حقوق، مطالبات اور احساسات کو دخل ہو گیا۔ معبد ہو اب تک معاشرتی اور سیاسی زندگی کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ اپنا خود پسندانہ اقتدار کھو رہے تھے۔ مذہبی لڑائیوں کی جگہ کی اور پولیٹیکل تنازعات نے لے لی تھی۔ لوگ ملوکیت اور "ظل الٰہی بادشاہ" کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ ان کے دلوں میں آزادی کا احترام تھا وہ آزاد رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ملوکیت کے جابرانہ قید و بند سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ مختصراً نئی دنیا، فلسفہ اور مذہبیات کے میدان سے ہٹ کر شاعری کے دشوار گزار میدانوں میں آرہی تھی۔ اس زمانے کے شعرا کا کلام اس تغیر کا آئینہ دار ہے۔

فریناؤ Freneau پہلا امریکی شاعر تھا جس نے فطرتی شاعری کی ابتدا کی۔ شاعری کی یہ صنف شاعر کے داخلی واقعات اور قلبی احساسات اور جذبات کا عکس ہوتی ہے ساتھ ساتھ اسے عوام کے حسیات کا بھی احترام کرنا پڑتا ہے۔ اس نے موضوعات شاعری کو یکسر بدل دیا اور مروجہ تمثیلی فضا کو چھوڑ کر مقامی مناظر سے شاعری کی دنیا کو رنگین اور دلفریب بنانا شروع کیا۔ فرینو نے تبدیل ماحول اور غیر ملکی شاعرانہ چیزوں کو چھوڑ کر ملکی چیزوں کو لازمۂ شاعری قرار دیا۔ در حقیقت اس نے فطرت کی نقاب کشائی کی اور امریکہ کے ان چھوٹے چھوٹے شاعرانہ پھولوں اور پرندوں کی تعریف کی جنہیں ابھی تک کسی شاعر نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ فرینو نے امریکن شاعری کو ایک نئے قالب میں ڈھالا اور ساتھ ہی ساتھ دیسی یا ملکی شاعری کی بھی داد دی۔ اس نے شاعری کو تصنع اور آورد سے پاک کیا۔ پرشکوہ الفاظ کی جگہ نرم، سادہ اور سہل الفاظ استعمال کئے اور کلام میں زور، جوش اور روانی پیدا کر دی۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں شاعروں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس کے نزدیک "انقلاب" دیوانگی اور پاگل پن کا نام تھا۔ یہ انگریزی ادب اور تمدن کے قائل تھے۔ اسلئے انہوں نے پھر ابتدائی انگریزی کلچر کو رواج دینا چاہا۔ طنز Satire اس گروہ کا زبردست آلہ تھا۔ شاعروں کا یہ گروہ

connecticut — wits کے نام سے مشہور ہے۔ امریکی شاعری کی تاریخ میں یہی وہ زمانہ ہے جب سے "طنزیات و مضحکات" کو ترقی ہوئی۔ اس صنف نے اس قدر ترقی کی کہ آج امریکہ اپنی طنزیات اور مضحکات پر ناز کرتے ہیں۔ اس گروہ کی نمایاں شخصیتیں، ٹموتھی ڈوائٹ، جان ٹرمبل، جوئل بارلو، ڈیوڈ ہمفری اور ساپکن ہیں۔ اول الذکر ٹموتھی ڈوائٹ، ٹرمبل اور بارلو گو اس دور کے معمولی شاعر ہیں مگر بہت مشہور ہیں۔ ہمفری اور ہاپکن کو شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ حالانکہ وہ فطری اور فن کار شاعر تھے۔ اول الذکر میں آرٹ اور رباعی فلسفہ کا حامل تھا۔ بارلو امریکی فلسفہ کے باوا آدم، پین Paine سے متاثر ہو کر آزادی پسند اور کشادہ دل ہو گیا۔ اس نے "جمہوریت" اور "بنی آدم" کے حقوق پر زور دیا۔ اور ایک رزمیہ نظم لکھ کر امریکی قوم کے دلوں میں "قومی آزادی" کی آگ روشن کر دی اس نے موجودہ ملکی حکومت کی چیرہ دستیوں اور زیادتیوں سے امریکن قوم کو آگاہ کیا اور انہیں بتایا کہ جب تک وہ غلامی کے تار و پود کو توڑ کر نہ پھینک دیں وہ کسی طرح انسان کہلانے کے مستحق نہیں۔ وہ مجبور ہیں۔ اپنے دل کی خوشی کے مطابق وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر کہ ہمارا ہر فعل ایک غیر قوم کے احکام کا دست نگر رہے۔ اس نے بتایا کہ جب تک ایک فیصلہ کن جنگ نہیں ہو گی ہم کبھی ترقی اور آزادی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی اس طنز آمیز باتوں نے لوگوں کے دلوں میں چرکے لگا دیئے۔ اور امریکن اندر ہی اندر اپنی غلامانہ فطرت اور کم ہمتی سے جلنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دبی ہوئی چنگاری ایک عالمگیر آگ ہو کر تمام ملک پر چھا گئی۔ بہت جلد انقلاب کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے امریکہ میں جمہوری حکومت کی بنیاد قائم ہو گئی۔

**دورِ جمہوریت** نقادانِ فن شاعری اور محققین کو بڑی حیرت ہے کہ انقلابی جنگ سے شعر و شاعری میں کوئی خاص تبدیلی اور ترقی رونما نہیں ہوئی۔ انیسویں صدی سے امریکہ کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن ۱۸۱۲ء سے لیکر جنگ کے اختتام تک کوئی غیر معمولی بات ظہور میں نہیں آئی۔ مگر نو آبادیات کی توسیع شروع ہوئی۔ اور امریکن قوم میں بیداری کی لہر پیدا ہو گئی۔ اور آبادی نصف صدی کے اندر ہی اندر سات لاکھ سے تیس لاکھ ہو گئی۔ اس توسیع و ترقی سے جذبات آزادی۔ ملکی اور قومی ہمدردی اور بھی استوار ہو گئی۔ آبادی کی افزائش اور تنوع سے غیر مزروعہ زمین کاشت میں آئی اور متواتر مسلسل کاوش و کاوش سے ایک جاہل اور غیر مہذب قوم ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوئی۔ چونکہ قوم کی صحت اور جسمانی حالت اچھی تھی۔ اسلئے ترقی نہایت سرعت کے ساتھ ظہور میں آئی۔ لیکن پھر بھی ان

کے جذبات و احساسات میں اتنی بالیدگی اور لطافت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ کہ وہ انہیں حسن و خوبی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ حالانکہ ان مظلوم قوموں نے ابھی تک نمایاں چمک نہیں پیدا کی تھی۔ لیکن ان کے دلوں میں وہ جوش پنہاں تھا جس کی تابش جہاں تاب دنیا والوں کی نظریں خیرہ کر دینے والی تھی۔ آبادی کے بڑھتے ہی تعلیم کی ناگزیر ضرورت محسوس ہوئی۔ اسکول کالج، کتب خانے، عجائب گھر اور ناچ گھر کھل گئے۔ اور کم و بیش تیس مشہور اور معیاری رسائل اور جرائد کا اجرا ہوا۔ گاڈے کی "لیڈیز بک" جو ستر برس تک اپنے ادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ اسی زمانے کی پیداکی ہوئی چیز ہے۔ اس میں صرف عورتوں کی تفریح طبع کے لئے عشقانی نظمیں اور امور خانہ داری کی کار آمد باتیں ہی نہیں بلکہ امریکہ کے مشہور شاعر لانگ فیلو، ہالمز Holmes اور برائنٹ کی منظومات اور تصانیف بھی شامل اشاعت ہوتی تھیں۔ شاعری سے بھی فرو گذاشت نہیں کی گئی۔ ۱۸۵۰ء تک مختلف شعرا کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ عنوانات اور موضوعات شاعری "محبت کے پھول" "بہائم کے ساتھ ہمدردی" "گمشدہ النغمات" ہو گئے تھے۔ ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کسانی گیت بھی سادہ گھر کے کار آمد نمازیں ادبی ذوق رکھنے والوں کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ گریسولڈ کی کتاب "Poets & Poetry of America" امریکہ کے شاعر اور شاعری، شاعری کی اس صنف کی حامل ہے۔ گریسولڈ کی دوسری کتاب Gems From The American Female Poetry نے کیرولین مے Caroline May کو "امریکہ کی شاعرات" تالیف کرنے پر اکسایا اور یوں شاعری کی دنیا میں بہترین کتاب کا اضافہ ہوا۔ یہ ادبی ذوق بدستور قائم رہا۔ اور ۱۸۶۰ء تک لوگ نظم انتہائی سہولت اور آسانی کے ساتھ سمجھنے لگے۔ لانگ فیلو نے منظوم سفرنامے لکھ کر شعر جس کا متنوع ہونا مستحسن ہے کو اور وسعت بخشی۔ لانگ فیلو نے "مقامی شاعری" پر کم و بیش تیس جلدوں کا اضافہ کیا۔

شاعری میں اب تنوع اور وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ شاعر یورپ کے شعرا کی طرح سحر کار اور چابک دست مصور نہیں تھے۔ مگر پھر بھی انہیں نئے موضوعات شاعری مل جانے سے ادبی شاہکار پیش کرنے کے لئے کافی امداد ملی۔ امریکہ میں تصنع اور بناوٹ کے نقائص دیکھنے کی نظریں پیدا ہو چلی تھیں۔ چونکہ شاعر اپنے کلام کو حتی الامکان اصلیت کے موافق اور فطرت کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اپنے کلام میں اثر اور جوش پیدا کرنے کے لئے کلام کو زیادہ سے زیادہ صاف فطری، سچا بناتے اور رنگ آمیزی آورد اور غیر فطری واقعات سے گریز کرتے تھے۔

**پیوریٹن شعرا** پیوریٹن شعرا کے زمانے میں مذہبی اور فلسفیانہ شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ اور شاعری تبلیغ مذہب اور معرفت نفس کا ذریعہ ہو کر رہ گئی۔ رفتہ رفتہ اس دور کے متاخرین نے بدعت کی بجائے غنائی شاعری کو اپنا موضوع بنالیا اور شاعری کی اس صنف کو بہت فروغ بخشا۔ ان کا کلام متقدمین کی طرح مذہبی رنگ میں رنگا ہوا نہیں ہوتا تھا مگر پھر بھی ان کے کلام میں مذہبی تاثرات کا جز شامل ہے۔ انہوں نے مذہبی خواب دیکھنے اور اصولوں کی بحث چھوڑ کر اپنی قوم کی زندگی بنانے اور بہبودی اور فلاح کے ذرائع نکالنے میں صرف کرنا شروع کر دی۔ انہیں خیالات سے معمور ہو کر برائنٹ Bryant نے "رعنائی کی پرواز" میں انسانی ترقی کا خواب دیکھا۔ ہالمز Holmes نے "ناٹکول" کی خوشبو اور نازک پتیوں میں معرفت کا راز پایا اور "ناموس گھونگھے" کے خانوں کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہم گھونگھے کے خانوں کی طرح اپنی روح کی لطافت اور پاکیزگی سے عالیشان محل بنا کر تیار کر سکتے ہیں۔ لانگ فیلو کی بے قرار روح کو زندگی کا راز معلوم کر کے سکون حاصل ہوا۔ اور اس نے دنیا والوں کو بتایا کہ "ہماری قسمت کی تکمیل زندگی کی دھکتی ہوئی بھٹی پر ہوتی ہے" یہ شاعر دنیا کی ہر شے سے ایک مشفقانہ نصیحت، ایک ابدی سبق حاصل کرتے تھے۔

اگرچہ اب امریکن شاعری کافی متنوع اور وسیع ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی بقول علامہ اقبال مرحوم

شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

چنانچہ ابھی اس میں کچھ خامیاں تھیں۔ کچھ خلا باقی رہ گئے تھے۔ جن کو پر کرنے کے لئے کسی بہت بڑے شاعر کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک کسان کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا بڑھا اور

باقی بر صفحہ ۱۲۴

# افسانۂ محبت

از جناب خلیق برہان پوری

تری فطرت کو ذوقِ حسن و الفت بخشنے والے
دلِ افسردہ کو سوزِ محبت بخشنے والے
کبھی تو نے دیا تھا عشق کا پیغام آنکھوں سے
پلایا تھا شرابِ زندگی کا جام آنکھوں سے
وہ میرا مستیوں میں دفعتاً سرشار ہو جانا
وہ میری حسرتِ خوابیدہ کا بیدار ہو جانا
وہ عہدِ جاں فزا وہ نوجوانی کی حسیں راتیں
حسیں راتوں کے سناٹے میں وہ رنگیں ملاقاتیں
یقیناً یاد ہوگی تجھ کو اس رنگیں زمانے کی
ہوئی تھی ابتدا جس میں محبت کے فسانے کی
شرابِ عشق پیکر کیف سے سرشار تھے دونوں
مگر اپنے فرائض میں بہت ہشیار تھے دونوں
گذرتے تھے بصد آرام سے دن زندگانی کے
نہ کوئی واسطہ تھا انقلابِ آسمانی سے
محبت کی ضیا آنکھوں سے دل میں کارفرما تھی
لبوں پر زمزمے تھے شادماں دل کی تمنا تھی
یکایک تو نے رشتے قطع کر ڈالے محبت کے
بھلائے اپنے دل سے عہد و پیماں میری الفت کے
مری دنیائے الفت میں اک ایسا انقلاب آیا
بدل کر رکھ دیا جس نے نظامِ زندگی میرا
سکوں ناآشنا یکسر طبیعت ہو گئی میری
غم و آلام کی خوگر طبیعت ہو گئی میری
نہیں میرے لئے دلچسپیاں دنیائے فانی میں
جوانی کی امنگیں مٹ گئیں عہدِ جوانی میں
مرے موجودہ حالِ زار کی تجھ کو خبر بھی ہے
شکارِ نامرادی ہجر میں دل بھی جگر بھی ہے
یہ حالت ہے کہ آٹھوں پہر خاموش رہتا ہوں
ہر اک ناقابلِ برداشت صدمہ دل پہ سہتا ہوں
یہ سب تیرے تغافل کی ہی ظالم کارفرمائی
خدا جانے تجھے میری محبت کیوں نہ راس آئی
محبت میں اگر ایسے ہی وفا ایسا ہی کرنا تھا
تو اے پیماں شکن دم میری چاہت کا نہ بھرنا تھا
نہ دینا تھا امید افزا کوئی پیغام آنکھوں سے
نہ لینا تھا اصولِ عاشقی کا کام آنکھوں سے
یہ بہتر تھا جہاں میں مجھ سے تو ناآشنا ہوتا
مجھے میرے اپنے حال پر رہنے دیا ہوتا
مگر افسوس ہو کر دوست کر لی دشمنی تو نے
محبت میں بنا دی تلخ میری زندگی تو نے
مرا دل آج بھی تیری ہی الفت کا ہے دیوانہ
کہ سوزِ عشق سے ہوتا نہیں کم ذوقِ پروانہ
جو تو چاہے تو پھر تجدید ہو جائے محبت کی
عیاں شامِ الم سے ہو ضیا صبحِ مسرت کی

# میری محبت تیری جوانی

از جناب واحد قریشی واڈیا موہی نون

(۱)

نتیجہ ہے یہ میری بیخودی کا | کرشمہ ہے یہ تیری دلبری کا
اِدھر بدنام ہے میری محبت،
اُدھر مشہور ہے تیری جوانی

(۲)

یہاں بربادیوں کا آسرا ہے | وہاں شانِ خدا جلوہ نما ہے
اِدھر ناکام ہے میری محبت
اُدھر مغرور ہے تیری جوانی

(۳)

بقدرِ ظرف دونوں ہیں شرابی | مگر فطرت کی ہے یہ بے نیازی
شہیدِ جام ہے میری محبت
نشے میں چور ہے تیری جوانی

(۴)

حقیقت ڈھونڈنے آتی ہے اِس کو | قیامت پوچھنے آتی ہے اُس کو
بہت گمنام ہے میری محبت،
بہت مشہور ہے تیری جوانی

(۵)

چل آ بیہوشیوں کا لطف اُٹھائیں | چل آ بیہوشیوں میں ڈوب جائیں
درخشاں جام ہے میری محبت
شرابِ نور ہے تیری جوانی،

(۶)

فرشتے ڈھونڈتے رہتے ہیں اِس کو | ستارے جھانکتے رہتے ہیں اُس کو
ابھی گمنام ہے میری محبت
ابھی مستور ہے تیری جوانی،

(۷)

سُن او پردہ نشینِ کعبۂ دل | وہاں شوقِ فراواں کی ہے منزل
جہاں مختار ہے میری محبت
جہاں مجبور ہے تیری جوانی

نسائیات

# انگلستان کا نسوانی جیل

از جناب قمر الدین صاحب

ہندوستان اور انگلستان کے جیل خانوں میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ جس طرح انگلستان ہندوستان سے تمدن و معاشرت، دولت و ثروت اور تعیش و تکلف میں ہندوستان سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح اس کے جیل خانے بھی ہندوستانی جیل خانوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور آرام دہ ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ انگلستان کے جیل خانوں میں عیش و راحت کے جو سامان و لوازم فراہم رہتے ہیں وہ متوسط طبقے کے ہندوستانیوں کو اپنے گھروں میں بھی میسر نہیں ہیں۔

انگلستان کے ایک نسوانی جیل کے کوائف و تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔ اس جیل کا نام ہولو وے ہے جس میں دو برس تک کی سزا یافتہ عورتیں رکھی جاتی ہیں۔ جیل کی بیرونی عمارت کے دیکھنے سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ جیل خانہ ہے۔ بلند فصیل کے اندر صاف ستھرا اور سرسبز میدان ہے۔ قطار اندر قطار کمرے ہیں جن کے سامنے لمبے چوڑے برآمدے بنے ہوئے ہیں۔

کوئی نئی قیدی عورت جیل میں داخل ہوتی ہے تو اس کا ڈاکٹری معائنہ ہوتا ہے اور ڈاکٹر کی رائے کے مطابق اسے کام دیا جاتا ہے۔ اگر عورت پہلی دفعہ کی مجرم ہوتی ہے تو اس کے ساتھ خاص رعایت برتی جاتی ہے۔ اور اسے "اسٹار کلاس" میں رکھا جاتا ہے۔ جو عورتیں اس کلاس میں رکھی جاتی ہیں انہیں جیل کے بڑے کمرے میں کھانے کا موقع دیا جاتا ہے۔ وہ بھورے رنگ کی بجائے سبز رنگ کی فراک پہنتی ہیں۔ لڑکیوں، جوان عورتوں اور بوڑھیوں کے رہنے کے علیحدہ علیحدہ انتظامات ہیں۔ عصمت فروش اور چور عورتوں کو ان سب سے علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ مختلف عمر اور مختلف نوعیت کی عورتوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں اور جوان عورتوں پر جرائم پیشہ اور بد اخلاق عورتوں کا اثر نہ پڑے۔

جیل میں داخل ہونے کے بعد قیدی عورتوں کے ذاتی کپڑے اتروا لئے جاتے ہیں اور انہیں دھلوا کر حفاظت سے ایک بکس میں رکھ دیا جاتا ہے رہائی کے بعد یہ کپڑے پھر واپس دے دیئے جاتے ہیں۔

قیدیوں کے کمروں کی دیواریں خوبصورت رنگوں سے رنگی ہوتی ہیں۔ ایک کونے میں منہ دھونے کے برتن ہوتے ہیں اور پاس ہی کنگھی اور آئینہ بھی رکھا رہتا ہے۔ سونے کے لئے اسپرنگ دار پلنگ گدا اور تکیہ وغیرہ ملتا ہے۔ کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی رہتی ہے جس سے سورج کی روشنی آتی رہتی ہے۔ عورتوں کے جیل میں آنے کا رنج و غم کچھ کم ہوتا ہے تو وہ اپنے کمرے کو آراستہ کرتی ہیں اور دیواروں کو تصویروں وغیرہ سے سجاتی ہیں۔

جیل کی عورتوں کو صبح چھ بجکر دس منٹ پر اٹھنا ہوتا ہے اور ۲۵ منٹ کے اندر ہاتھ منہ دھو کر کپڑے وغیرہ پہن لینے پڑتے ہیں اور پھر مقررہ کام کی انجام دہی کے لئے روانہ ہو جانا پڑتا ہے۔

اگر عورت کچھ پڑھی لکھی ہوتی ہے تو اسے جیل کی لائبریری یا ہسپتال میں کام کرنا ہوتا ہے اگر وہ سینے پرونے سے واقف ہوتی ہے تو اسے جیل کی عورتوں کے کپڑوں کی مرمت کا کام دیا جاتا ہے۔ عورتیں کھانے پکانے کے کام کر سکتی ہیں وہ اس کام پر مقرر کی جاتی ہیں۔ کچھ عورتوں سے کپڑوں کی صفائی کا کام لیا جاتا ہے۔ کچھ عورتیں باغبانی کے کام کرتی ہیں۔ غرض ہر عورت کو اپنی لیاقت اور اہلیت کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔

سات بجکر ۲۵ منٹ پر قیدی عورتیں ناشتے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں واپس چلی آتی ہیں ناشتے میں چائے، دودھ، شکر، روٹی، پاؤ چھٹانک کی کھیر اور مارجرین (ایک قسم کا مکھن) دیا جاتا ہے۔ ناشتے کے بعد ساڑھے آٹھ بجے تک وہ اپنے کمرے میں کام کرتی ہیں۔ پھر عبادت کیلئے

کوچے میں چلی جاتی ہیں۔ کھیت سے واپس آکر ایک گھنٹے تک ورزش کرنی پڑتی ہے۔ ورزش کرنے کے لئے ایک پُر فضا اور خوش منظر باغ ہے۔ ورزش کے دوران میں بات چیت کرنے کی شدید ممانعت ہے۔ خاص ضرورت کی حالت میں آنکھ کے اشاروں سے کام لیا جا سکتا ہے۔

رفتہ رفتہ عورتوں کی وحشت دور ہو جاتی ہے اور وہ جیل میں رہنے کی خوگر ہو جاتی ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے اُنس ہو جاتا ہے اور وہ آپس میں مل جل کر خوش اور بشاش رہنے لگتی ہیں۔ اب وہ اپنے بالوں کو بھی طرح طرح کے فیشنوں کے مطابق سنوارنا شروع کر دیتی ہیں۔ انہیں ایک منتظم کی ٹوپی پہننی پڑتی ہے جسے وہ ایک خاص ادا سے لگانے لگتی ہیں۔ بعض عورتیں تو جیل کی اس ٹوپی میں بہت حسین معلوم ہوتی ہیں۔

جیل میں داخل ہونے کے بعد قیدی عورت جیسے چاہے ایک خط بھیج سکتی ہے۔ اس کے بعد دو مہینے تک اسے کسی کو خط لکھنے کی اجازت نہیں۔ دو مہینے پورے ہونے پر وہ کسی ایک شخص سے ملاقات کر سکتی ہے یا ملاقات کی بجائے وہ ادمی کو خط لکھ سکتی ہے۔ ملاقات کے وقت عورت کو ڈرائنگ روم میں لایا جاتا ہے جہاں جیل کا افسر بھی موجود ہوتا ہے۔ اس ملاقات یا خط لکھنے کے ڈیڑھ مہینے بعد وہ پھر کسی سے چاہے ایک ملاقات کر سکتی ہے یا خط لکھ سکتی ہے۔ اس کے بعد اسے ہر مہینے ایک شخص سے ملاقات کرنے یا خط لکھنے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو جیل میں آکر قیدی عورتوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ وہ قیدی عورتوں سے مل کر ان کی آئندہ زندگی کے متعلق مفید معلومات و مشورے بہم پہنچاتے ہیں۔

قیدی عورتوں کے کام کرنے کی جگہ نہایت ہوادار اور صاف ستھری ہوتی ہے جہاں وہ آرام و اطمینان سے کام کر سکتی ہیں۔ کام کے دوران میں بات چیت کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ عورتوں کو دوپہر میں کھانے کی چھٹی ملتی ہے اس وقت کے کھانے میں گوشت ہوتا ہے اور ترکاری ہوتی ہے۔ دوسرے وقت ان عورتوں کو ساڑھے پانچ بجے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ چھ بجے پھر کھانا کھلایا جاتا ہے جس میں مکھن روٹی اور کوکو ہوتی ہے۔ چھ سے ساڑھے چھ بجے تک ان کو اپنے کمرے میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ساڑھے چھ سے ساڑھے سات تک حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور لوکر ی وغیرہ بنانا اور دوسرا دستی کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے کمروں میں واپس آجاتی ہیں۔ آٹھ بجے کمروں کے دروازوں پر تالا لگا دیا جاتا ہے اور نو بجے روشنی گل کر دی جاتی ہے۔

عورتوں کی طبی ضرورت پوری کرنے کے لئے جیل میں لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں بھی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی عورت بچے والی ہوتی ہے اور بچے کی عمر تین سال سے کم ہوتی تو اسے بچے کو ساتھ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ نرسیں ان بچوں کی نگہداشت کرتی ہیں۔ بچوں کے کھیلنے کے لئے ایک خاص کمرہ بھی ہوتا ہے جس میں طرح طرح کے کھلونے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ بچے اپنی ماؤں کے ساتھ کھاتے اور سوتے ہیں۔ ان کے لئے علیحدہ ایک چھوٹا سا پلنگ اور بستر دیا جاتا ہے۔

حاملہ عورتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور وضع حمل کے وقت اسے ہر قسم کی راحت و آسائش مہیا کی جاتی ہیں۔

جیل کے متعلق ایک کمیٹی بھی ہے جس کا مقصد رہا شدہ عورتوں کی امداد و اعانت ہے۔ یہ کمیٹی عورتوں کے لئے ملازمت تلاش کرتی ہے اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں صنعت و دستکاری میں بھی لگوا دیتی ہے۔ تاکہ وہ شریفانہ زندگی سے تنگ آکر پھر جرائم اور بدکاری پر مجبور نہ ہو جائیں۔

## گھریلو علاج

از جناب چودھری رحمداد گجراتی

اس مضمون میں ان چھوٹی چھوٹی اور اچانک ہو جانے والی بیماریوں کے علاج درج کئے جاتے ہیں۔ جن کو اگر عورتیں یاد کر لیں تو انہیں کافی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اور وقتی طور پر وہ ڈاکٹروں، حکیموں کی محتاجی اور فیس کے علاوہ اچانک پریشانی سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔

**دردِ سر** — صندل اور کافور یا افیون اور سونٹھ پیس کر لیپ کریں۔ سر میں کنگھی کریں۔ سر پر روغن کدو یا خشخاش کی مالش کریں۔ وہی ڈال کر نہائیں۔

**کان کا درد** — میٹھے تیل میں لہسن جلا کر یا پیاز کا پانی نیم گرم یا افیون پانی میں حل کر کے نیم گرم پانی یا برانڈی شراب ذرا ڈال لیں۔

**پیٹ کا درد** — نمک سیاہ اور اجوائن ملا کر یا ذرا سی ہینگ یا ست پودینہ ایک رتی کھائیں۔ چار عرق۔ کھاری سوڈا یا جنجر وائن میں مقدار معقول ہر تین چار گھنٹے کے بعد دو چار چمچے پلائیں۔

**دردِ گردہ** — خار خسک ۵ ماشہ، تخم خیارین ۵ ماشہ، تخم خربوزہ ۵ ماشہ۔ سب کو گھوٹ کر چھان کر شربت بزوری سو تولہ میں ملا کر پئیں فوراً آرام ہوگا۔

**آنکھ دکھنا** — نیک ٹوشن ڈالیں یا پھٹکری کو گرم پانی میں حل کر کے اس میں صاف کپڑا بھگو کر دن میں تین چار مرتبہ آنکھ کو دھوئیں اور پر سوت رگڑ کر لیپ کریں۔

**نیند آنا** — سر پر کھمن یا روغن خشخاش کی مالش کریں۔ ذرا سی افیون پانی میں پیس کر کنپٹیوں پر لیپ کریں۔ سونے کا ساگ سرہانے رکھیں۔ بکری کا دودھ پاؤں پر تلووں پر ملیں۔ نیند آجائے گی۔

**قے ہونا** — چھوٹی الائچی چبائیں۔ یا لیموں پر سیاہ مرچ اور نمک چھڑک کر چوسیں۔ یا پودینہ اور الائچی آبال کر گھونٹ گھونٹ پلائیں۔ یا زہر مہرہ خطائی عرق گلاب میں پیس کر دیں۔

**قبض** — رات کو مرتبہ ہلیلہ کھا کر اوپر سے گرم گرم دودھ پی لیں یا گلقند کھائیں۔

**کھانسی** — صرف گوند یا ملٹھی چھیل کر یا رب السوس کا ٹکڑا منہ میں رکھیں۔

**زکام** — بنفشہ پانی میں آبال کر چھان کر بتاشے پر ڈال کر نیم گرم دن میں تین چار مرتبہ

# جامنوں میں سانپ

برسات کی رُت شروع ہوا، آم کے باغ اور لہلہاتے کھیت گاؤں والوں کو اور کیا چاہیئے ایسی آم کے باغ اور جامنوں کے پیڑ اُن کے قلب کو راحت بخشتے ہیں ——— کنورپور کہنے کو تو چھوٹا سا گاؤں ہے مگر برسات کی رُت میں یہ گاؤں سچ مچ جنت نشان بن جاتا ہے اس گاؤں کے چاروں طرف آم کے باغ ہیں دُور دُور سے لوگ آم کھانے اور مول لینے آتے ہیں۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ کنورپور کی مٹی کو دودھ اور شہد میں گوندھ کر بنایا گیا ہے خیر یہ تو لوگوں کا مبالغہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ کنورپور کے آم مٹھاس میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

کنورپور کے بڑے باغ میں لوگ جمع تھے، اُودی گھٹائیں، ہرے بھرے پیڑوں پر سایہ کئے ہوئے تھیں، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی درختوں کے پتّے پانی میں شرابور تھے، اور ڈالیاں پانی سے بوجھل ہو کر نیچے کو جھک گئی تھیں۔ باغ میں درختوں کے آس پاس پانی بھرا ہوا تھا جس میں شاخوں سے ٹپکے ہوئے آم پڑے ہوئے تھے۔ باغ والوں کی تو آج چاندی ہی چاندی تھی، دھڑا دھڑ بکری ہو رہی تھی۔ شوقین لوگ ٹوکرے کے ٹوکرے ذرا سی دیر میں خالی کئے دیتے تھے۔

باغ کی چہل پہل دیکھنے کے قابل تھی خوشی، قہقہے، نغمے، ہنسی، شور، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ساری دُنیا کی خوشی آج یہیں سمٹ آئی ہے مسرت بیفکری کا نام ہے اور اس باغ میں سارے بیفکرے لوگ جمع تھے سو اس باغ میں سیاست اور فلسفہ کے مسائل پر غور کرنے کیلئے نہیں بلکہ خوش ہونے کے لئے آئے تھے۔ لوگوں نے غلطی سے زر و جواہر کے ڈھیروں کو مسرت کا مرکز سمجھ رکھا ہے حالانکہ خوشی، زر و جواہر میں نہیں دل کے اطمینان اور طبیعت کے سکون میں ہے۔ بے فکری اور اطمینان ہو تو پتھریلی زمین نرم و گداز مسہری جیسی ہے اور اطمینان نہ ہو تو پھولوں کی سیج پر آدمی کانٹوں کا بستر سمجھنے لگتا ہے۔

گاؤں کا زمیندار نیچے پلنگ پر بیٹھا آم کھا رہا تھا چند خوشامدی اُس کے آس پاس بیٹھے اِدھر اُدھر کی گپ ہانک رہے تھے۔ زمیندار کی کھاٹ سے بہت قریب جامنوں کے درختوں کی روش تھی۔ اس باغ کی جامنیں مٹھاس اور بڑے پن میں گاؤں کے تمام باغوں کی جامنوں سے بڑھ کر تھیں گاؤں کی عورتیں چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں لئے ہوئے جامنوں کے درختوں کے نیچے گھوم رہی تھیں۔ اُن کے پیروں کے منہ سے گیتوں کے بول نکل رہے تھے جیسے ایک خاص قسم کا نغمہ پیدا ہوتا تھا جسکو سن کر جی میں ایک خاص ... پیدا ہوتی تھی ... ان کے نغموں کا عالم تاثیر ہے تو یہ آوازیں واقعی فردوس بگوش تھیں۔ گاؤں کی بیاہی عورتیں ٹول کے دو وھوتیوں کے گھیرے گھیرے گھونگھٹ نکالے ہوتی تھیں۔ مگر ہر ایک کے گلے پر تھے پانی کی بوندوں سے بھیگ گئے تھے ہاتھوں میں ہری ہری چوڑیاں، کانوں میں بالے اور ہاتھوں پر چاندی کے چھوٹے بھرے ہوئے تھے۔ گویا ان کے جسم سے صحت، تندرستی اور شوخی چھلک رہی تھی۔ رُخساروں اور پیشانیوں پر تیل کے نشان اور بعض کے سینوں پر بھی تیل کے پھول بنے ہوئے تھے۔ یہ عورتیں زرا تکلف، اور جھجک کے ساتھ جامنیں چن رہی تھیں۔ انکھیوں سے گھونگھٹ کو اٹھا کر لوگوں کو دیکھ بھی لیتی تھیں، حجاب اور مسکراہٹ نے مل جل کر انکو جاذب نگاہ بنا دیا تھا۔

گاؤں کی کنواری لڑکیاں نہایت بے باکی کیساتھ جامنیں اُٹھا اُٹھا کر کھا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ جامنوں کے رنگ سے اُودے ہو گئے تھے انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا، ساون کی ہلکی ہلکی پھواروں میں کتنے بھلے معلوم ہوتے تھے! ان میں بعض بہت زیادہ شوخ اور چنچل تھیں، ایک دوسرے پر پانی اُچھالتیں، بدن میں گدگدیاں کرتیں، جامنیں پھینکتیں اس بھاگ دوڑ اور بے احتیاطی کی وجہ سے اکثر کے دوپٹے، سر اور سینے سے ڈھلک کر بہت نیچے ہو جاتے کون کہہ سکتا ہے کہ نظارہ کامیاب تھا یا مجروح ——— !

یہ لڑکیاں ساون کی ملہاریں ایک دوسرے کی لَے میں لَے ملا کر اس تاثیر کیساتھ گاتی تھیں، جیسے یہ سچ مچ آپ بیتی سنا رہی ہیں۔ ٹھنڈی اور نمناک ہواؤں میں انکے میٹھے بول گھل مل کر ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ باغ کا یہ کونہ جنت تھی جہاں حوریں بھی تھیں، بہتی ہوئی نہریں بھی، میٹھے اور خوش ذائقہ پھل بھی، اور نغمہ و شباب کی یکجائی بھی!

جتنی عورتیں اس باغ میں جمع تھیں، اُن سب میں زیادہ چنچل اور حسین پربھو سنار کی لڑکی پاروتی تھی، سانولا رنگ، کتابی چہرہ، کٹورے جیسی آنکھیں، چھریرا بدن، ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہوئی، باتوں میں غضب کا نمک، اور چال میں قیامت کا سوز! پاروتی کے سیاہ اور گھنے بالوں میں پانی کی بوندیں جھل مل کر رہی تھیں۔ لڑکیوں کا جمگھٹا پاروتی کے آس پاس رہتا تھا ——— کس لئے؟ اس کا جواب صرف پاروتی کی نشیلی آنکھیں اور اسکی شوخ و چنچل ادائیں دے سکتی تھیں ——— مقناطیس میں کشش کیوں ہوتی ہے؟ اسکا جواب مقناطیس ہی دے سکتا ہے۔ جذبات کی دُنیا عقل و فہم سے ماورا ہے سائنس ہواؤں کی گرہ کھول کر پانی بنا سکتی ہے مگر دل کی دھڑکن کم نہیں کر سکتی ——— دل کی باتیں نہ پوچھ جائیں، سوگ ... ن کی ہو ...

گاؤں سے زمیندار کی نظر پاروتی پر پڑی، اور وہ بہت دیر تک اُسکی طرف دیکھتا رہا۔ وہ چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گیا، اور خاص انداز میں بولا: ———

"یہ کون لڑکی ہے - - - - - یہ لال لہنگا اور بادامی دوپٹہ جو اوڑھے ہوئے ہے ———"۔

اسکے جواب میں زمیندار کی کھاٹ کے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا: ———

"ٹھاکر جی! یہ ہمارے گاؤں کے پربھو سنار کی لڑکی پاروتی ہے، یہ لڑکی بچپن میں ماں کے مرنے کے بعد اپنے ماموں کے یہاں چلی گئی تھی، اسکو اپنے ماموں کے یہاں سے آئے ہوئے کوئی دو تین مہینے ہوئے ہوں گے"۔

زمیندار خاموشی کیساتھ لڑکی کی طرف دیکھتا رہا پاروتی کی ہر معصوم ادا اس کی ہوسناک نگاہوں کا شکار ہو رہی تھی۔

"کتنی سُندر ہے یہ لڑکی ——— او ہو ہو"
(اپنے قریب بیٹھے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے)

"ہاں! رام سنگھ! تمہیں یہیں بیگھہ زمین جو تنے کیلئے مزید دیدونگا، دیکھو بھئی! لگان وقت پر دیدینا"۔ میں تمہاری اتنی امداد کر سکتا ہوں کہ اپنے بیل تمہارے کام کاج کے لئے بھیجدوں۔ اور ہاں! بوائی کیلئے بیج بھی اُدھار دیدوں گا ——— تو ہاں! یہ پربھو سنار کی لڑکی ہے ———" زمیندار نے کہا۔ "سرکار کی مجھ پر ہمیشہ مہربانی رہی ہے، اور سرکار تو ہمارے خاندانی ہیں۔ ان داتا ہیں، سرکار ہماری امداد نہ کریں گے تو اور کون کرے گا لیکن ٹھاکر جی! میں لگان بیساکھ کی فصل اُٹھانے کے بعد دوں گا، اور یہ کلیان بنیا میرا پیچھا اُٹھائے ہوئے ہے آپ کو میری ضمانت کرنی ہوگی، بیساکھ میں اُسکا روپیہ بھی کہیں نہ کہیں سے ادا کر ہی دوں گا ———
——— رام سنگھ نے خوش ہو کر جواب دیا۔

"ارے بھئی! تم جب چاہے لگان دیدینا تمہیں اتنی بے اطمینانی کیوں ہے۔ اور ہاں کلیان سے میں آج شام ہی کو کہہ دونگا وہ تم سے بیساکھ تک تقاضا (تقاضہ) نہیں کرے گا ——— ہاں ——— !"

"یہ پاروتی بڑی خوبصورت ہے، ایسی آنکھیں تو میں نے آج تک کہیں بھی نہیں ———" زمیندار پاروتی کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"ٹھاکر جی! یہ پربھو سنار کی چھوری (لڑکی) گاؤں کی سب چھوریوں سے زیادہ سُندر ہے، مگر ہے بڑی بگڑی اور ضدی، گاؤں کی سب لڑکیاں اس سے خوش رہتی ہیں" ——— رام سنگھ نے جواب دیا۔

"رام سنگھ تم بڑے سیدھے سادے اور بے وقوف ہو تم کچھ نہیں سمجھے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں میں کیا چاہتا ہوں!

اور تمہیں کیا کرنا چاہیئے تمہیں تو میں بہت سمجھدار سمجھتا تھا۔ مجھے یہ لڑکی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے ——— میں ——— اچھا ——— سمجھ گئے" ——— زمیندار پہلو بدل کر بولا۔

"ٹھاکر جی! تو یہ کہیئے ——— ہاں! (ٹھوڑی کھجاتے ہوئے) یہ کونسی بڑی بات ہے، پربھو سنار تو آجکل بہت تنگ ہے ذرا سے لالچ میں رام کیا جا سکتا ہے سرکار! پیسے میں تو وہ طاقت ہے کہ رانیوں، مہارانیوں کے پلنگ محلوں سے اُتر کر آجائیں، یہ پاروتی کس گنتی میں ہے ——— مگر ہاں! ٹھاکر جی، یہ اپنے گاؤں کی چھوکری ہے زمیندار تو گاؤں کا باپ ہوتا ہے، آپکی بڑی بدنامی ہو جائے گی خوب سمجھ لیجئے، آپکی گاؤں گاؤں بات پھیلتی ہے، ایسا نہ ہو کہ آپکے نام کو بٹہ لگ جائے" ———
——— رام سنگھ نے جواب دیا۔

"کیا بکتے ہو، کیسی بدنامی! پیسہ ہوتا کس لئے ہے، عیش و آرام کیلئے، مزے اُڑانے کیلئے! یہ راجہ اور بادشاہ اور امیر آدمی، جو مزے اُڑاتے ہیں تو کیا انکی بدنامی ہوتی ہے؟ اور لوگوں کے بدنام کرنے سے اُن کا کیا بگڑ جاتا ہے۔ دیکھو! رام سنگھ تم کو یہ کام کرنا ہوگا۔ نہیں تو ———" زمیندار تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے بولا

"نہیں سرکار! میں تو ہنس رہا تھا ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے وہ یہ کہ پربھو سنار کا مکان برسات میں بیٹھ گیا ہے وہ بہت پریشان ہے آپ اُسے اپنی حویلی میں جگہ دیدیجئے، اور تھوڑی سی امداد کر دیں پھر میدان آپ کے ہاتھ ہے ———" رام سنگھ نے مونچھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"بھئی! رام سنگھ کیا ترکیب بتائی ہے تم نے" ——— یہ کہتے ہوئے زمیندار کی نظر پربھو سنار پر پڑی، جو سامنے سے آرہا تھا "پربھو یہاں آؤ، یہاں میرے پاس" ——— زمیندار نے چلا کر کہا

زمیندار کی آواز سن کر پربھو سنار دوڑ کر آگیا۔ "ٹھاکر جی ——— میں آگیا، کہئے کیا حکم ہے" ——— پربھو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"ارے بھئی! سنا ہے کہ تمہارا مکان بیٹھ گیا" ——— زمیندار نے سنجیدہ بن کر جواب دیا۔

"سرکار! کیا بتاؤں، یہ سال میرے لئے بڑی مصیبت کا ہے، مکان میں چوری ہو گئی، لوگوں کے زیور جاتے رہے، جنکا تاوان مجھے بھرنا پڑا ... تھیلو پر دو بھینسیں مر گئیں، اور اب ... مکان گر گیا، میری تو زندگی مصیبت میں ... ہی ہے مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں" پربھو سنار تھلاتی ہوئی زبان میں ...

"ارے! تم کیوں رنج کرتے ہو، جو ہو گیا سو ...

تم میری سہیلی ہی تو بن کر آجاؤ۔ بہرحال اب میں تمہاری دید کا اس میں اطمینان کیسا تم رہو اور اب یہ میرے ہاں سے قلعہ لگا لینا۔ انہی جو کچھ ضرور ہوتا ہو گی یہی نہیں ہو دل کا ___ زمیندار نے مسرت کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

شکریہ! اچھا۔ آپ کا بھلا کرے! میں آج شام ہی کو آپکے یہاں آجاؤنگا ___

اور یہ کہ ___

یہ جو سنا! ابھی بات پوری بات نہ کہہ پایا تھا کہ اسکی لڑکی پاروتی "کا کا کا کا" کہتی ہوئی آنکلی۔ زمیندار نے پاروتی کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر کہا ___

"ہمیں بھی تو جامنیں کھلاؤ، کتنی دیر سے ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں"۔ پاروتی نے جواب دیا۔ "میں ابھی ٹوکرا لے کر آتی ہوں آپ اس میں سے جامنیں چھانٹ لیجئے"۔

پاروتی ٹوکرا لے کر آئی۔ زمیندار تصورات کے نشہ میں چور تھا مستقبل کی رنگین و خوبصورت اسکیم اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ پاروتی نے مسکراتے ہوئے جامنوں سے بھرا ہوا ٹوکرا زمیندار کے پلنگ پر رکھ دیا۔ زمیندار نے لڑکی کو انتہائی ہوسناک نگاہوں سے دیکھا ہوس کی شدت نے اسکے چہرے کو وحشت ناک بنا دیا تھا۔ زمیندار نے جامنوں کے ٹوکرے میں ہاتھ ڈالکر جامنیں ٹٹولنے لگا۔ جامنیں یکایک اوپر کو اٹھنے لگیں اور ایک سیاہ ناگ زمیندار کی انگلی میں منہ مار کر لہرانے لگا۔ زمیندار چیخ مار کر اٹھا اور زمین پر گر پڑا۔ لوگوں نے جلدی سے سانپ کو مار دیا۔ زمیندار کے منہ سے کف جاری تھا اور اسکا بدن اینٹھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

---

# نوادرات

### از جناب ڈاکٹر ایس، ایم مشتاق علی صاحب

۱ - دنیا میں سب سے پہلے پیدائش مسیح سے قبل مصنوعی آنکھیں مصری استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ آنکھیں سونے، چاندی، تانبے اور ہاتھی دانت وغیرہ سے مرصع ہوتی تھیں۔

۲ - ماسکو میں ایک گھنٹہ ہے جس کا وزن ایک ہزار سات سو چھبیس من ہے بائیس فٹ بلند ہے۔ نیچے کا محیط چھیاسی فٹ ہے۔ یہ گھنٹہ دنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ ہے۔

۳ - کازلو امریکہ کے افریقی النسل غلاموں میں سب سے آخری غلام تھا۔ جو امریکہ کے قانون آزادی کی رو سے آزاد کیا گیا۔ کازلو ایک سو پانچ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

۴ - انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "قد کا چھوٹا" اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک بونا تھا جو دو سو برس گزرے کہ جزیرہ ... میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا قد ... سے کچھ بڑا ہوتا تھا ... اور سر دم کے بال ... تھے ... مضبوط اور بہت چھوٹے اور بیکار ہوتے تھے۔ ... طرح اسے ڈھونڈ کر بیکار سے تھے ...

۵ - یورپ کے محققین نے انسانی زندگی کی مدت کو یوں تقسیم کیا ہے جب دیکھا اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ایک انسان اوسط پچہتر سال کی عمر میں تیرہ برس گفتگو میں صرف کرتا ہے۔ اور روزانہ تقریباً اٹھارہ ہزار الفاظ بولتا ہے۔

ان تیرہ سال میں چھ سال کام کی باتوں میں اور دس سال گپ شپ میں صرف کرتا ہے۔ بقیہ دو سال دسترخوان پر باتیں بنانے میں خرچ ہو جاتے ہیں۔

انسانی عمر کے ۲۳ سال بستر خواب پر صرف ہوتے ہیں اور چھ سال کھانے پینے میں اور پانچ سال ... سوچنے میں گزرتا ہے۔ غرضیکہ جس شخص کی عمر ۷۵ سال کی ہو اس کی عمر کے ۲۴ سال صرف باتیں کرنے، سونے، کھانے اور سوچنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔

۶ - یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ ایک سقے نے کیونکر اپنی مشک کے سہارے ہمایوں بادشاہ کی ایک ایسے نازک موقع پر جان بچائی جب وہ شیر شاہ کے حملوں سے بھاگ کر دریا میں کود پڑا تھا۔ لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ مشک بنتی کیونکر ہے۔ آپ نے مشک بھیڑ اور بیل کی کھال سے بنتی ہے۔ لیکن ایک ... بکری ... کی کھال ... سے ... اس شکل کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ ... سالم ... نکالی جاتی ہے ... کھال کی ... کر ... جاتا ہے ... دیا جاتا ہے ... گوشت ... کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس عمل کے بعد ... کھال کو آسانی کے ساتھ اس کے جسم سے جدا کر کے اور گلا کر مشک کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔

---

## گھریلو علاج بقیہ صفحہ ۱۴۰

پیٹ ۔ زکام ایک دن میں جاتا رہے گا۔

**چوٹ لگنا** گرم گرم ... میں ۱۶ ... ڈال کر پائیں یا دو ذبیں ... پھٹکری ... پیس کر ... میں حل کر کے ... چوٹ کی جگہ پر ... لگائیں۔

**پیٹ یا گرمی دانے** ملتانی مٹی پانی یا تیل میں ملا کر بدن پر ملیں۔

---

**خیام کی خریداری اردو کی خدمت ہے**

# دنیائے اسلام کا سیاسی مستقبل

بقیہ صفحہ ۱۶

ترکی و یورپ کے درمیان جدید تعلق ہے دوسری جانب مجموعہ عربیہ جس کی وساطت سے ترکی کا دامن عربی و افریقی اسلامی دنیا سے وابستہ ہے۔

جدید ترکی کا آغاز کیونکہ قارئین کرام کے سامنے ہے۔ یہ سب واقعات قریب کی باتیں ہیں جن کے اظہار یا اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاہم تعلیقی غرض سے غایت درجہ اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۲ء کے اوائل میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی شمشیر جگر شکن نے یونانی و اتحادی اقتدار کا خاتمہ کر کے ترکی کے سرحدی جم پر آزادی شجاعت کی گلپوشی کی۔ ۱۹۲۳ء میں لوزان کانفرنس میں ترکی کی آزادی تامہ کا اعتراف کیا گیا۔ اسی برس ۳ مارچ کو خلافت کا خاتمہ ہوا۔ جولائی ۱۹۲۵ء کو فیض (ترکش کیپ) کا استعمال قانوناً ممنوع قرار دیا گیا۔ اسی برس قدامت پسند اور جہالت کیش "درویشوں" اور "صوفیوں" کے اڈے بند کئے گئے اور مغربی تہذیب و رواج کو مقبول بنانے کی کوشش شروع ہوئی۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں یورپی لباس پہننے اور مذہبی شعائر کو کھلانے والی بدعتیں بند کرنے کا قانون نافذ کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء کو لاطینی رسم الخط رواج پذیر ہوئی اور اسی برس روس سے سیاسی و تجارتی معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں یونان سے معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں میثاق بلقان عالم وجود میں لایا گیا اور اسی برس جمہوریہ ترکیہ جمعیت اقوام کے حلقہ رکنیت میں داخل ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں میثاق سعدآباد کی مباحث پر گفتگو شروع ہوئی جو ۱۹۳۷ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی اب یہ میثاق عمل پذیر ہوتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ترکوں کو درہ دانیال پر قلعہ بندی کی اجازت مل گئی۔

## مسئلہ اسکندرونہ

اسکندرونہ کی ترک آبادی پر فرانسیسی حکام کا تشدد ۱۹۳۰ء سے جاری تھا جس سے متاثر ہو کر اتاترک مرحوم نے ۱۹۳۶ء کو اس بندرگاہ کی سرحد پر فوجیں جمع کر دیں لیکن غازی عصمت انونو نے غازی مرحوم سے کہا کہ یہ حرکت جمہوریہ سے اجازت حاصل کئے بغیر ہوئی ہے اسلئے نامنظور ہے۔ غازی مرحوم نے یہ قانونی اعتراض قبول تو کر لیا لیکن عصمت انونو کو اختلاف کے باعث مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا اس کے بعد مسئلہ اسکندرونہ کو جمعیت الاقوام میں لایا گیا جہاں اس بندرگاہ پر ترکی و فرانس کا مشترکہ تسلط منظور کر لیا گیا لیکن ترک حکام اپنی قابلیت اور اثر و رسوخ کے باعث اس درجہ کامیاب ثابت ہوئے کہ فرانسیسی حکام کو دوہرا طریق سے کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ موجودہ جنگ کے اندیشہ کے باعث فرانس ترکی کی دوستی خریدنے پر مجبور تھا کیونکہ ترک یورپ کے دروازہ میں اور جب تک دروازے کے مالک خوش نہ ہوں اندرونی آبادی اطمینان سے بسر نہیں کر سکتی اسلئے فرانس نے اسکندرونہ کو مکمل طور پر ترکوں کے حوالے کر دیا اور ۱۹۳۹ء میں اس بندرگاہ پر ترکی کا پرچم لہرانے لگا۔

## موجودہ جنگ میں دنیائے اسلام کی شرکت

ترکی نے چونکہ موجودہ جنگ میں برطانیہ کی حمایت و معاونت کا اعلان کر دیا ہے۔ اسلئے ساری اسلامی دنیا کو شامل جنگ سمجھنا چاہئے کیونکہ اسلامیان عالم کی فوجی و حربی پالیسی کی رہنمائی ترکی کرتا ہے اسلئے جس جنگ میں ترکی شامل ہو گا دنیا بھر کے مسلمان اس میں شرکت کرنے پر مجبور ہیں۔ اس دعویٰ کی تصدیق میثاق سعدآباد سے ہوتی ہے جسے ترکی، ایران، عراق اور افغانستان کے علاوہ شام و حجاز بھی قبول کر چکے ہیں چونکہ اس معاہدہ کی رو سے تمام اسلامی فوجیں ترکی کے ماتحت رہیں گی تمام اسلامی ممالک میں سے کسی ملک کو جنگ سے علیحدہ سمجھنا واقعات و دلائل کے خلاف ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترکی نے برطانیہ کی حمایت کیوں کی؟ جو لوگ سیاسیات کے اس اصول سے واقف ہیں کہ "کل کا دشمن آج کا دلی دوست" ان کے سامنے کسی دلیل کا اظہار دوپہر کے سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے لیکن جو حضرات جدید سیاست کے رموز و اسرار سے پوری طرح واقفیت حاصل نہیں کر سکے ان کے لئے یہ حقیقت بیان کرنا ضروری ہے کہ اگر ترکی جنگ میں شامل نہ ہوتا تو یہ خلاف مصلحت بہت بڑے جرم کا ارتکاب کرتا۔ اور اگر شامل ہو کر جمہوریت کا ساتھ نہ دیتا تو اس کے متوقع مفاد اور کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنے کے عزائم شاندار مستقبل سے محروم ہو جاتے۔

(۱) ترکی تازہ معاہدہ کے باعث جمہوری محاذ میں شامل ہو چکا ہے چونکہ ترکی کا سیاسی مذہب بھی جمہوریت ہے اس لئے وہ اعتقادی طور پر جمہوریت پرستوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہے۔

(۲) میثاق بلقان کے باعث ترکی بلقانی ریاستوں کی حفاظت کا ذمہ لے چکا ہے اور وہ حکومتیں جو بلقانی ریاستوں کو تاراج کرنے کا عزم کر چکی ہیں یا شروع کر رکھا ہے وہ جرمنی اور اطالیہ ہیں اس لئے ترکی ان حکومتوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہے جو مخالفین بلقان سے برسر جنگ ہو رہی ہیں۔

(۳) اسلامی دنیا کی سیاست کا بہت بڑا حصہ برطانیہ و فرانس سے وابستہ ہے اسلئے ترکی اگر موجودہ جنگ میں فرانس و برطانیہ کا حامی رہا تو وہ دوستانہ اثر و رسوخ سے دونوں حکومتوں کو اسلامی سیاسیات کی بہتری کیلئے مائل کر سکے گا۔

(۴) ترکی کے بحری محل وقوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے ایک طرف بحیرۂ روم ہے دوسری طرف بحیرۂ اسود۔ بحیرۂ روم کے سواحل پر جو ترکی کے بالمقابل ہیں وہ حکومتیں ہیں جو فرانس و برطانیہ کے زیر اثر ہیں اور بحیرۂ اسود کے ساحل پر روس ہے گویا دونوں طرف یا جمہوری حکومت ہے یا جمہوری حکومتوں کے دوست ہیں۔ اس اعتبار سے اگر ترکی برطانیہ کا ساتھ نہ دیتا تو بحری بلاؤں کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیتیں۔

(۵) اسکندرونہ کی واپسی سے یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہے کہ جمہوری حکومتیں ترکی کو دوستی کی مناسب قیمت ادا کرنے پر تیار ہیں۔ اگر فرانس نے ترکی کی محبت پر اسکندرونہ کا تسلط قربان کر دیا ہے تو کیا برطانیہ اس کی دوستی کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی کا اظہار نہ کریگا؟ اس سوال کا جواب میری توقعات فلسطین اور شرق اردن کی صورتوں میں ڈھونڈ رہی ہیں۔

ان حقائق میں نہ صرف ترکی کا موجودہ رویہ حق بجانب اور دانشمندانہ ثابت ہوتا ہے بلکہ اسلامی دنیا کا مستقبل بھی اطمینان بخش نظر آتا ہے کیونکہ ترکی کی رہنمائی میں تمام اسلامی ممالک ترقی و فلاح سے ہم آغوش ہو سکتے ہیں۔

## آئینۂ مستقبل

اس مقالہ کے تمام حصوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسلامی دنیا پر جب مستقبل قریب کی عینک سے نظر ڈالی جائے تو اس کی سیاسی زندگی اطمینان بخش ماحول میں دکھائی دیگی۔ میثاق سعدآباد کے باعث مسلمانوں کے عسکری اجزاء ایک مرکز پر جمع ہو گئے ہیں اور اس مرکزیت کی صدارت ترکی کے حصے میں آئی ہے جو انقلاب کی آغوش میں پل کر جوان ہوا ہے اس لئے مسلمانوں کا یہ اجتماعی اقدام نتیجہ خیز ثابت ہوگا اور اس اتحاد سے ایشیا میں جو اسلامی محاذ تیار ہو چکا ہے وہ سیلاب مغرب کو آسانی کے ساتھ روک سکتا ہے اس سلسلے میں ایک اہم حقیقت بہت زیادہ غور و توجہ کی محتاج ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت فخر مشرق سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے سیاسی وقار کا احیاء جس حکیمانہ طریق پر شروع کیا تھا اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ کسی یورپی حکومت کو مسلمانان عالم کا اس درجہ دوست بنایا جائے کہ وہ ایک طریق سے اتحاد و اخوت کے اس وسیع دائرہ میں شامل ہو۔ اس اسکیم سے حضرت سید صاحب کے مد نظر یہ حقیقت تھی کہ اسلامی حکومتیں چونکہ کمزور ہیں اور جب وہ اپنی کمزوری کو مؤثر طاقت سے بدلنے کے لئے متحد ہونے لگیں گی تو مغربی حکومتیں جو ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی عادی ہیں باتحاد اخوت کو تکمیل پذیر ہونے سے پہلے اپنی پناہ قوتوں کو اس جوش سے میدان مقابلہ میں لے آئیں گی کہ اسلامی اخوت کے اسباب و محرکات ہی ختم ہو جائیں گے۔ لیکن اسلامی اخوت کے لیڈروں کو اگر کسی مغربی حکومت کی حمایت حاصل ہو گئی تو دوسری غیر اسلامی طاقتیں اسی مغربی حکومت کے احترام کے باعث مخالفانہ اقدام پر آمادہ نہ ہو سکیں گی۔ اس مقصد کے لئے حضرت سید صاحب کبھی برطانیہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے کبھی روس کے دروازے پر دستک دینے گئے اور کبھی فرانس سے گفت و شنید میں مصروف رہے لیکن سید صاحب اس مقصد میں ناکام رہے۔ آپ کا کام چونکہ خلوص اور جوش ایمانی پر مبنی تھا اسلئے قدرت نے چالیس پچاس برس کے بعد نقشہ عالم میں رنگ عمل بھرنے کے سامان مہیا کر دیئے ہیں اور ترکی کا رویہ سید صاحب کے عزم و ارادہ کو زندہ حقیقت بنا رہا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ وحدت عربیہ کا سلسلہ مراکش تک وسیع کریں تاکہ ساری عربی دنیا ایک تحریک کے ماتحت عمل آمادہ ہو سکے لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ تمام عرب ریاستیں خواہ وہ آزاد ہوں یا نیم آزاد متحد ہو کر بھی کسی ایک طاقتور حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اسلئے اول تو طاقتور حکومتیں وحدت عربیہ کا تخیل حقیقت پذیر نہیں ہونے دیں گی اگر یہ نقشہ مرتب بھی ہو جائے تو بھی دولت متحدہ عربیہ اس شیطانی آلات کی دنیا میں اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے امرائے عرب و افریقہ کا فرض ہے کہ وہ ترکی کی سرپرستی حاصل کریں اس سے دو فائدے ہونگے (۱) کوئی مغربی طاقت ترکی کی دوستی کے باعث وحدت عربیہ میں مداخلت نہیں کر سکے گی (۲) جب وحدت عربیہ مکمل ہو جائیگی تو یہ متحدہ حکومت ترکی کی امداد سے جدید طاقتور حکومتوں کے ہم پایہ بننے کے قابل ہوتی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ترک و عرب کا سوال اس تجویز کو قابل عمل نہ ہونے دے لیکن جب عرب دوسروں کا سہارا لئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو انہیں اپنوں کی معاونت سے کیوں اجتناب ہے؟ مستقبل قریب انشاء اللہ عربوں کی اس غلط روش کا بوجود تمام ازالہ کر دے گا اور اسلام کی یہ دونوں جلیل القدر قومیں متحد ہو کر مسلمانوں کا سیاسی مستقبل تعمیر کریں گی کیونکہ کوئی قوم اغیار کے پروپیگنڈا اور فریب انگیزی سے زیادہ دیر تک متاثر نہیں رہ سکتی۔ رہے اسلامیان ہند اور مسلمانان چین و روس اور دوسرے ممالک کے فرزندان توحید تو ان کا فرض ہے کہ اپنی اپنی حکومتوں کو مجبور کریں کہ وہ اپنی اپنی اسلامی رعایا کو میثاق سعدآباد کے مطابق دائرہ اخوت میں شامل ہونے کے قابل بنائیں تاکہ تمام غلام و آزاد مسلمان ایک لڑی میں منسلک ہو جائیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ توقعات پوری ہو کر رہیں گی کیونکہ واقعات کی زبان سے سن رہا ہوں کہ مسلمان اپنی تاریخی عظمت عملی طور پر حاصل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ مضمون چونکہ بہت طویل ہو گیا ہے اور میں

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم

کے مقولہ پر عمل کر رہا تھا اسلئے اب رخصت چاہتا ہوں۔

لاہور ۱۷ ستمبر ۱۹۳۹ء

(اظہر امرتسری)

اے مسلمانوں کی طرف آئیے۔ عربوں کی نجات اسی

ایک دلچسپ تاریخی مقالہ

# پانچویں صدی ہجری کے اسلامی شفاخانے

از جناب مولانا عبدالقیوم صاحب ندوی

عرب کے بدعہ اسلامی فیوض و برکات وابستہ ہوکر دنیا کے ہر چہار جانب پھیل گئے تھے۔ وہ جہاں بھی گئے ایک فاتح اور غالب قوم کی حیثیت سے گئے۔ لیکن اُن کی ان فتوحات میں اقوام مغرب کی طرح ہوس ملک گیری اور جوع الارضی کا جذبہ کارفرما نہ تھا۔ بلکہ ان کا مقصد وحید خدمت خلق اور صرف خدمت خلق تھا۔ اسی لئے انھوں نے اپنے دائرہ حکومت میں ہر جگہ تعلیم و تربیت کے لئے مدرسے کھولے۔ مسافروں اور مہمانوں کے لئے کنوئیں تالاب اور مسافرخانے بنوائے۔ بیماروں اور مریضوں کے لئے بڑے بڑے شفاخانے تعمیر کرائے اور یہ صرف عربوں ہی کے لئے نہیں کیا بلکہ عجمی مسلمان بھی جس جگہ حکمران کی حیثیت سے گئے۔ اسلامی تعلیم و تہذیب کا ہمیشہ خیال رکھا اور ہر حال میں خدمت کا جذبہ غالب رہا۔

پانچویں صدی ہجری کے شروع میں جبکہ اسلامی حکومت کا دائرہ حدود مشرق، مغرب، شمال، جنوب کے اکثر ممالک اور دیار و امصار میں پھیلا ہوا تھا۔ رفاہ عام کے بیشمار امور کے ساتھ ان بڑے شفاخانے اور ہسپتال قائم تھے، جن میں بڑے بڑے حکیم اور جراح علاج کیا کرتے تھے اور نادار مریضوں کے لئے دوا مفت تقسیم کی جاتی تھی۔ نیز مہلک اور خطرناک مریضوں کے لئے رہنے کا بھی انتظام تھا۔ جہاں اُن کو بہترین کھانا دیا جاتا تھا اور اُن کی خدمت کے لئے ہوشیار اور جفاکش خادم نوکر تھے۔ یوں تو بہت سے بڑے بڑے شفاخانے قائم تھے لیکن صرف بعض کا ہم اس جگہ ذکر کرتے ہیں۔

## قرطبہ اور اندلس کے شفاخانے

اندلس میں کم و بیش آٹھ سو برس مسلمانوں کی حکومت رہی ہے۔ جہاں مسلمانوں نے مذہبی قومی اور رفاہ عام امور کے لئے بہت سی شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ آج بھی وہ صنعت اور فن تعمیر کی اعلیٰ مثال کہی جاتی ہیں۔ ان میں قرطبہ کا شفاخانہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ شہر کے مشرق کی جانب دریا کے کنارے مریضوں کیلئے ایک شاندار عمارت بنی تھی۔ جس کو عبدالرحمٰن خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ ایک پرفضا اور بلند مقام پر محل کی شکل میں قائم تھی۔ اس میں مریضوں کے رہنے کے لئے قریباً ۵۰ بلند اور وسیع کمرے تھے۔ اور دواخانہ مریضوں کے دیکھنے وغیرہ کے کمرے جداگانہ تھے۔ اس میں ملک کے قریباً تیس حکما اور متین جراح شب و روز کام کرتے تھے۔ اور ہر قسم کا علاج کیا جاتا تھا۔ شفاخانے کے دروازے ہر قوم اور ہر فرقہ کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ اور اس میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ تھا۔ ہفتہ میں ایک مقررہ دن میں چند گھنٹوں کے لئے شہنشاہ اندلس کا خاص حکیم جو نصرانی تھا آیا کرتا تھا اور علاوہ دیکھ بھال کے اہم اور پیچیدہ مرضوں کا علاج کرتا اور ماتحت حکیموں کو مشورہ دیتا۔ دوائیں انتہائی ہوشیاری اور صفائی سے تیار کی جاتی تھیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کبھی کبھی جب محل خاص کے دواخانہ میں کوئی دوا موجود نہ ہوتی تو یہیں سے منگائی جاتی تھی۔ اس کے اخراجات کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے ایک بڑی جائداد وقف تھی اور قریباً پچاس ہزار روپیہ سالانہ خود بادشاہ اپنی جیب خاص سے دیتے تھے۔ خاص قرطبہ میں اس کے علاوہ اور بھی کئی شفاخانے تھے۔ جو اس شفاخانے کے ماتحت تھے۔ جہاں بعض میں کسی خاص مرض کا اور اکثر میں تمام امراض کا علاج ہوا کرتا تھا۔ اندلس کے اور بھی مرکزی مقامات پر کئی عمدہ اور بہترین شفاخانے قائم تھے۔ جن کی نگرانی حکومت کی طرف سے ہوتی تھی۔ اور اخراجات کا بار بھی اسی کے سر تھا۔ محمد ابن جبیر اندلسی مشہور سیاح اور مورخ جو خلیفہ ابو العباس احمد ناصر الدین عباس خلیفہ بغداد المتوفی ۶۲۲ھ کا ہم عصر تھا۔ اُن کی تعداد اکیس لکھتا ہے۔ جن میں چھوٹے چھوٹے شفاخانے شامل نہیں ہیں۔

## مصر و دمشق اور شام کے شفاخانے

مصر و شام و دمشق اور الجزائر وغیرہ پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ان میں بھی بڑے بڑے شفاخانے قائم تھے۔ جہاں مایوس العلاج مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی سہولتیں اُن کے لئے مہیا تھیں۔ اور اخراجات کے لئے حکومت اور ارکان حکومت کی طرف سے بڑے بڑے وظائف اور جائدادیں وقف تھیں۔ جن سے حکما اور جراحوں کی تنخواہیں، ملازمین کے گذارے۔ مریضوں کی دوائیں اور اُن کے قیام و طعام وغیرہ کے مصارف چلتے تھے۔

مصر کا عظیم الشان شفاخانہ دریائے نیل کے کنارے ایک بلند خوبصورت عمارت کی شکل میں

قائم تھا۔ اس میں مسلمان حکما اور شعرا کے علاوہ عیسائی اور یہودی حکما اور ... بھی تھے۔ اور اس شفاخانہ کا ... خاص تھا کہ ان میں عورتوں کے لئے بھی ایک الگ شعبہ تھا۔ جس میں اکثر لائق ... بھی تھیں اس کے وقف کے ساتھ ... ذیل شرائط تھیں

(۱) ملک کے مشہور اور حاذق حکما ملازم ... کسی مذہب کے ہوں رکھے جائیں گے۔

(۲) ملازمین میں ایک ثلث مسلمانوں کی ضرور ہی ہوگی۔ اور اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔

(۳) دوائیں حتی الامکان مفت تقسیم کی جائیں گی۔ اور بوقت ضرورت قیمت بھی لی جا سکتی ہے۔

(۴) مریضوں کی سہولت کے لئے ہر قسم کے انتظامات کئے جائیں گے۔ اس میں تمام طعام کے مصارف بھی شامل ہوں گے۔

(۵) شفاخانے کے دروازے ہر وقت اور ہر قوم و فرقہ کے لئے کھلے رہیں گے۔

(۶) مریضوں کے ساتھ اُن کے بعض عزیز اعزہ بھی رہ سکیں گے اور اُن کے ضروری مصارف بھی شفاخانہ کے ذمہ ہوں گے۔ وغیرہ

یہ شفاخانہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں تعمیر ہوا۔ اور کئی صدیوں تک قائم رہا۔

## عراق و عرب اور بغداد کے شفاخانے

پانچویں صدی کے وسط اور چھٹی صدی کے شروع میں طبرستان، نیشاپور، زابلستان، موصل، ... وغیرہ۔ یمن اور عراق اور عرب کے دیگر حصوں میں کئی عمدہ شفاخانے کھل چکے تھے۔ یہاں آلہ کی بساط کے مطابق ہر قسم کا علاج کیا جاتا تھا۔ اور حتی الامکان حکومت ان کی امداد اور اعانت میں دریغ نہ کرتی تھی۔ ان میں طبرستان کا بیمارستان، بعد جبرہ کا دار الشفاء خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جو ۵۰۰ھ میں ابی المظفر المستنجد باللہ اوّل کے عہد میں تعمیر ہوئے تھے اور ایک عرصہ تک بڑی شان سے چلتے رہے۔

بغداد۔ عباسیوں کا دار الخلافہ تھا۔ اس میں بہت سے شفاخانے قائم تھے۔ مورخ یاقوت جو چھٹی صدی ہجری کا مورخ ہے ان کی تعداد گیارہ لکھتا ہے جو صرف خاص بغداد میں قائم تھے۔ اور حکومت ان کا اہتمام کرتی تھی۔ ان میں مغربی بغداد کا شفاخانہ جو دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھا خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ ۳۶۰ھ مطابق ۹۷۱ء میں عضد الدولہ جو کہ الطائع خلیفہ بغداد کا وزیر تھا محل خلافت کے کھنڈروں کی جگہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ ایک نہایت عمدہ اور خوبصورت

اور بڑی عمارت تھی جس کو سو سے زیادہ ... کاریگروں نے لاکھ ... تین سال میں مکمل کیا تھا۔ ۵۸۰ھ مطابق ۱۱۸۴ء میں ابن جبیر اندلسی سیاحت کی غرض سے آئے۔ اس وقت تک یہ عمارت موجود تھی۔ وہ اس کے متعلق لکھتا ہے: "بغداد کی عمارتوں میں شفاخانہ عضدیہ بھی ہے۔ اس کی عمارت سے شاہی محل کا شبہ ہوتا ہے۔ اس میں ملک کے بہت سے حذاق حکما کام کرتے ہیں۔ اور پیر و شنبہ اور پنجشنبہ کو شہر کے حکیم خاص طور پر معائنہ اور معالجہ کی غرض سے آتے ہیں۔ ... کرتے بیماروں کے ... ہوتے ہیں۔ بیماروں کو

آکر ... ہوتی ہیں۔ ... اور کھانے ... کے لئے الگ ... ہے ... کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اس ... سے ایران ... اور ... کے ... بندوبست ... کو ... مسلسل ... ہیں ... تھا

بہترین ... زر ... نقش ...

## کلام الٰہی کی برقی طاقت مفت آزمائیے

اگر مہربان ... مدعی ... کامیابی چاہتے ہوں۔ لیکن اگر ... ایک ... کر سکتے ہوں ... عمل ... دست غیب، حب، مراد اور بہترین تعویذات ایک ... مفت طلب کریں۔ لاکھوں فائدے اٹھا چکے ہیں۔ سید حمید کریم صاحب ... لکھتے ہیں۔ میرے سب کام آپ کی عملیات کی کوشش سے پورے ہو گئے ہیں۔ (۲) ... مادھو صاحب ایم ایل سی جاتون ... آپ کے نقش نے اپنا پورا کام کیا۔ ... ہمارے ہاں بہترین و ارزاں کتب ہر قسم اور ... اکسیر بھی فروخت ہوتا ہے فہرست اور نمونہ مفت جن کے لئے تیس روپے ماہوار پر ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔

مولانا صاحب عامل محلہ مغلپورہ مراد آباد

پرکاش پکچرز کا زبردست اور انوکھا ڈرامہ

آرہا ہے　　آرہا ہے

# حکم کا یکہ

حکم کا یکہ　　حکم کا یکہ

جس میں پرکاش کی تمام نامور اور چیدہ اداکاروں نے جذباتی اداکاری کے دریا بہا دیئے ہیں

بہت جلد آپ کے مشہور سینما میں اس کی نمائش کی جائے گی

استقبال کے لئے تیار رہیے

ڈسٹری بیوٹرز: ڈلیبائی اینڈ کمپنی بیڈن روڈ لاہور

# جدید مطبوعات

صحرا نورد کے خطوط ✻ دنیا کی کہانی ✻ ناموسِ اسلام ✻ ڈاچی ✻ چراغاں

## صحرا نورد کے خطوط

مصنف ...... میرزا ادیب بی۔ اے
ضخامت ...... [illegible] کے ۲۳۴ صفحے
پبلشر ...... مکتبہ اردو۔ لاہور
قیمت ...... ۱۲

جب سے کائنات معرضِ ظہور میں آئی ہے انسانیت کا کمزور طبقہ ہمیشہ جابروں اور زبردستوں کے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔ چنانچہ چنگیز۔ ہلاکو سکندر۔ ہنی بال سیزر۔ تیمور اور نادر سرخ خون کے دریا بہاتے ہوئے آئے اور چشمک برق میں آباد و شاداب دنیا کے ایک بڑے حصے کو خوفناک قبرستان بناتے ہوئے چل دئے۔ "صحرا نورد کے خطوط" کے مصنف کو صحرا کی وسعتوں میں انہی ظالمانہ داستانوں کے نقوش بکھرے ہوئے نظر آئے۔ اور اس نے اپنے سحر کار قلم سے ان میں ادب و رومان کا رنگ بھرا تاکہ دردمند دل رنگینی کے پردہ میں افسانہ کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا پہلو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ عام مصنفین نے آبادی کے مختلف پہلوؤں پر کافی خامہ فرسائی کی ہے لیکن کون جانتا تھا کہ صحراؤں اور جنگلوں میں بھی عجیب رومانی داستانوں کا ایک بے پایاں خزینہ مدفون ہے۔ میرزا ادیب کے عمیق تخیل کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے ریگ کے تودوں میں عظمت و جبروت کا ہیبت ناک جلال دیکھا۔ اور اسی کو انہوں نے دلکش الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے قارئین کو بھی لطیف کیفیت و لطافت کو دیا۔ میرزا ادیب الفاظ کے نقوش بناتے وقت تلمیحات و تشبیہات ایسی پیاری استعمال کرتے ہیں کہ اردو زبان میں یہ صفت صرف انہی سے مختص ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کتاب میں صحرا نورد کے آٹھ خطوط شامل ہیں۔ پہلا تیسرا خط "دامانِ باغبان وکفِ گلفروش" کی تفسیر ہے لیکن تیسرے خط سے مصنف کے قلم پر احساس زیادہ پیدا ہو گیا ہے۔ "سہارت کا قیدی" "چاہ بابل" "سیلِ حوادث" اور "ملکہ مصر" نقشیاتی کوائف کے لحاظ سے بے مثل چیزیں ہیں۔ الغرض کتاب ہر حیثیت سے بہت کامیاب ہے۔ (ع۔ش)

## دنیا کی کہانی

مصنف ...... پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن
ضخامت ...... [illegible] کے ۲۲۷ صفحے
پبلشر ...... جامعہ ملیہ دہلی
قیمت ...... ۱۲

یہ مجموعہ ہے جامعہ ملیہ دہلی کے قابل اور لائق پروفیسر جناب محمد مجیب صاحب بی اے آکسن کی اُن تقریروں کا جو آپ نے وقتاً فوقتاً دہلی ریڈیو سٹیشن سے براڈکاسٹ کیں۔ ان میں آپ نے نہایت سادہ اور دلنشیں پیرایہ میں دنیا کی کہانی بیان کی ہے۔ یہ دنیا کیسے بنی؟ اور کن کن ارتقائی مراحل سے گزری؟ ان سوالوں کا جواب سائنس کی موجودہ تحقیق کے مطابق آپ نے اس کتاب میں دیا ہے۔ تہذیب و تمدن کی ابتدا اور اقوام و ملل کے عروج پر بہت کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ دنیا کی کہانی کا یہی زیادہ تر یہی حصہ اہم اور ضروری تھا اس سے قبل ایچ جی ویلز اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ "تاریخ عالم" پر انگریزی زبان میں کتابیں لکھ چکے ہیں۔ لیکن اردو میں اس قسم کی غالباً یہ پہلی کوشش ہے۔ اور ہمیں مسرت ہے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے مقصد کو نہایت عمدگی سے نبھایا ہے۔ جو لوگ "دریا کو کوزے میں بند" دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بیحد مفید رہے گا۔ (ع۔ش)

(باقی اگلے صفحہ پر)

# اوراقِ پارینہ

## اساتذۂ اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط

### حضرت شوق قدوائی لکھنوی کا غیر مطبوعہ خط جناب رسا ہمدانی صاحب ایم ۔ اے کے نام

مرقومہ ۔ سلام ۔ ہیڈ ماسٹر ۔ جیلانی
۲۳ جولائی ۱۹۲۰ء

مہربان ۔ سلام شوق

بھانا پھینا ملک کے معنی میں ہے ۔ مرحوم امیر مینائی نے اس لفظ کو سمجھ کر کسی غزل کے جواب میں اس کو متروک لکھ دیا ہے ۔ حالانکہ وہ خود اپنے دیوان میں بھانا کو پھبتا کے معنی میں لکھ گئے ہیں ۔ میں خود کہتا تھا ۔ میرا مطلع ہے ؎

روتے ہیں ہنسا ہیں جو ادا بھا گئی مجھ کو
سنہ اس نے چڑھایا تو ہنسی آ گئی مجھ کو

یوں ہی مرحوم امیر مینائی نے " اسکے " میں چوک ہوئی ہے ۔ حالانکہ یہی عرف یہ ہے کہ بجائے لکھ دیا ۔ حالانکہ محاورہ مذکر کے ساتھ مذکر اور مونث کے ساتھ مونث ہے ۔ جیسا کہ سال اور اب کی بہار میں یعنی مرحوم امیر سے لفظ " پارسل " میں چوک ہوئی ہے ۔ انہوں نے پارسل کو مونث لکھ دیا ۔ حالانکہ بالاتفاق یہ لفظ لکھنؤ میں ہمیشہ مذکر بولا گیا اور اب بھی مذکر ہے ۔ رامپور والے مونث بولتے ہیں ۔ اسی سے مرحوم دھوکا کھا گئے ۔

(احمد علی شوق قدوائی)

---

ملک اردو بک سٹال لاہور نے آپ کے ۱۲ افسانوں کا حسین و جمیل مجموعہ شائع کیا ہے ۔ جو اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے ۔ ملک صاحب نے تمام افسانے ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے ہیں ۔ اور یہ وثوق ہے کہ یہ کہانیاں سیاسی دماغوں میں بیداری پیدا کئے بغیر نہ رہیں گی ۔ ہر افسانے کے شروع میں نقطۂ مرکزی کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے جن میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں ۔ (۱) اشعر پامپیائی کے لوگ ۔ سنا جاتا ہے انسانوں اور شیروں کو لڑا کر جشن منایا کرتے تھے ۔ پامپیائی غرق ہو گیا ۔ لیکن کیا دنیا میں آج ایسے تماشائی نہیں ؟ (۲) ادبچے ادبچے محلوں کی فضاؤں میں ہر امیر کوشش دم توڑ ۔ ان تنگ و تاریک گلیوں میں جا جنہیں جھک اور مفلوک الحالی نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے ۔ (۳) ڈاکو نے فاتح سے کہا ۔ تم ایک بڑے ڈاکو ہو اور میں چھوٹا ۔ تمہارے بازو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلے ہیں اور میں اپنے ہی علاقہ تک پرواز کر سکا ۔ تمام افسانے نہایت سہل ۔ دلکش اور موثر زبان اور پیرایہ میں لکھے گئے ہیں ۔ آرٹ کے نقطۂ نگاہ سے ہر افسانے معیار پر بالکل پورے اترتے ہیں ۔ مصنف نے نہایت کامیابی سے اپنی شخصیت کو کہانیوں میں نمایاں کیا ہے ۔ آپ کا طرز تحریر منشی پریم چند مرحوم سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے ۔ پبلشر نے کتاب کو ظاہری محاسن کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں کوئی

(باقی اگلے صفحہ پر)

## ناموران اسلام

مصنف ۔۔۔ محمد حسین حسان
ضخامت ۔۔۔ ۲۰۰ صفحات
ناشرین ۔۔۔ جامعہ ملیہ دہلی
قیمت ۔۔۔ ۱۲

اسلام کے نامور بزرگوں پر اب تک اردو زبان میں کوئی کتاب ایسی شائع نہ ہوئی تھی جو بڑوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید ہو ۔ جامعہ ملیہ نے ناموران اسلام کے نام سے ایک جامع کتاب شائع کی ہے ۔ جس میں مفسر ۔ محدث ۔ فقیہ ۔ عالم ۔ صوفی ۔ سپہ سالار ۔ فلسفی ۔ مورخ ۔ طبیب ۔ شاعرہ وغیرہ بھی شامل ہیں ۔ مشاہیر کی تعداد ۲۰۰ ہے ۔ تاریخی لحاظ سے حالات بہت مستند ہیں ۔ اور دلچسپ پیرایہ میں لکھے گئے ہیں ۔ کتاب بچوں لڑکوں کے لئے لکھی گئی ہے ۔ مگر بڑے لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں ۔ (ع ش)

---

## ڈاکو اور دیگر سیاسی افسانے

مصنف ۔۔۔ اوم پرکاش ملک بی اے ایل ایل بی
ضخامت ۔۔۔ ۲۰۰ صفحے
ناشرین ۔۔۔ ملک بک سٹال لاہور
قیمت ۔۔۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

اوم پرکاش ملک نہایت پر لطف افسانہ نگار ہیں ۔ آپ کی کہانیاں اردو اور ہندی زبان میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکی ہیں ۔ حال ہی میں ایم عبیدالدین صاحب

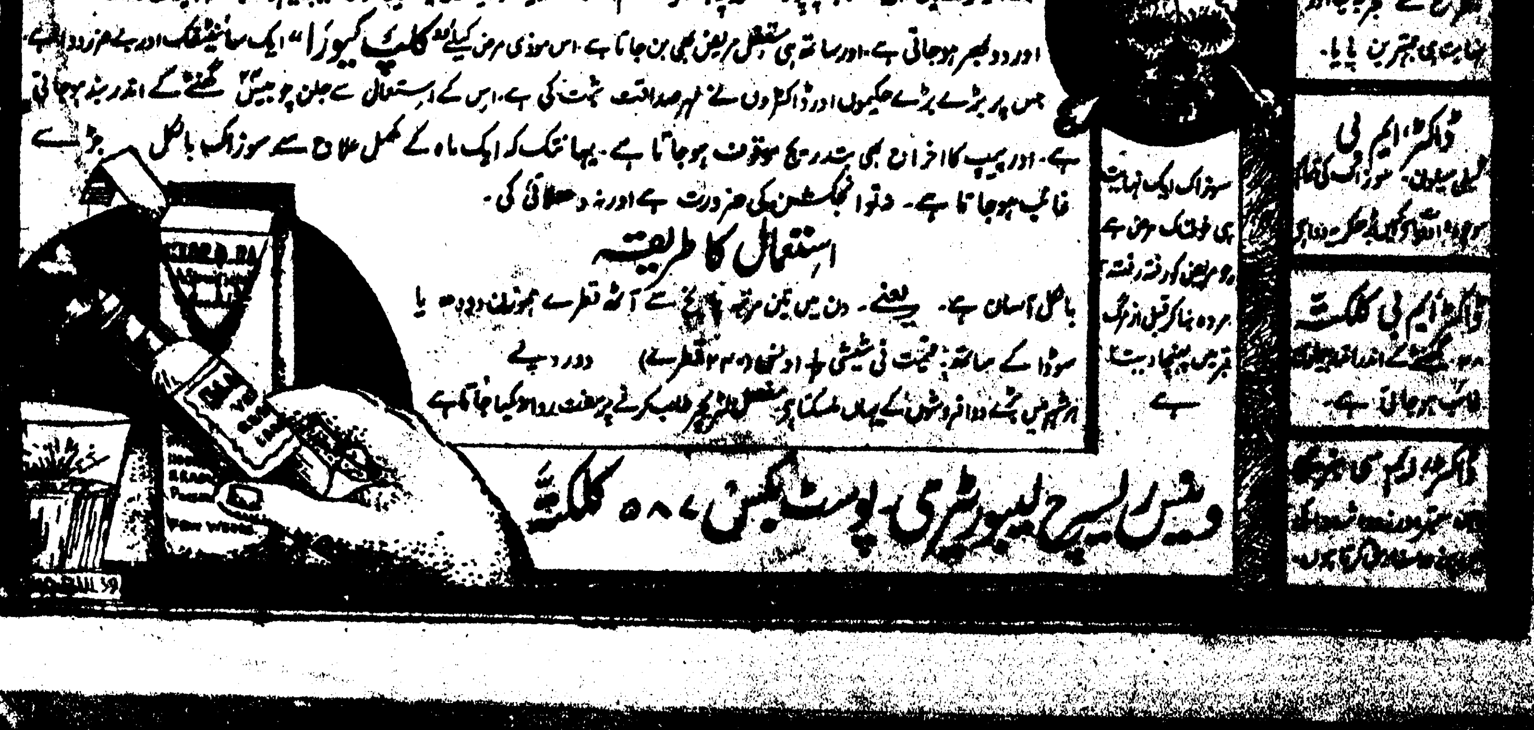
دیکھو ... محروم نہیں کیا۔ ... ظہیر صاحب کے
حسن انتخاب ... سکتے ہیں

## چراغاں

مصنف ... حضرت احسان بن دانش
تقطیع ... ۲۰×۲۲ ... صفحات
قیمت ... عہ
ملنے کا پتہ ... مکتبہ دانش مزنگ لاہور

یہ کتاب حضرت احسان بن دانش کی بہترین نظموں اور بعض غزلوں پر مشتمل ہے۔ احسان صاحب نوجوان شعراء کے اس صحیح الفکر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو اردو شاعری کو تقاضائے زمانہ کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ اس مجموعہ میں جتنی نظمیں ہیں اپنے اپنے مفہوم و بحث کے اعتبار سے قابل تحسین ہیں۔ ان میں جہاں اشعار سے ظاہر ہونے والی قلبی کیفیتوں کو الفاظ و حروف کا جامہ پہنایا گیا ہے وہاں شعور و محکوم کو مشعل انقلاب کی روشنی میں منزل ترقی بھی بتائی گئی ہے۔ اس لئے احسان کا کلام تمہید عمل اور احیائے جوش کا حامل ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ سیاسی حکمت کی شاعری تنقید کی انتہائی بلندی پہنچ کر رہے گی لیکن ہے کہ بعض حضرات احسان کے بعض شعروں کو فنی تنقید کا تختۂ مشق بنانے کی کوشش کریں لیکن یہ مجموعہ پیام و حریت کے اعتبار سے تحسین و تبریک کا مستحق ہے۔ قارئین خیام کو اس کے مطالعہ سے محظوظ ہونا چاہئے۔ (ل۔ ی)



# نارتھ ویسٹرن ریلوے

## یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء سے ریلوے ٹائم ٹیبل میں حسب ذیل اہم تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں گی

| اس وقت جو مندرجہ ذیل سٹیشنوں کے مابین جاری ہیں | ٹرین نمبر | یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء سے تبدیلیاں |
|---|---|---|
| "A" (۱) لاہور اور کراچی شہر | ۷ - اپ میل | ۱۹ بجکر ۴۰ منٹ کے بجائے اب ۱۹ بجکر ۵ منٹ پر چلا کرے گی اور ۱۷ بجکر ۵۵ منٹ پر لاہور پہنچیگی۔ |
| | ۸ - ڈاؤن میل | ۹ بجکر ۱۰ منٹ کے بجائے لاہور سے ۹ بجکر ۱۵ منٹ پر چلے گی اور کراچی میں ۸ بجکر ۵ منٹ کے بجائے ۷ بجکر ۵۵ منٹ پر پہنچے گی۔ |
| (۲) لاہور اور پشاور چھاؤنی | ۲۰ ڈاؤن ایکسپریس | پشاور چھاؤنی سے ۵ بجکر ۵ منٹ کی بجائے ۵ بجکر ۵۵ منٹ پر چلے گی اور ۱۸ بجے لاہور پہنچے گی۔ |
| (۳) لاہور اور دہلی براستہ سہارنپور | ۲ - اپ میل | لاہور میں ۸ بجکر ۵ کے بجائے ۷ بجکر ۵۵ منٹ پر پہنچے گی۔ |
| (۴) ” ” ” | ۲۳ - اپ مسافر گاڑی | دہلی سے ۸ بجکر ۵۰ منٹ کے بجائے ۹ بجکر ۲۰ منٹ پر روانہ ہوگی اور لاہور ۲۳ بجکر ۳ منٹ کے بجائے ۲۲ بجکر ۵۰ منٹ پر پہنچے گی |
| (۵) ” ” ” | ۸۳ - اپ اور ۸۴ ڈاؤن | دہلی اور میرٹھ کے درمیان منسوخ کردی گئی ہے۔ |
| (۶) دہلی اور کالکا | ۱ - اپ میل | دہلی سے ۲۲ بجکر ۱۰ منٹ کے بجائے ۲۲ بجکر ۱۵ منٹ پر روانہ ہوگی اور ۴ بجکر ۳۵ منٹ پر کالکا پہنچے گی۔ |
| | ۲ - ڈاؤن میل | دہلی ۶ بجکر ۲ منٹ کے بجائے ۶ بجکر ۵ منٹ پر پہنچے گی۔ |
| (۷) | | |

## "B" زائد ٹرینیں

| ٹرین کا نمبر | روانگی کا اسٹیشن | جس مقام تک جائے گی |
|---|---|---|
| ۲۵ - اپ | دہلی روانگی ۷ بجکر ۲۵ منٹ | مظفرنگر آمد ۱۰ بجکر ۵۰ منٹ |
| ۲۶ - ڈاؤن | مظفرنگر روانگی ۱۱ بجکر ۳۴ منٹ | دہلی آمد ۱۵ بجے |
| ۱۲۵ - اپ | لاہور روانگی ۱۰ بجکر ۱۳ منٹ | سیالکوٹ آمد ۱۵ بجے |
| ۱۲۶ - ڈاؤن | سیالکوٹ روانگی ۱۵ بجکر ۱۶ منٹ | لاہور آمد ۲۰ بجے |

## "C" تھرڈ سروس کے ڈبے

| اس وقت جن اسٹیشنوں کے درمیان چلتی ہیں! | ٹرین کا نمبر | یکم اکتوبر ۳۹ء سے تبدیلیاں |
|---|---|---|
| دہلی - راولپنڈی - بوگی انٹر و تھرڈ | ۶۷ - اپ | دہلی - لالہ موسےٰ |
| راولپنڈی - دہلی - بوگی انٹر و تھرڈ | ۶۸ - ڈاؤن | لالہ موسےٰ - دہلی |
| لدھیانہ - راولپنڈی - بوگی اول و دوئم لگیج اور بریک | ۶۷ - اپ | لدھیانہ - لالہ موسےٰ |
| راولپنڈی - لدھیانہ بوگی اول و دوئم لگیج اور بریک | ۶۸ - ڈاؤن | لالہ موسےٰ - لدھیانہ |
| پشاور چھاؤنی - ملتان چھاؤنی - بوگی تھرڈ لگیج اور بریک | ۵۸ - ڈاؤن / ۶۴ / ۵۹ - اپ | جاری کی جائیں گی۔ |
| ملتان چھاؤنی - پشاور چھاؤنی - بوگی تھرڈ لگیج اور بریک | ۶۶ - ڈاؤن / ۶۳ - اپ / ۴۱ - اپ | |
| لاہور خانیوال - بوگی تھرڈ | ۴۳۷ - اپ / ۴۳۶ ڈاؤن / ۴۴۴ ڈاؤن | بند کردی جائیں گی |
| خانیوال - لاہور بوگی تھرڈ | ۴۴۳ - اپ / ۱۳۸ / ۱۳۵ / ۱۳۸ ڈاؤن | ” ” |

## "D" نئے سلسلے

(۱) ۳۳ - اپ پسنجر دہلی سے براہ سہارنپور - انبالہ چھاؤنی کے اسٹیشن پر ۵۸ ڈاؤن بمبئی ایکسپریس کے ساتھ۔
(۲) ۳۳ - اپ پسنجر دہلی سے براہ سہارنپور لاہور کے اسٹیشن پر ۴۳۹ - اپ پسنجر ٹرین کے ساتھ۔
(۳) ۱۱۸ ڈاؤن پسنجر شورکوٹ روڈ سے شاہدرہ سٹیشن پر ۱۹ - اپ سندھ ایکسپریس کے ساتھ اور ۱۲۰ ڈاؤن پسنجر سے لاہور اسٹیشن پر
(۴) ۷۴ - ڈاؤن سکنڈ شورکوٹ روڈ سے شاہدرہ اسٹیشن پر ۶۷ اپ کو جھنگ ایکسپریس کے ساتھ
(۵) ۷۶ - ڈاؤن - ڈیرہ دون پسنجر ٹرین لاہور سے امرتسر اسٹیشن پر ۳۷۲ ڈاؤن سکنڈ ٹرین کے ساتھ

## "E" ٹرینیں جن کی توسیع کی گئی ہے!

۱۱۹ - اپ اور ۱۲۰ ڈاؤن - لاہور - لدھیانہ - سہارنپور سے اور سہارنپور تک توسیع کی جائے گی۔

## "F" ۳۰ ۱/۱۱۹ اور ۱۲۹ کی درمیانی رات ٹرینوں کا فلنگ!

نئے اوقات کے مطابق ۴۴۳ - ڈاؤن پسنجر ٹرین انور اور سیالکوٹ کے درمیان یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کو نہیں چلے گی۔
یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء سے نافذ العمل ٹائم اور میگزین ٹیبل تمام ریلوے بک سٹالوں پر برائے فروخت موجود ہے - ایک نسخہ کی قیمت ۴ آنے ہے۔

**چیف اوپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ**

## فلمستان

# "پُکار"

## ہندوستانی فلم سازی کا بہترین نمونہ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

از جناب ابوالقلم دبیر صاحب

(۱۶ ستمبر کے خیام میں پکار پر رفیق نودھی صاحب کا تبصرہ شایع ہو چکا ہے لیکن چونکہ دبیر صاحب کے مضمون میں بعض ایسی باتیں موجود ہیں جو پہلے تبصرہ میں نہ تھیں اس لئے یہ بھی خیام میں شایع کیا جاتا ہے ۔ مدیر)

ایک وقت تھا کہ آج کے مجبور و محکوم ہندوستان کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا اس کی عظمت و جبروت کے پرچم انتہائی حدود پر لہراتے تھے اس کے باشندوں کی شجاعت و دلیری کی تیغ و کمان کو لوہا دنیا تسلیم کرتی تھی اس کے عدل و انصاف کا ڈنکا سارے عالم میں بج رہا تھا لیکن آج وہ تہذیب کا گہوارہ ہندوستان کی ان قدیم روایات کو صفحاتِ تاریخ سے ناپید نہیں کیا جا سکتا۔

آج کس کی تہذیب و تمدن کے ہمنوا عدل و انصاف کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن کیا وہ شہنشاہ نورالدین جہانگیر کی عدالت گستری اور انصاف پروری کی ایک مثال بھی ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کے اس زندہ عالم تاجدار کے عدل و انصاف کا یہ کس نادر مثال مقتول کا رتبہ ہے کہ اس کا قانون صرف رعایا اور غریبوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ جس وقت خود اس کی منظور نظر و جان سے زیادہ عزیز ملکہ قانون کی زد میں آئی تو اس کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا گیا جو عام ملزمین کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔

شاہ جہانگیر کے عدل و انصاف کی اس بھولی بسری کہانی کو منروا موویٹون نے پھر یاد دلا دیا ہے اور اس انداز سے دعوت نظارہ دی ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے انسان خود کو اور گرد و پیش کے ہنگامہ پرور ماحول کو فراموش کر کے یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ خاندان مغلیہ کے زندہ جاوید تاجدار کے دربار میں بیٹھا ہے اور یہ سب کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔

منروا کے مالک مسٹر سہراب مودی مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے "پکار" ایسا عظیم المرتبت فلم تیار کر کے ہندوستانی فلموں میں ایک عدیم النظیر اضافہ کیا ہے۔ "پکار" ایک ایسی تصویر ہے جسے نہایت فخر کے ساتھ ہندوستان کی جانب سے ممالک غیر میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ تصویر ہندوستانی ماحول۔ ہندوستانی اخلاق۔ ہندوستانی جرأت و بہادری۔ ہندوستانی شجاعت و مردانگی۔ ہندوستانی خلوص و محبت۔ ہندوستانی غیرت و حمیت اور ہندوستانی عدل و انصاف کی صحیح ترجمان اور پوری پوری ...

"پکار" کی اساس اس واقعۂ قتل پر رکھی گئی ہے جو نادانستہ طور پر ملکہ نورجہاں سے سرزد ہو گیا تھا اس واقعہ کو علامہ شبلی نعمانی نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ نظم فرمایا ہے اور یہ نظم علامہ کے کلام میں خاص درجہ رکھتی ہے اس کے بہت سے اشعار باذوق حضرات کو بھی ازبر ہونگے۔ اس نرالے موضوع کو نئے ڈھنگ اور نرالی سج دھج کے ساتھ پیش کرنا صرف منروا کا کام ہے مسٹر سہراب مودی کی فطرت شناس طبیعت نے اس میں بہت سی جدتیں پیدا کی ہیں اور تصویر کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے میں انھوں نے گرانقدر مہارت طویل مدت اور شدید مشقت برداشت کی ہے لیکن ہمیں خوشی ہے کہ ان کی یہ تمام مساعی ... ثابت ہوئی ہیں۔

سب سے بڑی چیز جو اس تصویر کو درجہ امتیاز پر پہنچا رہی ہے وہ مغلیہ عہد کے اصلی ماحول کی نمائش ہے۔ پوری تصویر میں کوئی سی چیز آپ ایسی نہ بتلا سکیں گے جسے دور حاضر سے مخصوص کہا جا سکے۔ مناظر تمام تر اکبرآباد کے ہیں۔ دربار بھی اسی جگہ دکھایا گیا ہے جہاں شاہ جہانگیر منعقد کیا کرتا تھا۔ وہی جہاں کا سامان ہے اور وہی اکبرآباد کا قلعہ معلیٰ۔ ویسا ہی لباس ہے، وہی تزئین و آرائش اور ویسی ہی ترتیب مجلس۔

اداکاروں کے انتخاب میں بھی مسٹر سہراب مودی نے اپنی خوش سلیقگی کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ ہندوستانی اداکاروں کی فہرست آپ کے سامنے ہے خود غور کیجئے اور بتلایئے کہ چندر موہن سے زیادہ جہانگیر بننے کے لئے اور کون موزوں ہو سکتا ہے کیا اس کے خط و خال جہانگیر سے مشابہت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں؟ ہندوستان کی کون سی ایکٹرس ہے جو نور جہاں ایسی نازک اندام اور پری تمثال ملکہ کی شکل میں آپ کے سامنے جلوہ گر ہو سکے؟ یقیناً آپ کو ماننا پڑے گا کہ سوا اسے (؟) چہرہ نسیم کے یہ سعادت اور کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ قوی الجثہ طویل القامت اور وجیہ صورت مسٹر سہراب مودی کیا راجپوت بننے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں؟ اس کے بعد مسٹر صادق علی اور شیلا کی ذات ہے یہ بھی راجپوت اور راجپوتنی کی شکل میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

تصویر کی ترتیب میں ہندوستان کے ہر فرقہ اور طبقے کے جذبات و حسیات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور حتی الوسع ہر اس لغزش سے اجتناب کیا گیا ہے جو کسی کے جذبات کو ٹھیس لگا سکتی تھی برخلاف اس کے فلم میں ایسی چیزیں جمع کر دی گئی ہیں جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی باعث فخر ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے تصویر میں قریباً تمام محاسن موجود ہیں۔ ادا آموزی کا شرف خود مسٹر سہراب مودی کو حاصل ہے اور انھوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیت کے پورے نقوش مرتسم کئے ہیں تصویر کو دلچسپ بنانے کے لئے دھوپ کا ماحول نہایت خوش نما ئی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اسی طرح جذبات کو ابھارنے کی بھی پوری کوشش کی گئی ہے اور ہر چیز کو سلطنت مغلیہ ماحول کے مطابق پیش کیا ہے۔

اداکاروں میں سب سے بہتر کام مسٹر چندر موہن کا ہے جنھوں نے خود کو واقعی شہنشاہ جہانگیر ثابت کر دکھایا ہے اس کے بعد مسٹر سہراب مودی نے خود کو راجپوت کی شکل میں پیش کیا ہے اور وہ بھی بہت کامیاب رہے۔ صادق علی کے کام میں بھی کافی ابھار موجود ہے۔ ایکٹرسوں میں نسیم دہلوی نور جہاں کے روپ میں فریب نظارہ دے رہی ہیں۔ ان کے بعد شیلا ہے لائق ڈائرکٹر نے حالانکہ اس اداکارہ کو ابھارنے کی کافی کوشش کی تھی اور اس میں بھی اسے بہت ابھارا ہے سرج۔ وہ ڈیوٹی کی ممتاز ممشدہ (؟) راجہ دھوبن کے بھیس میں بہت کامیاب معلوم ہوتی ہیں۔ دیگر اداکاروں نے بھی کافی محنت کی ہے اور ہر شخص کے کام میں ابھار پیدا ہو گیا ہے۔

اس تصویر کو بام عروج پر پہنچانے کا باعث جہاں حسبِ حال ماحول اور صحیح ادا آموزی ہے وہاں مکالمہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مکالمہ کمزور ہوتا تو تصویر یقیناً بہت پست رہتی لیکن خوشی کی بات ہے کہ "پکار" کا مکالمہ قصہ اور گانے جیلر کے شہرت یافتہ ادیب جناب کمال امروہوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

مکالمہ میں کافی زور اور اثر موجود ہے اور بعض مقامات پر لطیف چٹکیاں بھی موجود ہیں بالخصوص انصاف و رحم کا موازنہ بیحد دلچسپ پیرایہ میں کیا گیا ہے۔

صدا بندی۔ فوٹو گرافی اور موسیقی خوشگوار، کیف زا اور سامعہ نواز ہے۔ آخر میں ہم یہ چیز بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ہندوستانی تصاویر سے عام طور پر سرپرستانِ اردو کو یہ شکایت رہی ہے کہ وہ فلم سازی کے ذریعے سے اردو کو شدید نقصان پہنچا رہے ہیں لیکن ان حضرات کے لئے یہ چیز وجہ مسرت ہوگی کہ منروا مووی ٹون ہی وہ اولین فلمی ادارہ ہے جو زبان کے استعمال میں بیحد حزم و احتیاط برتتا ہے "پکار" کے مکالمے میں جس قدر آسان اور سہل زبان استعمال کی گئی ہے یقین جانئے اس سے اچھی زبان استعمال نہیں ہو سکتی تھی۔ خاص طور پر پکار میں انگریزی عبارت کے پہلو بہ پہلو اردو کو اہتمام کے ساتھ پیش کرنا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور حتی الوسع تراجم میں انگریزی مصطلحات کا ترجمہ اردو میں پیش کیا ہے۔ بعض چیزیں رہ گئی ہیں حالانکہ ذرا سی توجہ کی جاتی تو ان کا اردو ترجمہ کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً ڈائرکشن کا ترجمہ ادا آموزی عام طور پر رائج ہے یا اسسٹنٹ کا ترجمہ مددگار ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال پکار ہر لحاظ سے لائق ستائش کارنامہ ہے اور یقین کیا جاتا ہے کہ یہ تصویر ۱۹۳۹ء کے اولیں انعام کی مستحق قرار پائے گی۔ ہم آخر میں مسٹر سہراب مودی، کمال امروہوی اور ان تمام حضرات کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں جن کی مساعی جمیلہ اس کامیابی کا موجب بنیں۔

# بادۂ احمر

از جناب احمر گورکھپوری

کسی کی برقِ جمال شعلہ بنی ہوئی طُور پر نہیں ہے
کوئی حسین مُسکرا رہا ہے مرا فریبِ نظر نہیں ہے

اگرچہ شرم و حیا کے پردے میں جھومتا ہے شبابِ ناز
مگر نگاہ و ادا کی شوخی شباب سے بیخبر نہیں ہے

ہجومِ وارفتگی ہے، میں ہوں، کسی کے جلوے ہیں، دل کی ابھر
مجھے وہاں لے گیا تصوّر جہاں نظر کا گزر نہیں ہے

نظامِ عالم بدل رہا ہے کسی حسیں کا خرامِ رنگیں
چمک رہی ہے نظر کی بجلی نمودِ نورِ سحر نہیں ہے

وجودِ انساں تو ہے معطّل مگر ہے پرواز میں مکمّل
جہاں ہیں بے بال و پر ہے لیکن جہاں میں بے بال و پر نہیں ہے

کسی کے دستِ حنائی احمر ہوئے ہیں مصروف چارہ سازی
ستم ہوا ہے کرم کسی کا علاجِ دردِ جگر نہیں ہے

# غزل

جناب قمر فاروقی انبالوی

آہوں کی کس میں ہمت ہے دُنیا کا شکوا کون کرے
دل پارہ پارہ کر تو چکے اب جان کو پارا کون کرے

جب دل کا شیشہ ٹوٹ گیا جب آس کا دامن چھوٹ گیا
پھر خواہش دُنیا کس کو ہو عقبیٰ کی تمنّا کون کرے

آنکھوں نے مری رو رو کر اظہارِ محبّت کر ہی دیا،
یہ باتیں تو چھپنے سے رہیں اب ان کو چھپایا کون کرے

جب چاندنی راتوں میں دریا کی موجیں نغمے چھیڑتی ہیں
تم غیر سے جا کر ملتے ہو اب اس کو گوارا کون کرے

اک لفظِ محبّت کو لے کر لوگوں نے بنایا افسانہ
اچھا یہ قمر جھوٹا ہی سہی دُنیا کو جھوٹا کون کرے؟

# [illegible]

از حضرت ضیا [illegible]

اپنی چشمِ شوق میں اتنا اثر پیدا کریں
وہ حجابِ ناز میں ہوں ہم انھیں دیکھا کریں

تنگ ہے اپنی نظر میں جلوہ گاہِ حُسن و عشق
جی میں آتی ہے کہ دُنیا کو تہ و بالا کریں

کاش پہنچا دے تصوّر جلوہ گاہِ ناز تک
بند آنکھیں کر کے اُن کو شوق سے دیکھا کریں

الوداع اے ضبطِ غم اے جوشِ گریہ المدد
دل اگر چاہے تو ہر قطرے کو اک دریا کریں

اے نیازِ عشق پیدا کر اثر اتنا ہی اب
میری نظروں سے وہ اپنے حُسن کو دیکھا کریں

حُسن عکسِ عشق ہو اور عشق میں انداز حُسن
دل کے ذرّوں سے نئی آباد اک دُنیا کریں

سلب ہوتا جا رہا ہے امتیازِ کوئے دوست
بندگی کس کی کریں کس کو خدا سمجھا کریں

اہلِ عالم آ کے دیکھیں زینتِ باغِ سخن
خاکِ گُل سے ہم شگوفے نے فضا پیدا کریں

# عالمگیر بکڈپو کی مشہور و معروف کتابیں!

**شادی** ہندوستان کے مشہور مزاح نگار حضرت ملا رموزی صاحب کی شادی کے دلچسپ واقعات خود ملا صاحب کے قلم ظرافت سے لکھے ہوئے حالات خیال فرمائیے کہ یہ کتاب کس قدر دلچسپ ہوگی ہمارا خیال ہے کہ اہل شادی میں وہ مسرت نہیں جو اس کتاب میں پائی جاتی ہے ضرور پڑھنے چاہیے اور سننے چاہیے حجم ۔ ۵ صفحات قیمت ۸/

**تحفۂ لطافت** جناب ملک لاموزی کے بہترین فرمائشیں نمبر ہیں کا گراں قدر مجموعہ کتاب ہے ہر ورق زعفران زار کشمیر کی کیاریوں سے کم نہیں حجم ۔ صفحے قیمت ۵/
نوٹ: شادی اور تحفۂ لطافت خریدنے پر ناظرین کی خدمت میں صرف تین روپے چار آنے میں ارسال ہوں گی۔

**روزنامچے** ادبیات نفسیات اور مزاحیات کا شاہکار مجموعہ دور حاضر کی بہترین تصنیف نہایت دلچسپ کتاب ۔ چند روزنامچوں کے عنوان ملاحظہ ہوں ۔ بادشاہ کا روزنامچہ ۔ نقد کا روزنامچہ ۔ مسز الیلی کا روزنامچہ ۔ ایڈیٹر کا روزنامچہ ۔ دوشیزہ کا روزنامچہ ۔ غرضکہ ہر ایک انسان کا روزنامچہ اس کتاب میں موجود ہے ۔ آپ کی معلومات میں اضافہ کرنے والی اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہو سکتی قیمت صرف ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک

**لپٹے ہوئے خطوط** ایک داستان ہے مظلوم عورت کی ایک فریاد ہے دُکھے ہوئے دل کی آنسوؤں کے چند قطرے جو خون جگر کا ماحصل ہیں کتاب کے صفحات پر اس لئے پیش کئے گئے ہیں کہ مصلحین ان جرائم کو دیکھیں جو ہمارے اجتماعی نظام کو فنا کئے دیتے ہیں عجیب دلچسپ کتاب ہے قیمت صرف ایک روپیہ۔

**سیب کا درخت** شہرہ آفاق ادیب قاضی عبدالغفار کا ایک بہت دلچسپ اور فلسفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا مقبول افسانہ جو انگریزی سے نوبل پرائز یافتہ ادیب گالزوردی کے افسانے کا اردو ترجمہ ہے قیمت صرف ۱۲/

**تفسیرِ حیات** ادبی ذوق رکھنے والوں کی نظر سے ایم اسلم صاحب کا ہر ایک افسانہ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں ہر ایک افسانہ اپنے اندر سینکڑوں درد انگیز واقعات کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے کتاب کا حجم ۔ صفحات پر مشتمل ہے قیمت صرف ۸/

ملنے کا پتہ

**عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا لاہور**

**مجنوں کی ڈائری** مرقع ہے ایک بازاری مرد کے نفسیات کا خاکہ ہے ہماری اجتماعی زندگی کے نقائص کا ۔ موجودہ تہذیب و تمدن ہمارے نوجوانوں کو کس طرح مردہ کر رہا ہے ۔ اس کا ایک ہلکا سا عکس مجنوں کی ڈائری میں دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ اگر ہوا کا یہی رُخ رہا تو سو سال کے بعد ہماری کیا حالت ہوگی ۔ نہایت دلچسپ کتاب قیمت صرف ایک روپیہ

**خطوط کی ستم ظریفی** خطوط کی ستم ظریفی مرزا عظیم بیگ کا ایک ایسا پھڑکتا ہوا ہنسانے والا ناول ہے جس کی نظیر اردو لٹریچر میں ملنی مشکل ہے۔

**مجبورۂ قیروال** علامہ جرجی زیدان کا بلند پایہ ناول ہے جسے عالمگیر بکڈپو نے بہ صرف زرِ کثیر عربی سے اردو میں ترجمہ کروا کر ایک نئی کتاب کا اضافہ کیا ہے حجم ۔ صفحات قیمت ۱۲/ علاوہ محصولڈاک۔

**آرائش جمال باتصویر** اردو زبان میں زنانہ سنگھار کے متعلق پہلی کتاب جو ایک معزز خاتون نے لکھی ہے ۔ اس سے پہلے اس قسم کی کوئی دوسری کتاب موجود نہیں تھی ۔ جو جو بیبیوں کے ہاتھ میں کتاب جا ملے کتاب کی خوبیاں پڑھنے سے واضح ہوں گی تصاویر کی تعداد ۔ حجم ۲۷۲ صفحات مجلد قیمت صرف ۵/

# دلچسپ مفید کارآمد اور پرازمعلومات کتابیں ہم سے طلب فرمائیں!

**تعلیم تقدیر** اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تقدیر کیا چیز ہے اور تقدیر کس طرح بنتی اور بگڑتی ہے ۔ تو آپ اپنے ۔ ۔ ۔ کو نحوستوں اور نحوسوں کو دور کر ۔ ۔ ۔ کے عمل ہماری تیار کردہ کتاب انتقادیہ منگا کر ملاحظہ کریں ۔ ۔ ۔ تمام امور کے متعلق ۔ ۔ ۔ اس کتاب کے پڑھنے سے ۔ ۔ ۔ ہو جائیں گے ۔ کتاب مذکور میں قرآن مجید کی آیتوں سے ۔ ۔ ۔ امور کے بابت ۔ ۔ ۔ اردو زبان میں آج تک ۔ ۔ ۔ کوئی ۔ ۔ ۔ حجم ۔ صفحات قیمت ۔ ۔ ۔ محصولڈاک
صرف ۔ ۔ ۔

اگر آپ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ تعبیر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو

**مجموعۂ خوابنامۂ یوسفی** ۔ ۔ ۔ خواب کی تمام مشہور عربی ۔ ۔ ۔ اردو کی ۔ ۔ ۔ اور نایاب کتابوں ۔ ۔ ۔ کیا ہے ۔ موجودہ زمانہ کی ایجادات ریل ۔ ۔ ۔ ہوائی جہاز ۔ پوسٹ کارڈ ۔ گراموفون ۔ ٹیلیسکوپ تھیٹر ۔ ۔ ۔ موٹر کار ۔ بائیسکل ۔ موٹر سائیکل وغیرہ وغیرہ جدید اشیاء کے خواب دیکھنے کی تعبیر پرانی کتابوں میں نہیں ملتی ۔ اس میں ان کی تعبیریں درج ہیں ۔ غرضکہ یہ خواب کی کتاب تمام خواب اور تعبیر کی کتابوں سے اعلیٰ اور عمدہ ہے کتاب کے آخر میں خواب دیکھنے کا علم ہے ۔ جسے سامدرک کہتے ہیں ۔ درج ہے جو آپ نے آج تک دیکھا نہ سنا ہوگا ۔ باوجود اس قدر خوبیوں کے قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے مجلد سنہری صرف ۲/

**مفتاح الجفر** یوں تو علم نجوم و جفر و رمل وغیرہ کی بیسیوں کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں لیکن اس کتاب مفتاح الجفر کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی علم جفر و رمل کی کتاب کو حاصل نہیں ۔ ہم ڈنکے کی چوٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ ایسی نایاب کتاب آپ کو ہمارے سوا اور کہیں نہ مل سکے گی ۔ لہٰذا اگر آپ اس علم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر آپ ہر ایک بہتر راز کے انکشاف کی خواہش ہے ۔ اگر آپ کو ہر ایک امر میں کامیاب ہونے کا خیال ہے ۔ اگر آپ کسی کو اپنا بنانا چاہتے ہیں اگر کسی کے زیر قبضہ کرنے کے خواہاں ہیں تو یہ کتاب طلب فرمائیے
۲۴۸ صفحہ قیمت ۲/

ملنے کا پتہ

**عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا لاہور**

**رہبرِ روزگار** اگر آپ مفلسی سے چھٹکارا چاہتے ہیں تو کتاب رہبر روزگار کو منگا لیجئے ۔ یہ کتاب مفلسی اور بیکاری بیروزگاری میں آپکی معاون ہوگی ۔ یہ کتاب آپ کو بتا دیگی کہ مفلسی اور ناداری کیونکر دور ہو سکتی ہے ۔ یہ کتاب آپ کی قسمت کے منحوس ستارہ کو بدل کر خوش نصیب بنا دیگی کیونکہ یہ وہ کتاب ہے جس میں ہر قسم کے کام ۔ ہر قسم کے ایسے ایسے گر اور ایسے راز کہ جن سے کوڑیوں کے روپے بنائے جا سکتے ہیں لکھے گئے ہیں کئی قسم کے صابن بنانے کے طریقے ۔ کئی قسم کے شربت بنانے کے طریقے ۔ کئی قسم کے نسخے ۔ کشتے ۔ کھلونے ۔ سیاہیاں ۔ مٹھائیاں ۔ حلوے ۔ مربے ۔ اچار ۔ چٹنیاں وغیرہ کے ایسے سہل اور آسان طریقے سے لکھے گئے ہیں کہ ہر شخص جو بیکار ہے اس کتاب کا کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے ۔ اس میں کوئی ہنر ایسا نہیں ہے جس کا خود تجربہ نہ کیا گیا ہو ۔ کتاب اگر اشتہار کے مطابق نہ ہو تو قیمت واپس کر دی جائے گی قیمت صرف ۸/ علاوہ محصولڈاک۔

**رہبرِ صابن سازی** بیروزگاری کا آسان علاج گھر بیٹھے سینکڑوں روپیہ پیدا کرنے کی ترکیب اس کتاب میں ہر قسم کے دیسی ولایتی صابن تیار کرنے کے چار سو مختلف نسخے درج کئے گئے ہیں صابن کے اجزا حاصل کرنے کا مفصل بیان دیا گیا ہے قیمت ۸/

## ہندوستانی کمپنی حج لائن کے جدید تیز رفتار
## اور آرام دہ جہازات
## "المدینہ"
## "الہند" اور "انگلستان"
## سے سفر کیجئے

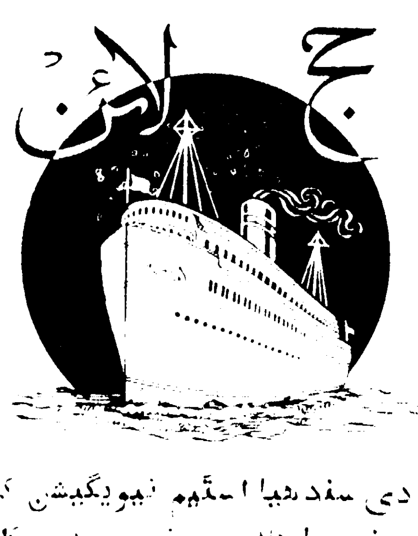
ان جہازوں میں آپکو نہایت آرام دہ اور آراستہ کیبن۔ تفریح گاہ اور بحری نظارہ کے لئے صاف و شفاف برآمدہ ملینگے۔ ڈیک کے مسافروں کے لئے ہوادار برقی پنکھے۔ مذہبی۔ علمی اور ادبی کتب کا دارالمطالعہ باجماعت نماز کے لئے کشادہ اور پاک صاف علیحدہ جگہ۔ حسب مذاق عمدہ اور لذیذ کھانا۔ اور میٹھا پانی بافراط دن رات۔ وغیرہ

اور مستورات کے لئے علیحدہ جگہ کا انتظام پردہ کا خاص لحاظ رکھتے ہوئے کیا گیا ہے

عیدالفطر کے بعد ہمارے جہازات تھوڑے تھوڑے وقفہ سے روانہ ہوتے رہینگے

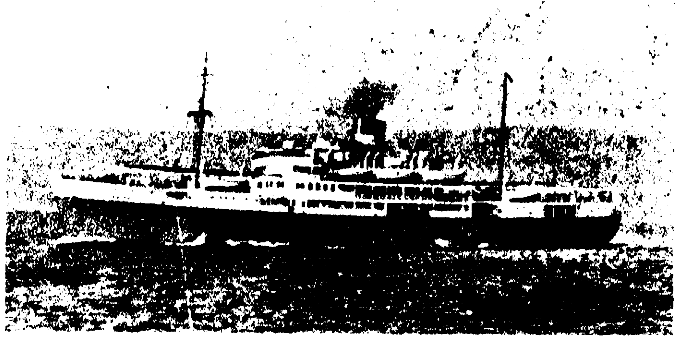
ان جہازوں کی مندرجہ بالا خصوصیات کو ان دس ہزار حاجیوں نے بہت پسند کیا جنہوں نے گذشتہ دو سال میں ان جہازوں سے سفر حج کیا ہے

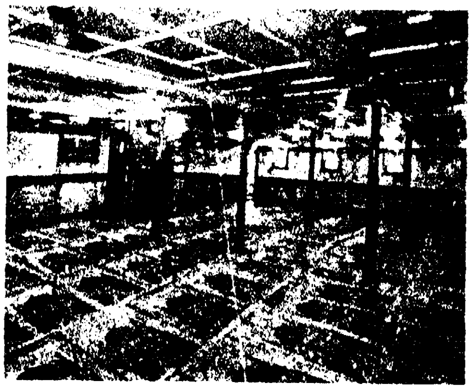
مزید معلومات کے لئے مندرجہ ذیل
کسی پتہ سے دریافت کریں




حج لائن

دی سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹیڈ
سندھیا ہاؤس – نیپیر روڈ – کلا ہوا سٹریٹ
بمبئی — کراچی — کلکتہ



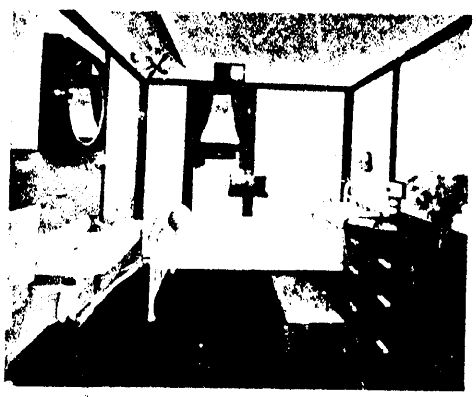


ایس ایس "المدینہ"

جہاز میں نماز کا کمرہ



فرسٹ کلاس لاؤنج



فرسٹ کلاس کیبن

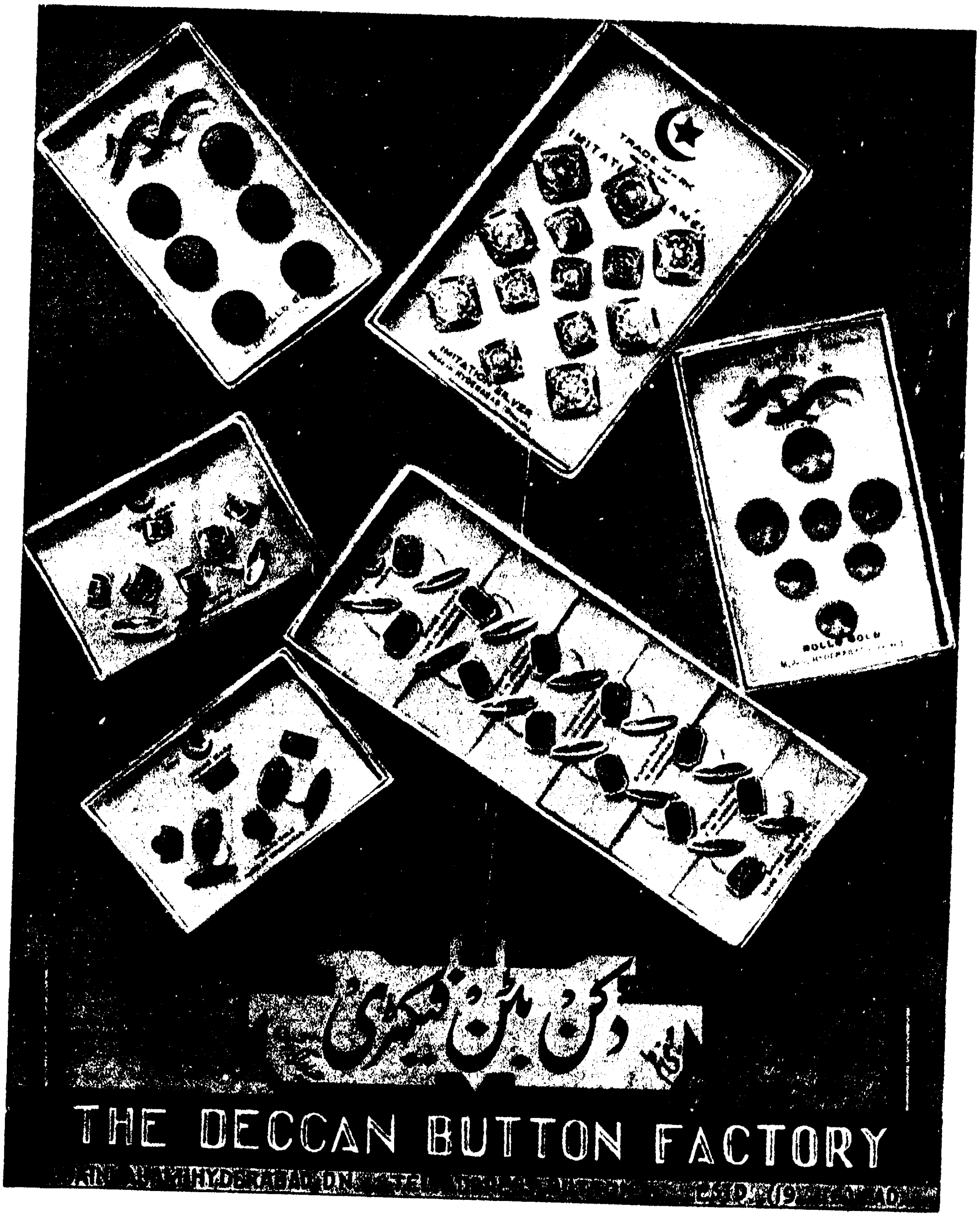


تفریحی برآمدہ

R. L. NO. 4127

# دکن بٹن فیکٹری حیدرآباد دکن

یہی وہ [illegible] حیدرآباد [illegible] صرف حیدرآباد ہی میں بلکہ تمام ہندوستان میں صنعت بٹن سازی کی ایجاد [illegible] بہترین بٹن تیار کرکے [illegible] ہندوستان میں قبول عام ہوچکے ہیں بلکہ یوروپ سے بھی اس کارخانہ کے [illegible]




آپ ہمیشہ اس کارخانہ کے ساختہ چاند تارہ ٹریڈ مارک بٹن استعمال کریں جو آپ کے روپیہ کا پورا پورا معاوضہ دیں گے

## دکن بٹن فیکٹری حیدرآباد دکن